گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

جون 2014

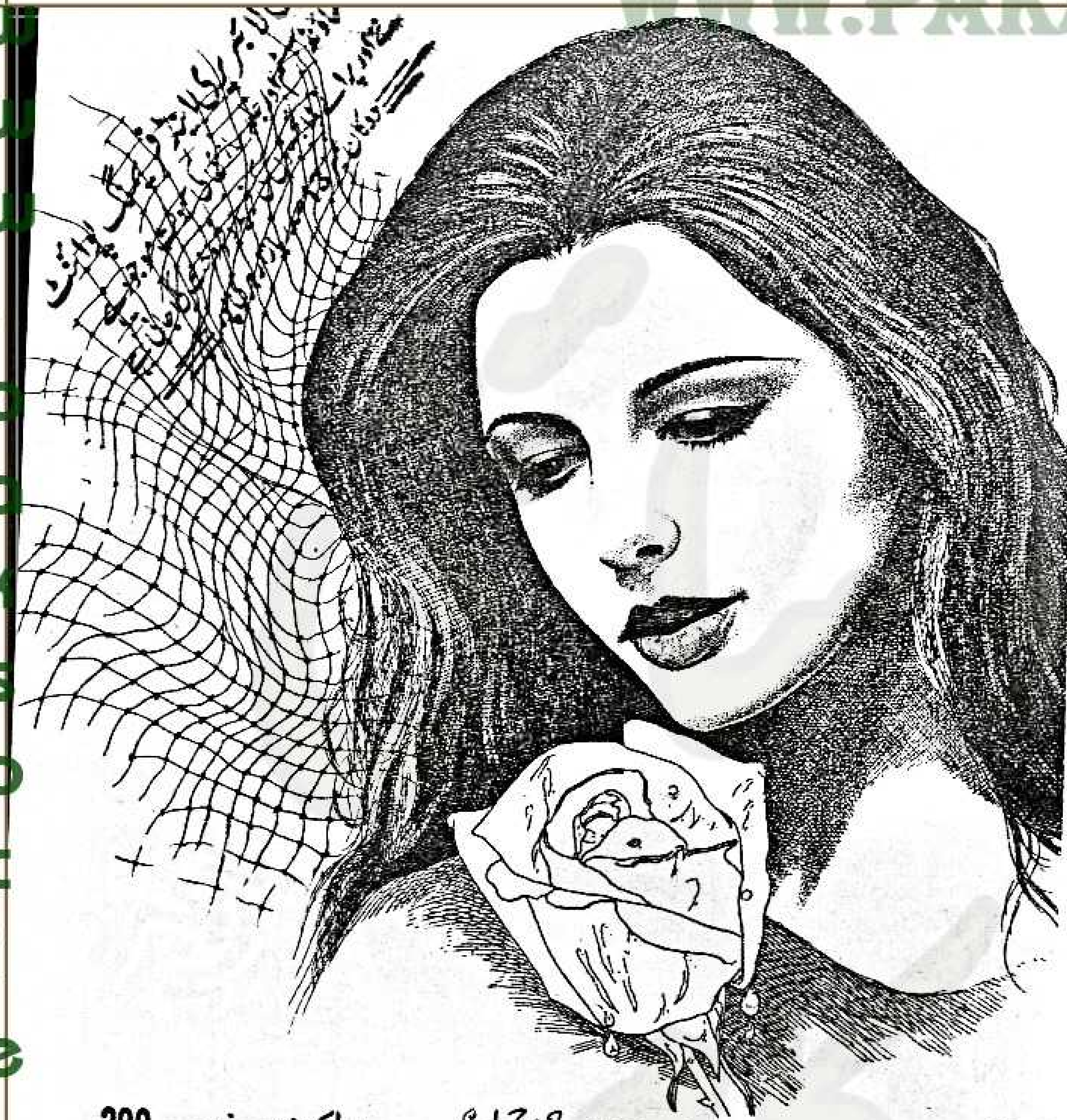
نگران اعلیٰ

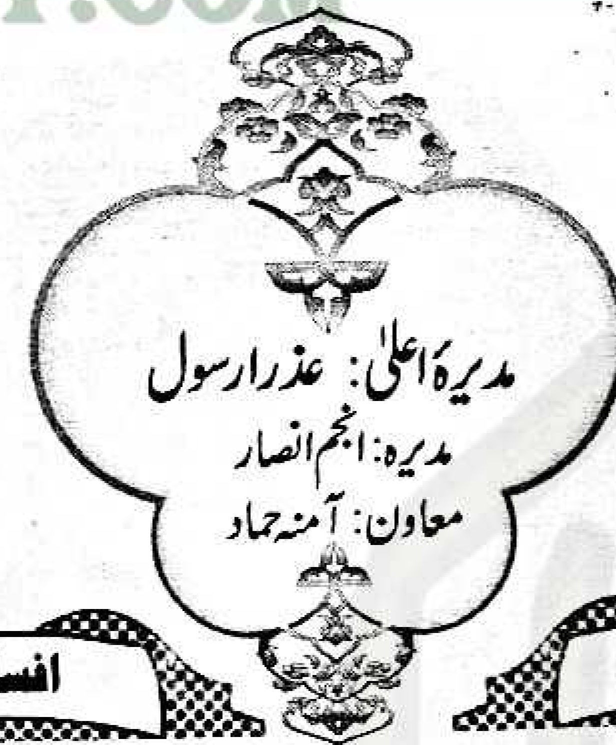
معراج رسول

رفعت سراج [illegible] کے سلسلے وار ناول [illegible]

نگہت عبداللہ، [illegible] نسیما

کے ساتھ ساتھ پڑھیے [illegible] مقبول [illegible] کی متاثر کن کاوشیں





مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد

شعبۂ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: مریم .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 42 • شمارہ 03 • جون 2014 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے ....!

اس نفسا نفسی کے دور میں کوئی کسی کا دوست ہے ہی نہیں...... اس لیے نہ ہم کسی سے ملتے
ہیں...... اور نہ ہی کسی کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اس طرح کی گفتگو یقیناً آپ نے بھی سنی ہوگی۔ تنہائی
کا احساس کبھی نہ کبھی ہر شخص کو ستاتا ہے لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیشہ اکیلا
رہنا بھی ایک نرالی بات ہے۔ ایسے بے شمار لوگ ہیں جو کہیں جانے یا کسی سے ملنے کے بجائے اپنا
وقت سو کر گزارنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ دوستی اور میل ملاقات کو کم اہمیت دینا بعض لوگوں کے لیے
زیادہ حیران کن نہیں ہوا کرتی کیونکہ ان کی پرورش ہی اپنے ماحول میں ہوتی ہے جہاں دوستوں کو
زیادہ اہمیت نہ دی جاتی ہو اور آج آپ سے یہی کہنا ہے کہ انسانوں کی رفاقت کا طلب گار نہ ہونا
ایک غیر صحت مند علامت ہے۔ عمرانیات کے ماہرین نے بارہا یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے اندر
جانوروں کے ریوڑ جیسی جبلتیں پائی جاتی ہیں اور اس جبلت کا ننھے سے ننھا حصہ بھی زیبرے کے
غول سے زیادہ توانا ہوتا ہے، جو ہمارے لیے رفاقتوں اور دوستی کو پانی اور خوراک کی طرح اشد
ضروری بناتا ہے۔ ایک مستند اعداد و شمار سے یہ بات ثابت ہے کہ جسمانی بیماری کا ان لوگوں میں
تقریباً 76 فی صد زیادہ امکان ہوتا ہے جو تنہائی کو محسوس کرتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو دوستی
اور محبت کو اپنی عادت میں شامل کر لیتے ہیں۔ تو آئیں...... اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے کے
بجائے دوست بنائیں اور کچھ ان کی سنیں اور کچھ اپنی سنائیں اور اپنا وقت پر لطف بنائیں...... یاد
رکھیں زندگی چند روزہ ہے، اور ہم لوگوں سے جب ملتے ہیں تو بہت سی اچھی باتیں ان سے سیکھتے بھی
ہیں...... تو اچھے دوستوں کی رفاقت میں آپ کی تنہائی بھی کہیں دور بھاگ جائے گی...... اور آپ کی
زندگی بھرپور، توانا اور یقینی طور پر پرلطف بھی ہوگی۔
مگر اس کے لیے آپ کو اپنا تنہائی کا خول خود توڑنا ہوگا...... جو کسی جیل کی سلاخوں کی طرح آپ
کے گرد موجود ہے...... تو بتائیں آپ اپنی اس خود ساختہ جیل سے کب رہائی حاصل کریں گے......؟

مدیرہ
انجم انصار

دین کی باتیں



اختر شجاعت

علمِ معرفت

تمام تعریف اس اللہ کے لیے جو ایسا اول ہے جس کے پہلے کوئی اول نہ تھا اور ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی آخر نہ ہوگا...... وہ اللہ جس کے دیکھنے سے دیکھنے والوں کی آنکھیں عاجز اور جس کی توصیف وثنا بیان کرنے والوں کی عقلیں عاجز ہیں......اس نے اس کائنات کو اپنی قدرت سے پیدا کیا اور پھر اپنے ارادے کے راستے پر چلایا اور اپنی محبت کی راہ پر ابھارا۔ اے ہمارے رب درود وسلام ہو اس عظیم ہستی پر یعنی نبی اکرم ﷺ پر اور ان کی آل پر......

اللہ...... وہ حسین لفظ جس کے بعد دنیا میں حسن اپنے معنی کھو دیتا ہے۔

اللہ...... وہ محبوب ترین ہستی جس کے بعد دنیا کی تمام محبتیں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں جب اپنے پورے انوار کے ساتھ انسانی قلب وذہن پر آشکار ہوں تو پھر کیوں نہ انسان ہمیشہ کے لیے اس کی رفاقت اختیار کرے۔

پھر ہمارے لیے لازم ہے کہ اسے جانیں ...... پہچانیں ......اس کے لیے یقیناً علم درکار ہے اور اس علم کے حصول کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کس بندے پر کتنا مہربان ہے، کتنا راضی ہے وہ جتنا اسے قریب اور عزیز رکھتا ہے اسی قدر وہ اسے علم عطا کرتا ہے......اللہ تعالیٰ چونکہ علم کو بہت عزیز رکھتا ہے اس لیے وہ جس سے راضی ہوگا اسے ہی علم عطا کرے گا کیونکہ علم سے عقل پیدا ہوتی ہے اور عقل ودانائی کا حاصل خود رب ہے۔ رب تعالیٰ اس علم کے ذریعے بندے کو خود شناسی کی طرف لے جائے گا اور یہ خود شناسی بندے کو حق شناسی کی طرف لے جائے گی......تو اس طرح اس علم کے ذریعے معرفت الٰہی عطا ہوگی۔

علم کے لغوی معنی دانائی وآگاہی کے ہیں......سب سے پہلے حصول علم شرعیہ لازم وضروری ہے کیونکہ اسی پر تمام عبادات کا دارومدار ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ......

''اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ......اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔'' (پارہ ۳ آیت ۱۸)
یہاں اللہ تعالیٰ نے شہادت کی ابتدا اولاً اپنی ذات سے فرمائی پھر فرشتوں کا ذکر فرمایا......اور تیسرے نمبر پر اہل علم کا ذکر کیا۔

حضرت ابن عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ دوسرے مومنین کے مقابلے میں اہل علم کے سات سو درجات زیادہ ہوں گے اور دو درجوں کی درمیانی مسافت پانچ سو برس کی مسافت کے برابر ہوگی۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد مبارکہ ہے کہ...... ''اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ دیتا ہے اور اسے ہدایت دیتا ہے۔ (۱) ''علما، انبیا کے وارث ہیں۔'' (۲) ''زمین وآسمان کی تمام چیزیں عالم کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہیں۔'' (۳) ''بے شک عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت میرے کسی ادنیٰ درجے کے صحابی پر۔''

''عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔''

تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم عبادت سے افضل واعلیٰ جوہر ہے اس لیے بندے کے لیے عبادت کے ساتھ ساتھ علم بھی ضروری ہے۔ علم کو عبادت سے پہلے حاصل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ علم کی روشنی میں کی جانے والی عبادت ہر قسم کے عیوب سے محفوظ رہ سکے اور لذت عبادت حاصل ہو سکے کیونکہ سب سے پہلے معبود کی پہچان ضروری ہے پھر عبادت......

بعض اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر معبود کے بارے میں کوئی اعتقاد رکھا جاتا ہے لیکن حقیقت حال اس سے مختلف ہوتی ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ ''صاحب علم کا سونا جاہل کی نماز سے بہتر ہے۔'' کیونکہ بغیر علم کے عمل کرنے والے اکثر نیکیوں کو برباد کر بیٹھتے ہیں کیونکہ علم پر ہی معاملات عبادت کا دارومدار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حق بندگی اور عبادت وخدمت علم پر ہی موقوف ہے کیونکہ علم نافع خشیت الٰہی اور ہیبت الٰہی کا ثمر ہے۔ علم کے سب سے اہم دو منبع ہیں ایک قرآن کریم ......دوسرا حدیث یعنی سنت رسول اللہ ﷺ۔

1۔ قرآن کریم جو کلام اللہ ہے...... ہدایت قرآن ہی کرے گا کلام ربانی ہی سے ہدایت ملے گی۔ اس کلام اللہ کے مطالب کی وسعت اور حکمت وگہرائی تک رسائی ہر فرد کی اپنی ذہنی اور فکری حیثیت اور اس کے مقام کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کی مکمل تشریح ایک ہی ذات مقدسہ کی زندگی ہے جو قولاً، فعلاً، عملاً اور نوراً ان آیات کی آئینہ دار ہے اور یہ ہستی مقدسہ سرکار دو عالم ﷺ کی ہے۔ ان ہی کے وسیلے ان ہی کے اتباع اور ان ہی کی محبت سے اسرار قرآن کھلتے ہیں۔ اس کے بغیر نہ علم، علم ہے اور نہ عمل، عمل......

قرآن وہ ہے جو صاحب قرآن سے ملائے اور صاحب قرآن ﷺ وہ ہیں جو اللہ سے ملائیں......

قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ ام القریٰ کی عربی معلی ہے جو دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے لوگ بولتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو فصاحت وبلاغت کا ایک لافانی معجزہ بنا دیا ہے......لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ وہی زبان ہے جو خدا کے پیغمبر بولتے تھے...... جو اس زمانے کے مکہ میں اس قوم کی زبان تھی۔

ایک بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ فیوض وبرکات کے حصول کا ذریعہ ادب واطاعت ہے۔ اس قرآن میں کہیں انبیا علیہ السلام کا ذکر ہے...... کہیں عقائد...... کہیں اخلاص...... کہیں رجوع الی اللہ ...... کہیں اصلاح معاشرہ تو کہیں حسن معاشرت کی تربیت دی گئی ہے...... یہ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ''جب میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ سے باتیں کروں تو میں نماز پڑھتا ہوں اور جب چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کلام کرے تو میں قرآن پاک پڑھتا ہوں۔''

حدیث مبارکہ ہے کہ ''جو قرآن کریم میں مشغول رہا اور دعا نہ کر سکا......تو بغیر مانگے اللہ مانگنے والوں سے زیادہ عطا فرمائے گا......'' تو یہ قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے...... حکمت بھرا کلام ہے، فیصلہ کن کلام ہے اور یہ قرآن ہی سیدھا راستہ ہے اور علوم کا سرچشمہ ہے۔

(جاری ہے)

امانت

رفعت سراج

قسط 18

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت وخیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ایس پی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو نا قابلِ قبول ہوتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا کہ وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ گل جان، شاہ عالم کو بتاتی ہے کہ وہ مہر جان کا علاج نہیں کرائے گی اور وہ روما کو بھی کچھ دن کے لیے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ ستارہ، برہان کو فون کر کے بتاتی ہے کہ شبینہ کی جگہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ گل جان، مہر جان کو اکیلا نہیں چھوڑتی ان کے ہی کمرے میں لیٹ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہے۔ ستارہ، برہان کو بتاتی ہے کہ اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں جائے گی۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ جابر علی، ایس پی سے ویسے کی بابت دریافت کرتا ہے تو وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کر دیتا ہے۔ رابی، برہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کون ہے۔ روما، شاہ عالم کے گھر آ جاتی ہے۔ ایس پی، جابر علی کو منع کرتا ہے لیکن جابر علی کہتا ہے کہ جو آرڈر اسے ملا ہے وہ اس پر عمل ضرور کرے گا۔ ستارہ، وارث علی کی بات پر حیران رہ جاتی ہے۔ جابر علی، ستارہ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ ستارہ منع کرتی ہے تو جابر علی ستارہ کو گولی مار دیتا ہے۔ برہان کو خبر ملتی ہے تو وہ فوراً اپنے گھر پہنچتا ہے۔ ایس پی شاہ زمان، جابر علی سے کہتا ہے کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے وارث علی کا نام نہ لے لیکن جابر علی اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ شاہ عالم اخبار میں لگی خبر میں برہان کا نام پڑھ کر چونکتے ہیں۔ برہان، شاہ عالم کا فون آنے پر انہیں بتاتا ہے کہ اس کی بہن کا مرڈر ہو گیا ہے وہ اب روما کو نہیں پڑھا سکے گا۔ شاہ عالم اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کا ایڈریس پوچھتے ہیں تا کہ وہ اس کے گھر جا سکیں۔ مہر جان اپنے مرحوم باپ کو صدائیں دیتی ہیں وہ گل جان سے کہتی ہیں کہ بابا ان سے ملے بغیر کبھی نہیں گئے تو اب کیسے چلے گئے۔ ایس پی، وارث علی کو خبردار کرتا ہے۔ رابی کو برہان کی بہن کے مرڈر کی خبر ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ شاید اب وہ اسے نہیں دیکھ پائے۔ رابی کو دیکھ کر مہر جان اسے پہچانتی نہیں ہیں وہ ایسا تصور میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی جو ان کی حالت تھی۔ شاہ عالم، رابی کی ہمت بندھاتے ہیں شاہ عالم، برہان کے گھر جاتے ہیں اسے تسلی دیتے ہیں۔ شائستہ بیگم، فائزہ کو کہتی ہیں کہ اب وہ شبینہ سے دوستی ختم کرے...... شبینہ، برہان سے جابر علی کے بارے میں پوچھتی ہے تو برہان کہتا ہے کہ وہ اب ان سے نہیں ملے گا۔ رابی، کائناز اور روما کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ جابر علی اپنے ماتحت سے کہتا ہے وہ اس کی اس عزت افزائی کو یاد رکھے گا۔ وارث علی، ایس پی شاہ زمان سے کہتا ہے کہ وہ جابر کے قبضے سے وہ فائل نکلوائے...... ستارہ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ رابی شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ کائناز کو بتا دیں کہ اب برہان انہیں پڑھانے نہیں آئے گا تو شاہ عالم کہتے ہیں کہ وہ برہان کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ روما، کائناز کے ساتھ اپنے گھر جاتی ہے تو مہر جان اسے نہیں پہچانتیں، ایس پی جابر علی سے بات کرتا ہے کہ وہ فائل اسے دے دے مگر جابر علی، ایس پی کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے، وارث علی، برہان کو فون کر کے کہتا ہے اسے ایک فائل چاہیے اور اگر وہ فائل اسے نہ ملی تو ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا...... برہان فائل کے بارے میں شبینہ سے پوچھتا ہے تو وہ بھی پریشان ہو جاتی ہے، احمر، شائستہ بیگم کی اس بات سے بہت ڈپریسڈ ہوتا ہے کہ فائزہ، شبینہ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ اصیل خان، گل جان سے کہتا ہے کہ اب روما اور رابی کو گھر واپس آ جانا چاہیے۔ وارث علی برہان کو فون کرتا ہے تو وہ ریسیو نہیں کرتا۔ میر داد، جابر علی سے کہتا ہے کہ وہ کیس کو الجھا دے لیکن جابر علی اس کی بات کی نفی کرتا ہے۔ گل جان، اصیل خان سے کہتی ہے کہ وہ بچیوں کو اصل حقیقت کا بتا دے گی۔ کائناز اپنے والدین کی تصویریں روما اور رابی کو دکھاتی ہے تو روما جذباتی ہو جاتی ہے۔ گل جان دیکھتی ہے کہ مہر جان ماضی کی یادوں میں گم ہیں۔ وارث علی گھر آتا ہے اور صابرہ سے کہتا ہے کہ وہ رشتے داری کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ صابرہ اسے کہتی ہے کہ وہ برہان کے آنے پر آ کے بات کرے۔ برہان غصہ کرتا ہے کہ صابرہ نے اسے گھر میں کیوں بلا لیا۔ وارث علی ایس پی سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی کی بیٹی کو اٹھا لے گا۔ روما، اصیل خان سے کہتی ہے وہ اس کے باپ کے بارے میں بتائے، اصیل خان اسے صرف اتنا بتاتا ہے کہ اس نے روما کے باپ کو دیکھا ہے۔ شبینہ، صابرہ کو نیند کی دوا دیتی ہے، وہ وارث علی کا فون سنتی ہے تو وارث علی، برہان کو دھمکی دیتا ہے تو برہان، شبینہ کو شاہ عالم کے گھر لے جاتا ہے۔ وہ گارڈ سے کہہ کر کائناز کو بلاتا ہے اسے بتاتا ہے کہ شبینہ اس کی بہن ہے وہ اسے یہاں رکھے صبح وہ شاہ عالم سے بات کر لے گا۔

اب آگے پڑھیں

''بھائی میں آپ کو بتا رہی ہوں میں شبینہ کو نہیں چھوڑ سکتی پلیز...... آپ ممی کو سمجھائیں...... انہوں نے کیوں ایک چھوٹی سی بات کو ایشو بنا لیا ہے۔ اتنی سمپل اتنی سادہ سی ہے شبینہ...... ممی کو آخر مسئلہ کیا ہے؟'' فائزہ ماں، باپ کے سونے کے بعد اپنے دل کی بھڑاس نکالنے احمر کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔

احمر لیپ ٹاپ پر کوئی بہت اہم میل ٹائپ کر رہا تھا۔ فائزہ نے یہ جانے بغیر کہ وہ کتنا اہم کام کر رہا ہے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''میں ممی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں ٹینس مت ہو جاؤ، جا کر سو جاؤ صبح کالج جانا ہے ناں یا چھٹی ہے ؟''

''دل تو نہیں چاہتا مگر جانا پڑے گا۔''

''آخر تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو...... بس ممی نے ویسے ہی کہہ دیا ہوگا۔ تھوڑا سا ممی کو ایموشنلی پریشرائز کریں گے، سیٹ ہو جائیں گی...... جاؤ تم جا کر سو جاؤ۔''

''بھائی...... نیند نہیں آ رہی تھی تبھی تو آپ کے پاس آ گئی۔''

''میرا دماغ کھانے کے لیے ؟'' احمر نے برجستہ انداز میں کہا تھا۔

''نہیں بھائی...... بس سونے کے لیے لیٹی تو ایک دم ذہن شبینہ کی طرف چلا گیا...... پھر نیند ہی نہیں آئی میں نے سوچا دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں...... تھوڑی دیر آپ سے ہی باتیں کر لوں۔''

''کوئی اچھی سی مووی دیکھ لو۔'' احمر نے مشورہ دیا۔

''اس سے تو اور نیند بھاگ جائے گی۔''

''پھر ایسا کرو بہت بوری مووی دیکھ لو ایک دو سین دیکھنے کے بعد تمہیں نیند آنا شروع ہو جائے گی۔''

''لیکن میں اچھی اور بور موویز کے چکر میں پڑوں گی تو صبح ہو جائے گی...... آپ کو کچھ سمجھ آئی ہے کہ ممی شبینہ سے کیوں اتنا چڑتی ہیں؟'' فائزہ کی سُوئی اسی طرح اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ احمر نے اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارا...... اور بڑی بے بسی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا جو باتیں اس کے دل کی کر رہی تھیں مگر وہ اپنے دل کی بات فی الحال اس سے نہیں کر سکتا تھا۔

''ویسے ہی شاید ممی سمجھتی ہوں کہ وہ ان کے اسٹیٹس سے میچ نہیں کرتی...... ایکچوئیلی تمہیں پتا ہے ناں ممی بہت زیادہ اسٹیٹس کانشس ہیں۔''

''پتا نہیں کیا کامپلیکس ہے ممی کو۔'' فائزہ برا سا منہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سب انسان اللہ کے بنائے ہوئے ہیں......'' وہ مزید گویا ہوئی تھی۔ احمر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا...... پیاری سی بہن بڑی پیاری پیاری باتیں کر رہی تھی۔

''خدا کرے یہ بات سب کو سمجھ آ جائے...... اگر یہ بات سب کو سمجھ آ جائے تو دنیا میں شاید کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے۔'' احمر نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

''اچھا تم اپنے کمرے میں جاؤ اور ایک ہزار مرتبہ شبینہ کا نام لو، میں گارنٹی سے کہتا ہوں تمہیں نیند آ جائے گی۔ یہ میری طرف سے تمہیں وظیفہ گفٹ ہوا ہے۔'' فائزہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پیر پٹختے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگی۔ اس وقت اس کا مذاق کا بالکل موڈ نہیں تھا لیکن احمر کا سیریس ہونے کا موڈ نہیں تھا۔

☆☆☆

''آپ کی...... میرا مطلب ہے آپ کی مدر اور فادر کہاں ہیں، جو سر آپ کو یہاں لے آئے ؟'' کائناز اور

روما حیرت بھری معصومیت کے ساتھ شبینہ کو تکے جارہی تھیں۔ بالآخر کائناز بول پڑی تھی۔ شبینہ نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔

''میری مدر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور فادر کے ساتھ ایک پرابلم چل رہی ہے وہ شاید آپ کے دادا جان کو پتا ہے، کیا انہوں نے آپ کو بھائی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

یہ سن کر کائناز اور روما ایک دم حواس باختہ سی ہوگئیں تو وہ شبینہ کی خاطر انجان بننے کی ایکٹنگ کررہی تھیں انہیں شرم آرہی تھی کہ وہ شبینہ کے سامنے ظاہر کریں کہ بہت سی باتیں ان تک پہنچ چکی ہیں۔ وہ شبینہ کو پُرسکون رکھنے کی سعی کررہی تھیں۔ روما نے کائناز کو نظروں ہی نظروں میں جیسے لتاڑا کہ تم نے مہمان کے سامنے یہ کیسا سوال کردیا بے چاری کو مشکل میں ڈال دیا۔

''آئی ایم سوری...... وہ ویسے ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا پلیز آپ، آپ ریسٹ کیجیے صبح آپ سے بہت ساری باتیں کریں گے اور آپ کی داداجان سے ملاقات بھی ہوگی۔''

''مجھے پتا ہے آپ دونوں اتنی رات کو میرے یہاں آنے سے پریشان ہوگئی ہیں لیکن صبح بھائی آئیں گے ناں تو میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی بس رات ہی رات کی بات ہے۔'' شبینہ نے اپنی دانست میں ان دونوں کی الجھن رفع کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ارے نہیں، نہیں کیسی باتیں کررہی ہیں آپ...... ہم تو آپ کے آنے سے بہت خوش ہوئے اور پریشانی والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے، دراصل اس گھر میں کئی کمرے ہیں مگر میں اور روما نہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اب یہ میرے بیڈ پر سوجاتی ہے تو میں صوفے پر سوجاتی ہوں اب آپ ایسا کریں کہ روما کے ساتھ بیڈ پر سوجائیں۔ آپ کو شاید اچھا نہ لگے آپ شاید کمفرٹیبل فیل نہ کریں مگر صرف رات کی بات ہے اور اتنی رات تو ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہوجائے گی۔'' کائناز اپنی فطری سادگی اور معصومیت کے ساتھ بولے چلی جارہی تھی اور شبینہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریڈش براؤن سلکی بال اور گلابیوں کی جھلکیاں دکھاتا دودھیا چہرہ اسے تو وہ ایک باربی ڈول کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اسکائی بلیو چمکدار نرم کپڑے سے بنے ہوئے شب خوابی کے لباس میں وہ اتنی پُرکشش دکھائی دے رہی تھی کہ نظریں...... ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا جبکہ روما نے اپنے بالوں کی اونچی سی پونی بنائی ہوئی تھی گہرے سیاہ شب خوابی کے لباس میں اس کے وجود سے اداسیاں سی ٹپکتی محسوس ہوتی تھیں شب خوابی کے لباس کا جیٹ بلیک کلر اس کی دودھیا رنگت کو بہت نمایاں کررہا تھا۔ وہ کائناز سے کم خوب صورت نہ تھی مگر دونوں کے چہرے بہت مختلف تاثرات کے حامل تھے۔ کائناز معصومانہ حیرت کے ساتھ کھوئی، کھوئی سی دکھائی دے رہی تھی جبکہ روما کے انداز میں گہری سوچ کے ساتھ ساتھ عجیب سی بیزاری بھی جھلک رہی تھی، وہ بیزاری جو اس کے اندر سے پھوٹ، پھوٹ کے باہر آرہی تھی ایسی کیفیت جو کائناز کے لیے تھی نہ شبینہ کے لیے شاید صرف اس کے اپنے لیے تھی۔

''آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاؤں......؟'' کائناز کو ایک دم ہی یہ خیال آیا تھا کہ اتنی دیر میں اس نے شبینہ سے کچھ کھانے پینے کے بارے میں نہیں پوچھا۔

''نہیں، نہیں میں نے کھانا کھالیا تھا پلیز آپ لوگ آرام کیجیے، مجھے تو بہت شرمندگی ہورہی ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کی نیند خراب ہوئی۔'' شبینہ نے دل کی گہرائیوں سے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا تھا جو اس کی آنکھوں سے بھی جھلکنے لگی تھی۔

''پلیز آپ لوگ آرام کیجیے......'' شبینہ نے ان دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا...... جو عمر میں اس سے بہت زیادہ نہ سہی پر چھوٹی تھیں اور ابھی تک ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھے جارہی تھیں چونکہ کہنے والی ساری باتیں کہہ چکی تھیں لگتا تھا کہ اب ان کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں بچا۔

☆☆☆

برہان بہ مشکل دو، تین گھنٹے ہی سویا تھا فجر کی اذانیں بلند ہوئیں تو اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔ چند لمحے اس نے ذہن سے نیند کا پردہ ہٹانے میں صرف کیے پھر ایک دم جیسے اس پر عجلت طاری ہوگئی...... شبینہ کا خیال آتے ہی اس کے وجود میں بجلیاں سی دوڑ گئیں پتا نہیں اس کی رات کیسے کٹی وہ سوئی بھی یا جاگتی رہی۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے بستر چھوڑ دیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کی نیت سے وضو کرنے واش روم کی طرف بڑھ گیا......

ابھی اس نے وضو کرنا شروع ہی کیا تھا کہ صابرہ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جو بڑے وحشت زدہ انداز میں پکارتے ہوئے اس کے کمرے میں آگئی تھی۔

''برہان...... برہان...... شبینہ کہاں ہے؟ واش روم میں بھی نہیں ہے چھت پر بھی نہیں ہے برہان......''

''امی...... پلیز...... آرام سے گھبرائیں نہیں، آئیں بیٹھیں میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' برہان ماں کی آواز سن کر تیزی سے باہر آگیا اور ماں کے قریب جاکر ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''ارے کیا بتاتے ہو، دماغ تو صحیح ہے تمہارا۔ میں کہہ رہی ہوں شبینہ گھر پر نہیں ہے۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے بہت پیاس لگ رہی تھی میں نے شبینہ کو آواز دے کر کہا کہ بیٹا مجھے ایک گلاس پانی پلادو کافی دیر انتظار کیا مگر وہ پانی ہی لے کر نہیں آئی تو میں اٹھی اس کو دیکھا وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دی، مجھے لگ رہا ہے کہ بس اب میرا دل بند ہونے والا ہے۔ برہان تم باہر نکل کر خود دیکھو شبینہ پورے گھر میں نہیں ہے۔''

''امی، امی آپ پہلے میری بات تو سنیں، میں آپ کو کچھ بتارہا ہوں، شبینہ ہی کے بارے میں کچھ بتارہا ہوں خدا کے لیے امی......'' برہان نے صابرہ کو دونوں کاندھوں سے تھام کر منت کے انداز میں کہا تھا۔ وہ حیران، پریشان ہوکر اس کی شکل دیکھنے لگی کیونکہ اس کے لیے واقعی حیرت کا مقام تھا کہ وہ برہان کو بتارہی ہے کہ شبینہ گھر میں کہیں دکھائی نہیں دے رہی اس کے باوجود اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

''کیا بتاؤ گے بیٹا...... مجھے کیا بتاؤ گے تم، ارے پہلے شبینہ کو......''

''امی پلیز......'' برہان نے ماں کی بات کاٹ دی۔ ''امی...... شبینہ کو میں خود شاہ صاحب کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔ آپ میری پوری بات تو سن لیں۔'' برہان کی بات سنتے ہی صابرہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

''شاہ صاحب کے گھر...... کون شاہ صاحب؟'' ان کے منہ سے بڑی اضطراری کیفیت میں نکلا تھا۔

''امی، جہاں میں ٹیوشن پڑھانے جاتا ہوں کئی مرتبہ ان کا ذکر کیا ہے ناں آپ سے اور وہ گھر پر بھی تو آئے تھے تعزیت کرنے کے لیے۔''

''اچھا، اچھا!'' صابرہ کو اب ایک دم سب کچھ یاد آگیا۔ وہ گرنے کے انداز میں قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یا اللہ...... میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ ارے بیٹا تم اسے کس وقت چھوڑ کر آئے، کیوں چھوڑ کر آئے مجھے جلدی سے بتاؤ، میرا تو دماغ چکرا رہا ہے۔'' صابرہ نے اب بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''امی، رات کو وارث علی کا فون آیا تھا، وہ دھمکیاں دے رہا ہے، وہ اتنا بڑا مجرم ہے کہ صرف دھمکیوں سے کام نہیں چلائے گا وہ کچھ بھی کرسکتا ہے غصہ تو مجھے بہت آرہا تھا، میں اس کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں لیکن جب

بات ماں یا بہن کی ہو تو رِسک لینا عقل مندی نہیں ہوتی۔''

''کیا دھمکیاں دے رہا تھا وہ؟'' صابرہ نے سہمی، سہمی نظروں سے برہان کی طرف دیکھا۔ دل تھا کہ بس ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔

''امی بظاہر تو وہ بہت اچھا بن کر بات کر رہا ہے، کہہ رہا ہے کہ آپ لوگ سے رشتے داری توڑنا نہیں چاہتا آپ کی ایک بہن دنیا سے جا چکی تو کیا ہوا...... دوسری بہن تو ہے...... نیا رشتہ بنایا جا سکتا ہے، امی آپ اس بات کا مطلب سمجھ رہی ہیں ناں......؟ وہ چاہتا ہے کہ ہم اب شبینہ کی شادی اس سے کر دیں......''

''اللہ توبہ استغفار......'' صابرہ تڑپ کر برجستگی کے انداز میں بولی تھی۔

''تم مجھے بتائے بغیر شبینہ کو گھر سے لے گئے، ارے مجھے اٹھا کر بتا تو دیتے......''

''امی میں نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں اٹھایا، آپ نیند کی گولی کھا کر سوئی تھیں شبینہ کو تو لے کر جانا ہی تھا مگر آپ کی نیند خراب ہو جاتی پھر ذرا سی دیر میں آپ کی طبیعت بگڑ جاتی ہے میں نے سوچا تھا صبح آپ اٹھیں گی تو آپ کو آرام سے سب کچھ بتا دوں گا۔''

''ارے بیٹا...... تم شبینہ کو لے کر اکیلے نکل کھڑے ہوئے مجھے بھی اٹھا دیتے، میں اس کے ساتھ ہی چلی جاتی...... بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ تمہارا بھی اب اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں...... ارے ایسے بدمعاشوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے...... تم بھی بس اس گھر کو خدا حافظ کہہ دو اور میرے ساتھ وہیں چلو جہاں شبینہ کو چھوڑ کر آئے ہو...... بیٹا اب ہمارا اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے، اس کمبخت نے سمجھو یہ گھر دیکھ لیا ہے وہ ہمارا پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا...... ارے اتنی بری طرح لُٹ گئے ہم مگر کمبخت کو رحم نہیں آتا جانے کیا کھا کر زندہ رہتے ہیں ایسے لوگ جو اتنے سخت ہوتے ہیں ان کے دل۔''

''امی میں نماز پڑھ رہا ہوں آپ بھی نماز پڑھ لیں...... نماز پڑھ کر پھر ہم چلتے ہیں، آپ پُرسکون رہیں یہ ہر وقت کی ٹینشن ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب بھی ہو سکتی ہے میری اور شبینہ کی خاطر آپ خود کو سنبھالیں...... ہمیں اپنی ماں کی بہت ضرورت ہے، بس آپ کی دعاؤں کے سہارے ہی تو اس اندھیرے میں راستہ تلاش کرنا ہے۔'' برہان کے لہجے میں بلا کا سوز تھا۔ ساری گزری ہوئی افتاد اس ایک لمحے میں سمٹ آئی تھی وہ لمحہ جو ابھی، ابھی اسے اور اس کی ماں کو چھو کر کسی لازوال پنہائی میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شاہ عالم اپنے معمول کے مطابق نمازِ فجر مسجد میں ادا کرنے کے بعد واک پر چلے گئے تھے آدھے گھنٹے کی واک کے بعد جب انہوں نے گھر میں قدم رکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کائناز لان کے سامنے بڑے سے برآمدے میں بڑی بے قراری سے ٹہلتی دکھائی دی جیسے وہ ان ہی کا انتظار کر رہی ہو۔

''السلام علیکم...... دادا جان......'' کائناز نے عجلت بھرے انداز میں شاہ عالم کو سلام کیا تھا...... وہ چار قدم اندر آئے تھے اور وہ بھاگتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئی تھی۔

''وعلیکم السلام بیٹا! خیریت تو ہے یہ اتنی صبح، صبح تم مجھے سلام کرنے کے لیے یہاں آ کر کھڑی ہو گئیں، خیریت تو ہے ناں آج کوئی بہت بڑی فرمائش ہو گی اس لیے سلام کرنے میں بڑی جلدی کی۔'' شاہ عالم نے مسکرا کر بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مگر شاہ عالم کے اس شگفتگی کے جواب میں بھی کائناز کے چہرے پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ فکرمند سے نظر آنے لگے کیونکہ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی

کہ کائناز کے چہرے پر تفکر کی لکیریں، آنکھوں میں الجھن اور پریشانی کی کیفیت......

''دادا جان...... میں آپ کو یہ بتانے کے لیے کمرے سے باہر آئی تھی کہ ہمارے گھر میں رات کو گیسٹ آئے تھے۔'' اب چونکنے کی باری شاہ عالم کی تھی۔

''گیسٹ آئے تھے تو مجھ سے کیوں نہیں ملے؟''

''وہ ابھی ہمارے گھر میں ہیں۔'' کائناز نے فوراً ہی جواب دے دیا تھا۔

''اوہو! کون ہے بیٹا، کون گیسٹ ہیں؟ مجھے تو تم پریشان نظر آ رہی ہو حالانکہ گھر میں مہمان آتے ہیں تو اس میں پریشانی والی تو کوئی بات نہیں ہے مگر وہ کون لوگ ہیں، میرے لیے پریشانی کی بات یہی ہے۔'' شاہ عالم.... اب انتہائی متفکر دکھائی دینے لگے...... بلکہ اضطراری کیفیت میں مبتلا دکھائی دیے۔

''وہ... سر برہان ہیں ناں......'' کائناز نے تمہید باندھی۔

''اوہو...... برہان آیا تھا؟'' برہان کا نام سن کر شاہ عالم ایک دم چونک پڑے۔

''دادا جان...... سر برہان اپنی بہن کو ہمارے گھر لائے تھے، وہ ہمارے گھر میں ہی سو رہی ہیں، پتا نہیں بے چاری کب سوئی ہوں گی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو، بیٹا مجھے ٹھیک سے بتاؤ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' وہ واقعی اس مرتبہ گڑبڑا کر رہ گئے تھے۔

''وہ آپ سوئے ہوئے تھے ناں تو گارڈ نے مجھے اٹھا کر بتایا تھا کہ سر برہان آئے ہیں، میں ان سے ملنے باہر آئی تو دیکھا ان کی بہن ان کے ساتھ ہیں، سر کہنے لگے کہ ان کی بہن آج رات ہمارے گھر ہی رہیں گی۔''

''تو بیٹا آپ نے مجھے کیوں نہیں اٹھایا؟'' شاہ عالم اب بالکل پُرسکون ہو کر پوچھنے لگے۔

''وہ دادا جان، سر کہہ رہے تھے کہ آپ کو نہ اٹھاؤں آپ پیشنٹ ہیں، اتنی رات کو اچانک اٹھانا آپ کے لیے اچھا نہیں ہو گا...... آپ میڈیسن لیتے ہیں اور جو لوگ دوا لیتے ہیں ان کی نیند خراب نہیں کرنی چاہیے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، بچہ بہت حساس اور ذمے دار ہے بڑی مہربانی اس کی کہ اس نے اتنا احساس کیا مگر میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی بہن کو یہاں چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔''

''جی دادا جان میں اور روما بھی رات سے پریشان ہیں ان کے ساتھ کیا پرابلم ہے ان کی تو...... مدر بھی ہیں۔''

''وہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اس کی ماں کہاں ہے، وہ اپنی بہن کو یہاں کیوں چھوڑ گیا؟ خیر میں ابھی فون کر کے اس سے بات کر لیتا ہوں، تم فکر نہ کرو۔''

''دادا جان! وہ کہہ رہے تھے کہ وہ صبح آئیں گے اور اپنی بہن کو یہاں سے لے جائیں گے صرف رات، رات کی بات ہے۔'' کائناز بولی۔

''ارے یہ تو بعد کی باتیں ہیں، وہ کہاں لے کر جاتا ہے اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہوا...... کوئی مسئلہ تو ہے ورنہ وہ آدھی رات کو اپنی بہن کو یہاں چھوڑ کر نہ جاتا۔'' اب شاہ صاحب خود کلامی کے انداز میں بات کر رہے تھے اور کائناز ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''چلو بیٹا اندر چلو آپ تو اپنی تیاری کرو ناں......''

''دادا جان وہ سر کی بہن ہیں ناں ان کا نام شبینہ ہے سو رہی ہیں وہ......''

''ہاں، ہاں بیٹا، انہیں سونے دو جب وہ اٹھیں گی تو ان سے بات ہو جائے گی آپ اپنی تیاری کرو ناشتا

وغیرہ کرو...... یا پھر چھٹی کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو؟'' شاہ صاحب نے اپنے چہرے سے تفکرات کا جال مٹانے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے بڑے لطیف انداز میں اس سے بات کی...... ان کا ذہن تو بس برہان پر جا کر اٹک گیا تھا اور جب تک یہ معما حل نہیں ہوتا تھا ان کا ذہن کسی اور سمت جا ہی نہیں سکتا تھا۔"بہن کو یہاں چھوڑ گیا اور ماں کہاں ہے؟''

☆☆☆

''شاہ صاحب یہ میری امی ہیں۔'' برہان اس وقت شاہ عالم کے ڈرائنگ روم میں صابرہ کے پہلو میں بیٹھا ہوا بڑے مؤدبانہ انداز میں ماں کا تعارف کرا رہا تھا۔ صابرہ اچھی طرح سر پر دوپٹا جمائے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے اپنے کسی ناکردہ جرم کی سزا سننے کی منتظر ہو۔

ایک تو اتنا عالیشان گھر دیکھ کر وہ ویسے ہی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ دوسرے شاہ صاحب کی بارعب شخصیت اسے نظریں نہیں اٹھانے دے رہی تھی۔

شاہ صاحب کے چہرے پر غم و حزن کی کیفیت بہت واضح تھی، چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔

''شاہ صاحب میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں مگر میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ آس پاس کوئی ایسا محفوظ ٹھکانا دکھائی نہیں دیتا جہاں میں امی اور شبینہ کو ٹھہرا سکوں...... میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا...... لیکن بس یہ چند دنوں کی بات ہوگی...... میں انشاء اللہ کچھ ایسا انتظام کرلوں گا کہ میں ان دونوں کو یہاں سے لے جاؤں۔'' برہان بہت پُرتکلف اور شرمسار لہجے میں شاہ صاحب سے مخاطب تھا، شاہ صاحب کے چہرے پر بکھری ہوئی لکیروں کا جال ایک دم معدوم ہو گیا اور ہونٹوں پر بڑی لطیف سی مسکراہٹ ابھری انہوں نے بہت محبت بھری نظروں سے برہان کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ تو مجھے اندازہ ہے بیٹا! آپ بہت خوددار نوجوان ہیں اور اسی وجہ سے میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے، وہ جو بس ایک نظر میں کچھ سما جاتا ہے ناں...... بس پھر وہ تصویر آنکھوں کے سامنے سے ہٹتی نہیں ہے...... آپ کو یاد ہوگا میں ٹیوٹر کا اپائنٹمنٹ کر چکا تھا لیکن میں نے آپ کو ترجیح دی...... کوئی تو وجہ ہوگی ناں......''

شاہ صاحب محبت بھرے لہجے میں برہان سے مخاطب تھے اور صابرہ کے روم، روم میں ایک سکون سا اتر رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت فخر اور خوشی کی بات تھی کہ ایک معزز شخص اس کے بیٹے کی اس انداز سے تعریف کر رہا تھا۔

''دیکھیں انسان ہی انسان کے کام آتے ہیں، ماشاء اللہ اتنا بڑا گھر ہے، انیکسی مدتوں سے خالی پڑی ہوئی ہے۔ پہلے اِدھر کرائے دار ہوتے تھے مگر بہت پریشان کر رہے تھے بڑی مشکلوں سے ان سے جان چھڑائی تھی پھر اس کے بعد کوئی کرایہ دار رکھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا...... اب میرے بوڑھے دماغ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں یہ فضول کی ایکسرسائز کروں، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے...... ہم فیملی ممبرز ہی کتنے ہیں...... ایک میں ہوں اور ایک میری پوتی...... شکر ہے بہت اچھی طرح گزر بسر ہو رہی ہے۔'' شاہ صاحب نے برہان کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں گویا اسے تسلی دی تھی۔

''پھر بھی شاہ صاحب ہم وہ انیکسی کرائے پر لے لیتے ہیں تو اتنا کرایہ تو نہیں دے سکیں گے جو یہاں آج کل چل رہا ہے اتنی مہنگی اکاموڈیشن تو فی الحال ہم افورڈ نہیں کر سکتے لیکن جب تک ہم رہیں گے، میں آپ کو کچھ نہ کچھ دے دیا کروں گا اور جب آپ کہیں گے کہ جگہ خالی کردو تو میں ایک ہفتے کے اندر، اندر خالی کردوں گا...... اب جیسا آپ بولیں۔'' شاہ صاحب، برہان کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا پڑے۔

''اچھا......! تو یعنی آپ ہمارے کرایہ دار بن کر رہنا چاہتے ہیں جیسے آپ کی مرضی ... میں تو آپ کو اپنے گھر میں مہمان بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔'' صابرہ ابھی تک ان دونوں کی گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اب بڑے شرمسار سے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''شاہ صاحب مہمان تین دن کا ہوتا ہے اور ہمیں پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں۔ میں تو آپ کی طرف آتے ہوئے بہت ڈر رہی تھی۔ بلکہ بڑی شرم سی آرہی تھی...... یوں بھی اب ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل ہی کہاں رہے ہیں۔'' بولتے، بولتے...... صابرہ کی آواز ایک دم بھرانے لگی تھی۔

شاہ صاحب کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی...... کیونکہ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ یہ ماں، بیٹا جو اس وقت ان کے سامنے بیٹھے ہیں قطعی بے قصور ہیں اور ایک افتاد سر پر آپڑی ہے جس کا وہ مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے اب تو یوں سمجھیں کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، سب کچھ دیکھا جو دیکھنا چاہا وہ بھی جو دیکھنا نہیں چاہا...... آپ تکلف نہ کیجیے اور خود پر کوئی بوجھ محسوس مت کیجیے...... میں نے کہاں ناں...... اللہ کا دیا بہت کچھ ہے، لوگ تو اپنے پورے، پورے گھر ٹرسٹ کو دے دیتے ہیں۔ میں تو آج بھی اتنا بڑا گھر لیے بیٹھا ہوں...... گزر بسر کے لیے تو ایک کمرا ہی کافی ہے مگر...... ابھی بچی کا ساتھ ہے اس کی ذمے داری ہے...... اس لیے اتنے بڑے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں...... آپ لوگ آجائیں گے تو گھر میں رونق ہوگی...... شبینہ کی کائناز کے ساتھ دوستی ہو جائے گی...... میرا خیال ہے جتنا بھی ساتھ قسمت میں لکھا ہے...... وہ اچھا ہوگا۔'' شاہ صاحب اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں مخاطب تھے، یوں جیسے...... ڈھلوان پر پانی گر رہا ہو...... صابرہ کے دل پر ان کے الفاظ اور لہجے کا بہت اثر ہوا تھا...... وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دے رہے تھے...... اللہ یوں اس کی مدد کرے گا، اندھیرے میں راستہ دکھائے گا...... وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ رات تک دل پر وحشتیں بلاؤں کی طرح نازل ہوئی تھیں...... اور اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے اللہ نے ساری زندگی کی مانگی ہوئی دعائیں ایک ہی دفعہ میں قبول کرلیں...... خوف سے نجات مل گئی، محفوظ ٹھکانا مل گیا...... اس برے وقت میں اس سے زیادہ اور چاہیے بھی کیا تھا۔

''آپ جیسے لوگوں کے رحم سے یہ دنیا قائم ہے۔'' وہ آنسوؤں بھری آواز میں بڑی بے اختیاری کیفیت میں گویا ہوئی تھی۔

شاہ صاحب اس کا یہ جملہ سن کر شرمندہ سے ہو گئے۔

''یہ آپ کا بڑا پن ہے آپ اس طرح سوچتی ہیں ورنہ جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ تو نہیں کیا...... جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو بے شمار نعمتوں سے نوازے تو اس کے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے اور نعمت کی شکر گزاری کا یہ سب سے آسان راستہ ہے کہ اس کے پریشان حال بندوں کا خیال کیا جائے۔ میں نے تو ابھی تک ایسا کچھ نہیں کیا...... جانے کتنا قرض چڑھ چکا ہے...... اتار بھی پاؤں گا یا نہیں......'' شاہ صاحب کے لہجے میں ایک سوز سا اتر آیا یوں لگتا تھا جیسے ان کا دل بھر آیا ہے۔ وہ صابرہ کی موجودگی میں جان بوجھ کر جابر علی کے ذکر سے احتراز کر رہے تھے...... یہ بھی ان کی حیاداری کا کمال تھا۔

''میں ابھی ملازمہ سے کہتا ہوں کہ فی الحال آپ کو...... گیسٹ روم میں پہنچا دے...... پھر اس کے بعد انیکسی کی صفائی کا انتظام کرتا ہوں...... میرا خیال ہے کہ صفائی ستھرائی میں پانچ چھ دن لگ جائیں گے...... اب

پانچ چھ دن تو آپ میری مہمان ہیں......اس کے بعد بقول برہان کے آپ ہمارے کرائے دار ہیں۔'' یہ کہہ کر شاہ صاحب مسکرانے لگے ان کی نظریں برہان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''لیکن شاہ صاحب آپ نے تو یہ نہیں بتایا کہ ہمیں کم سے کم کرایہ کیا دینا چاہیے؟'' برہان پھر شرمسار سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''بھئی آپ زبردستی کے کرائے دار بن رہے ہیں اب اپنی مرضی سے ہی دے دیجیے گا......'' شاہ صاحب نے شگفتگی سے جواب دیا۔ صابرہ اب حیران، حیران نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسے اس گھر سے باہر آنے کے بعد ویسے ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صدیوں کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے پھر رہی تھی۔ آج وہ بوجھ اسی گھر میں اتار پھینکا ہے اور گھر سے نکل آئی ہے۔

☆☆☆

''سر جی...... یہ تو کمال ہو گیا...... میں سوچ رہا تھا کہ کوئی آئے نہ آئے آپ کا بیٹا تو ضرور آئے گا...... حیرت ہے ایک بار بھی ملنے نہیں آیا آپ کو......'' میرداد کیونکہ جابر علی کا ارادت مند تھا...اس کو بہت عزت دیتا تھا اسی لیے اسے جابر علی کی بہت فکر تھی۔

''میرا بیٹا ہوتا تو ملنے آتا ناں......'' میرداد خان ایک دم چونک پڑا اور شرمائے شرمائے انداز میں بولا۔

''سر جی......آپ......اپنی بیوی کو گالی دے رہے ہیں؟''

''جو عورت اپنے مرد کو نافرمان اولاد کا تحفہ دیتی ہے اس سے اچھی تو بازاری عورت ہے، میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا...... میری طرف سے آج ہی اسے تین طلاقیں......'' جابر علی جیسے پھٹ پڑا تھا...... میرداد خان تو جیسے تھرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر جابر علی کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے شک ہو کہ جابر علی کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے یا وہ ہوش میں نہیں ہے...... اس نے اپنے کانپتے ہوئے وجود کو سنبھال کر حواس باختہ انداز میں کہا۔

''توبہ، توبہ سر جی...... اپنے غصے کو کنٹرول کریں، یہ آپ نے کھڑے، کھڑے تین طلاقیں بول دیں...... میں نے سنا یا دیواروں نے سنا لیکن آپ کے منہ سے تو نکل گئیں...... اب کیا ہوگا......؟'' میرداد خان واقعی چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی... بلکہ وہ تو پچھتا رہا تھا کہ آخر اسے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی...... یہ کیا ہو گیا تھا۔

''پچیس سال سے میرا کھا رہی تھی، وہ آئی مجھ سے ملنے......؟''

''سر جی میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں...... یہ آپ کیا منہ سے نکال بیٹھے ہیں سر...... مرد اگر ایک مرتبہ عورت کو تین طلاقیں بول دے تو عورت کو طلاق ہو جاتی ہے ناں'' میرداد خان اٹک، اٹک کر کہہ رہا تھا۔

''ہاں تو ہو گئی' میرے کس کام کی وہ عورت...... جو عورت اتنے برے وقت میں مجھ سے ملنے دو منٹ کے لیے نہیں آئی...... مجھے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر آپ کی ضمانت کے لیے میں بھاگ دوڑ کروں؟'' میرداد خان بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر بولا تھا۔ ابھی تک وہ بہت دکھ اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا تھا...... اس کے کانوں میں بار بار جابر علی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ تو پچھتاوے سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔

''مجھے نہیں کرانی ضمانت' تم اپنے کام سے کام رکھو میرداد خان...... مجھے کسی کا احسان نہیں لینا تمہارا ابھی

نہیں......اب میں پھانسی کے تختے پر چڑھنے کو تیار ہوں...... تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''نہ، نہ سر جی...... بندہ غصے میں خطا کھا جاتا ہے، آپ ایسا نہیں بولیں مجھ سے جو ہو سکا، وہ میں کروں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے میرداد خان تم بھی ملنے مت آیا کرو...... مجھے کسی کی ضرورت نہیں...... میں تو تمہیں بھی پاگل سمجھ رہا ہوں۔ وردی اتار کر جیل کے کپڑے پہن چکا ہوں اور تم سر جی...... سر جی کہتے ہو۔ پولیس اور ملٹری میں فرق ہوتا ہے جاہل آدمی......'' جابر علی بجائے اس کے کہ میرداد خان کا احترام کرتا اس کی وفاداری کو سراہتا الٹا اس پر چڑھ دوڑا تھا۔ میرداد خان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا...... وہ تو اسی طرح سکتے کی کیفیت میں لاک اپ کی سلاخیں پکڑے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک جابر علی کی اپنی بیوی کو دی ہوئی تین طلاقیں گونج رہی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے جابر علی کے ساتھ مل کر کسی پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔

☆☆☆

''شاہ زمان ایک دم برہان کو اپنے سامنے پا کر اچھا خاصا حواس باختہ ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم......'' برہان کسی روبوٹ کی طرح سلام کر کے اس کے کہنے سے پہلے ہی سامنے بیٹھ گیا۔ ایس پی اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک برہان کے سلام کا جواب دینے کی صلاحیت اس میں بیدار نہیں ہوئی تھی۔ کسی گونگے بہرے کی طرح اس کو تکے جا رہا تھا۔

''سر میں جابر علی کا بیٹا برہان ہوں...... میں نے peon کو اپنا نام بتا کر آپ کے پاس بھیجا تھا کیا اس نے نہیں بتایا؟'' برہانؔ ایس پی کی کیفیت کو دیکھ کر کچھ سے کچھ سمجھنے لگا اور الجھے، الجھے انداز میں گویا ہوا۔

''نہیں، نہیں مجھے اس نے بتایا تھا وہ بس...... آپ کو دیکھ کر مجھے جانے کیا کچھ یاد آنے لگا۔ مجھے آپ سے اور آپ کی فیملی سے ہمدردی ہے مگر آپ کے والد صاحب اقبالی بیان ریکارڈ کرا چکے ہیں۔ آئی ایم سوری...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' شاہ زمان خان اب خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو چکا تھا...اور قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ برہان نے حیرت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کیا سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنے والد صاحب کی سفارش کرنے آیا ہوں، ان کی جان بچانے کے لیے آپ سے مدد مانگنے آیا ہوں؟'' اب حیران ہونے کی بار ایس پی کی تھی۔ وہ الجھی، الجھی نظروں سے برہان کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

''ظاہری بات ہے' آپ میرے پاس اور کس مقصد سے آ سکتے ہیں۔ انسپکٹر جابر علی گرفتار ہو چکا ہے بیان ریکارڈ کرا چکا ہے۔ میں تو یہی سمجھوں گا کہ آپ اسی سلسلے میں میرے پاس آئے ہیں لیکن کیا آپ کوئی اور بات کرنے میرے پاس آئے ہیں؟''

''جی...... بالکل میں اپنا ایک پرسنل مسئلہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''پرسنل...... بولیے! کیا مسئلہ ہے؟'' ایس پی بری طرح الجھ چکا تھا۔

''سر وہ ہمیں threat دی جا رہی ہے۔''

''threat؟'' ایس پی نے مختصر سا سوال کیا تھا۔

''جی سر......! وہ کوئی فائل کا چکر ہے، ہم سے ایک فائل کا مطالبہ کیا جا رہا ہے پریشر ڈالا جا رہا ہے...جبکہ میں سارا گھر چھان چکا ہوں۔'' برہان کی بات سن کر ایس پی کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اب اسے برہان کے آنے کا مقصد سمجھ آ گیا تھا اور ساتھ ہی وارث علی کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی اس کے حافظے میں بازگشت بن کر

گونجنے لگی۔

”تو آپ مجھ سے کس قسم کی ہیلپ لینے آئے ہیں؟“ ایس پی اب بڑے سپاٹ لہجے میں گویا ہوا تھا کیونکہ برہان کے منہ سے سن کر کہ فائل اس کے گھر میں نہیں ہے اسے برہان میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی جی چاہ رہا تھا کہ یہ لڑکا فوراً سے بیشتر یہاں سے چلا جائے۔ اس نے تو سو فیصد مایوس کیا تھا۔ اب اس کا برہان سے کیا انٹرسٹ ڈویلپ ہو سکتا تھا۔

”سر میں آپ سے قانونی تحفظ مانگنے آیا ہوں‘ اس لیے کہ میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس نے پولیس کے محکمے کو پچیس سال اپنی خدمات دی ہیں۔ آج ان کی بیٹی بہت غیر محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں آپ ہمارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

”دھمکیاں کون دے رہا ہے؟“ ایس پی نے چندرا کر پوچھا تھا اور اپنی نظروں کا رخ دیوار کی طرف موڑ رکھا تھا کیونکہ برہان کی آنکھوں میں دیکھنے کا حوصلہ فی الحال اس میں نہیں تھا۔

”سر! میری جس بہن کا مرڈر ہوا ہے اس کا ہزبینڈ کرمنل بندہ ہے۔ مجھے تو حیرت ہے میرا باپ پولیس افسر ہوتے ہوئے اس کے ہاتھوں بے وقوف کیسے بن گیا۔“

”اب یہ تو بیٹا جی آپ اپنے والد صاحب سے ہی پوچھیں کہ وہ کیسے بے وقوف بن گئے...... یہ تو وہ ہی بتا سکتے ہیں لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی کہ میں آپ کی فیملی کو کیسے پروٹیکٹ کروں؟“

”یہ کیا بات ہوئی سر، پولیس کا کام عوام کو تحفظ دینا ہے اور میں تو پولیس افسر کا بیٹا ہوں۔ آپ اپنے ہی افسر کی فیملی کو تحفظ دینے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے ؟“ برہان نے اپنے اندر کا غصہ دباتے ہوئے بظاہر بڑے ٹھنڈے لہجے میں بات کی۔ ایس پی کی بے رخی تو اسے حیران کیے دے رہی تھی۔

”سر آپ بھی جانتے ہیں اور سارا پولیس ڈپارٹمنٹ بھی کہ میرے والد صاحب کے پاس ایک چھوٹے سے گھر کے علاوہ کوئی پراپرٹی نہیں ہے اور ہمارے گھر میں گھر کی فائل کے علاوہ کسی اور پراپرٹی کی فائل نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یہ آپ کا اور آپ کے بہنوئی کا معاملہ ہے۔ آپ کا فیملی میٹر ہے آپ اسے گھر میں نمٹانے کی کوشش کیجیے۔ آئی ایم سوری‘ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ ایس پی نے تو فوراً ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ کر جواب دیا تھا۔ برہان لاشعوری طور پر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے فوراً ہی احساس ہو گیا ہو کہ اس شخص کے سامنے بیٹھ کر مزید کوئی بات کرنا وقت ضائع کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس نے گہری سانس لی اور ایس پی کی طرف دیکھا۔

”خدا حافظ!“ برہان نے ایس پی سے ہاتھ ملانے کا تکلف بھی نہ کیا اور بڑی تیزی سے آفس سے نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی ایس پی کی آنکھوں میں شیطانیت بال کھول کر ناچنے لگی۔

☆☆☆

”اس اندھیرے میں اللہ ہی تو ہماری مدد کر رہا ہے بیٹا۔ آج تک سنتے چلے آئے ہیں کہ دنیا میں خوش قسمت انسانوں کی غیبی مدد بھی ہوتی ہے۔ یقین نہیں آ رہا کہ ہم اتنے خوش قسمت ہو سکتے ہیں۔“ صابرہ گیسٹ روم میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ شبینہ اس کا سر دبا رہی تھی۔ صابرہ کی بات سن کر شبینہ بے معنی سا مسکرائی۔

”ہاں امی، واقعی یقین نہیں آ رہا۔ یقین کریں مجھے تو ڈر کے مارے رات بھر نیند نہیں آئی۔ پتا نہیں وارث علی نے بھائی سے کیا کہا کہ بھائی بس مجھے فوراً لے کر نکل کھڑے ہوئے۔“

”کوئی بڑی بات ہی کی ہوگی بیٹا ورنہ برہان بھی جابر علی کا بیٹا ہے، اتنی آسانی سے تو ڈرنے والا نہیں۔ بہت حوصلہ ہے میرے بچے میں اور قدرت بھی اسے خوب آزما رہی ہے۔“

”امی شاہ صاحب نے ہمیں اپنے گھر رہنے کی اجازت تو دی ہے مگر ہم زیادہ دن تو یہاں نہیں رہ سکتے ناں...... اچھا نہیں لگے گا۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن برہان نے شاید کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ لگتا ہے کہ اس، وارث علی نے برہان کو کوئی ایسی دھمکی دی ہے جس کے بعد وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں...... اور لینا بھی نہیں چاہیے۔ ہم تو پہلے ہی لٹ چکے ہیں اور اب مزید لٹنے کی ہمت نہیں ہے۔“ بولتے، بولتے صابرہ کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔ شبینہ نے ماں کی طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھا۔

”شکر ہے کہ ہم اس وقت بہت محفوظ جگہ پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس گھر میں کم از کم وارث علی تو نہیں آ سکتا۔“ شبینہ نے سکون کی سانس لیتے ہوئے ایک طرح سے ماں کو تسلی بھی دی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے...... کچھ سکون سا محسوس ہو رہا ہے لیکن میں تمہارے باپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے...... ہم ان کے لیے وکیل کریں...... ان سے ملیں، پوچھیں کہ ہمیں بتاؤ ہم کیا کریں......“

”امی آپ برہان بھائی کے سامنے یہ بات کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں اب مت بولیے گا...... مجھے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ برہان بھائی نہ ابا جان سے ملنا چاہتے ہیں نہ ہمیں ملنے کی اجازت دیں گے۔“

”بچہ ہے، جذباتی ہے مگر میں یہ سوچتی ہوں کہ پچیس برس کا ساتھ رہا...... ایک بار تو ملنے جاؤں اور پوچھوں جابر علی سختیاں سہنے کے لیے میں کافی نہیں تھی...... میری بچی کے خون سے کیوں ہاتھ رنگے...... ایسا کیا، کیا تھا اس نے...... تم نے جہاں چاہا اس کی شادی ہو گئی پھر...... پھر تم نے اپنی ہی اولاد کو زمین کا پیوند بنا دیا۔ اس نے ایک ظالم کو تمہارے کہنے پر اپنا لیا، کیا اتنی فرمانبرداری کافی نہیں تھی ؟“ بولتے بولتے صابرہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

☆☆☆

”سر جی دروازے پر اتنا بڑا سا تالا دیکھ کر تو میرا میٹر گھوم گیا۔ بس اب آپ کا امتحان ہے پتا چلائیں کہ وہ کہاں چھپے ہیں......“ وارث علی شدید غصے کی کیفیت میں ایس پی سے بات کر رہا تھا۔

”کہاں چھپے ہیں کیا مطلب......؟ تم کیا سوچ رہے ہو کہ وہ کہیں چھپ کر بیٹھ گئے ہیں؟“ ایس پی جیسے کچھ سمجھا نہیں...... وہ تو اپنی طرف سے وارث علی کو بڑی تھرلنگ انفارمیشن دینا چاہ رہا تھا برہان کے بارے میں کہ وہ اس سے مدد مانگنے آیا تھا...... اس کا خیال تھا کہ وارث علی یہ سنے گا تو بہت انجوائے کرے گا مگر وارث علی تو آتے ہی شروع ہو گیا تھا اور بے تکان...... نان اسٹاپ بولے چلا جا رہا تھا۔

”یار آج اس کا بیٹا آیا تھا مجھ سے ملنے اگر وہ لوگ کہیں چھپ گئے ہوتے تو وہ مجھ سے ملنے کیوں آتا......؟“

”بیٹا آیا تھا؟“ وارث علی پر جیسے چھت گر پڑی تھی وہ انتہائی حیرت سے ایس پی کی طرف دیکھ رہا تھا، آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔

”ہاں، ہاں یار آج ہی مجھ سے مل کر گیا ہے۔“

”آپ کے پاس آیا تھا...... اپنے باپ کی ضمانت کرانے آیا ہوگا۔“ وارث علی نے فوراً اندازوں کے

دوستی ایسا ناتا

Blood is thicker than water یہ کہاوت بہت پرانی صحیح لیکن آج بھی لوگ اپنا، اپنا، غیر، غیر کہتے ہیں مگر اس مرتبہ امریکا جا کر میرے مشاہدے اور تجربے نے ثابت کر دیا کہ خون ہی نہیں بلکہ دوستی ایسا ناتا جو سونے سے بھی مہنگا اور اس کا پورا کریڈٹ ماہنامہ پاکیزہ اور بالخصوص انجم انصار کو جاتا ہے جن کے توسط سے مجھے اپنی 35 سال پرانی دوست عروس ملی جو امریکا کی اسٹیٹ مشی گن میں اپنے شوہر، دو بیٹوں، بہو اور پوتے کے ساتھ رہتی ہے میں اپنے جذبات اور احساسات کو سطح قرطاس پر بکھیرنے سے قاصر ہوں جو اس سے امریکا بات کر کے میرے ہوئے۔ میں شروع سے ٹھٹھہ میں اور وہ کراچی میں۔ اس کی شادی میں مع والدین میں نے شرکت کی اور میری شادی پر وہ دو بیٹوں اور شوہر صفدر بھائی کے ساتھ ٹھٹھہ آئی اور شادی کے بعد کراچی میں سب سے پہلی دعوت بھی اسی کے گھر ہوئی کہ اس وقت موبائل کجا فون بھی اتنے عام نہیں تھے پھر شادی کے بعد نہ میری شاعری رہی نہ افسانہ نگاری بس ٹیچنگ اور گھر داری کب سندھی مسلم سے گلشن اقبال اور وہ کراچی سے اسلام آباد اور پھر امریکا شفٹ ہوگئی پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے میرے سب سے چھوٹے بیٹے حماد قادر کی شادی کی تصویریں پاکیزہ میں دیکھ کر میرا سراغ لگایا تھا اور پھر میرے حماد کے پاس شارلٹ پہنچنے سے پہلے ہی میرا ٹکٹ پہنچ چکا تھا کہ مشی گن ضرور آنا ہے، واہ ری دوستی۔ 14 ستمبر کو ہم دونوں میاں بیوی ڈیٹرائٹ پہنچے اور عروس اپنے بہو اور بیٹے کے ساتھ دو پھولوں کے بوکے پکڑے استقبال کو موجود۔ لگتا نہیں تھا کہ اتنے برسوں بعد ملے ہیں اس کی والہانہ محبت...... دونوں ہی لپٹ کر رو پڑے۔ بڑے گھر بہت دیکھے میرے اپنے بڑے بیٹے کا کیلی فورنیا میں پانچ بیڈ روم کا گھر ہے مگر 2-1/2 باتھ روم، عروس کا واحد گھر ہے جہاں چھ بیڈ رومز کے ساتھ چھ ہی باتھ رومز تھے۔ عروس چند سال پہلے بریسٹ کینسر سے صحت یاب ہوئی ہے گھٹنے بھی مصنوعی ہیں مگر اس کی ہمت، حوصلے اور ول پاور کی داد دینی پڑتی ہے۔ عموماً ساسیں بہوؤں کے آتے ہی پیر پسار کر ہر کام بہوؤں پر ڈال دیتی ہیں لیکن اس گھر کا ماحول امریکا میں رہتے ہوئے بھی مشرقی ہے۔ عروس صبح تہجد پڑھ کر کچن میں ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر کھانا پکاتی ہے بے حد لذیذ اور مزیدار اور باہر کے تمام کام اور صفائی بہو سعدیہ اور سسر صفدر بھائی کے ذمے کیونکہ عروس کے دونوں بیٹے ڈاکٹر ہیں فیلوشپ بھی کی ہے بے حد مصروف لیکن دین دار، نماز روزے کے پابند گھر میں شلوار قمیص پہننے والے پکے مسلمان۔ خیر ویسے تو امریکا میں مجھے ہر شخص مسلمان ہی لگا سوائے اس کے کہ وہ کلمہ گو نہیں ورنہ ان میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو ایک مسلمان میں ہونی چاہیے۔ عروس نے اپنی زندگی اور ذات کو محور بنانے کے بجائے اپنے بچوں اور گھر کے لیے وقف کر دی ہے اب تو خیر بڑھاپا تھا لیکن جوانی میں بھی کبھی اسے گھومنے پھرنے، میک اپ یا فیشن سے دلچسپی نہیں تھی جبکہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی لیکن ہر فن مولا، باوقار اور وضعدار اور وہی خوبیاں بیٹوں میں بھی منتقل ہوئی ہے۔ پھر دونوں میاں بیوی میں ایسی ذہنی مطابقت اور ہم آہنگی جو میں نے کم ہی میاں بیوی میں دیکھی ہے یعنی تو من شدی من تو شدم بہو بھی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح فٹ۔ پوتا صفہان بھی وہ کہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔ پیارا اور تمیز دار۔ پاکستان میں مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹ رہا ہے لیکن بیس سال سے امریکا میں رہتے ہوئے بھی یہ لوگ تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ میں ہمیشہ کہتی ہوں میرا بیٹا فیصل اور بہو فرح دل کے بڑے اور ہاتھ کے کھلے ہیں لیکن یہاں آکر پتا چلا کہ اس گھرانے کی چیریٹی تو کیا مسلم یا غیر مسلم اپنے ہوں یا غیر سب کے لیے کھلی ہے اور یہی ایک اچھے مسلمان کی پہچان ہے۔ ہوٹلنگ، گھومنا پھرنا اور شاپنگ سب ایک طرف۔ عروس کی فیملی کے ساتھ گزارے ہوئے دن ہم دونوں میاں بیوی کبھی نہیں بھول سکتے۔ شکریہ عروس تمہارا اور شکریہ انجم انصار آپ کا کہ آپ نے اتنی پیاری دوست سے ملوایا۔

تحریر: سلمٰی غزل

گھوڑے دوڑانا شروع کردیے۔

”میں بھی یہی سمجھا تھا...... مگر اس نے تو اپنے باپ کے بارے میں مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔“

”پھر کس لیے آیا تھا......؟“ وارث علی الجھا۔

”ارے بھئی پولیس سے protection مانگنے آیا تھا۔“

”میں سمجھا نہیں......“ وارث علی واقعی الجھا ہوا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ”کیسی protection؟ سر جی کھل کر بات کریں آپ تو سسپنس بڑھا رہے ہیں۔“

”تم بولنے دو تو میں آگے بولوں ناں......“ ایس پی نے کچھ جتانے کے انداز میں کہا تھا۔

”اچھا جلدی سے بتائیں وہ کیوں آیا تھا اور کس سلسلے میں protection مانگ رہا تھا؟“

”یار اس کا...... بہنوئی threat دے رہا ہے، ان مظلوموں کو فون پر دھمکیاں مل رہی ہیں۔ کوئی فائل ان سے مانگی جارہی ہے جو اُن کے پاس ہے ہی نہیں۔“

”اوہ......!“ وارث علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ وارث علی کے غبارے سے جیسے ساری ہوا نکل گئی تھی جو کچھ کہنے آیا تھا...... جتنا کہہ دیا تھا بس کہہ دیا باقی تو سب کچھ بھول گیا۔

”آپ سے حفاظت کی درخواست کرنے آیا تھا؟“ اب وارث علی کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ ”threat مل رہی ہے ان لوگوں کو...... فائل مانگی جارہی ہے اور وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ جھوٹ بولتے ہیں وہ، ارے اتنی قیمتی زمین کی فائل ان کے قبضے میں ہے، وہ کوئی بتاشوں کی طرح بانٹ دیں گے۔ باپ نے اچھی طرح پکا کر دیا ہوگا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو یار......“ ایس پی نے وارث علی کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اپنے باپ سے کوئی ملاقات نہیں کی اس نے... مجھ سے اپنے باپ کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی...... یوں لگ رہا تھا جیسے باپ سے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے...... میں نے تو اپنی طرف سے بات کی تو اس نے تب بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بس اپنی بات کر کے چلا گیا......“ ایس پی نے حیرت انگیز بے نیازی کے ساتھ کندھے اچکاتے ہوئے وارث علی کو بتایا تھا۔

”کیا خیال ہے پھر تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوا دوں؟ کیوں تنگ کر رہے ہو بے چارے معصوموں کو......“ اتنا کہہ کر ایس پی نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

”سر جی...... آپ ایک مرتبہ پھر اسے اپنے پاس بلائیں، کوئی لالچ دے کر...... کوئی آسرا دے کر...... بس اس سے یہ پتا کریں کہ وہ گھر میں تالا ڈال کر کدھر جا کر بیٹھ گئے ہیں۔“ وارث علی کی سوئی اپنی جگہ اٹکی ہوئی

تھی کیونکہ گھر میں پڑا ہوا تالا ایک طرح سے اس کا منہ چڑا رہا تھا...... یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بہت ذہین، عقلمند انسان کو کوئی معمولی سا انسان بے وقوف بنا کر چلا گیا ہو...... یہ تو بہت بڑی ہزیمت تھی...... بہت بڑی شکست بہت بڑی ذلت کہ جابر علی پولیس افسر ہوتے ہوئے تو کچھ نہ کر سکا اور اس کا بیٹا جُل دے کر نکل گیا۔

''دماغ خراب ہے تمہارا اگر وہ روپوش ہوتے تو لڑکا مجھ سے ملنے کیوں آتا...... وہ تو بڑے دھڑلے سے شہر میں گھومتا پھر رہا ہے۔ تمہیں ویسے ہی شک پڑ رہا ہے...... ماں شاید باہر کہیں سودا سلف لینے گئی ہو گی تم سمجھے کہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میرا خیال ہے تم دوبارہ جاؤ گے تو گھر میں تالا نہیں ہوگا...... کیوں خود کو پریشان کر رہے ہو بابا...... یہ بچے...... بتاؤ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں...... ہمیں بے وقوف بنائیں گے...... ہمیں...ہم جو دنیا کو بے وقوف بنا کر مال بناتے ہیں۔'' ایس پی کی بات کچھ کچھ وارث علی کی سمجھ میں آ گئی۔

''آپ کی بات دل کو لگتی ہے سر جی...... دراصل رات کو اس لڑکے سے بات ہوئی تھی...... شاید اسی وجہ سے وہ اپنی ماں بہن کو اس گھر سے نکال کر لے گیا اور گھر میں تالا ڈال دیا...... ہو سکتا ہے کہ واقعی وہ اِدھر اُدھر نکلے ہوئے ہوں...... میں رات کو جا کر دوبارہ دیکھتا ہوں پھر آپ کو بتاتا ہوں۔''

''چلو شکر ہے تمہیں میری بات سمجھ آئی ویسے یار اس بچے پر بڑا ترس آتا ہے مجھ سے protection کی درخواست کرنے آیا تھا...... اگر تم کہو تو...... CM کی سیکیورٹی اس کے گھر پر لگوا دیں......؟'' ایس پی نے تمسخرانہ انداز میں وارث علی کی طرف دیکھا اور ایک زبردست قہقہہ لگایا...... وارث علی کا قہقہہ بھی اس کے قہقہے سے ہم آہنگ ہو گیا تھا...... دونوں جی بھر کر برہان کا استہزا کر رہے تھے۔

☆☆☆

''یار اٹھو ناں...... چلو ناں سر کی امی سے باتیں کرتے ہیں روما......''

''میرا دل نہیں چاہ رہا تم چلی جاؤ......''

''کیا بوریت ہے بھئی، کیوں دل نہیں چاہ رہا تمہارا یہاں بیٹھ کر کیا کرو گی؟''

''کچھ بھی کر لوں گی......کل کے ٹیسٹ کی تیاری کر لوں گی......اب میں سر کی امی سے کیا باتیں کروں گی؟''

''بھئی...... جب ہم ان کے سامنے بیٹھیں گے تو باتیں بھی شروع ہو جائیں گی خود بخود جیسے کہ ہوتا ہے۔''

''مجھ سے نہیں ہوتیں خود بخود باتیں......'' روما نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''اچھا چلو، باتیں میں کر لوں گی تم بیٹھ کر سنتی رہنا۔'' کائناز نے روما کا بازو پکڑ کر اپنی طرف سے پورا زور ڈالا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہمارا سر کی امی یا ان کی سسٹر سے کیا تعلق......؟ ہمارا تعلق سر سے ہے جو ہمیں ٹیوشن پڑھاتے ہیں......ہم فضول میں جا کر اُن سے دوستیاں بگھارنا شروع کر دیں۔'' روما بیزاری اور بددلی سے کہہ رہی تھی۔

''بھئی کنسرن ہے ناں تو وہ اچانک سے ہمارے گھر کیوں آ گئے جبکہ ہم لوگوں کی ان سے کوئی پرانی واقفیت یا دوستی بھی نہیں...... پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔''

''بس...... تمہیں تو 007 بننے کا شوق ہے۔ کیوں بھلا...... کیوں گڑبڑ نظر آ رہی ہے تمہیں...... بھئی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ رینٹ پر رہتے ہوں اور مالک مکان نے اچانک انہیں گھر خالی کر دینے کا کہہ دیا ہو......اور کوئی فوراً انتظام نہ ہو سکا ہو تو وہ یہاں آ گئے ہوں۔ میں نے تو سنا ہے......سر کی امی کہہ رہی تھیں دو چار دن کی بات ہے پھر وہ چلے جائیں گے۔'' روما نے اسی طرح سابقہ انداز میں بڑی بیزاری سے جواب دیا تھا۔

''لیکن یار میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، میں چاہتی ہوں میں ان سے پتا کروں یا پھر ان کی بیٹی نے ایسی کیا غلطی کی تھی کہ سر کے فادر نے اس کو شوٹ کر دیا۔''

''افوہ...... کائناز تمہیں کیا ہو گیا ہے، ہمیں کیا لینا دینا...... ہو گئی ہو گی کوئی بات...... ہر وقت تو اس طرح کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔اس سے بھی زیادہ عجیب، عجیب......ایسی خبریں جنہیں سن کر یقین ہی نہیں آتا کہ دنیا میں ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے مجھے تو اب کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی، تمہیں ہو رہی ہے تو تم جا کر باتیں کر لو......'' یہ کہہ کر روما بیڈ پر اوندھی لیٹ گئی۔

''یار تم بالکل ہی ٹھس ہو گئی ہو...... پتا نہیں اب تو تمہارے بہت سارے مسئلے بھی حل ہو گئے ہیں کوئی تم پر پریشر بھی نہیں ڈالتا...... خالہ جانی بھی تمہارا اتنا خیال کرتی ہیں...... دادا جان بھی ہر طرح سے خیال کرتے ہیں......تمہارا موڈ کیوں نہیں ٹھیک ہوتا...... روما......؟ یار کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتا دو......!'' کائناز نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اسے گھورا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے کائناز......'' روما نے سیدھے ہوتے ہوئے کائناز کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''پتا نہیں کیوں کسی کام میں میرا دل نہیں لگتا عجیب بوریت سی ہوتی ہے...... دیکھو ناں یار تم تو سمجھ سکتی ہو میری ماں کی کیا حالت ہے، ان کی حالت دیکھ کر میں نارمل رہ سکتی ہوں......؟ خوش ہو سکتی ہوں یا میری ماں سے زیادہ کوئی میرے لیے اہم ہو سکتا ہے؟''

''اوہ......'' کائناز کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

''سوری روما میں بھول جاتی ہوں مگر ظاہر ہے تم تو نہیں بھول سکتی ناں...... آئی ایم رئیلی سوری...... ظاہر سی بات ہے آنٹی کی جو حالت ہے اس کی وجہ سے تم ضرور پریشان رہتی ہو گی۔''

''اور نہیں تو کیا...... تم کیا سمجھتی ہو کہ اماں جان مجھے ڈانٹتی ڈپٹتی نہیں ہیں...... مجھے روکتی نہیں ہیں تو میں کوئی خوشی محسوس کرتی ہوں...... کون ہے جو اپنی ماں کو بری حالت میں دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے۔ وہ جیسی بھی ہیں، میری ماں ہیں۔'' آخری جملہ بولتے ہوئے روما کی آنکھیں بھر آئیں...... کائناز کے چہرے سے لگتا تھا کہ روما کی باتوں نے اسے شرمندہ کر دیا ہے اور یہ کہ وہ روما کو پریشرائز کر کے زیادتی کرتی ہے۔

''اچھا...... اچھا...... ڈونٹ وری...... میں آنٹی سے مل کر آتی ہوں...... ٹھیک ہے اور پلیز دیکھو میری کسی بات کا کوئی خیال نہ کرنا...... پتا نہیں عادت ہے مجھے تو فضول میں بولنے لگ جاتی ہوں...... ٹھیک ہے۔'' کائناز یہ کہتے ہوئے بیڈروم سے باہر چلی گئی۔ روما اس کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کائناز کا خلوص اور اس کی معصومیت اور اس کی معذرت نے بہرحال اس کا موڈ تو بحال کر دیا تھا۔

☆☆☆

''بیٹا آپ کے حالات کا کچھ، کچھ اندازہ تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب آپ اپنا موبائل یہاں بھول کر چلے گئے تھے اور اس موبائل پر آپ کی والدہ سے کائناز نے بات کی تھی۔'' شاہ عالم اپنے معمول کے مطابق رات کا کھانا کھا کر لان میں ٹہل رہے تھے برہان کو انہوں نے وہیں بلا لیا تھا جو شام ڈھلے گھر آنے کے بعد سے انہیں دکھائی نہیں دیا تھا چونکہ اب ماں کو سمجھانے اور سنبھالنے میں بھی اسے اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

''میں حالات سے ڈرنے والا گھبرانے والا نہیں ہوں شاہ صاحب! مجھے اپنی بہن کی وجہ سے بہت احتیاط کرنی پڑ رہی ہے دیکھیں ناں یہ بڑا sensitive matter ہے، کوئی رسک نہیں لیا جا سکتا ایسے

www.paksociety.com

معاملات میں رسک لینا بڑی حماقت ہوتی ہے۔ ابا جان گھر میں تھے تو مجھے کوئی ٹینشن نہیں تھی مگر اب ساری ذمے داریاں مجھے اٹھانی ہیں۔“ برہان پشت پر ہاتھ باندھے، سر جھکائے شاہ عالم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا۔

”میں نے آج تک کسی کے ذاتی معاملات میں کھوج نہیں کی جب تک کسی نے خود نہیں بتایا میں نے سوال نہیں کیا لیکن پتا نہیں کیوں بار بار ایک سوال میری زبان پر آتا ہے اور رک جاتا ہے شرم سی آتی ہے پوچھتے ہوئے۔“ شاہ عالم، برہان کی طرف دیکھے بغیر بڑے شرمسار سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ”کہنا بھی اس لیے پڑا ہے کہ وہ سوال بے چین بہت کر رہا تھا۔“ وہ لاشعوری طور پر چاہ رہے تھے کہ یہ بات سن کر برہان اصرار کرے ان سے پوچھے کہ وہ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں؟ اور یہی ہوا برہان، شاہ عالم کی بات سن کر چونک پڑا تھا اس نے بڑی بے تابی سے کہا تھا۔

”شاہ صاحب...... آپ، آپ مجھ سے جو مرضی چاہے پوچھ سکتے ہیں۔ اتنا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں، آپ تو ہمارے محسن ہیں، آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ ہم سے جو مرضی سوال کریں اور ہم آپ کے ہر سوال کا جواب دیں۔“

”بیٹا کیوں شرمندہ کرتے ہیں بس اللہ نے اتنی ہمت اور توفیق دی کہ آپ کی کوئی چھوٹی موٹی خدمت کرسکوں۔“

”شاہ صاحب آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

”بیٹا بس یہی کہ آپ کی بہن شادی شدہ تھیں، اپنے شوہر کے گھر میں تھیں تو آپ کے والد صاحب کو اس سے ایسی کیا شکایت ہوگئی؟ دیکھیں وہ دنیا سے جاچکی ہے اور اللہ ستار العیوب ہے وہ سب کے پردے رکھتا ہے مگر آپ سے ملنے کے بعد آپ سے باتیں کرنے کے بعد یہی سوچ آتی ہے کہ آپ کی بہن بھی آپ ہی کی طرح بہت اچھی بچی ہوگی...... ظاہر ہے سب بچوں کی تربیت ایک ہی ماں نے کی ہے...... ایسا کیا، کیا تھا اس بچی نے کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی؟“ برہان یہ سوال سن کر چونک کر شاہ صاحب کی شکل دیکھنے لگا اس کی آنکھوں سے لگتا تھا جیسے وہ ماحول سے کٹ گیا ہے اور اس کا ذہن کہیں دور پہنچا ہوا ہے...... شاہ صاحب کو اندازہ تھا کہ وہ ان کی طرف دیکھ رہا ہے اس لیے انہوں نے برہان سے نظر ملانے سے گریز کیا اور اپنے سوال کے جواب کا بڑے صبر سے انتظار کرنے لگے۔ دونوں پہلو بہ پہلو آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ برہان کو جیسے خود ہی احساس ہوا کہ وہ شاہ صاحب کی طرف دیکھے جا رہا ہے اور اس نے ابھی تک شاہ صاحب کے سوال کا جواب بھی نہیں دیا ہے۔ جلدی سے خود کو سنبھالا ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ چند لمحے اس کا سر جھکا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”شاہ صاحب آپ کا اندازہ ٹھیک ہے میری بہن واقعی بہت اچھی تھی بس تھوڑی سی جذباتی تھی لیکن اس کی پارسائی میں اور اس کی معصومیت پر کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں سگے بھائی کی حیثیت سے گواہی دے رہا ہوں کہ میری بہن بہت معصوم تھی لیکن ابا جان نے کیوں اس کی جان لی، یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا کیونکہ آپ کے سوال کا جواب بہت طویل ہوجائے گا اور اس جواب سے پہلے بہت کچھ آپ کے گوش گزار کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا ٹھیک ہے۔“ شاہ صاحب فوراً بولے۔ ”میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا خدانخواستہ آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو بہت معذرت چاہوں گا۔“ شاہ صاحب بہت اپنائیت بھرے لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

”نہیں، نہیں شاہ صاحب ایسی کوئی بات نہیں آپ تو اتنی اچھی طرح بات کر رہے ہیں کہ دل آزاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ابھی تو لوگ پتا نہیں کس، کس طرح ہماری دل آزاریاں کریں گے اور ان کو احساس بھی نہیں ہوگا۔“ برہان کے لہجے میں دکھ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو رہے تھے اور وہ ریزے اُڑتے ہوئے شاہ صاحب کی سماع خراشی کر رہے تھے۔

”چلیں بیٹا اندر چلتے ہیں آپ ایسا کریں کہ پہلے کھانا کھالیں آپ کی والدہ اور بہن کو تو کائنات نے کھانا کھلا دیا تھا، آپ کا کافی انتظار کیا مگر پھر سوچا کہ وہ بے چاریاں کب تک بھوکی رہیں گی پھر ان میں مروت اور تکلف بھی بہت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انہوں نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا آپ، آپ ان سے پوچھ لیجیے گا۔“

شاہ صاحب کو دیکھ کر ان کی باتیں سن کر برہان کو یقین ہو چلا تھا کہ ابھی اللہ کے ان بندوں کی وجہ سے کائنات کا توازن باقی ہے۔ وہ سر جھکا کر ان کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

رابی نے اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی سے شاہ صاحب کے ساتھ برہان کو گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا پھر چند لمحے برہان کی طرف دیکھتی رہ گئی اور لاشعوری طور پر اپنے چہرے کے داغوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

”کھڑکیاں کُھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے اور ساتھ تم بھی...... یہ کتنا خوب صورت اتفاق ہے کہ اس پریشر کُکر سے باہر آتے ہی ہر طرف آزادی اور خوشی کے گیت گونجنے لگے پر نہیں نہیں خوشی کیسی......؟“ سوچتے، سوچتے رابی ایک دم ہڑ بڑا گئی۔ ”اس داغدار چہرے کے ساتھ کہاں سے خوشی ملے گی؟ کیسے خوشی ملے گی؟ اور پھر وہ جو خود اتنا اچھا ہے اسے کیا کوئی اچھا چہرہ نہیں ملے گا؟ وہ بھلا میری طرف کیوں دیکھنے لگا...... جانے وہ اس گھر میں کتنے دن کے لیے مہمان بن کر آیا ہے، میں تمہارے لیے اپنا چہرہ پہلے جیسا بناؤں گی مجھے ہر قیمت پر اپنا وہ چہرہ چاہیے...... اس لیے کہ... مجھے وہ چہرہ ملے گا تو تم میری طرف دیکھو گے ناں...... اور جب مجھ پر ایک نظر ڈالو گے تو میں تمہیں اسی پل سمجھا دوں گی کہ تم یہیں رک جاؤ، مجھ سے گزر کر آگے مت جانا۔“ یہاں تک سوچ کر رابی نے ایک گہری سانس لی تھی۔ آنکھوں میں خواب چمک رہے تھے۔ دل برہان کا دیدار کرنے کے لیے مچل رہا تھا لیکن اس کے اور برہان کے درمیان ابھی ناقابلِ عبور گہری کھائیاں تھیں...... اپنا یہ چہرہ لے کر تو وہ برہان کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

اب اسے... ایک طرح کی بے چینی لاحق ہوگئی کہ وہ کیسے جادو کے زور سے آن کی آن میں اپنا پہلے والا چہرہ حاصل کرلے...... صرف برہان کے لیے...... ایک نظر برہان پر پڑی تو احساس ہوا کہ اسے تو ابھی بہت کچھ چاہیے اس کی زندگی میں تو بہت بڑی کمی ہے، وہ ایک ادھوری ذات ہے۔ اس ذات کی تکمیل کے لیے اسے کوئی برہان جیسا چاہیے۔ جب سے برہان اس گھر میں آیا تھا رابی کی سوچ برہان سے شروع ہوتی تھی اور اسی پر ختم ہوتی تھی۔ برہان کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ کوئی دروازوں کی اوٹ سے جھروکوں سے صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کا انتظار کرتا ہے۔

☆☆☆

”بیٹا یہ آپ کیا کہہ رہی ہو...... اکیلی بچی کو سمندر پار بھیج دیں...... نہ بابا نہ...... اتنا حوصلہ نہیں ہے ہم میں۔“ گل جان نے رابی کی بات سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگا کر جواب دیا تھا۔ رابی ناگوار تاثرات کے ساتھ چند

لمحے تو کارپٹ کی طرف گھورتی رہی پھر نظریں اٹھا کر گل جان کی طرف دیکھا۔

''خالہ جانی...... آپ کو پتا ہے ناں میں نے ایک دفعہ گھر چھوڑ دیا تھا اور جولڑکی ایک بار اتنا حوصلہ کر لے وہ سمندر پار تو کیا...... دوسرے سیاروں میں بھی آرام سے جا سکتی ہے بشرطیکہ اسے وہاں جانے کا راستہ مل جائے...... میرے اندر حوصلے کی کمی نہیں ہے۔ آپ اپنے حوصلے سے میرا حوصلہ نہ ناپیں......'' رابی نے انتہائی بدلحاظی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا میں نے یہ سنا ہے کہ اس ملک میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ پیسے ہونے چاہئیں...... ایک سے ایک سرجن یہاں پڑا ہوا ہے...... آخر وہ بھی تو اس لیے یہاں کام کرتے ہیں کہ انہیں یہاں کام ملتا ہے ورنہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔'' گل جان نے اپنی دانست میں بڑی مضبوط دلیل دی تھی۔

''خالہ جانی مجھے یہاں نہیں کرانا...... بس مجھے تو باہر جانا ہے اور پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آنا ہے۔'' رابی کسی خیال میں کھو کر اب بڑے ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بیٹا اللہ نے جو شکل بنائی وہ بھی لاکھوں میں ایک ہے، تم نے کون سا مقابلۂ حسن میں حصہ لینا ہے۔'' گل جان کی گہری نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بے معنی سا مسکرائی۔

''کہاناں خالہ جانی مجھے باہر جانا ہے، چاہے کچھ ہو جائے اور آپ بیٹھی ڈرتی رہیے، مجھے کسی بات سے ڈر نہیں لگتا...... چلیں آپ مجھے بتا دیجیے آپ نے ساری...... زندگی ڈر، ڈر کر گزاری آپ کو ملا کیا ہے؟ دو لڑکیوں کا بوجھ اور ایک پاگل بہن......'' رابی یہ کہہ کر تلخی سے ہنس پڑی تھی...... اس کی ہنسی میں ایک محسوس ہونے والا نوحہ تھا جو گل جان اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

''بیٹا لندن، امریکا میں بہت آزاد ماحول ہے اور......''

''اور...... وور کچھ نہیں خالہ جانی میں نے کہاناں میں نے کچھ نہیں سننا...... لندن، یورپ میں ماحول آزاد ہے، مجھے بھی آزاد ماحول چاہیے بہت گھٹ، گھٹ کر جی لیے اب تو پر لگا کر ہواؤں میں اڑنے کا جی چاہتا ہے، ہمیں تو پتا ہی نہیں کہ کھل کر سانس کیسے لیتے ہیں، ہماری تو سانسوں تک پر پہرہ تھا اب میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی اور آپ بھی مجھ سے یہ سوچ کر بات کیا کیجیے کہ ماننے والی بات ہو گی تو مانوں گی ورنہ میں اب کسی کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔'' رابی کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی...... گل جان تو یوں ہی گھر سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔ مہر جان خواب آور دوا کے زیرِ اثر سوئی ہوئی تھیں اور خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ اس گھر کی وحشت زدہ تنہائی سے اکتا کر رابی کے پاس چلی آئی تھی پھر یہاں آ کر پتا چلا کہ رابی تو خود اس کے پاس آنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی تھی اور وہ اس کے پاس کیوں آنا چاہتی تھی وہ بھی آتے ہی پتا چل گیا...... رابی نے تو بغیر کسی تمہید کے اپنی بات کہنا شروع کر دی تھی اس کی بات سن کر گل جان پریشان ہی نہیں ہوئی بلکہ حواس باختہ سی ہو گئی اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی...... لیکن...... حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔

اب بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی کو اپنی سی کرنے میں میری بہن ناکام رہی تو پھر میری تو حیثیت ہی کیا ہے؟ میرے کہنے سے تو یہ نہیں رکے گی...... گل جان نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں رابی کی طرف دیکھا...... جو بڑے بے فکر انداز میں گل جان کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی...... لیکن جو کچھ بھی سوچ رہی تھی کچھ اچھا ہی تھا...... کیونکہ اس کی آنکھیں دل کا مضمون کھول، کھول کر بیان کر رہی تھیں اور جو کچھ سنا رہی تھیں... گل جان کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ یہ عمر، یہ وقت اس پر آیا تھا...... اور ساری زندگی بس اسی عہد پر آ کر رک گئی

تھی...... اس کے بعد تو گویا اس نے آگے سفر ہی نہیں کیا...... بائیس سال پہلے جس جگہ کھڑی تھی اس جگہ سے ایک انچ قدم آگے نہیں بڑھایا تھا...... بالوں میں چاندی اتر رہی تھی لیکن عمر ایک ہی جگہ رکی ہوئی تھی۔ اسے رابی کا انداز دیکھ کر عجیب سا خوف محسوس ہوا...... لاشعوری طور پر اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا...... یہاں تو ایسا کوئی بھی نہیں جو رابی کی آنکھوں میں خواب سجا دے مگر اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی ہیں اور جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ بہت ڈرا دینے والا ہے...... یہ کیوں مسکرا رہی ہے......؟ یہ کیوں ضد کر رہی ہے......؟ یہ کیوں اتنی پُرسکون ہے؟ کمال ہو گیا تھا...... رابی کا سکون بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا کم از کم گل جان کے لیے۔

رابی محسوس کر رہی تھی کہ گل جان اب بالکل خاموش ہے اس کی خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ اس نے رابی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

''خالہ جانی آج میں دادا جان سے بات کروں گی، میرا پاسپورٹ وغیرہ وہ ہی بنوا دیں گے۔ آپ کو ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں...... دادا جان آپ لوگوں کی طرح نہیں ہیں...... پتا نہیں آپ لوگ تو کس جہان میں جی رہے ہیں، آج کل لڑکیاں...... ہائر اسٹڈیز کے لیے اکیلی جاتی ہیں۔ تین، تین، چار، چار سال اپنے ملک سے دور رہتی ہیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹا اصل میں آپ دونوں بہنوں کی تربیت ذرا مختلف ماحول میں ہوئی ہے۔''

''لیکن تعلیم تو ہم نے اکیڈمی میں حاصل کی ہے ناں...... جہاں ہر کلاس کے ہر مزاج کے اسٹوڈنٹس آتے ہیں، ہر اسٹوڈنٹ اپنا ماحول ساتھ لے کر آتا ہے اور جب ہم سے ملتا ہے تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ماحول کیا ہے...... کتنی قسم کے ماحول ہو سکتے ہیں سب پتا ہے، آپ بے خبر ہیں مگر میں بے خبر نہیں ہوں۔'' رابی نے اب دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں بڑے اعتماد کے ساتھ بات مکمل کی تھی۔ اس انداز میں کہ گل جان اب فضول قسم کی مزید دلیل نہ دے۔

''ٹھیک ہے بیٹا میں شاہ صاحب سے بات کرتی ہوں۔''

''رہنے دیں...... خالہ جانی! دادا جان سے میں خود بات کر لوں گی...... بس...... آپ کو تو میرے باپ کی دولت میرے ہینڈاوور کرنی ہے...... جس پر میری ماں نے برسوں سے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ مجھے تقریباً بیس، پچیس لاکھ کی فوراً ضرورت ہے خالہ جانی آپ بس پیسوں کا انتظام کریں باقی کام میں خود کر لوں گی۔'' رابی بول رہی تھی اور گل جان اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''اتنا اعتماد، اتنی بے خوفی...... یہ تو نی بنائی اپنے باپ پر ہے مگر اللہ نہ کرے کہ بالکل اپنے باپ پر ہو۔''

☆☆☆

''شاہ صاحب آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے فون کر دیتے میں خود حاضر ہو جاتا۔'' شاہ عالم کے قانونی مشیر بیرسٹر جمیل خان بہت مؤدبانہ انداز میں شاہ صاحب سے مخاطب تھے جو اُن کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے، مخصوص مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی مگر آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ خاصے الجھے ہوئے ہیں۔

''ارے نہیں، نہیں، خان صاحب بہت شکریہ آپ ہی میرے پاس آتے ہیں...... اصل میں گھر میں آج کل مہمان داری وغیرہ چل رہی ہے۔ آرام سے بیٹھ کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو...... آج بیرسٹر صاحب کو جا کر خود سلام کرتے ہیں۔'' شاہ صاحب اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''بہت عزت افزائی کی آپ نے شاہ صاحب بہت شکریہ ویسے خدانخواستہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں......معاملات ٹھیک چل رہے ہیں۔'' بیرسٹر جمیل خان نے بہت خاکساری کے ساتھ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ہلکا سا خم دیا۔

''ہاں...... ہاں الحمدللہ سب معاملات ٹھیک چل رہے ہیں۔ وہ میں آپ کے پاس ایک خاص کام سے حاضر ہوا ہوں اور جس کام کے بارے میں اس وقت آپ سے بات کرنے جارہا ہوں اس سے پہلے بھی آپ سے اس پر بات ہوچکی ہے۔'' شاہ عالم نے مافی الضمیر بیان کرنے سے پہلے مختصر تمہید باندھی۔

''جی...... جی شاہ صاحب میں سمجھ گیا...... آپ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں کیونکہ آپ نے میری مشکل ویسے ہی آسان کردی، یہ کہہ کرکے آپ پہلے بھی اس سلسلے میں مجھ سے بات کرچکے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ اپنی مصروفیات میں شاید بھول گئے۔'' شاہ عالم نے بیرسٹر جمیل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا شاہ صاحب آپ کسی کام کا حکم دیں اور بندہ بھول جائے...... ایسا تو سوچیے گا بھی نہیں لیکن وہ جو آپ کی طرف سے کچھ خاص شرائط ہیں ان شرائط کے مطابق بات بن نہیں پارہی...... کافی لوگوں سے میں نے اس بارے میں ذکر کیا تھا......''

''مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب میرے پاس مہلت تھوڑی رہ گئی ہے۔ اصل میں بچی نے اپنے شوق کا اظہار کیا کہ وہ انجینئرنگ پڑھنا چاہتی ہے...... آپ کو پتا ہے ناں کہ اس بچی میں میری جان اٹکی ہوئی ہے۔ میں اس کی خواہش سن کر کئی دن الجھا رہا تھا...... سمجھ نہیں آتی تھی کہ اپنی بچی کو کیسے سمجھاؤں کہ بیٹا تمہارے آگے پیچھے تمہارے بوڑھے دادا کے سوا کوئی نہیں ہے، میری تو یہ خواہش ہے کہ تم میری زندگی میں ہی اپنے گھر کی ہوجاؤ۔''

''جی...... جی...... جی آپ بالکل ٹھیک سوچتے ہیں، شاہ صاحب لیکن اللہ سے ہمیشہ اچھی ہی امید رکھنی چاہیے اور دیکھیں موت...... عمر اور وقت دیکھ کر کبھی نہیں آتی...... یہ تو اللہ کا حکم ہے...... کسی بھی وقت اتر سکتا ہے...... لیکن آپ کی سوچ بالکل ٹھیک ہے آپ حقیقت پسندی سے کام لے رہے ہیں لیکن...... میں آپ کو صاف، صاف بتا رہا ہوں قطعی بات گھما پھرا کر نہیں کررہا۔''

''مجھے صاف، صاف ہی سننا ہے خان صاحب...... صاف بات ہوجاتی ہے ناں تو بڑی بچت ہوتی ہے...... سب سے بڑھ کر ٹائم کی بہت بچت ہوتی ہے، جو بہت قیمتی ہوتا ہے۔ بس...... میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ مجھے ایسا رشتہ چاہیے کہ ان لوگوں کو شادی کے بعد بچی کی پڑھائی جاری رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو، پتا نہیں اس کے سر پر کیا خبط سوار ہوگیا ہے، لڑکیاں تو...... ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتی ہیں، بچپن ہی سے ڈاکٹر، ڈاکٹر کھیل رہی ہوتی ہیں، یہ عجیب بچی ہے اسے انجینئرنگ کا شوق ہے۔'' شاہ صاحب اپنی بات پر خود ہی ہنس دیے۔ بیرسٹر جمیل خان بھی مسکرانے لگے۔

''بس شاہ صاحب ہر بچے کی اپنی، اپنی صلاحیت ہوتی ہے اس حساب سے وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتا ہے۔ شاہ صاحب رشتے تو بہت ہیں یقین کیجیے آپ کی پوتی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے، بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو ذاتی طور پر آپ کو جانتے ہیں اور میرے بھی واقف کار ہیں، میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ آپ سے رشتے داری کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن...... میں نے ان سے اس موضوع پر بات

آگے نہیں بڑھائی اس کی وجہ صرف آپ کی شرط ہے......'' بیرسٹر جمیل خان کہہ رہے تھے۔

''تو خان صاحب آپ بات آگے بڑھا کر تو دیکھتے ناں...... کیا پتا ان میں سے کوئی اس شرط کو قبول کرلیتا......''

''آپ کی بات ٹھیک ہے شاہ صاحب......لیکن جس انداز میں ان لوگوں نے مجھ سے بات شروع کی اور اپنے خیالات کا......اظہار کیا اسی سے میں نے اندازہ لگالیا تھا...... آپ جانتے ہوں گے ہاشمی صاحب کو اُن کا بیٹا شارجہ میں بزنس کرتا ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ بچہ جو وہاں اکیلا رہتا ہے اس کی شادی ایسی لڑکی سے ہو جو اس کی مکمل دیکھ بھال کرے اور آپ کو یہ بھی بتادوں کہ صاحبزادے کی والدہ جو اچھی خاصی بوڑھی ہیں...... کیونکہ یہ لڑکا بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے...... وہ بھی اسی کے ساتھ رہتی ہیں...... اب یہ تو آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اگر... کائنات کی شادی آپ وہاں کردیتے ہیں تو کائنات کے اوپر تو ایک مکمل گھر کا بوجھ آپڑے گا اور وہ اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھ سکے گی...... گھر میں بیمار اور بوڑھی خاتون ہیں، لاکھ گھر میں نوکر چاکر میڈ وغیرہ موجود ہوتے ہیں...... لیکن جس پر گھر کی ذمّے داری ہوتی ہے مینج تو اسی کو کرنا ہوتا ہے۔ بچی کم عمر ہے اور اُدھر ذمّے داریاں بہت ہیں۔'' خان صاحب نے بہت تفصیل سے جواب دے کر شاہ صاحب کی تسلی و تشفی کرنے کی کوشش کی۔

''ہوں......'' شاہ صاحب نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا...... ''اچھا یہ تو ہاشمی صاحب کے بیٹے کی بات ہوگئی۔ کسی اور رشتے کے بارے میں بتائیں، دیکھتے ہیں بچی کو سمجھاتے ہیں کیونکہ خان صاحب مجھے اب رات کو نیند نہیں آتی، دیکھیں میرے سارے رشتے دار یا تو ہندوستان میں ہیں یا یورپ میں...... پاکستان میں میرے دو تین رشتے دار ہیں مگر وہ بھی دور دراز کے شہروں میں رہتے ہیں۔ ایسے میں میری پریشانی تو بجا ہوئی ناں......''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اس کے علاوہ شاہ صاحب میری مسز نے اپنی دوست سے بھی بات کی تھی...... ان کے صاحبزادے اس وقت ملک سے باہر پڑھنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ فی الحال ان کی کوئی مستقل جاب نہیں ہے لیکن بچہ بہت لائق اور قابل ہے...... مسز بتا رہی تھیں کہ وہ واپس آئے گا تو باپ کا ہی بزنس سنبھالے گا لیکن......''

''لیکن کیا......؟''

''لیکن...... یہ شاہ صاحب کہ وہ بچہ اپنے گھر میں سب سے بڑا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سب بچوں میں اس کا پہلا نمبر ہے اور اس کے بعد چار چھوٹی بہنیں ہیں...... اور سب کی سب پڑھ رہی ہیں۔ دو تو شاید کائنات ہی کی عمر کی ہوں گی...... میں سمجھتا ہوں کہ ابھی کائنات کی اتنی عمر نہیں ہے کہ وہ کسی گھر کی سربراہ بن کر اتنی ذمّے داریاں اٹھائے...... بڑے ناز و نعم سے پلی ہوئی بچی ہے...... پھر بھی اگر آپ دلچسپی لیں تو بات میں آگے بڑھادوں۔'' بیرسٹر جمیل خان نے کھوجتی ہوئی نظروں سے شاہ صاحب کے پُرتفکر چہرے کی طرف دیکھا تھا جیسے اپنے طور پر اندازہ لگانے کی کوشش کررہے ہوں کہ ان کی بات کا شاہ صاحب پر کیا ردِعمل ظاہر ہورہا ہے۔

''سب کچھ سمجھتے ہیں آپ...... ٹھیک کہہ رہے ہیں خان صاحب اس بچی میں اتنی صلاحیت نہیں ہے...... یہ بھی بہت بڑی ذمّے داری ہوتی ہے...... اب ظاہر ہے جب تک اس بچے کی بہنیں اپنے، اپنے گھر نہیں چلی جاتیں اس کی بیوی کو تو یہ سارا بوجھ اٹھانا ہے ناں...... نہیں، نہیں یہ کائنات کے بس کی بات نہیں ہے...... آپ کوشش کیجیے کہ لڑکا اکلوتا ہو اور اس پر ماں، باپ کے علاوہ کوئی اور ذمّے داری نہیں ہو۔''

''جی، جی شاہ صاحب میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھتا ہوں اور ابھی تک جو آپ سے بات نہیں کر پایا

یہی وجہ تھی ورنہ رشتے تو سامنے تھے، ڈسکس بھی ہوئے تھے مگر میں خود ہی مطمئن نہیں تھا اس لیے آپ سے بات ہی نہیں کی...... آج آپ خود چل کر تشریف لائے تو آپ کو یقین دلانے کے لیے یہ سب کچھ بتایا ہے کہ میں بھولا نہیں ہوں...... اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں۔''

''ارے نہیں، نہیں خان صاحب میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا تھا۔ آپ یوں سمجھیں کہ گھر میں پڑے، پڑے بھی جی گھبرا جاتا ہے فرض کر لیجیے کہ میں ویسے ہی آپ سے ملنے چلا آیا......'' شاہ صاحب شگفتہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''بہت اچھا کیا...... جب بھی آپ کا دل چاہے آجایا کیجیے...... بس آنے سے پہلے مجھے فون کر دیں تاکہ میں اس جگہ پر آکر بیٹھ جاؤں آپ کو ویل کم کہنے کے لیے کیونکہ کچھ پتا نہیں ہوتا بعض اوقات گھر پر بھی کلائنٹ سے میٹنگ ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ کورٹ سے دیر سے نکلتے ہیں...... میں نہیں چاہتا کہ آپ کو تکلیف ہو۔''

''جی...... جی آج تک تو آپ ہی ہمارے پاس آتے ہیں، میں تو غالباً دوسری یا تیسری مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''آپ کا احسان ہے شاہ صاحب۔'' بیرسٹر جمیل خان نے پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی خاکساری سے کہا تھا۔

بیرسٹر جمیل خان گزشتہ بائیس سال سے شاہ عالم کے لیگل ایڈوائزر تھے۔ ان کی تمام جائداد کے معاملات اور بیرونِ ملک کاروبار میں لگے ہوئے سرمائے کی حفاظت اور دیکھ بھال انہی کی ذمے داریوں میں شامل تھی۔ ہر مہینے شاہ صاحب کی طرف سے ان کے اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے ٹرانسفر ہو جاتے تھے چاہے چھ، چھ مہینے تک قانونی مسائل نہ آئیں انہیں ہر مہینے فیس ملتی تھی، دو لاکھ روپے اچھی خاصی رقم ہوتی ہے وہ تو... شاہ صاحب کے دو سو سال جینے کی دعائیں کرتے تھے۔

''شاہ صاحب طبیعت کا بتائیں کیسا محسوس کرتے ہیں چیک اپ وغیرہ تو ریگولر کروا رہے ہیں ناں......؟'' معاً بیرسٹر جمیل خان کو ان کی صحت کی بابت پوچھنے کا خیال آیا۔

''مشینیں تو فی الحال تسلی دے رہی ہیں......'' شاہ عالم دھیرے سے ہنس پڑے۔ ''مگر اس دل پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''اللہ آپ کو صحت دے اور آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے آپ جیسے لوگ تو ہم جیسے لوگوں کے لیے رول ماڈل ہوتے اس عمر میں تو لوگ بستر میں لیٹ کر اپنی خدمتیں کروا رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے کتنی ہمت سے خود کو سنبھالا ہوا ہے...... اللہ آپ کو مزید ہمت دے۔''

''بس آپ کی دعائیں چاہئیں خان صاحب، آپ میرے لیگل ایڈوائزر بھی ہیں...... دوست بھی ہیں...... میری پوتی کے لیگل custodian بھی ہیں...... ویسے تو پالنے والی ذات، حفاظت کرنے والی ذات اللہ رب العالمین کی ہے لیکن کچھ ایسے زمینی حقائق ہیں جن سے نظریں چار کیے بغیر گزارہ نہیں...... میرے بعد میری پوتی کی تمام ذمے داریاں آپ پر ہیں خان صاحب۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں شاہ صاحب آپ...... ایسی باتیں نہ کیا کریں ڈر لگتا ہے مجھے ایسی باتوں سے...... اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو صحت کے ساتھ لمبی عمر دے اور آپ اپنی پوتی کی خوشیاں دیکھیں اور اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کریں...... آمین۔''

شاہ صاحب سر جھکا کر مسکرانے لگے...... جمیل خان سے بات چیت کر کے وہ خود کو خاصا ہلکا محسوس کر رہے تھے۔

جاری ہے

تانگے والا

بشریٰ گوندل



اس کی سماعتیں گیٹ پر لگی ہوئی تھیں جب مخصوص ہارن سن کر وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکلی۔ نوید کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

”آپ آگئے؟“

”ہوں۔“ مختصر جواب ملا۔ وہ بیڈروم کی طرف بڑھ گئے اور بریف کیس تھامنے کے لیے اس کے ہاتھ اٹھے ہی رہ گئے۔

"پانی لاؤں؟" وہ پیچھے لپکی۔

"نہیں۔" اندر داخل ہو کر انہوں نے اپنے پیچھے نہ صرف دروازہ بند کیا بلکہ اس کی بولتی بھی بند کر دی۔

"اوہ......اس کا مطلب ہے ابھی تک ناراض ہیں صاحب بہادر۔" وہ پریشان سی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

نوید صبح ناشتا کیے بغیر خفا، خفا سے آفس چلے گئے تھے۔ وہ پورا دن بے چین و بے قراری گھر میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی کسی کام میں دل نہ لگا کیونکہ یہ اس کی ازدواجی زندگی کا پہلا دن تھا کہ نوید چوبیس گھنٹے سے زیادہ اس سے خفا رہے ہوں اور گزشتہ سولہ برسوں میں یہ پہلے چوبیس گھنٹے تھے نہایت پریشان کُن گھنٹے۔ وہ حیران تھی اس لیے بھی کہ نوید بہت نرم مزاج اور ٹھنڈے دماغ کے مالک تھے جبکہ وہ خود غصے کی تیز تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر اکثر لڑتی جھگڑتی، روتی، غصہ کرتی، ناراض ہوتی اور وہ بڑے آرام سے مسکراتے رہتے تھے اور وہ اپنا سارا غصہ ان پر انڈیل کر فریش ہو جاتی اور کچھ ہی دیر بعد ساری ناراضی، گلے شکوے بھول بھال کر وہ پورے دل سے قہقہے لگا رہی ہوتی لیکن شکایت کرنا پھر بھی نہ بھولتی۔

"آپ میرے غصے کی پروا ہی نہیں کرتے، اس کا مطلب ہے آپ کو میری کوئی پروا نہیں ہے۔" وہ ہنس دیتے۔

"ارے نہیں یار...... مجھے تم لڑتی اچھی لگتی ہو اور ویسے بھی بیوی کو ناراضی، غصہ، لڑائی یہ چیزیں سوٹ کرتی ہیں۔"

"ہونہہ......عجیب لاجک ہے آپ کی بھی...... لوگوں کو ہنستی مسکراتی بیویاں اچھی لگتی ہیں اور آپ کو لڑتی جھگڑتی ہوئی۔" وہ اور منہ چڑاتی۔

"پسند اپنی، اپنی، خیال اپنا، اپنا۔" وہ محبوبیت سے اسے دیکھتے ہوئے ازدواجی زندگی کے اولین روز و شب یاد دلانے لگتے اور اسے لگتا کہ وہ اولین ساعتیں، وہ ان دونوں کی محبتیں رخصت نہیں ہوئیں بلکہ اس کے آس پاس بکھر گئی ہیں خوشیاں بن کے۔ وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی۔ محبت اور قدر کرنے والا شوہر، تمیزدار اور باشعور بچے، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اور باپ جیسی محبت و شفقت رکھنے والا سسر۔ وہ اپنے گھر کو جنت مانتی تھی اور اس جنت کو قائم و دائم رکھنے اور ماحول کو خوشگوار رکھنے میں زیادہ کردار بلاشبہ نوید کا تھا جبکہ نوید سارے کا سارا کریڈٹ اپنی عزیز از جان بیوی سدرہ کو دیتا جو اس کے بوڑھے باپ کو اپنے باپ کا درجہ دیتی تھی۔ بچوں کی تربیت پُروقار اور اسلامی طریقوں پر کر رہی تھی اور صبح سے شام بلکہ رات گئے تک گھر کی دیکھ بھال اور جملہ افراد کی خدمت میں مصروف رہتی اور ماتھے پر شکن تک نہ لاتی حتیٰ کہ دل میں بھی کوئی حرفِ شکایت نہ ہوتا پھر نوید بھی پورے دل سے اس کی عزت اور قدر کرتا تھا۔

وہ چونک گئی اسے کافی دیر ہو چکی تھی اسی طرح صوفے پر بیٹھے ہوئے۔ اباجی مسجد سے اور بچے ٹیوشن سے ابھی واپس نہیں آئے تھے شاید پارک چلے گئے تھے اور نوید صاحب اپنے کمرے میں بند۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے گھر میں وحشت ناک قسم کی خاموشی تھی حالانکہ گھر میں دو افراد موجود تھے۔ دو افراد بھی وہ جن میں انتہائی قریبی رشتہ تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی محبت کے دعوے دار بھی تھے پھر یہ درمیان میں اتنی گہری چپ کہاں سے آن ٹھہری تھی اسے اذیت سی ہوئی۔ پچھلے سولہ برسوں کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا اذیت ناک نہ تھا ابھی پچھلے ماہ ہی تو اس نے اپنی سولھویں ویڈنگ اینی ورسری منائی تھی۔ بچے اباجی کے پاس چھوڑ کر وہ پیا سنگ چلی آئی تھی کسی نئی نویلی دلہن کی طرح۔ خوابناک ماحول... میں کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے اور نوید

کے ہاتھوں سے اپنی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنتے ہوئے اور پھر اس ہاتھ کی پشت پر نوید کے ہونٹ ثبت ہوتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ دنیا میں اس جیسی خوش نصیب شاید ہی کوئی ہوگی اور اسی رات وہ ان کے کاندھے پر سر رکھے پورے چاند کے جوبن کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نوید......سولہ سال گزر گئے ہماری شادی کو آپ ایک دن بھی مجھ سے ناراض نہیں ہوئے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے اس بات کی چاہت ہی رہے گی کہ آپ روٹھے ہوں اور میں آپ کو مناؤں۔"

"اچھا!" اس کی انوکھی خواہش سن کر نوید ہنس دیے۔ "سچی مچی کی ناراضی یا جھوٹ موٹ والی؟"

"سچی مچی والی، ظاہر ہے جب پیار سچا ہے تو ناراضی بھی سچی ہی ہونی چاہیے۔"

"ہاں واقعی؟" نوید نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "پھر کیسے مناؤ گی تم؟"

"ہاتھ جوڑ کر۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

"میں نہ مانا تو؟"

"پاؤں چھو کے۔" وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"اور میں پھر بھی نہ مانا تو؟"

"پھر رو رو کے مناؤں گی آپ کو۔" اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب ہو گئیں۔

"ارے، رے۔" نوید کے ہاتھ پاؤں پھولے۔ "تم نے یار ابھی سے ریہرسل شروع کر دی۔ بھئی میں یہ رسک ہی نہیں لیتا۔ نہ کبھی روٹھوں گا نہ تمہیں منانا پڑے گا۔" اور آج دوسرا دن تھا نوید اس سے روٹھے ہوئے تھے۔ اپنے تمام قول و قرار بھلا کر حالانکہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی پھر بھی یہ روٹھنا۔ اب کیسے اپنی باتوں سے مُکر گئے تھے وہ گزشتہ رات جاگ کر مناتی رہی مگر ناراضی ہنوز قائم تھی۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ وہ آنسو صاف کر کے اندر چلی آئی۔

"نوید!" اس نے پکارا مگر جواب ندارد۔ وہ بازو آنکھوں کے اوپر رکھ کے لیٹے ہوئے تھے کوئی اور موقع ہوتا تو وہ گدگدی کرتی لیکن اب ان کی مزید ناراضی کے خوف سے اس نے آہستہ سے بازو چھوا۔

"نوید......چائے لے آؤں آپ کے لیے؟"

چونکہ کھانا وہ آفس سے کھا کر آتے تھے مگر چائے اس کے ہاتھ کی پسند کرتے تھے۔

"اوں ہوں، میں پی چکا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ

غزل

عکس سارے آئینوں میں بٹ گئے
خواب میرے کرچیوں میں بٹ گئے

جو بنائے میں نے خوابوں کے محل
اس کے حصے دوستوں میں بٹ گئے

حق کا رستہ چھوڑ کر پایا ہے کیا
نور سارے ظلمتوں میں بٹ گئے

ہو گئے بے مول جو انمول تھے
اونی پونی قیمتوں میں بٹ گئے

زر کے پیچھے بھاگنے سے کیا ہوا
چین کھویا آفتوں میں بٹ گئے

زندگانی کم ہے چاہت کے لیے
لوگ کیسے نفرتوں میں بٹ گئے

دہر میں خانم خدا ہی آسرا
میرے اپنے دشمنوں میں بٹ گئے

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

کروٹ بدل گئے۔ گویا وہ سو نہیں رہے تھے۔ آنسوؤں کا پھندا سا اس کے گلے میں لگا تو وہ مزید کوئی بات کیے بنا ہی باہر نکل گئی۔ ذہن میں اپنی غلطی کو بار بار دُہراتی، یاد کرتی ہوئی لیکن وہ ایسی خطا نہ تھی کہ نوید معاف ہی نہ کرتے۔

اگر نوید سے اسے محبت تھی تو بچے ان سے زیادہ عزیز تھے۔ اس کی زندگی کا حاصل تھے ان کی خوشیوں سے وابستہ اس کی خوشی تھی، وہ بچوں کی آنکھوں میں آنسو کسی صورت بھی نہیں دیکھ سکتی تھی حالانکہ خود نوید کو بھی یہ دعویٰ تھا کہ وہ اپنے بچوں کی ہر خواہش اور ہر فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر یہ تو بچوں کی...... سدرہ کے خیال میں معمولی سی خواہش تھی جسے سن کر نوید کو تو غصہ آیا ہی ساتھ ہی ابا جی کو بھی سخت اعتراض ہوا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ چند ہفتوں سے لائبہ اور لاریب کے ساتھ ساتھ اسامہ کا بھی موڈ سخت خراب رہا تھا۔ جب پوچھا تو بتایا گیا کہ دوسرے بچے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ لوگ تانگے پر سوار ہو کر اسکول آتے جاتے ہیں اور شاید وہ لوگ غریب ہیں جو رکشا یا وین کا کرایہ افورڈ نہیں کر سکتے ہیں۔ تانگے سستی اور غریبوں کی سواری ہے وغیرہ، وغیرہ جبکہ دوسرے بچے ویگنوں اور رکشوں پر آتے ہیں اور کچھ اپنی گاڑیوں، موٹر سائیکلوں پر۔" نوید بچوں کے اعتراض پر ہنس پڑے۔

"یار اس میں مذاق اُڑانے والی کیا بات ہے۔ آپ لوگ پیدل تو نہیں جاتے ہو کہ کوئی مذاق اڑائے۔"

"اور کوئی بچہ بھی تانگے پر سوار ہو کر نہیں آتا۔" لائبہ نے بتایا۔

"پاپا مجھے تو لگتا ہے اب اس پورے قصبے میں ایک ہمارا ہی تانگا رہ گیا ہے۔" اسامہ نے کہا۔

"ہونہہ، آؤٹ آف فیشن۔" لاریب نے بھی منہ بنا کر کہا تو نوید کے ساتھ ساتھ سدرہ کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"بس پاپا ہم نے کہہ دیا ہے کہ ہم اب تانگے کے ذریعے اسکول نہیں جائیں گے۔ اب مزید انسلٹ برداشت نہیں ہوتی۔ آپ ہمیں وین لگوا دیں یا رکشا۔" لائبہ نے تجویز دی۔

"بیٹا میرے خیال میں تو تانگے جیسی محفوظ اور معقول سواری اور کوئی نہیں ہے۔ سب سے فائدہ مند بات یہ ہے کہ پیٹرول اور ڈیزل کے بغیر ہی سڑک پر بھاگم بھاگ...... گھوڑے کی ٹنکی بس ایک بار فل کروا لو چارے سے پھر کئی میل کئی گھنٹے تک چلے گا۔" نوید نے اپنی طرف سے خاصا معقول جواز پیش کیا مگر بچے بضد رہے۔

"کوئی نہیں ناں۔" اسامہ نے کہا۔ "پاپا آپ کو تانگے پر سوار ہو کر اگر آفس جانا پڑتا ناں ہم پھر آپ سے پوچھتے۔"

"بھئی میرا روٹ دوسرا ہے ورنہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ تانگے پر ہی جاتا آفس۔" نوید نے آرام سے کہا۔

اس روز تو بات آئی گئی ہو گئی لیکن چند دنوں کے بعد لاریب ہچکیوں سے روتی ہوئی اسکول سے واپس آئی۔ وجہ وہی تانگا...... لائبہ نے وجہ بتائی کہ اسکول میں سب بچوں نے مل کر یہ مشہورِ زمانہ گیت گایا تھا جسے سن کر تانگے کا کوچوان بھی پورے راستے مسعود رانا مرحوم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند گاتا آیا تھا۔

تانگے والا خیر منگدا...... تانگے والا خیر منگدا
تانگا لہور دا ہووے تے پاویں جھنگ دا
تانگے والا خیر منگدا

سدرہ کی اس وقت تو ہنسی نکل گئی لیکن شام کو نوید اور ابا جی کی عدالت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔

اب تو بچوں کے ساتھ ساتھ سدرہ بھی تانگا ہٹا دینے کے حق میں تھی کہ پہلے چلو دیہاتی گرد و نواح میں کسی نہ کسی سڑک پر ایک آدھ تانگا ٹپاٹپ کرتا دکھائی دے جاتا تھا۔ اب تو وہ بھی نظر نہ آتے۔ اب تو لے دے کے یہی بابا شیرا کا تانگا رہ گیا تھا جس سے بچے عاجز تھے۔

"نوید...... بچے ٹھیک کہتے ہیں آپ تانگا ہٹا کر وین یا رکشا لگوا دیں۔" سدرہ نے بچوں کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"بچے تو ناسمجھ ہیں، نادان ہیں ساتھ تم بھی بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ تانگا کتنا محفوظ ہے ہمارے بچوں کے لیے۔"

"ہاں بلٹ پروف ہے ناں اس لیے۔" وہ غصے سے بڑبڑائی۔

"بلٹ پروف ہی سمجھو۔" نوید ذرا تیز لہجے میں بولے۔ "وہ اس لیے کیونکہ میں اپنی بچیوں کو تانگے پر محفوظ سمجھتا ہوں۔ ان کو بابا شیرا کے ساتھ بھیج کر میں ان کی طرف سے بے فکر ہو جاتا ہوں۔ تم آئے روز خبریں نہیں سنتی ہو یا تم نے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں۔ ایسی، ایسی خبریں آتی ہیں کہ دل دہل جاتا ہے۔ کس پر بھروسا کیا جائے، ویگنوں اور رکشوں والے اکثر اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی جوان بچیوں کو ان کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ سارے لوگ اگرچہ ایک جیسے نہیں ہوتے لیکن زیادہ تر قابلِ اعتبار بھی نہیں ہوتے۔" نوید کی بات میں کچھ، کچھ صداقت محسوس کر کے سدرہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔

ابا جی سے بات کی تو وہ بھی نوید کے ہمنوا تھے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"کس سے بات کروں آخر؟" اگلے دن نوید کی بڑی بہن سلمیٰ آپا آئیں تو اس نے بچوں کی پریشانی اور نوید کی ضد سمیت پوری بات ان کو بتائی تو وہ بولیں۔

"نوید بھائی ٹھیک کہتے ہیں سدرہ۔ میرا گھر اگر شہر کے دوسرے کونے پر نہ ہوتا تو میں اپنے بچوں کو تمہارے بچوں کے ساتھ تانگے پر ہی اسکول بھیجتی۔ ویگنوں اور رکشوں والے قابلِ بھروسا تو نہیں ہوتے۔ ہر وقت دل دہلتا رہتا ہے۔ اللہ پاک ہر کسی کو اپنی امان میں رکھے۔" پھر انہوں نے اس سے متعلق وہ، وہ کہانیاں سنائیں کہ توبہ...... وہ شام تک استغفار پڑھتی رہی۔

بچوں نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ انہوں نے بھی گویا ضد ہی باندھ لی تھی۔ اب تو انہوں نے تانگے والے بابا سے جھگڑنا شروع کر دیا تھا اور ہر روز اسے آخری وارننگ دیتے ہوئے کہتے۔

"ہوسکتا ہے ہمارا کل کا دن آخری ثابت ہو تمہارے تانگے پر۔" وہ آ کر ابا جی کو بتاتا باقاعدہ رقت آمیز لہجے میں اور کبھی آنسو بہا کے۔

بچوں کے اسکول سے پیرنٹس کا بلاوا آ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سدرہ کو جانا پڑا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ظاہر ہے آج کل ایک ہی ایشو تھا جو دردِ سر بنا ہوا تھا۔ آخر اس کا شبہ درست ثابت ہوا۔ پوری رام کہانی سننے کے بعد پرنسپل صاحبہ بھی اس بات پر متفق نظر آئیں کہ فی الفور بچوں کا تانگا ہٹا دیا جائے۔

"وین اور رکشا اگر آپ لوگوں کو قابلِ بھروسا نہیں لگتے تو آپ بچوں کے فادر سے کہیں کہ وہ خود یہ ذمے داری قبول کر لیں۔"

"مگر ان کا روٹ دوسرا ہے اور پھر ٹائمنگ کا بھی فرق ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"آپ نے ایک بات کا شاید نوٹس نہیں لیا مسز نوید کہ آپ کے بچوں کی نفسیات پر بہت گہرا اثر پڑا ہے اس تانگے والے ایشو کے بعد...... ان کی ٹیچرز کی شکایت آئی ہے کہ ان کا دھیان پڑھائی سے ہٹ گیا ہے۔ ان کی رپورٹس میں نمایاں کمی آئی ہے اور ان کا

کانفیڈنس لیول بھی لو ہو رہا ہے۔ اس طرح تو خدانخواستہ ان کی شخصیت متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔''

''آپ دوسرے بچوں کو اس حوالے سے سمجھائیں۔'' سدرہ نے کہا۔

''میں کسی حد تک تو منع کر دوں گی لیکن پورے اسکول میں آپ کے بچوں کو تانگے کے حوالے سے ٹھیک ٹھاک ہوٹ کیا جاتا ہے بلکہ شرمندہ کیا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کا تانگا آثارِ قدیمہ سے دریافت شدہ کوئی شے ہے، کبھی تانگا چلانے والے بابا کے حوالے سے کوئی ایسی ہی بات...... میں کس، کس کا منہ بند کروں۔''

''میں کیا کروں میڈم ان کے فادر اور گرینڈ فادر نہیں مان رہے ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی تو پرنسپل نے فوراً کہا۔

''پرابلم واقعی کوئی نہیں ہے اور نہ ہی تانگے کی سواری قابلِ مذمت یا کوئی شرم کی بات ہے۔ پرابلم دراصل یہ ہے کہ اب یہ سواری تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ سمجھیں کہ آؤٹ آف فیشن اور فیشن کی ہی دوڑ میں جہاں ہم بڑے بھاگ رہے ہیں ہمارے بچوں کو بھی میڈیا نے لگا دیا ہے۔ وہ آؤٹ آف ڈیٹ چیزوں کو اثاثہ سمجھنے کے بجائے باعثِ شرم سمجھنے لگے ہیں اور منہ چھپانے پر مجبور ہیں۔ یہ ہمارا المیہ ہے۔'' وہ بوجھل دل کے ساتھ واپس چلی آئی۔

''اباجی اب آپ بتائیں اس مسئلے کا کوئی حل؟'' اس شام وہ اباجی کو پرنسپل صاحبہ سے ہونے والی تمام گفتگو من وعن سناتے ہوئے بولی۔

''یہ اتنا مسئلہ نہیں ہے جتنا بچوں نے بنالیا ہے بیٹا۔'' اباجی نے کہا۔

''جی وہ تو ٹھیک ہے اباجی لیکن مسئلہ اگر چھوٹا بھی ہے مگر ہے تو حل طلب۔'' وہ احتیاط سے بولی۔

''اب وہ تینوں کہہ رہے ہیں کہ ہم کل سے اسکول نہیں جائیں گے۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں، وہ اب عمر کے اس حصے میں ہیں کہ ان پر غیر ضروری سختی بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں تو اباجی انہیں ہر طریقے سے سمجھا، سمجھا کر تھک چکی ہوں لیکن وہ نہیں مانتے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟'' اس کی آواز رُندھ گئی۔

''مجھے خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا بیٹا۔'' اباجی قدرے توقف کے بعد بولے۔ ''بچے تو چلو ویگن یا رکشے میں ایڈجسٹ ہو جائیں گے اس سارے قصے میں تم نے سوچا کہ بابا شیرا کا کیا ہوگا۔ اسے تو زندگی بھر تانگے کے آگے جُتے ہوئے گھوڑے کی باگ پکڑنے کے سوا کوئی ہنر بھی نہیں آیا کہ اس بڑھاپے میں بروئے کار لا سکے۔ اس کا یہ عہد تھا کہ وہ آخری سانس تک ہمارے لیے تانگا چلائے گا۔ اب اس سے کیسے اس کا یہ ہنر چھین کر بے روزگار کر دیا جائے۔ اس سارے قصے میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ اس سے اب کون تانگا چلوائے گا چنانچہ گھوڑا کسی اصطبل کی زینت بن جائے گا اور تانگے کی لکڑی ایندھن کے کام آجائے گی لیکن وہ غریب مسکین کہاں جائے گا جس کی روزی، روٹی ان چلتے دو پہیوں کی بدولت تھی۔ یہ پہیے رک گئے تو سوچو بیٹا وہ عمر کے اس آخری پہر کہاں جائے گا۔ اس کا تو کوئی والی وارث بھی نہیں ہے اور یقین کرو اُسے اگر ہم دو وقت کی روٹی اور کپڑا دینے کی حتیٰ کہ رہائش دینے کی بات بھی کریں تو وہ صاف انکار کر دے گا۔ جن کو محنت کر کے حلال کھانے کی عادت ہوتی ہے وہ پھر ہمدردی اور ترس کا لقمہ نہیں کھاتے۔'' وہ چپ چاپ سنتی رہی اور یہ اس کی عادت تھی وہ اباجی کی باتیں گھنٹوں اسی طرح سنتی رہتی بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ۔

''بیٹا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نوید کو جب اسکول میں داخل کروایا تھا تو بابا شیرا اس کو کاندھے

پر بٹھا کر اسکول چھوڑنے جاتا تھا اور نوید نے ہی شیر محمد کو بابا شیرا کا نام دیا تو پھر وہ پوری کالونی میں بابا شیرا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتی نہیں ہو نوید کو اس سے کتنی انسیت ہے اور اسے تمہارے بچوں سے۔ سردی آئی، گرمی گئی، جاڑے میں، برسات میں اس نے کوئی ایک ناغہ بھی کیا؟ بیماری کی حالت میں بھی وہ چھٹی نہیں کرتا۔ کتنی دفعہ تو وہ آگ کی طرح تپتے بخار میں چلا آتا ہے۔ یہ ذمے داری وہ مجبوری سے مارے باندھے نہیں بلکہ محبت سے نبھا رہا ہے۔ وہ ہمارے، بچوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس بات کا مجھے یقین ہے کہ وہ جان پر کھیل کر بھی تمہارے بچوں کی حفاظت کرے گا۔'' اباجی اسے ہر پہلو سے سمجھا رہے تھے۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے اباجی...... مجھے بابا شیرا کی محبت اور خدمت گزاری پر کوئی شبہ نہیں ہے اور نہ ہی آپ کی کسی بات سے اختلاف۔'' سدرہ نے سعادت مندی سے کہا۔ ''آپ کو تو پتا ہے اباجی میں نے آج تک آپ کی اور نوید کی کوئی بات کبھی رد نہیں کی لیکن اب مسئلہ بچوں کا ہے وہ کسی صورت نہیں مان رہے۔ آپ نے شاید محسوس کیا یا نہیں وہ تینوں روز بروز مینٹلی اپ سیٹ ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی پروگریس رپورٹ روز بہ روز خراب ہوتی جارہی ہے۔ پرنسپل صاحبہ نے سختی سے کہا ہے کہ ہمیں جلد سے جلد اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا چاہیے۔''

''ہوں، میں نوید سے بات کرتا ہوں۔'' اباجی نے یہ کہہ کر ٹی وی کھول لیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی مسئلہ جوں کا توں تھا۔

آخر بچوں کی رونی صورتیں اور اترے ہوئے چہرے دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ بچوں نے گھر سے باہر نکلنا بھی ترک کر دیا تھا کہ گلی کے ہم عمر بچے بھی اب انہیں تانگے کے حوالے سے چھیڑنے لگے تھے۔ وہ تینوں بہن بھائی شروع سے

غزل

مجھے آواز تک میری سنائی کیوں نہیں دیتی
حقیقت زیست میں تیری دکھائی کیوں نہیں دیتی

تیری آنکھیں جو رستہ دیکھتی رہتی تھیں بس میرا
وہی تصویر اب دل میں دکھائی کیوں نہیں دیتی

مجھے عادت سی ہوتی جارہی ہے ظلم سہنے کی
یہ دنیا ظلم پہ آخر دُہائی کیوں نہیں دیتی

مجھے تڑپائے رکھتی ہے جو ہر لمحہ زمانے میں
نظر تیری یہ اب مجھ کو رہائی کیوں نہیں دیتی

سبھی مجرم سمجھتے ہیں غزالہ کو جہاں والے
میرے سچ کی صدا ان کو سنائی کیوں نہیں دیتی

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

غزل

مقدر آزمانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
مرادیں دل کی پانے میں زمانے بیت جاتے ہیں

نہیں رکھتا اگر ہمت کوئی اظہارِ الفت کی
زباں پر بات لانے میں زمانے بیت جاتے ہیں

محبت زندگی میں گر بڑی مشکل سے ملتی ہے
مگر اس کے نبھانے میں زمانے بیت جاتے ہیں

اگر اک بار آنکھوں میں اچانک کوئی بس جائے
اسے دل سے بھلانے میں زمانے بیت جاتے ہیں

کاوش: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

ہی بہت حساس تھے شاید اسی لیے اتنی سی بات کو دل پر لے لیا تھا یا شاید دوسرے بچوں کا رویّہ زیادہ ہی ہتک آمیز رہا ہو کہ ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

وہی وہ وقت تھا جب سدرہ نے ذرا سی جرأت پکڑی اس کی ممتا اپنے بچوں کو مزید پریشان نہ دیکھ سکی۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ سے سر جھکا کر فقط مان لینے کی عادی تھی جس نے جو کہا، سن لیا، مان لیا نہ سوال نہ جواب لیکن اب اپنے بچوں کے لیے اس نے جرأت کی تو معتوب ٹھہرائی گئی۔ جو جیون ساتھی تھا، جو محبوب شوہر تھا جس کو روٹھنا آتا ہی نہ تھا اور اب ایک ذرا سی بات کو ایشو بنا کر روٹھ گیا تھا گویا اسے تو سارے ہنر آتے تھے روایتی شوہروں والے، روایتی مردوں والے۔ بس بیوی نے ہی ساتھ گزارے سولہ برسوں میں کبھی روٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہر بات کو حکم کا درجہ دیا، ہر حکم کو مان سمجھ کر پورا کیا۔ اس نے نہ کی تو بھی راضی، اس نے ہاں کی تو بھی راضی۔ اس کی خوشی میں خود کو خوش نصیب کہا اور اب ...... جب اس کے بچے اس کے کاندھوں برابر ہو گئے تھے تو اس نے ہمت کر کے محض بچوں ہی کی خاطر نوید اور ابا جی سے اجازت اور مشاورت کے بغیر اس وین والے سے بات کر لی تھی جو کالونی کے دیگر بچوں کے لیے مختص تھی۔ جب اس نے دروازے پر ہارن دیا تو کف بند کرتے نوید کے ساتھ ساتھ سپارہ پڑھتے ابا جی بھی چونک گئے تھے۔ زیادہ شاک شاید اس لیے بھی لگا ہو کہ ان کے گھر میں ان کی خدمت پر کمر بستہ صبح سے رات کر دینے والی اور ان کے کسی فیصلے پر کبھی چُوں چرا بھی نہ کرنے والی سدرہ اتنی خود مختار کیسے ہو گئی تھی۔

وہ دونوں حیرت سے گنگ تھے جبکہ بچے خوش اور بچوں کو تیار کرتی ان کی ماں مطمئن...... لیکن یہ اطمینان اگلے چند لمحوں میں رخصت ہو گیا جب نوید کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ سامنے دیوار پر نقش و نگار بناتا کرچی، کرچی ہو کر یہاں وہاں بکھر گیا اور اسی لمحے سدرہ کے اندر بھی کچھ ٹوٹا تھا اور کرچیاں آنکھوں میں چبھنے لگیں۔ بچے ناسمجھ نہیں تھے ماں کی مجبوری سمجھ گئے اور چپ چاپ سامنے کھڑے تانگے کے پائدان پر پاؤں رکھ دیے۔

وہ آنسو بھری آنکھوں سے انہیں رخصت کر کے پلٹ آئی۔ اس نے کوئی ایسا ناقابلِ معافی جرم نہیں کیا تھا لیکن یہ تو اسے اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر معلوم ہو گیا تھا کہ روایتوں میں جکڑی عورت بے جرم ہی سزا پاتی ہے۔ ذرا ذرا سی خواہش کے پیچھے، چھوٹی، چھوٹی نادانیوں کے عوض اور کبھی کبھی فقط عورت ہونے کے ناتے۔

☆☆☆

پورے تین دن وہ نوید کے روکھے پھیکے رویے کو برداشت کرتی رہی۔ بچوں کی اداسی اور ابا جی کی گہری چپ۔ گھر کا سوگوار سا ماحول اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ باپ جیسی شفقت اور محبت رکھنے والے سسر کے سامنے آنسو بہا بیٹھی جو وہ گزشتہ تین دن سے آنکھوں کے پیچھے روکے ہوئے تھی۔ ابا جی نے تحمل سے اس کی پوری بات سنی پھر تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''کچھ الجھنیں ریشم کے دھاگوں جیسی ہوتی ہیں۔ سلجھن کا سرا موجود ہوتے ہوئے بھی الجھ کر گم ہو جاتا ہے اور ہم جلد بازی میں سارا ریشم الجھا بیٹھتے ہیں۔''

''لیکن ابا جی...... مجھے نوید کے رویے سے تکلیف ہوئی ہے۔ وہ تحمل اور نرمی کا مظاہرہ کرتے، بچوں کو پیار سے سمجھاتے یا کوئی اور درمیانی راہ نکالتے جبکہ وہ تو بچوں کے موقف کو سراسر حماقت قرار دے رہے تھے لیکن میں ایک ماں ہونے کے ناتے بچوں کی نفسیات اچھی طرح سمجھتی ہوں، وہ غلط نہیں تھے اور اسی لیے تو...... بس مجھے آپ سے اور نوید سے

اجازت لینی چاہیے تھی وین والے سے بات کرنے سے پہلے۔ آئی ایم سوری، ابا جی مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

''نوید تو ایسے مجھ سے ناراض ہیں جیسے اس سارے قصے میں، میں اکیلی قصوروار ہوں۔ سارا جرم میرا ہی ہے۔'' وہ رو رہی تھی اور ابا جی ہنس دیے جیسے کوئی بڑا کسی نادان بچے کے رونے پر ہنس دے۔

''بیٹا دانا لوگ کہتے ہیں کہ ناراضی انہی سے ہوتی ہے جن سے آپ محبت کرتے ہیں اور تمہیں اندازہ تو ہونا چاہیے کہ نوید تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ تم نے ان تین دنوں میں شاید غور سے اس کی طرف نہیں دیکھا وہ کیسا.... الجھا، الجھا اور پریشان لگ رہا ہے۔ تم سے تعلق قطع کر کے شاید وہ بھی پریشان ہے۔ ابھی تم نے کہا ہے کہ تم بچوں کی فریکوئنسی سمجھتی ہو تو کیا اتنے سالوں میں تم نوید کی فریکوئنسی نہیں سمجھ سکی ہو؟ اس نے ماں کا پیار نہیں دیکھا، میں مصروف رہتا تھا تو اس کا زیادہ وقت شیر محمد کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ بابا شیرا کے وجود کے سائے میں اس نے کئی غیر موجود رشتوں کو کھوجا، محسوس کیا، یہ اس کی بچپن کی وابستگی اور محبت کہہ لو بابا شیرا سے کہ وہ اس کو ہر غم اور صدمے سے بچانا چاہتا ہے اور ظاہری بات ہے روزگار چھوٹنے کا صدمہ اس کا بوڑھا دل نہ برداشت کر پاتا۔ تم خواہ مخواہ ہم دونوں کی طرف سے بدگمان ہو گئی تھیں سدرہ بیٹا۔ ورنہ ہم نے اس سارے معاملے سے آنکھیں بند نہیں کر رکھی تھیں۔ بچوں کی پریشانی اپنے دل پر محسوس کرتے ہوئے ہم اس کا کوئی بہتر حل سوچ رہے تھے لیکن تم نے جلد بازی سے کام لیا تو نوید کو شاید غصہ آ گیا لیکن فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ابا جی کی بات سن کر ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔

''السلام علیکم!'' اسی وقت نوید نے لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے بلند آواز میں سلام کیا۔ اس کے ساتھ بچے بھی اندر داخل ہو رہے تھے اور ان کے چہروں پر محسوس کی جانے والی ایک الگ ہی خوشی تھی۔

''یہ لیں گاڑی کی چابی...... اب تو کسی کو کوئی شکایت نہیں ہے ناں؟'' درمیانی میز پر گاڑی کی چابی رکھتے ہوئے نوید نے گہری نگاہ سدرہ پر ڈالی تو وہ ناسمجھی سے ابا جی کی طرف دیکھنے لگی۔

''اب شکایت ہونی تو نہیں چاہیے کسی کو۔'' ابا جی نے شرارت سے سدرہ کی حیران آنکھوں میں دیکھا۔

''چلو جی، بچوں کا مسئلہ تو حل ہو گیا ہے نئی گاڑی لے آیا ہوں۔ بچے اب آج سے ابا جی کی ذمے داری ہیں...... ابا جی بھی کافی سالوں سے بے روزگار پھر رہے تھے۔'' نوید نے شرارت سے کہا تو بچوں نے یاہو کا نعرہ لگایا۔

''اور تمہارے بابا شیرا کا مسئلہ میں نے حل کر دیا ہے۔'' ابا جی بولے۔ ''میں نے اسے کالونی کے گیٹ کیپر کی ملازمت دلوا دی ہے، کیوں ٹھیک کیا ناں؟ اب تانگے والا نقلی بندوق لے کر کالونی کے گیٹ پر بیٹھا کرے گا۔ مشقت کم اور تنخواہ پوری اور ہم اس کی جگہ سنبھالیں گے، مشقت پوری اور تنخواہ کوئی نہیں، کیا خیال ہے بچوں...... چلو آؤ گاڑی دیکھنے چلیں۔ یہاں تو بارش کے آثار ہیں۔'' سدرہ کی نم آنکھیں دیکھتے ہوئے ابا جی شرارت سے کہہ کر بچوں کو لے کر باہر نکل گئے تو نوید، سدرہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''ارے...... ابا جی ٹھیک کہہ گئے ہیں کہ یہاں تو بارش کے آثار ہیں۔ دیکھو اس برسات میں کہیں ڈوب نہ جائیں ہم۔'' نوید کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی اور نوید کو یقین تھا کہ اس برسات میں تمام گلے شکوے دُھل جائیں گے۔



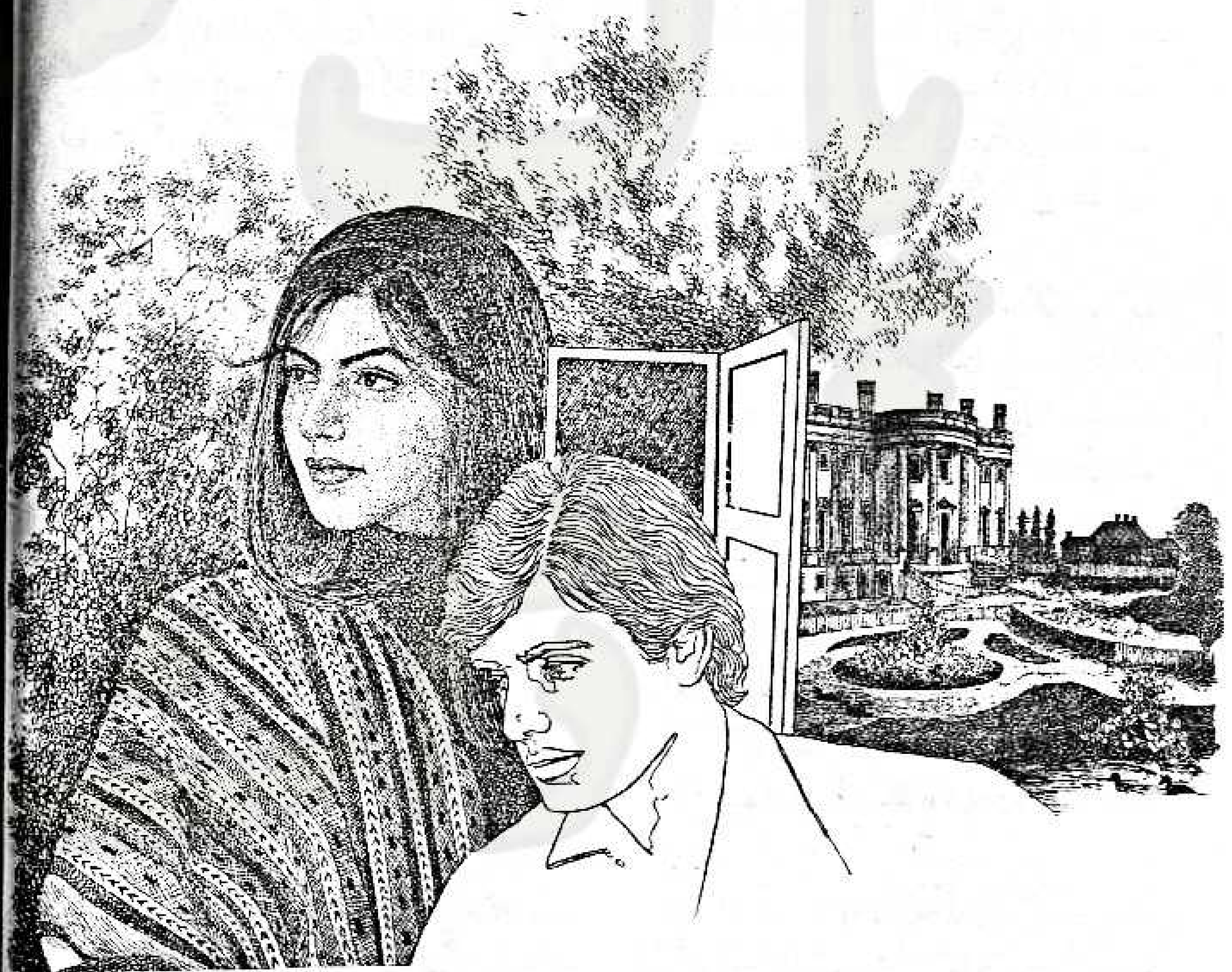
ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



پانچواں حصہ



تانتے نے گچ مچ میں ''ایفق'' نام لیا تھا۔ یہ نام بھلا کیا تھا؟ اور کس شخصیت کا تھا؟ مالا کچھ نہیں جان پائی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آواز اس کے کانوں سے غیر متوقع ٹکرا گئی۔

''ارے مالا جی! تُسی؟ کس لئی یاد کرلیا سانوں.....'' (مالا جی آپ! کیسے یاد کرلیا ہمیں؟) وہ ٹھیٹ پنجابی میں بڑے کھلکھلاتے لہجے میں بول رہا تھا جبکہ مالا اس کی آواز سن کر لمحوں میں پہچان گئی تھی۔

''آفاق تم یعنی ایفق؟'' مالا کے منہ سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی...... یہ بڑبولا باتونی آج فون پر بھی اس سے ٹکرا گیا تھا۔ مالا گویا اپنے ناخن چبا کر رہ گئی تھی۔ آفاق کی آواز سننے کی اسے توقع ہرگز نہیں تھی۔ آخر یہ کہاں سے ٹپک پڑا تھا؟

''جی ہاں...... میں ہی ایفق...... اِدھر سارے بواریا میں مجھے ایفق ہی کہا جاتا ہے۔'' وہ بڑے خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا۔ گویا مالا سے اس کی خوب دوستی رہ چکی ہو۔ بے تکلفی ایسی کہ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس رہا تھا اور یوں مخاطب تھا گویا اس سفر کے بعد بھی مالا اس سے رابطے میں رہ چکی تھی۔ یہ بے تکلفی مالا سے ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

''اور سناؤ تم کیسی ہو......؟ عیسیٰ صاحب تو ٹھاٹ باٹ سے ہوں گے۔ کام پڑے تو میں یاد آتا ہوں، کبھی بھول کر بھی تمہارے شوہر نے مجھ مسکین کو یاد نہیں کیا۔'' آفاق کی چلتی زبان کو روکنا محال تھا...... ویسے بھی اسے اگلے بندے کی سنے بغیر بولنے کی عادت تھی اور فی الحال اس کے اپنے شکوے ہی بے شمار تھے، وہ مالا کی ناگواری یا غصے کو بھلا کیسے محسوس کرتا...... اس کی چلتی زبان رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''خیر، مصروف بندہ ہے وہ، اب میں اسے کیا کہوں...... محسن ہے میرا، ویسے عنقریب میں بھی من ہائیم آنے والا ہوں۔'' وہ بہت پُرجوش سے دوستانہ لہجے میں بتا رہا تھا۔ گویا مالا کو تو بڑی بے قراری سے اس کا انتظار تھا۔ کم از کم آفاق کے جوش و خروش سے تو یہی نظر آ رہا تھا۔ مالا کو سخت الجھن ہونے لگی تھی، ابھی وہ سوزن کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہی تھی کہ آفاق پھر سے بول پڑا۔

''من ہائیم میں مجھے اچھی جاب مل سکتی ہے، میں نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ہی سویڈن سے اضافی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔ مجھے اسکالرشپ ملا تھا ناں عیسیٰ کو سب پتا ہے، وہ میری قابلیت کی تعریف بھی کرتا ہے اور مجھے امید ہے، اپنی فرم میں ہی مجھے بھی کھپا لے گا۔ میں نے ایک ماہ اس کے پرسنل سیکرٹری کی جاب بھی کی ہے پر مجھے اس جاب کو چھوڑ کر یہاں آنا پڑا...... ڈچ سیکھنے کے لیے۔ مجھے ڈچ نہیں آتی تھی ناں...... ورنہ جاب کے کیا ٹھاٹ تھے، عیسیٰ کے ساتھ آنا جانا' پتا ہے تمہارے گھر کے گیسٹ روم میں رہتا تھا میں...... انکل اور عیسیٰ بہت اچھے ہیں۔'' آفاق کی ہر بات، ہر انداز میں بے ساختگی چھلکتی تھی۔ وہ بولتا تو اگلے بندے کی ہرگز نہیں سنتا تھا تب وہ مالا کو بہت برا لگتا تھا مگر جب اس کی ہر بات کی تان عیسیٰ کی تعریف پر ٹوٹتی تب وہ مالا کو بہت اچھا لگتا تھا۔ چاچو اور اب آفاق بھی...... ہاں جو شخص عیسیٰ سے محبت کرے گا، اس سے مالا بھی محبت کرے گی، یہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا بلکہ خود ایسے جذبات دل میں امڈ آئے تھے جبکہ آفاق تو بیانگ دہل کہہ رہا تھا۔

''مجھے عیسیٰ سے بہت محبت ہے، اس جیسا پورے مغربی جرمنی میں کوئی نہیں۔'' آفاق کے یہ الفاظ مالا کے لیے کسی انمول خزانے سے کم نہیں تھے۔ اس کے ہونٹ آپوں آپ مسکرا اٹھے۔ عیسیٰ کی تعریف اس کے اندر باہر پھول کھلا دیتی تھی۔ کچھ پل کے لیے اسے بھول گیا تھا کہ اس نے فون پر آخر کس سے بات کرنا تھی؟ وہ سوزن کا پوچھنا چاہتی تھی مگر آفاق بولنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ اللہ، اللہ کر کے پورے پندرہ منٹ بعد آفاق بولتے، بولتے رکا تب مالا نے عجلت میں اس سے سوزن کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ مبادا وہ پھر سے کہیں اسٹارٹ ہی ہو جائے...... اس کے خدشے اور وسوسے کے عین مطابق وہ اسٹارٹ ہوتے، ہوتے رک گیا تھا۔

''سوزی بس آتی ہی ہوگی، باڑے تک گئی

ہے، میں ابھی ابھی آیا ہوں اِدھر...... پہلے یہیں رہتا تھا، پھر مجھے اچھا نہ لگا کہ ڈھیر سارے دن کسی پر بوجھ بن جاؤں...... خیر، تم سناؤ؟ فون سوزن کے لیے ہی کیا ہوگا یہاں کوئی اور سوزن کے علاوہ اردو نہیں بولتا اور تمہیں ڈچ آتی نہیں۔'' ایک ہی سانس میں اتنا طویل جملہ بولنا، محض آفاق کا ہی کمال ہو سکتا تھا...... اور وہ اپنے کمالات میں انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

''مجھے سوزن سے بات کرنی ہے۔'' مالا نے بروقت اپنا مدعا اس باتونی کی سماعتوں تک پہنچا دیا تھا تبھی وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''تم انتظار کرو، سوزن بس آتی ہوگی بلکہ انتظار سے بہتر ہے مجھ سے بات کر لو۔'' آفاق نے اپنے تئیں بڑا بہترین مشورہ دیا تھا مگر مالا کو ایسے بھیانک مشورے کی ضرورت نہیں تھی سو وہ فوراً ہی خوفزدہ سی ہوگئی۔

''نہیں...... نہیں، میں پھر کال کر لوں گی، تم یاد سے سوزن کو بتا دینا۔'' مالا نے عجلت کے عالم میں ہکلاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا۔ تب آفاق کو اچانک کچھ ایسی بات یاد آئی تھی کہ وہ ایک دم بول اٹھا۔

''مالا خاتون! میرا ایک کام تو کر دینا......'' آفاق نے جس تیز رفتاری سے اسے پکارا تھا، وہ فون کان سے ہٹاتے ہٹاتے رک گئی۔

''کون سا کام......؟'' مالا ٹھٹک گئی تھی۔

''ایکچوئیلی! کام یہ ہے کہ تمہیں میری سفارش کرنا ہوگی۔'' اب وہ بڑے لاڈ سے ٹھنک کر کہہ رہا تھا۔ مالا کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا گزرا۔ تھا تو وہ عیسیٰ کا ہم عمر مگر حرکتیں...... مالا کا دماغ بری طرح جھنجنا اٹھا۔ ایک دم اسے آفاق پر خوب تپ چڑھی تھی۔

''کیسی سفارش......؟'' اسے سخت قسم کا غصہ آ گیا تھا...... حالانکہ وہ اتنا غصہ کرتی نہیں تھی، دوسری طرف اس کے غصے کی ہرگز پروا نہیں کی گئی تھی بلکہ آفاق نے تو اس کے غصے کی طرف دھیان بھی نہیں دیا تھا...... اسے بس اپنی ہانکے جانے کی عادت تھی۔

''وہ علی عیسیٰ سے کہنا، مجھے پھر سے اپنا پرسنل سیکرٹری رکھ لے، اللہ کی قسم......! اب کہ ذرا بھی گڑبڑ نہیں کروں گا، فر فر لینگویج بولوں گا، عیسیٰ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' وہ عادتاً ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا تھا...... تب مالا نے بھنا کر کہا۔

''میں عیسیٰ کے آفیشل افیئرز میں انٹرفیئر نہیں کرتی......'' مالا جس طرح چبا، چبا کر بولی تھی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس کی ناگواری کو سمجھ جاتا مگر بھلا وہ اس کی ناگواری کو سمجھتا ہی کیوں......؟ اسے کون سا کسی کی بھی بات کبھی بری لگی تھی۔ کوئی اسے گالیاں ہی کیوں نہ دے جاتا، وہ مسکرا کر گالیاں دینے والے کو تھینکس ضرور بولتا تھا اگر کوئی اسے بے ضمیر یا بے حس کہہ کر غیرت دلانے کی کوشش کرتا تو آفاق صاحب آفاقی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بڑے رسان سے فرماتے۔

''میں کسی بداخلاق کی وجہ سے اپنا اخلاق نہیں گرا سکتا۔'' اپنی انہی خوبیوں کی بنا پر وہ حسیب صاحب کا دُلارا تھا مگر عیسیٰ کی آنکھ کا تارہ نہیں بن سکا تھا۔ اس وقت بھی وہ مالا کی ناگواری پر غور کیے بغیر چہک رہا تھا۔

''میں نے تو تم سے اس لیے کہا تھا کہ عیسیٰ تمہاری بات کبھی ٹال نہیں سکتا، خیر، مجھے سفارش کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، حسیب انکل ہیں ناں...... ویسے بھی مجھے اپنی صلاحیتوں پہ ناز ہے۔'' اس کی طرف سے ٹکا سا جواب ملنے پر اب وہ لمبی، لمبی چھوڑ رہا تھا۔ مالا نے جھنجلا کر کھٹاک سے فون بند کر دیا...... اس کا پہلے سے تپا دماغ کچھ اور تپ گیا تھا جس کام کے لیے فون کیا تھا، وہ بھی نہ ہو سکا۔ نقلی نگینوں والا بریسلیٹ ہنوز اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ مالا کو اتنا غصہ آیا کہ بریسلیٹ توڑ مروڑ کر ڈسٹ بن میں جا پھینکا...... ایسے بے نام تحائف اور تعلقات کی

جگہ کوڑے دان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ وہ اس الجھن کو اپنے تئیں ڈسٹ بن کے حوالے کرچکی تھی مگر الجھنیں یوں اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دینے سے ختم ہوجاتیں تو آج ہر کوئی اپنی زندگی میں مطمئن اور شاد ہوتا۔

☆☆☆

اس کی زندگی میں آنے والی یہ صبح بھی عجیب تھی۔ اور ہوتا یوں تھا کہ جو صبح بھی عجیب ہوتی، عجیب طرح سے طلوع ہوتی، وہ مالا کے...پورے دن کو عجیب بنادیتی تھی۔

تو پھر یہ صبح بھی عجیب طرح سے طلوع ہوئی، ہُوا کچھ اس طرح کہ پہلے کیا حسین، چمکیلی سنہری دھوپ نکلی، محض آدھے گھنٹے کے لیے، عیسیٰ نے گلاس ونڈو کے جالی دار نائیلون کے پردے کو ہٹا کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے کرسیاں اٹھائے لان میں جا پہنچا۔ کچھ دیر بعد چاچو بھی عیسیٰ کے بلاوے پر بھاگے، بھاگے چلے گئے تھے مگر یوں ہوا کہ لمحوں میں آسمان نے رنگ بدل لیا، سورج نے بدلیوں میں چہرہ چھپایا اور اوپر سے شفاف چمکیلے موتی برسنے لگے۔

ٹپ ٹپ بارش برستی جارہی تھی اور عیسیٰ ایک مرتبہ پھر کرسیاں اٹھائے برآمدے کی طرف بھاگا تھا۔ چاچو تو بارش کی ہولنا کی ملاحظہ کرکے بدمزہ سے ہوکر اپنے بیڈ روم میں گھس گئے تھے جبکہ عیسیٰ وہیں برآمدے میں اسٹول پر براجمان برستی بارش کا نظارہ کرنے لگا تھا۔ اسے ایسی فرصت کبھی کبھی نصیب ہوتی تھی اور آج کا خوش قسمت ترین دن چھٹی کا تھا۔ سو عیسیٰ کا دل تھا وہ چھٹی کو خوب انجوائے کرے۔

مالا کچن میں ناشتا بنارہی تھی اس کا رخ بھی برآمدے کی طرف تھا، وہ اِک نظر عیسیٰ کو دیکھ کر دوبارہ کچن میں آگئی تھی۔ مالا اسی سمت کھڑی تھی جہاں سے علی عیسیٰ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑے ہی انہماک سے بارش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی تھی، گویا وہ برستی بارش کو دیکھتا، خوب انجوائے کررہا تھا۔ اس دوران وقتاً فوقتاً وہ کچن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا مگر بارش دیکھنے میں اس کی دلچسپی کم نہیں ہورہی تھی پھر وہ اٹھا تھا اور اندر سے ڈائری اور قلم اٹھا لایا۔ یقیناً کچھ لکھنے کا موڈ بن رہا تھا مگر وہ لکھنے کی کوشش کیے بغیر کوئی نظم دھیرے، دھیرے گنگنانے لگا تھا۔ ڈائری میں قلم رکھ کر اس نے ایک طرف اچھال دی تھی۔ مالا بہت غور سے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تو ویسے بھی علی عیسیٰ کو سوچنا اور پہروں چپکے، چپکے دیکھتے رہنا پسند تھا اور فی الوقت وہ بڑی توجہ اور فراغت سے عیسیٰ کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کی ساری توجہ عیسیٰ کے ہلتے لبوں اور خوب صورت آنکھوں کی طرف تھی۔ وہ جانتی تھی' عیسیٰ کو بہت سارے شاعروں کا کلام زبانی یاد ہے۔ عیسیٰ کو شاعری سے دلچسپی وراثت میں ملی تھی، چاچو کو بھی لگ بھگ چھ سات سو اشعار تو زبانی یاد تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا چاچو نے اپنا شوق عیسیٰ میں منتقل کردیا ہے۔ وہ خود بھی اکثر کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے تھے اور اس وقت عیسیٰ بھی کچھ گنگنا رہا تھا۔ اس نے اوٹ سے جھانکا تو اسے عیسیٰ پہلے کی طرح انہماک سے بارش دیکھتا نظر آیا تھا اور اس کی آواز گویا مالا کے دل میں اترتی جارہی تھی۔

”دل سوچ کا پنجرہ ہے
اِک بار ہی کُھلتا ہے
دل پیار کا سودا ہے
اِک بار ہی ملتا ہے“

آخری شعر گنگناتے ہوئے وہ خود بھی بڑی بے خودی کیفیت میں تھا۔

”دل درد کا ٹکڑا ہے
بے چین سا رہتا ہے“

عیسیٰ کی آواز نے پورے ماحول پر سحر طاری کر رکھا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو گویا طلسم پھر سے ٹوٹ

گیا۔ وہ گویا اس کے لفظوں کی موسیقی اور لہروں کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ عیسیٰ کی آواز وائلن کے سُروں جیسی تھی۔ دلوں کو پگھلا دینے والی، انتہائی پُرلطف احساس جگاتی محبت کو ابھارتی، جذبات کو گرماتی اور دلوں کو بے چین کرتی۔

”دل سوچ کا پنجرہ ہے
ایک بار ہی کھلتا ہے“

اب وہ بے خیالی میں یہی دو لائنیں گنگنا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھا، اسے مالا کی موجودگی اور نگاہ کی تپش نے نہیں چونکایا تھا۔ اسے سانسوں کی سرسراہٹ اور پیروں کی آہٹ نے بھی نہیں چونکایا تھا، وہ آنکھیں بارش کے قطروں پر جمائے نظم کے خالق سے غائبانہ مخاطب تھا۔

”اے لکھنے والے، تم نے ٹھیک کہا۔ دل کی اتنی اچھی تشریح ہو ہی نہیں سکتی، ہاں دل سوچ کا پنجرہ ہے، ایک بار ہی کھلتا ہے، بار بار نہیں کھلتا اور جس کے لیے ایک دفعہ کھل جائے پھر اسے اپنے اندر محصور کرلیتا ہے۔ اپنی دیواروں میں قید کرلیتا ہے پھر اسے ”مقیدِ دل“ کہتے ہیں۔“ عیسیٰ زیرِ لب بڑبڑایا تھا پھر گردن موڑے بغیر گویا مالا کی موجودگی محسوس کرکے بولا۔

”چوری چھپے کسی کو تاڑنا اچھی بات نہیں ہوتی۔“ اس کی نگاہیں اب بھی بارش کے شفاف قطروں پر جمی تھیں۔ مالا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکلنے والی تھی، جسے دونوں ہاتھ منہ پر جما کر اس نے بہ مشکل روکا تھا۔

”اللہ......! یہ دونوں بہن بھائی تو کمال کے ہیں...... جادوگر ناں ہوں تو...... کیسے پتا چل گیا، میں چپکے، چپکے تاڑ رہی ہوں انہیں......“ مالا کی سانسیں اس اچانک حملے پر اتھل پتھل ہوگئی تھیں۔ وہ چونکہ اپنے دھیان میں کھڑی تھی اور اپنے تئیں اس انداز سے چھپی تھی کہ عیسیٰ کی نظر میں نہ آسکے مگر یہ علی عیسیٰ بھی ناں......

”پردے میں رہنے والے، ذرا پردہ تو ہٹا
چھپ کر تاڑنے والے ذرا سامنے تو آ“

بِنا گردن موڑے، وہ سامنے رکھی میز ہاتھوں سے بجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ مالا سخت جھینپ گئی تھی۔ اب اوٹ میں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، وہ جھینپی، جھینپی سی سامنے آگئی تھی۔ عیسیٰ نے نگاہ جما کر اسے دیکھا تھا، وہ خاصی گھبرائی، گھبرائی نظر آرہی تھی۔ عیسیٰ نے آنکھیں میچ کر سرتاپا اسے دیکھا تھا، اس کی نگاہیں مالا کے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔ اس کے ہاتھوں پر میدے کی باقیات لگی تھیں۔ وہ کچن میں کام کررہی تھی اور عیسیٰ کی آواز سن کر شاید باہر آگئی تھی۔ عیسیٰ کے ہونٹ نیم وا ہوئے...... وہ دھیمے، دھیمے مسکرا رہا تھا اور مالا اپنی خجالت چھپاتی اس پر بگڑ رہی تھی۔

”جانے کون سی دوربین سر کے پیچھے فٹ کررکھی ہے۔“ مالا روٹھے، روٹھے انداز میں بولی تھی۔ اس کا پھولا منہ عیسیٰ کو ہنسنے پر مجبور کرگیا تھا۔

”آں...... ہاں، دوربین نہیں......“ عیسیٰ نے فوراً وضاحت کی...... ”مالے ڈیئر! یہ انتہائی تیز رفتار حواسِ ظاہری ہیں...... شامہ، باصرہ، ذائقہ، لامسہ اور سامعہ...... کچھ لوگوں میں ان کی رفتار ایک ہزار فی سیکنڈ سے بھی بڑھ کے ہوتی ہے، وہ لمحے کے آخری حصے سے بھی پہلے سونگھتے، دیکھتے، چھوتے یا سن لیتے ہیں...... میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوں، مجھے تو تمہارے وجود کی یہ بھینی، بھینی خوشبو چونکا دیتی ہے۔ تم میری پسندیدہ خوشبو لگاتی ہو، مجھے تمہارے آنے سے پہلے اس اعلان کرتی خوشبو سے پتا چل جاتا ہے۔“ عیسیٰ نے تفصیلاً وضاحت کردی تھی، گویا اسے کوئی جادوگر یا غیر معمولی ذہن نہ سمجھا جائے۔ مالا نے بھی گہری سانس کھینچ کر مسکرانا شروع کردیا تھا...... وہ ایک سادہ لڑکا تھا، جھوٹ اور غلط بیانی اسے پسند نہیں تھی۔

"اُوہ...... تو یہ بات تھی۔" وہ ہاتھوں سے میدہ کھرچتی عیسٰی کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ عیسٰی نے عادتاً اسے نیچے بیٹھنے سے ٹوکا تھا مگر وہ عیسٰی کی یہ بات نہیں مانتی تھی، اسے عیسٰی کے سامنے فرش یا کارپٹ پر بیٹھنا بہت پسند تھا۔

"ویسے یہ پرفیوم مجھے چاچو نے لے کر دیا تھا۔" مالا اپنے دوپٹے کو سونگھتی مسکرائی تھی۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور لمبی سی قمیص پہن رکھی تھی، عیسٰی کو مالا کے ایسے تمام ڈریسز پسند تھے۔ وہ لمبی فراک کو بھی پسند کرتا تھا۔ مالا نے اپنی وارڈ روب کو رنگ، رنگ کے کپڑوں سے بھر رکھا تھا۔ ان میں زیادہ ڈریسز وہ تھے جنہیں اس کی ماں نے پاکستان سے بھیجا تھا۔ آہ، پیاری ماں، اتنے فاصلوں کے باوجود بھی دوری کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ ماں ہی تو تھی جس نے دل سے دل تک کے درمیان اپنی محبت سے ربط قائم کر رکھا تھا۔ وہ دور دیس میں موجود اپنوں کی یاد میں پور، پور بھیگنے لگی تھی مگر عیسٰی نے اس کی یہ کوشش ناکام کردی۔ وہ مالا کو اپنے علاوہ کچھ اور سوچنے نہیں دیتا تھا۔

"میں جانتا ہوں، پاپا میری پسند سے آگاہ ہیں۔" عیسٰی نے بے نیازی سے کہا تھا، برستی بوندوں سے اس کا دھیان ہٹ گیا تھا، اب وہ مالا کی طرف متوجہ تھا اور اسی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"اور میں......؟" مالا نے ٹھنک کر کہا۔

"تم ابھی وہاں تک نہیں پہنچی......" عیسٰی شریر ہوا۔

"کہاں تک......؟" وہ بھینچی بھینچی آواز میں چیخی۔

"جہاں سے محبت ختم ہوتی ہے اور عشق شروع ہوتا ہے۔" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مالا کو ڈھیر سارا غصہ آگیا۔

"اچھا تو میں اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچی......؟" مالا نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ عیسٰی نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا تھا۔

"وہاں تک نہیں پہنچیں...... تاہم قریب، قریب ضرور ہو۔" مالا کی ناراضی نے اسے کھل کر قہقہہ لگانے پر مجبور کردیا تھا۔ مالا کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ خفگی مصنوعی تھی مگر عیسٰی کی جان پر بن آئی۔ اس نے مسکراہٹ سمیٹ کر اٹھتی ہوئی مالا کو بے ساختہ روکا تھا مگر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا تم نے سوزن کا شکریہ ادا کردیا؟" کچھ دیر بعد عیسٰی اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے الفاظ اور لہجہ نارمل تھا پھر بھی مالا کا دل بری طرح سے کانپ اٹھا۔ پھر وہ ہی پارسل، سلپ اور پھر بریسلیٹ...... اس کا دھیان اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھی ڈسٹ بن تک گیا تھا، جس کے اندر وہ تڑا مڑا بریسلیٹ رکھا تھا۔ اور ٹکڑے، ٹکڑے ہوئی سلپ، عیسٰی کے الفاظ ایسے نہیں تھے جو مالا کو پریشان کردیتے مگر وہ پھر بھی پریشان ہوچکی تھی۔

"میری اس سے بات نہیں ہوسکی۔" وہ سچ، جھوٹ بولنے کے درمیان معلق تھی۔ پھر اچانک مالا نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جھوٹ بولتی تب بھی بے چین رہتی...... اگر وہ کہہ دیتی، ہاں بات ہوئی ہے، میں نے اس کا شکریہ بھی ادا کردیا تو یہ کہنا مشکل نہیں تھا پھر اگر عیسٰی سوزن سے خود پوچھ لیتا اور سوزن نے گفٹ ہی نہیں بھیجا ہوتا تب مالا کو منہ چھپانے کی کہیں جگہ نہیں ملتی، سو اس نے سچ بول کر خود کو بھی مطمئن کرلیا تھا مگر کبھی، کبھی بلاوجہ ہی اطمینان رخصت ہوجاتا ہے، شاید عیسٰی فی الوقت مطمئن ہوگیا تھا تبھی اس نے مزید کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا۔ خاموشی سے ناشتا کرتا رہا، مالا چپکے سے کھسک گئی تھی پھر چاچو کو بلا لائی، وہ صبح، صبح ناشتا نہیں کرتے تھے، کبھی چائے پیتے، کبھی دودھ کبھی جوس کا ایک گلاس پی لیتے تھے، تاہم اکثر موڈ ہوتا تو ناشتے کی میز پر آجاتے...... چاچو کا میز تک آنا ہی ماحول کو خوشگوار

کردیتا تھا اسی لیے مالا فضا کو کثیف محسوس کرکے چاچو کو بلا لائی تھی......اور چاچو کے آنے کی دیر تھی، عیسٰی کا موڈ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ چاچو کو دیکھ کر وہ بے ساختہ چہکا تھا۔

"آجائیں...... آج پراٹھے نہیں ہیں، قیمہ بھرے سلائس اور انڈوں کا حلوا......آپ کو اپنا لاہور یاد آگیا ہے ناں......" چاچو سربراہی کرسی سنبھال چکے تھے، یہ کرسی انہی کے لیے مخصوص تھی اور اب عیسٰی کی چہکتی آواز کے موجب کو دیکھ رہے تھے، یعنی ناشتا آج اسے پسند آیا تھا اور وہ خوب رغبت سے کھا رہا تھا مگر تعریف اب بھی نہیں کی تھی۔ چاچو نے گہرا سا ہنکارا ابھرا۔

"اتنا لذیذ حلوا کھا کر بھی تمہیں تعریف کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔" ان کی پہلی گھرکی پر ہی عیسٰی اسٹارٹ ہوگیا تھا۔ مالا کو لمحے بھر کے لیے وہ آفاق جیسا لگا تھا، تیز تیز بولتے ہوئے سانس لینے کے لیے بھی رک نہیں رہا تھا...... مگر وہ آفاق جیسا کیوں ہونے لگا......اپنی فضول سوچ پر اسے جی بھر کے تاؤ آگیا تھا۔ بڑے غلط ٹائم پر آفاق کی طرف دھیان گیا تھا سو اسے غصہ کیوں نہیں آتا؟

"میں نے زندگی میں ایسا لذیذ حلوا نہیں کھایا بلکہ میں نے زندگی میں حلوا کبھی کھایا ہی نہیں...... پر اس لذیذ ڈش کو بنانے والے ایکسپرٹ ہاتھوں نے کمال کردیا...... میں دوسری پلیٹ فل بھر کے معدے میں اتار چکا ہوں، ابھی سلائس کھانے باقی ہیں، کاش کہ میں اتنی اتھارٹی رکھتا اور پورے من ہائیم کے فوڈ پوائنٹس بند کروادیتا پھر میرے گھر کے سامنے ایک ہجوم کھڑا ہوتا اور میں فرم چلانے کے بجائے ہوٹل بنانے کا پلان کرلیتا...... ایسی بہترین کک ہم دونوں باپ، بیٹے کو کہیں نہ ملتی۔" وہ مزے سے بولتا ہوا کبھی مالا کو اور کبھی چاچو کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے انڈوں کا تھوڑا اور حلوا اپنی پلیٹ میں ڈالا تھا۔ مالا کی گویا پوری محنت وصول ہوگئی تھی جبکہ چاچو، عیسٰی کی جانے کس بات پر خفا ہونے کا موڈ بنا چکے تھے۔

"تم نے میری بیٹی کو بیکر اور خانساماں بنا دیا...... خود تم کہاں کے ڈیوک ہو۔" چاچو نے لڑائی کا باقاعدہ آغاز کردیا تھا، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ عیسٰی خاموش رہ جاتا۔ مالا جب تک چاچو کے لیے ابلے چاول اور مسور کی ...خوشبودار دال کا باؤل بھر کے لائی تب تک جھڑپ نے ماحول کو خاصا گرم کردیا تھا۔

"میں نے کب کہا، میں کہیں کا ڈیوک ہوں۔" عیسٰی بے ساختہ چلایا۔

"ڈیوک تمہارے جیسے ہوتے بھی نہیں۔" چاچو نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"تو پھر آپ جیسے ہوتے ہوں گے؟" وہ انہیں تاؤ دلا کر بولا تھا۔

"آف کورس......!" چاچو نے مصنوعی کالر کھڑے کیے تھے۔ اب وہ دال چاول کھاتے ہوئے ہر، ہر اسپون کو بھرنے کے ساتھ مالا کی تعریف کیے جارہے تھے۔ اور ان کا انداز مالا کا سیروں خون بڑھانے کے ساتھ ساتھ اسے جھینپنے پر بھی مجبور کررہا تھا۔ کھانے کے دوران نوک جھوک جاری تھی جبھی عیسٰی اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے کہیں ضروری فون کرنا تھا وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر فون تک آگیا تھا۔ اسے اچانک ایک فون کال کا خیال آیا تھا۔ سیل کمرے میں رکھا تھا سو وہ لینڈ لائن تک آگیا۔ ایک آفیشل کال کرنے کے بعد اس نے سوچا کافی دن سے گروسی کو کال نہیں کی۔ بس یہی سوچ کر وہ ڈائلڈ نمبر دیکھ رہا تھا آخری کال گروسی کے نمبر پر کی گئی تھی، کال کا دورانیہ پچیس سے تیس منٹ تھا۔ عیسٰی قدرے حیران رہ گیا۔ اس کی پچھلے دو ہفتے سے گروسی یا نانتے سے بات نہیں ہوسکی تھی گھر سے آخری کال مالا نے کی تھی، عیسٰی کو کال کرنے کے بعد......یعنی سوزن کا نمبر عیسٰی سے لے کر پھر اسے کال کی گئی تھی مگر بقول مالا

کے سوزن سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ تانتے اور گروسی انگریزی اور اردو کی شُدھ بدھ نہیں رکھتی تھیں۔ گروسی اردو تھوڑی بہت سمجھ لیتی تھیں مگر بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پھر اگر سوزن سے بھی بات نہیں ہوسکی تھی تو مالا نے گروسی کے گھر پچیس، تیس منٹ تک کس سے بات کی تھی؟ وہ شکی مزاج نہیں تھا، نہ وہ مالا پر شک کرسکتا تھا مگر تجسس تو عین انسانی فطرت ہے، اس سے مبّرا تو کوئی بھی نہیں...... تو بس اسی تجسس کے تحت اس نے گروسی سے پوچھ لیا تھا تب انہوں نے تانتے سے پوچھ کر بتایا تھا کہ کل مالا کی کال آئی تھی، وہ سوزن سے بات کرنا چاہتی تھی مگر سوزن اس وقت گھر پر نہیں تھی تب آفاق آیا ہوا تھا تو تانتے نے آفاق کو فون پکڑا دیا۔ پھر آفاق نے جانے کتنی دیر بات کی ہوگی۔ گروسی نے سادگی سے سب جواب دے دیے۔ عیسیٰ نے فون بند کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کیں پھر فون بھی رکھ دیا...... مگر اس کے ذہن میں کوئی بات چبھن دینے لگی تھی۔

''سوزن سے بات نہیں ہوسکی مگر آفاق سے اتفاقاً ہوگئی...... لیکن مالا نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ یہ بات کیوں چھپائی؟ کیا یہ بات چھپانے والی تھی؟'' اس کا ذہن بہت گرم سوال اگل رہا تھا۔

☆☆☆

الجھن چھوٹی ہو یا بڑی...... ہوتی تو الجھن ہے...... اگر ذہن میں الجھن کی گرہ لگ جائے تو آسانی سے کھلتی بھی نہیں ہے...... وہ بلاوجہ مشکوک نہیں ہوتا تھا مگر جہاں گرہ لگ گئی تو پھر آسانی سے کھلتی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا الجھ رہا تھا کہ اسے پاپا کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، وہ اسے بلا رہے تھے مگر عیسیٰ نے گویا سنا ہی نہیں تھا۔ وہ benz کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ ایک دم گھر میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ وہ بلاوجہ گھر سے نہیں نکلا تھا، اسے چھوٹے موٹے ایک دو کام نمٹانے تھے جو اس نے چھٹی والے روز تک روکے ہوئے تھے۔ ہارڈ ویئر اسٹور سے کچھ سامان لے کر اس نے گاڑی کی ڈگی میں رکھا تھا پھر غیر ارادی طور پر اسپورٹس کلب کی طرف آ گیا...... وہ جب بھی کچھ ڈپریسڈ ہوتا تھا تو اسپورٹس کلب کی طرف آ جاتا تھا۔ یہاں خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے کھیل تھے جس میں پیراکی کرنا بھی تھا۔ لہروں پر تیرنا، لہروں کو چیرنا، پانی میں گم ہونا، ڈوبنا، ابھرنا، گویا چند لمحوں کے لیے دنیا کی ہر سوچ سے تعلق ٹوٹ جاتا تھا وہ آدھا گھنٹا اسی شغل میں مصروف رہا تھا مگر پھر بھی فریش ہونے کے بجائے اس کی طبیعت اور بھی اوب گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹینس کلب کی طرف آ گیا...... مگر ٹینس کورٹ میں بھی اس کے لیے دلچسپی اور کشش نہیں تھی جلد ہی اس پر بیزاریت طاری ہوگئی تھی اور آخری پناہ گاہ کی طرف اسے آنا ہی پڑا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، دنیا کے کسی کونے میں بھی تمہارے لیے ویسا سکون نہیں ہوسکتا جیسا تم اپنے گھر کے کسی بھی گوشے میں محسوس کرسکتے ہو، وہ اپنی الجھی سوچوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ الجھن گھر سے باہر کبھی نہ ختم ہوسکتی ہے نہ حل ہوسکتی ہے، الجھنیں وہیں پہ ختم ہوتی ہیں جہاں سے ان کی شروعات ہوتی ہے، اب اسے اسی مقولے پر عمل کرنا تھا جو بات کسی سے براہِ راست کرلی جائے، اس خاموشی اور گریز سے بہتر ہے جو ایک چپ کی وجہ سے دماغ کو تپاتی رہے۔ وہ باہر اسی لیے چلا گیا تھا کہ مزید اس چیز پہ سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر جب الجھی سوچوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا تو واپس پلٹ آیا۔ اس نے مالا سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ اپنی الجھن کو نظر انداز نہیں کرسکا تھا پھر بہتر یہی تھا کہ وہ مالا سے صاف بات کرلیتا کیا خبر، اسے بتانا یاد ہی نہیں رہا ہو...... یا پھر مالا کے نزدیک اس بات کی کوئی وقعت ہی نہیں ہو؟ وہ حقیقت میں

شکی مزاج نہیں تھا مگر الجھنیں اکثر الجھا لیتی ہیں...... پھر جب وہ چار گھنٹے بعد گھر واپس آیا تو مالا بے قراری اسے برآمدے میں کھڑی نظر آ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی نے عیسیٰ کو قدرے نادم کردیا تھا۔ وہ مالا کو بتائے بغیر جو نکل گیا تھا پھر وہ پریشان کیوں نہ ہوتی......؟ اس صورت میں بھی کہ سیل فون گھر میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ عیسیٰ کو ہلکی سی ندامت ہوئی۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ عیسیٰ کو دیکھ کر خود پہ قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''کہاں چلے گئے تھے بنا بتائے؟'' اس نے سسکیوں کے درمیان روتے ہوئے کہا تھا۔ عیسیٰ کے دل کو کچھ ہوا، اس کے اندر بے قراری بڑھ گئی تھی، اس نے بہ مشکل مالا کو چپ کروایا تھا۔ حالانکہ ابھی وہ ڈھیر سارا رونا چاہتی تھی عیسیٰ کے اجنبی رویے پر اسے بہت سی باتیں بھی سنانا چاہتی تھی مگر عیسیٰ کے نرم پھولوں سے لہجے اور الفاظ کو سن کر ساری ناراضی اور غصہ بھلا گئی تھی۔ محبت میں ایسی ہی وسعت ہوتی ہے اور محبت میں ایسی ہی طاقت ہوتی ہے، مالا اس کے لفظوں سے نرم پڑ گئی تھی تو پھر عیسیٰ بھی اس کے آنسوؤں سے پگھل گیا تھا۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کسی کو اتنا مت چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ کرسکو...... مگر مجھے لگتا ہے، میں تمہاری چاہت میں بہت آگے بڑھ گیا ہوں، اتنا کہ پلٹنے کا سوال نہیں...... اگر تم مجھے کبھی دکھائی نہیں دو تو میرا کیا حال ہوگا؟'' عیسیٰ کے محبوبانہ الفاظ اور لہجے نے کچھ دیر پہلے والی کثافت کے اثر کو زائل کردیا تھا۔ وہ رونا بھول گئی تھی۔ اب وہ مسکرا رہی تھی مگر لفظ جدائی نے پھر اس کی ہنسی کا رس نچوڑ لیا تھا۔

''جدائی کی بات کیوں کرتے ہو؟ رسوائی کی بات کیوں کرتے ہو؟'' مالا کی آنکھیں پھر سے لبالب بھر گئیں۔

''آں...... ہاں...... اللہ نہ کرے، جو تمہیں کبھی رسوا کروں، پھر خود سے جدا کروں......'' عیسیٰ نے مالا کو اپنے گارڈن سے ایک کلی توڑ کر دی تھی۔ مالا روتے، روتے ہنس پڑی۔ عیسیٰ نے بارش میں دھوپ نکلتی دیکھی تھی پھر دھوپ میں بارش برستی دیکھی تھی۔ دونوں منظر اس کی نگاہ کو مبہوت کر گئے تھے۔ وہ گویا مسحور سا کھڑا تھا اور اس سحر کو مالا کی آواز نے توڑا تھا۔

''آپ کو کیا ہوا تھا......؟ ایسے اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟ بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔'' مالا کا شکوہ عیسیٰ کو کچھ وقت پہلے کی ذہنی کشمکش میں دھکیل گیا تھا۔ اسے تھوڑی دیر پہلے کی اذیت یاد آ گئی...... وہ مالا سے کچھ پوچھنے اور نہ پوچھنے کے درمیان معلق ہوگیا تھا اگر اس نے انکار کردیا تو......؟ اگر جھوٹ بول دیا تو...... چاہے مصلحتاً ہی سہی۔ پھر میرے اندر وہ ٹوٹ جائے گا جو کبھی ٹوٹنا نہیں چاہیے۔'' وہ کسی تکلیف دہ ساعت کے اثر میں تھا...... وہ مالا کو بھلا کیا بتاتا......؟ وہ مالا سے کیسے پوچھ لیتا؟ اگرچہ بات بڑی نہیں تھی۔ اگر مالا خود سے شیئر کردیتی یا ہلکا سا ذکر بھی کردیتی تب اس کے اندر ایسی بے چینی نہ اترتی مگر اب کیفیات مختلف تھیں، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔

''آپ کچھ بول نہیں رہے، آپ ٹھیک تو ہیں ناں......'' مالا کی آنکھوں میں تفکر اتر آیا تھا۔ وہ کس قدر گھبرا رہی تھی، شاید عیسیٰ کو اس کی گھبراہٹ کا اندازہ نہیں تھا مگر یہ مالا کی خام خیالی تھی، عیسیٰ اس کی بے چینی کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

''مجھے کچھ کام تھا اسی لیے اچانک چلا گیا۔'' عیسیٰ نے بات بنا کر کہا۔ اگرچہ بات بنانا مشکل تھا مگر وہ سچ ہی تو بول رہا تھا۔

''بتا کر تو جاتے ناں......'' وہ خفگی سے بولی۔

''آئی ایم سوری......'' عیسیٰ نے مسکینی صورت بنالی تھی تب مالا نے بڑے خفا، خفا لہجے میں کہا تھا۔

''مجھے انگریزی کے اس خبیث لفظ ''سوری''

سے بہت سخت نفرت ہے۔'' وہ دھپ، دھپ کرتی اندر چلی آئی تھی، عیسیٰ بھی اس کے پیچھے چلا آیا... وہ سوچ رہا تھا کہ مالا سے خفا ہونا مشکل ہے، وہ اس لڑکی سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتا تھا۔

''میں جرمن میں سوری کرلیتا ہوں۔'' عیسیٰ نے فرمانبرداری کے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے، تب مالا نے گویا ہاتھ باندھ لیے۔

''آپ مجھے اپنی گچ پچ سے تو محفوظ ہی رکھیں......'' وہ تپ کر بولی تھی۔

''تو پھر کیا کروں......؟'' عیسیٰ حقیقت میں سوچنے لگا تھا، مالا کی خفگی کتنی جان لیوا تھی اور اس کے آنسو دیکھنا مشکل ترین کام تھا۔ وہ خود سے عہد کررہا تھا کہ اب کبھی مالا کو نہیں رُلائے گا۔

''کچھ نہیں......'' مالا بے نیازی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''لغت میں اس کے کیا معنی ہیں؟'' وہ ہونق پن سے بولا تھا پھر مالا کو بے ساختہ ہنستے دیکھ کر جھینپ گیا۔

''تم بھی ناں......'' اسے ہنسی آنے لگی تھی کیونکہ مالا بھی ہنس رہی تھی۔ اسی ہنسنے مسکرانے کے چکر میں عیسیٰ کو پھر وہی فون کال یاد آگئی تھی۔ لمحہ بھر پہلے کھلنے والی گرہ پھر سے بندھ گئی۔ اس نے مالا کو چائے بنانے کے لیے بھیج دیا تھا...... جب تک وہ واپس آئی، عیسیٰ لفظوں کو ترتیب دے چکا تھا...... وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی پھر عیسیٰ نے مالا سے ہلکی پھلکی بے شمار باتیں کی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی، اس کے بچپن کی، گھر والوں کی، تایا، تائی، بندیا اور اس کے بھائیوں کی بے شمار باتوں کے دوران اسے پتا چلا تھا کہ ذیشان اپنی کزن عینی میں انٹرسٹڈ ہے، ان دونوں بہنوں کو عینی پسند نہیں تھی۔ عینی میں نخرہ اور غرور تھا۔ ان کی ممی یعنی عیسیٰ کی تائی بہت نرم مزاج اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔ اپنے بچوں پر زور زبردستی کی قائل نہیں تھیں۔ عیسیٰ کو اپنی تائی اور کزنز سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ کبھی زندگی میں موقع نہیں ملا تھا کہ وہ ان سے مل سکتا...... اب اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ جلد ہی مالا کو لے کر پاکستان جائے گا۔ وہ اپنے بہن، بھائیوں کے لیے بہت اداس تھی، اگرچہ منہ سے کہتی نہیں تھی پھر بھی عیسیٰ، مالا کی فیلنگز سمجھتا تھا اور عیسیٰ کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ بندیا اور ذی شاہ کو بہت مس کرتی تھی۔ اسے بندیا سے بہت پیار تھا، ان دونوں بہنوں کی بہت دوستی تھی۔ عیسیٰ کو خبر تھی ذیشان تھوڑا اسیلفش تھا یعنی اپنی ذات کے بارے میں سوچنے والا...... ذی شاہ کچھ بے پروا تھا جبکہ زرشام یعنی شامی بہت شرارتی تھا۔ وہ مالا کی زبانی گھر کے ہر فرد کی عادت، مزاج اور شخصیت کے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ ان سب سے ملنے کا خواہشمند تھا، پاپا کی خواہش تھی کہ مون کی شادی کرکے وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے جاتے مگر فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ مون شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہورہی تھی۔

فی الوقت وہ مالا سے اس کے گھر کی ہر چھوٹی' بڑی بات ڈسکس کرنے کے بعد قدرے ریلیکس ہوگیا تھا پھر اسی ریلیکس موڈ میں اس نے بے حد سرسری سے لہجے میں مالا سے اصل بات پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ وہی بات جس نے عیسیٰ کو اندر سے کچھ مضطرب کر رکھا تھا۔ اس کا انداز اتنا سرسری سا تھا کہ مالا ہرگز بھی چونکی نہیں تھی جیسے معمول کی باتیں کرتے ہوئے اچانک کسی کا ذکر چھیڑ لیا جائے بالکل اسی طرح عیسیٰ نے آفاق کی بات چھیڑ لی تھی۔

''تم نے کبھی آفاق سے بات کی؟ یا تمہاری کبھی آفاق سے بات ہوئی؟'' عیسیٰ کا انداز اتنا عام اور نارمل سا تھا کہ مالا ہرگز بھی ٹھٹکی نہیں تھی بلکہ کچھ یاد آنے پر سرسری سے انداز میں بولی تھی۔

''ہاں تو...... جس روز سوزن کو کال کی تھی، فون تب تانتے نے اٹھایا تھا۔ انہیں میری بات سمجھ نہیں آسکتی تھی سو انہوں نے پاس بیٹھے آفاق کو فون پکڑا دیا تھا پھر اس سے کافی بات ہوئی، مجھ سے سفارش کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن سے بھی نکل گیا۔ بے چارہ کافی اچھا ہے اور جاب لیس بھی۔'' آفاق کے ذکر نے مالا کو اس کی درخواست بھی یاد کروادی تھی بھلے وقت میں عیسیٰ نے بھی آفاق کا ذکر چھیڑا تھا۔ وہ اس سے آفاق کی جاب کے متعلق کہہ سکتی تھی، اگرچہ مالا کو انسانوں کی پہچان تو نہیں تھی مگر آفاق اسے بہت مخلص، سادہ اور ہمدرد سا لگا تھا پھر عیسیٰ کی تو اتنی تعریف بھی کرتا تھا اور مالا کو ہر وہ بندہ پسند تھا جو عیسیٰ کی تعریف کرتا۔

''آں...... تو اس نے تم سے کہا، جاب کے لیے سفارش کرو؟'' عیسیٰ ایک دم حیران ہوگیا تھا، وہ کچھ دیر پہلے کی الجھن کیا رفع ہوئی تھی اس کی ساری چونچالی لوٹ آئی تو اس کا اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ مالا اسے آفاق کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی۔ یہ اتنی اہم بات بھی نہیں تھی کہ جسے مالا یاد رکھتی...... عیسیٰ کو مالا اس لمحے بہت پیاری لگی تھی، انتہائی سادہ، معصوم اور تھوڑی، تھوڑی بھلکو......

''جی ہاں اس نے کہا...... آپ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے سو میں جاب کے لیے آپ سے کہوں......'' مالا نے بڑے مان بھرے لہجے میں کہا۔ عیسیٰ کو اس کا مان توڑنا اچھا نہیں لگا تھا سو کچھ سوچ کر اثبات میں سرہلا گیا۔

''بات تو میں تمہاری کبھی نہیں ٹال سکتا۔ مگر یہ آفاق بطور سیکریٹری میرا ناک میں دم کردیتا ہے۔'' عیسیٰ نے اسے کچھ سابقہ واقعات بھی بتائے تھے جسے سن کر وہ ہنس، ہنس کر دہری ہوتی رہی۔

''وہ پرسنل سیکریٹری کے بجائے بیوی بننے کی کوشش کرتا ہے، تمہیں تو پتا نہیں ہوگا میں نے اپنی قابل ترین سیکریٹری ایلنس کو ہٹا کر اسے پاپا کے کہنے پر جاب دی تھی مگر اس نے مجھے ذلیل وخوار کردیا......''

عیسیٰ ہنستے ہوئے مالا کو بتارہا تھا کہ ڈچ سے نابلد ہونے کی وجہ سے آفاق نے کہاں، کہاں اسے ستایا نہیں تھا۔ تنگ آکر اس نے پاپا سے شکایت کی، پاپا نے شاید مون سے ذکر کیا تھا پھر اسے مون کے انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن مل گیا۔ حالانکہ عیسیٰ چاہتا تھا اُدھر بھیجنے کے بجائے وہ یہاں کے کسی ادارے سے لینگویج کورس کرلے۔ آفاق جلدی سیکھ جانے والوں میں سے تھا اور اب یقیناً اس کا کورس کمپلیٹ ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا تبھی اسے جاب کی پریشانی ہورہی تھی۔ حالانکہ آفاق کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی جب تک عیسیٰ یا پاپا یہاں تھے وہ کسی بھی پاکستانی کو پریشان ہونے نہیں دیتے تھے۔

ان کی گفتگو کا اختتام خوشگوار موڈ پر ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح عیسیٰ نے مالا کو علم وحکمت اور دانائی سے گندھی آخری بات سمجھائی تھی۔ وہ ایسی باتیں عموماً کرتا رہتا تھا مگر گفتگو کے اختتام پر اس دانائی بھری بات کی مالا کو سمجھ نہ آئی تھی۔ عیسیٰ نے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا۔

''ایک بات تمہیں سمجھاؤں گا مالا......! تھوڑی، تھوڑی نادان لگتی ہو، شاید کم عمری کی وجہ سے یا پھر آگہی کے در منکشف نہیں ہوئے تم پر...... ویسے بھی ہم جو کچھ سیکھتے ہیں مکتبِ حیات میں سیکھتے ہیں.... درسگاہیں، اسکول، یونی ورسٹیز ہمیں کچھ نہیں سکھاتیں...... شاید کتابِ حیات تمہیں بہت کچھ سکھا دے مگر اس سے پہلے ایک بات یاد رکھنا، اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو پھر اس کے وجود کا اعتراف بیکار ہوجاتا ہے، امید ہے تم سمجھ گئی ہوگی......'' وہ نرم الفاظ میں بولتا ہلکا پھلکا ہوکر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عیسیٰ نے مالا کو سرزنش کی تھی یا تنبیہ......؟ جو بھی تھا علی عیسیٰ کی بات کو مالا نے اپنی گرہ سے ضرور باندھ لیا تھا۔

اس سے اگلا دن مالا کے لیے خاصا مصروف

تھا، ناشتے کے بعد وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچ گئی تھی۔ آج کی کلاس بہت اہم تھی، اس کی اتالیق نے چھٹی سے منع کیا تھا۔ آج اسے یہ سیکھنا تھا کہ اگر اچانک اسے کیمسٹ یا ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ جائے تو اسے کیا کہہ کر اپنا مسئلہ بتانا ہوگا۔ اہم نکات ہمیشہ کی طرح وہ اپنی ڈائری میں لکھ رہی تھی اگرچہ اس نے زیادہ امید نہیں رکھی تھی کہ وہ زبان سیکھ جائے گی مگر پھر بھی عیسیٰ کے لیے یہ گھونٹ تو بھرنا ہی تھا...... وہ برابر اسے ڈھارس بندھاتا تھا کہ مالا کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے...... کوئی بھی کام مشکل ضرور ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں، بس اسی حوصلے کی بدولت وہ دل بڑا کر کے روزانہ کلاس اٹینڈ کرنے آجاتی تھی۔

جرمن زبان سیکھنے کی اس کلاس میں اس کی سب سے اچھی ہیلو ہائے ہوگئی تھی جبھی اس روز، ہیرا نام کی لڑکی...... کلاس فیلوز کے بارے میں اپنی رائے دے رہی تھی۔ ایک، ایک کر کے سب کی باری آتی گئی اور مالا کے بارے میں وہ کہنے لگی۔

''مالا علی عیسیٰ، این فاخ پوپے'' (سادہ گڑیا)

ہیرا کی دمکتی آنکھوں میں سچائی کے رنگ تھے۔ پوری کلاس نے گویا تائید میں پُر جوش تالیاں بجائی تھیں...... وہ سب لوگ مالا کے لیے ان الفاظ پہ متفق تھے اور بہت خوشی کا اظہار کر رہے تھے، مالا نے ان سب کے دلوں میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ خصوصاً ہیرا کے دل میں مالا کے لیے خوب جگہ نکل آئی تھی۔

وہ ہیرا کے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ اور یوں ہی اچانک ذہن میں کچھ کِلک ہوا تھا۔ اسے بواریا کے چھوٹے سے قصبے میں اس ہاؤس فراؤ کے الفاظ یاد آئے تھے جو اس نے مالا کے لیے کہے تھے۔ ''این فاخ پوپے اور پھر اس رات سوزن، مون سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مالا کے ذہن میں پھر سے جھما کا ہوا تھا۔ سوزن کیا کہہ رہی تھی، کس کے بارے میں کہہ رہی تھی؟ مالا کو سب خبر ہوگئی...... سوزن کے وہ الفاظ مالا کو بھولے نہیں تھے۔ بھول سکتے ہی نہیں تھے۔

''این فاخ......'' (سادہ) وہ مون سے کہہ رہی تھی، وہ مالا کے متعلق ہی بات کر رہی تھی...... وہ مون کو شاید سمجھا رہی تھی کہ مالا بہت سادہ ہے۔ وہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں...... مون اسے لفظوں سے tease (ستایا) نہ کرے...... یقیناً سوزن جانتی تھی کہ مون، ضرور مالا کو ٹیز کرے گی۔ تبھی اسے سمجھا رہی تھی کہ مالا ایسی نہیں...... وہ سادہ اور معصوم ہے، بے خطا ہے، اسے تنگ مت کرو...... مالا کے آنے سے پہلے شاید یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

وہ اسکول کے گراؤنڈ میں چلتی ہوئی مسلسل سوزن کو سوچ رہی تھی۔ سوزن کی محبت کو سوچ رہی تھی، سوزن کے خلوص کو سوچ رہی تھی۔ وہ اپنی دوست نما بہن مون سے مالا کی خاطر الجھ رہی تھی۔ ایک اجنبی اور غیر لڑکی کی خاطر لڑائی کر رہی تھی۔ مون کو سمجھا رہی تھی بلکہ مون کو خفا اور ناراض کر رہی تھی۔ سوزن کتنی اچھی، کتنی نیک، کتنی عظیم تھی۔ اس پل مالا کے دل میں سوزن کے لیے محبت اور خلوص کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ سوزن اس کے سامنے ہوتی تو وہ اس کا منہ چوم لیتی...... سوزن کی محبت نے گویا مالا علی عیسیٰ کو بن داموں خرید لیا تھا۔

☆☆☆

مالا نے عیسیٰ کو بتایا تھا کہ پہلے پہل اسے ہیرا اچھی نہیں لگی تھی، تھوڑی شوخ اور چھچھوری محسوس ہوئی تھی مگر اس سے تفصیلی بات کر کے اس کی سوچ بدل گئی۔ وہ خوش مزاج اور ہنسوڑ لڑکی تھی۔ مالا سے فٹ دوستی گانٹھ لی...... اب مالا کو اپنی سوچ پر ندامت تھی...... خواہ مخواہ وہ ہیرا کو چھچھوری سمجھتی رہی تھی۔ وہ اپنے لینگویج اسکول کے کلاس فیلوز کے بارے میں عیسیٰ سے باتیں کر رہی تھی۔

''ہر انسان کا ایک نہ ایک روپ آپ سے چھپا ہوا ضرور ہوتا ہے ورنہ آپ کسی کے خاص رویے پر چونکتے نہیں...... اب تمہیں پتا چلا ہے کہ ہیرا چھچھوری نہیں بلکہ خوش مزاج اور ہنسوڑ ہے۔ پانی میں اترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، انسان کو سمجھے، پرکھے اور جانے بغیر اس کی شخصیت پہ فتویٰ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔'' وہ علی عیسیٰ تھا، کوئی بھی بات بنا مقصد کیے جانے کو گناہ سمجھتا تھا۔ وہ زندگی کو محتاط انداز میں برتنے والا بندہ تھا۔ اس نے مالا کو ایک مرتبہ بتایا تھا کہ اس نے آج تک کسی سے بداخلاقی نہیں کی، کسی کا برا نہیں چاہا، فحش کلامی نہیں کی...... کلاس فیلو سے ایک حد تک انسیت اور لگاؤ بھی رکھا...... مگر دوستی میں حدود وقیود کا خاص دھیان رکھا تھا۔ نہ اتنا میٹھا ہوا کہ لوگوں نے اسے نگل لیا، نہ اتنا کڑوا ہوا کہ لوگوں نے اسے تھوک دیا...... اس نے باپ سے سیکھے علم، ہنر اور فن کو مٹھی میں قید کر کے زندگی کا سفر شروع کیا تھا...... اسے میانہ روی نے کبھی ڈگمگانے نہیں دیا...... وہ اپنا فن مالا میں منتقل کرنے ...... پر بضد نہیں تھا وہ تو بس اسے زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق سمجھانا چاہتا تھا۔

''مالا ہر مسکراہٹ کے پیچھے خلوص نہیں ہوتا اور نہ ہر خلوص بھری مسکراہٹ کے پیچھے منافقت ہوتی ہے۔ بات معمولی ہے اگر سمجھ لی جائے۔'' وہ اسے بتانا چاہتا تھا، بھروسے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں، وہ بھی ہر کسی پر بھروسا نہیں کیا کرے، عیسیٰ اسے سمجھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی تکون کو گھر، عیسیٰ اور چاچو تک محدود رکھے، اسے وسیع کرے گی تو توڑ...... دے گی اور عیسیٰ کو پورا یقین تھا کہ وہ عنقریب تین کی اس تکون کو وسیع کرنے کی خواہش کرے گی، وہ مون کے متعلق بات کرے گی، مالا اسے اپنی زندگی میں شمولیت کی دعوت دے گی اور حیرت انگیز طور پر مالا نے گفتگو کا رخ ہیرا سے ہٹ کر مون کی طرف موڑ دیا تھا۔ وہ بہت سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میں ہیرا کو بہت چھچھوری سمجھتی تھی مگر وہ ایسی نہیں، اسی طرح مون کو بہت عجیب اور پُراسرار سمجھتی ہوں، مجھے لگتا ہے، مون بھی ایسی نہیں......'' یہ ایک عام سی سوچ تھی جسے اس نے عیسیٰ سے شیئر کر لیا تھا۔ عیسیٰ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مالا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا...... اب مالا کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''دیواریں محض قلعوں کی نہیں ہوتیں مالا......! دل کے اندر بھی ایک دیوار ہوتی ہے، وجود کے اوپر بھی ایک دیوار ہوتی ہے، انسان اپنی ذات کو پرت در پرت چھپائے رکھتا ہے۔ انسانی ذہن، سوچ اور شخصیت کو کھوجنا آسان نہیں، کوئی اس کھوج میں آگے تک نکل جاتا ہے اور سمجھو، یا تو وہ بھٹک جاتا ہے یا انسانیت کی اعلیٰ معراج پالیتا ہے۔ تمہیں میری کہاوتیں حیران کرتی ہیں ناں......؟ دراصل میں نے ڈسکو کلب میں وقت ضائع نہیں کیا، نہ شراب کے نشے میں اپنے حواس معطل کیے ہیں، اپنی تھوڑی سی عمر کا زیادہ تر وقت صحت مندانہ سرگرمیوں میں گزارا ہے۔ تبھی کچھ نہ کچھ وہ پاچکا ہوں جس کی خواہش تھی...... اور جہاں تک مون کی بات ہے تو اس کے بارے میں کیا کہوں؟ جب تک پتھروں سے واسطہ نہ پڑے، ان کی سختی، نوکیلے پن اور وزن کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور پھر ہر کوئی الفاظ کو اپنی سمجھ کے مطابق ڈھالتا ہے۔'' عیسیٰ نے کتنی روانی اور سبھاؤ سے مالا کو بہت کچھ باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو بزنس کی کتابیں پڑھتا رہا تھا یہ حکمت، دانائی اور فلسفہ کہاں سے سیکھ گیا؟ مالا کو لگا، وہ اپنے سامنے ایسے نوجوان لڑکے کو دیکھ رہی ہے جو اپنی ذات میں ایک پوری یونیورسٹی ہے جبکہ وہ خود کو چھوٹا سا کتب خانہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مون وہ نہیں جو نظر آتی ہے؟'' اس کے بے تکے سوال کو سن کر عیسیٰ نے بردباری کی انتہا کر دی تھی۔ وہ جھنجلائے بغیر ایک مرتبہ

پھر رک گیا۔ حالانکہ اسے دفتر سے دیر ہورہی تھی، یہ بھی حقیقت تھی کہ دفتر اپنے باپ کا ہی تھا مگر وقت کی پابندی تو لازم تھی چاہے مالک ہو یا ملازم......

''خاموشی بغیر تخت کی بادشاہی ہے۔'' عیسیٰ کی مسکراہٹ نہ جانے کہاں سے امڈ آئی۔ مالا اس کی کوئی اور بات سمجھتی یا نہ سمجھتی مگر یہ بات ضرور سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے فوراً منہ پھول کر کُپا ہوگیا تھا حالانکہ عیسیٰ کے لہجے میں کتنی شرارت تھی مگر وہ سمجھ ہی نہیں پائی۔

''آپ کا مطلب ہے، میں بولوں ہی نہ......''

اس نے بھنا کر کہا تھا، عیسیٰ کی توقع کے عین مطابق وہ ناراض ہوگئی تھی۔

''میں نے بس اتنا کہا ہے کہ فضول بولنے سے بہتر خاموشی ہے۔'' عیسیٰ نے فوراً وضاحت کی تھی مگر یہ وضاحت کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ مالا کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا جبکہ وہ چاہتا تھا کہ مون کی شخصیت پر مزید بات نہ ہو، ٹاپک بدلنے کے لیے مالا کی ہلکی پھلکی خفگی اسے گوارا تھی مگر اب کہ ---- مالا ذرا سیریس قسم کی ناراض ہوچکی تھی۔

''آئندہ آپ میری آواز نہیں سنیں گے۔'' وہ عجلت میں کرسی پیچھے کر کے اٹھ گئی تھی جبکہ عیسیٰ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا وہ لمحے بھر کے وہ بھونچکا رہ گیا...... پھر اسے فوراً احساس ہوا تو مگر ذرا دیر ہو ہی گئی تھی۔ مالا نے کمرے میں جا کر دروازہ لاک کرلیا تھا۔ یعنی عائلی زندگی کا پہلا سنجیدہ ٹائپ کا جھگڑا...... مگر جھگڑا تو ہوا نہیں تھا۔ بلاوجہ ناراضی ہو گئی تھی۔ عیسیٰ بے چارہ پریشان سا ہوگیا...... اس نے دیکھا تھا، مالا نے کھانا بھی نہیں کھایا...... اور اب ناراض ہو کر اندر بند ہوگئی تھی، عیسیٰ نے پاپا کو پریشان کرنے کے خیال سے کچھ نہیں بتایا تھا نہ انہیں جگا کر فکر مند کیا...... وہ خود ہی مالا کی منتیں کرتا رہا...... اسے دفتر جانا ہی بھول گیا تھا۔ اپنے بیڈروم کے باہر کھڑے ہو کر مالا کو آوازیں دے دے کر بولنے پر مجبور کرنے کا تجربہ بھی خاصا انوکھا تھا۔ وہ ایک پریکٹیکل لڑکا تھا۔ شروع سے لے کر اب تک خاصا روکھا مزاج بھی تھا مگر مالا کے اس کی زندگی میں چلے آنے کے بعد بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

اب وہ دروازے پر دستک دے رہا تھا اور دستک دینے والا بھی ایک حد تک دستک دیتا ہے اگر کواڑ بروقت نہ کھولے جائیں تو دستک دینے والے ہاتھ گر جاتے ہیں، قدم پلٹ جاتے ہیں، وہ اس فلسفے کی گہرائی سے ابھی تک واقف نہیں تھی۔ دوسری طرف وہ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ باہر کھڑا اپنا سب سے ضروری کام کررہا تھا...... بھلا مالا کو منانے کے علاوہ فی الحال کوئی اور اہم کام ہوسکتا تھا؟

''وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وقت آپ کو بھی ضائع کررہا ہے۔'' عیسیٰ نے اونچی آواز میں اسے سنانے کو کہا تھا۔ پورے سات منٹ گزر چکے تھے۔ وہ گھڑی پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اندر سے ذرا سی بھی آہٹ نہیں آرہی تھی۔ عیسیٰ سخت بے چین تھا اور اندر تک اس کی بے چینی، بے قراری اور بے تابی کی آہٹیں پہنچ رہی تھیں مگر دروازہ پھر بھی کھل کر نہ دیا...... دس منٹ چپکے سے نکل گئے۔ مالا کی ناراضی شدید نوعیت اختیار کررہی تھی۔ حالانکہ بات اتنی بڑی نہیں تھی۔ وہ اور بھی بے قرار ہوا...... نظریں گھڑی کے آر پار ہورہی تھیں۔

عیسیٰ زیرِ لب آنکھیں بند کیے بڑبڑاتا رہا...... تیرھواں، چودھواں اور پندرھواں منٹ گزرنے والا تھا۔ اچانک چرچر کی آواز سے دروازہ کھل گیا تھا بلکہ کھلا نہیں، باہر کی صورتِ حال ملاحظہ کر کے پھر سے بند کردیا گیا تھا۔ عیسیٰ پھر سے بھونچکا رہ گیا...... اس نے انتہائی دلسوز لہجے میں آہ بھر کر کہا تھا۔

''آپ کا پل پل بدلتا رویّہ، آپ سے وابستہ لوگوں کو پل پل اذیت میں مبتلا کررہا ہے۔'' اس کے بھیگے لہجے میں مقناطیس کی سی کشش تھی۔ کاش وہ پہلے یہ حربہ استعمال کرلیتا، مالا نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ عیسیٰ کے سامنے اس کا دکھی سا چہرہ آگیا...... اس نے بے ساختہ مالا کی افسردگی دیکھ کر کہا۔

''ہٹ دھرمی سردیوں کی برف جیسی ہوتی ہے، نری بے فائدہ...... نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے نہ قدر...... جس بات کی وضاحت کرنے کے لیے زبان ہو، اسے استعمال کرلینا چاہیے۔'' عیسیٰ کے نرم الفاظ پر وہ خفگی سے منہ پھلا کر جتانے والے انداز میں بولی۔

''اور اسی زبان کو اگر بند کرنے کا حکم دیا جائے تو......؟'' مالا کے طنزیہ لہجے کو محسوس کر کے وہ مسکرادیا تھا۔

''بات الفاظ کی نہیں، لہجے کی ہوتی ہے، تم نے الفاظ پر غور کیا...... لہجے پر نہیں...... اگر غور کرلیتیں تو غصہ نہ کھاتیں...... مگر غصہ تو تمہیں کھانا ہی تھا۔ بھوک جو لگ رہی ہے۔'' اس نے پہلے سی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا...... تب مالا کو خیال گزرا...... عیسیٰ نے کہاوت غصہ دلانے والی بولی تھی مگر اس کی مسکراہٹ اچانک امڈ آئی تھی۔ شرارتی سی مسکراہٹ' تھوڑی چڑانے والی، تھوڑی زچ کرنے والی، اسے عیسیٰ کی بات ٹھیک لگی تھی اس نے الفاظ پر غور کیا تھا لہجے پہ نہیں...... مگر تائید کر کے اسے اترانے پر مجبور نہیں کرسکتی تھی۔

''میں آپ کے فلسفے سے متاثر ہو کر دروازہ کھولنے پر مجبور نہیں ہوئی، بات فقط اتنی ہے کہ میں آپ کو ناراض نہیں کرسکتی اور نہ آپ کی خفگی سہہ سکتی ہوں۔'' مالا نے نم آواز میں سچ اگل دیا تھا۔ عیسیٰ کے لیے مالا کے یہ الفاظ گویا امرت تھے۔ وہ سرتاپا سرشار ہوگیا۔

''کچھ چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ جیسے پھول کے ساتھ خوشبو جیسے چاند کے ساتھ ستارے...... جیسے دن کے ساتھ رات...... جیسے روشنی کے ساتھ اندھیرا...... اسی طرح روٹھنے اور منانے کا سنگم بھی بہت پرانا ہے۔ الفاظ جیسے بھی ہوں، مطلب ایک ہی نکلتا ہے، نہ تم میری خفگی سہہ سکتی ہو اور نہ میں تمہیں خفا کر کے دنیا کے کسی کام کا ہوسکتا ہوں۔ میرے سارے کام اب تمہی سے شروع ہو کر تمہی پر ختم ہوتے ہیں۔ سو اب ناراضی ختم، آرام سے بیٹھ کر کھانا کھالو، بھوکے پیٹ تو بولا بھی نہیں جاتا، ناراضی تو دور کی بات ہے۔'' وہ اسے واپس میز تک لے آیا تھا، مالا خفگی بھلا کر اس بے پایاں محبت بھرے احساس رکھنے والے انداز پر مسکرا دی تھی۔ ایک نرم مسکراہٹ، دلوں کی رنجش دور کرسکتی ہے اور جانے لوگ لفظوں کے ذخیرے اور دلیلوں میں وقت ضائع کیوں کرتے ہیں؟ وہ اسی بات پر غور کررہی تھی جبکہ عیسیٰ اسے اپنے زیرِ نگرانی کھانا کھلانے کے بعد آفس چلا گیا تھا پھر چاچو اُٹھے تو مالا نے عادتاً دن بھر کی روداد انہیں سنادی تھی۔ وہ اتنا مزے کا سین نہیں دیکھ پائے تھے، یہی عیسیٰ کی منتیں کرنے والا، سو خاصے بدمزہ ہورہے تھے، اس کے منہ سے من وعن پوری رومینٹک اسٹوری سن کر بھی خاصے افسردہ اور رنجیدہ تھے۔

''لائیو سین کا تو اپنا ہی ایک الگ مزہ ہے۔'' انہیں شدید قلق تھا کہ مالا نے انہیں جگایا نہیں...... اب وہ انہیں تسلی دے رہی تھی کہ پھر کبھی لائیو بھی دیکھ لیجیے گا۔ چاچو سوپ پی رہے تھے جبکہ مالا فون کی بیل سن کر اٹھ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عیسیٰ کی ہی کال ہوگی مگر دوسری طرف سوزن تھی۔ مالا غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر خوشی سے دیوانی ہوگئی تھی۔

''تم مجھے بھول گئی ہو سوزن......'' اس نے بے ساختہ شکوہ کیا تھا۔ دوسری طرف سوزن متانت سے ہلکا سا مسکرائی تھی۔ مالا کا شکوہ سوزن کو بہت اپنائیت بھرا لگا تھا۔ وہ اس کی غلط فہمی فوری طور پر دور کرنا چاہتی تھی مگر اسی پل آفاق گھر میں داخل ہوا تھا۔ سوزن کچھ حیران ہوئی، وہ بیگ اٹھائے آیا تھا تو کیا وہ جانے والا تھا......؟ رات کو گروسی بھی آفاق کی واپسی کے متعلق کوئی بات کررہی تھیں مگر سوزن کا ان

کی طرف دھیان نہیں تھا...... اب آفاق کے بیگ کو دیکھ کر اسے خیال آیا تھا کہ اس کا کورس کمپلیٹ ہو چکا ہے، اس نے اشارے سے آفاق کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ جب وہ لاؤنج کے ایک کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر میگزین اٹھائے ورق گردانی کرنے لگا تب سوزن، مالا کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”میں تمہیں ہرگز بھی نہیں بھول سکتی۔“ سوزن کے محبت بھرے الفاظ نے آفاق کو کچھ چونکا دیا تھا...... وہ جو ذرا بے پروا سا بنا بیٹھا تھا، اب کچھ چوکنا ہو گیا۔

”یہ کس سے بات کر رہی ہے؟ وہ بھی اردو میں......“ تجسس جیسا بھی ہو، انسان کی فطرت میں ضرور شامل ہوتا ہے، آفاق بھی سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا تھا۔ یقیناً فون پر حسیب انکل نہیں تھے، ورنہ سوزن کا یہ انداز نہ ہوتا...... عیسیٰ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سوزن سے اس طرح بات کرے...... وہ عیسیٰ کو اچھی طرح سے جانتا تھا پھر فون پر دوسری طرف کون تھا؟

”کیوں نہیں، میں چکر لگاؤں گی، تم شولے (اسکول) جا رہی ہو؟“ سوزن نے سابقہ مٹھاس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اب کہ آفاق کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔

”اوہ ....تو دوسری طرف مالا ہے۔“ غبارے میں سے نکلنے والی ہوا کی طرح آفاق کا تجسس ”پھُر“ ...... سے نکل گیا تھا، وہ ایک مرتبہ پھر میگ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے بولا تھا، دوسرے معنوں میں اس نے سوزن کو یاد دلانا چاہا تھا کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔

”مالا سے کہہ دو، میری میزبانی کے لیے تیاری پکڑ لے...... میں کل وہاں پہنچ رہا ہوں...... عیسیٰ سے فون پر بات ہو گئی ہے۔“ آفاق نے کمالِ شاہانہ انداز میں بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا تب سوزن کچھ اچنبھے سے ریسیور پر ہاتھ رکھے بغیر بولی۔

”تم عیسیٰ کے گھر میں رہو گے؟“ سوزن نے شدید حیرت کا مظاہرہ کیا تھا کیونکہ آفاق کسی کے گھر پر ٹھہرنا.... پسند نہیں کرتا تھا۔ گروی کے بہت دفعہ اصرار پر بھی وہ ریںٹ پر کمرا لے کر رہنے پر بضد رہا تھا اور ان کے گھر ٹھہرنے کو ترجیح نہیں دی تھی پھر اب بھلا کیسے مان گیا تھا؟ سوزن کیوں نہ حیران ہوتی......؟

”ہاں...... جناب شرط یہی رکھی ہے، حالانکہ میں نے اتنا کہا، پہلے کی بات اور تھی...... اب تو مالا بھی ہے، اچھا نہیں لگتا مگر عیسیٰ نہیں مانا...... مجھے دھمکی دی کہ جاب نہیں دے گا...... مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی...... ورنہ میں جاب کے لیے کہاں دھکے کھاتا......؟ تم تو جانتی ہو ناں میرے گھر کے سارے حالات...... ماں کو حج کروانا ہے، دادی کے کڑے، بہنوں کی شادیاں وغیرہ...... وغیرہ......“ وہ آفاق تھا، مختصر جواب نہیں دے سکتا تھا، سوزن تو اسے چھیڑ کر پچھتائی تھی جبکہ دوسری طرف مالا نے بھی آفاق کی لن ترانیاں سن لی تھیں۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اتفاقاً آج بھی آفاق یہاں موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں پارسل کے بارے میں پوچھنا مناسب رہے گا؟ کچھ دیر کی کشمکش کے بعد بالآخر مالا نے سوزن سے پوچھ لیا...... بلکہ بہت مناسب طریقے سے شکریہ ادا کرنا چاہا تھا۔

”تم نے مجھے گفٹ بھیجا تھا، اس کے لیے بہت شکریہ......“ اس نے بڑے محتاط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ دوسری طرف سوزن کچھ حیران رہ گئی تھی۔ ابھی اس کے لبوں میں یہی الفاظ تھے کہ ”کون سا گفٹ......؟“ جب اچانک لاؤنج کے دروازے میں کھڑی مون پر اس کی نظر پڑی تھی، عین اسی لمحے آفاق نے بھی لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا تھا، پھر اس کی آنکھیں ایک عجیب سا منظر دیکھ کر گویا ابل کر باہر آ گئی تھیں۔ اس نے موں کی سحر طراز

آنکھوں میں سے ایک مقناطیسی لپک نکلتی دیکھی تھی، شاید لمحے کے آخری حصے سے بھی پہلے وہ لپک سوزن تک سفر کر گئی۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی! یا پھر سوچ سے سوچ ٹکرائی تھی؟ جہاں انسانی عقل دم بخود رہ جائے وہیں سے معاملے کی شروعات ہوئی تھی۔ محض ایک لمحے کی دیر تھی۔ آفاق اب سوزن کی آواز سن رہا تھا جبکہ اس ایک لمحے میں نہ جانے کیا سے کیا ہو گیا تھا؟

”ہاں...... گفٹ میں نے بھیجا تھا مگر شکریے کی ضرورت نہیں۔“ سوزن کی ٹھہری سوئی سوئی آواز میں خوابیدگی کا عنصر نمایاں تھا۔ آفاق اسے پہلے سے فون پکڑے بولتے نہ سن چکا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ سوزن نیند سے اٹھ کر آئی ہے مگر اب تو اس کی حیرانی کا کوئی عالم ہی نہیں تھا۔ وہ اس لمحاتی اتھل پتھل کرتی کیفیت کو سمجھ نہیں پایا تھا مگر اس کے دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھی...... دماغ گویا مفلوج ہو گیا تھا۔ موں کے پلٹتے ہی غیر ارادی طور پر سوزن نے فون کریڈل پر پٹخا اور آفاق کی طرف دیکھے بغیر کسی اور ہی عالم کو سوچتی راہداری کی طرف پلٹ گئی تھی جبکہ آفاق جو الوداعی سلام کرنے آیا تھا اپنے ایسے استقبال پر ششدر رہ گیا...... اس کی عقل گویا لمحے بھر کے لیے مفلوج ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لائن اچانک ڈراپ ہو گئی تھی، مالا نے سوچا کہ دوبارہ کال کرے مگر چاچو کی پکار نے ارادہ ڈانوں ڈول کر دیا تھا۔ اور وہ جو پہلی فرصت میں بیڈ روم کے ایک کونے میں رکھی کورپ کو کھنگالنا چاہتی تھی وقتی طور پر اتنا اہم کام بھول گئی...... دراصل چاچو کی پکار میں تکلیف کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی چاچو تک آئی تو وہ کرسی سے نیچے گرے کراہ رہے تھے۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ پہلی مرتبہ چاچو کو اس حالت میں کراہتے اور تکلیف

اصل وجہ

استاد: ”بھینس کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟“
شاگرد: ”سر! یہ تو کوئی بے وقوف بھی بتا دے گا۔“
استاد: ”اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔“

درد شریک

کرایہ دار نے نصف شب کو مالک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا، مالک مکان نیند سے بیدار ہو کر جلدی سے دروازے پر آیا تو کرایہ دار بولا۔ ”میں اس مہینے کا کرایہ ادا نہیں کر سکوں گا۔“

”مگر یہ اطلاع دینے کا کون سا وقت ہے؟“ مالک مکان غصے سے بولا۔ ”تم یہ بات مجھے صبح بھی بتا سکتے تھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے سوچا اس پریشانی میں، میں اکیلا کیوں جاگتا رہوں۔ تم بھی میرے درد شریک بھائی بنو۔“

از: نگینہ ضیا...... کیماڑی

زندگی

زندگی کی شام ہو رہی ہے
پھر بھی سکون نہیں حاصل ہمیں
چھائی ہے من پر غم کی چادر
قرار اب بھی تو نہیں حاصل ہمیں
زندگی اب کم ہی باقی ہے ہماری
پھر بھی راحت کیوں نہیں حاصل ہمیں
چاہت ہے کہ گزر جائیں اب تو ہم
لیکن موت بھی اب نہیں حاصل ہمیں
کیا کریں گے ایسی زندگی کا اتنا
سکون ہی جس میں نہیں حاصل ہمیں

از: اتا خولہ بنت حوا، کراچی

سے تڑپتے دیکھا تھا...... انہیں سینے میں شدید درد تھا...... مالا بھاگتے ہوئے فون تک آئی پھر عیسیٰ کو فون کر کے چاچو کی خرابی طبیعت کا بتایا تھا۔ جب تک عیسیٰ آندھی طوفان کی طرح گھر آیا تب تک مالا رو رو کر بے حال ہو چکی تھی۔ وہ مالا کو تسلی دے کر چاچو کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال چلا گیا تھا۔ جبکہ مالا تنہا، اکیلی گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ چاچو کو پھر سے سینے میں اتنا بھیانک درد اٹھے گا اور وہ اسپتال چلے جائیں گے۔

وہ جانے کتنے ہی گھنٹے بے آواز روتے ہوئے دعائیں کر رہی تھی۔ اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا...... بکھری ہمتیں مجتمع کر کے وہ اللہ کے حضور نماز کے لیے کھڑی ہوئی تھی پھر آخری سجدے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسو پھر سے بہتے چلے گئے تھے۔ جانے وہ کب تک روتی رہتی مگر فون کی چنگھاڑتی آواز نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا...... وہ لپک کر گرتی پڑتی فون تک گئی تھی۔ سینے میں دھڑکتا دل خوف سے... پھڑپھڑا رہا تھا...... فون اٹھایا تو دوسری طرف سے غیر متوقع طور پر بندیا کی آواز سنائی دی تھی۔ آج پورے پندرہ دن بعد بندیا نے ہی بالآخر فون کیا تھا...... اور وہ خاصے جارحانہ تیور لیے ہوئے تھی۔ اس کی آواز سنے بغیر گویا ابل پڑی۔

”اللہ! تم جیسی بہن کسی کو نہ دے...... کبھی توفیق نہیں ہوتی فون کرنے کی...... جب بھی کیا، ہم نے ہی فون کیا...... تمہاری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ تم عیسیٰ کو ہی پیاری ہو جاؤ۔“ بندیا نے اتنے دن کا جمع شدہ غصہ باہر نکال دیا تھا مگر ابھی اس کی تسلی کہاں ہوئی تھی۔

”ہمیں تو تم بھول ہی چکی ہو...... ایسے بھی جرمنی میں کون سے کام ہیں جو تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی......؟ کیا اُپلے تھاپتی ہو، فصلوں کی کٹائی کرنے جاتی ہو، بھینسوں کو چارہ ڈالتی ہو؟ آخر مصروفیت کی وجہ بھی تو معلوم ہو۔“ بندیا بھنّا بھنّا کر چیخ رہی تھی۔ پیچھے ممی شاید اسے تحمل سے بات کرنے کی تلقین کر رہی تھیں مگر وہ بندیا ہی کیا جو کسی کی سن لے...... اس کے اپنے ہی بے شمار شکوے تھے۔

”نہ شادی کی تصویریں بھیجیں...... نہ مووی، کم از کم نیٹ ہی استعمال کر لیا کرو...... جرمنی جا کر بھی بدّھو ہی رہیں......“ بندیا اب بری طرح سے لتاڑ رہی تھی۔ شاید وہ اب بھی جی بھر کے اس کی کلاس لیتی مگر مالا کی سوں، سوں نے بندیا کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

”تم رو رہی ہو مالا......! تم ٹھیک تو ہو ناں......؟“ سابقہ بکواس بھلائے بندیا لمحے بھر میں انتہائی پریشان ہو گئی تھی۔ ”ارے، کچھ تو بولو میں ہی بولتی جا رہی ہوں...... خیریت تو ہے ناں....؟ میرا دل سخت گھبرانے لگا ہے۔“ بندیا کی دُہائیوں نے بالآخر مالا کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے چاچو کی طبیعت کے متعلق بتا دیا تھا تب بندیا بھی سخت متوحش ہو گئی تھی۔

”عیسیٰ کہاں ہے؟“ بندیا نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

”چاچو کے ساتھ ہیں۔“ مالا کو بندیا کی آواز سن کر خاصی ڈھارس پہنچی تھی۔ تبھی قدرے سنبھل کر بتانے لگی۔

”اور تم اکیلی ہو......؟“ بندیا مزید ہراساں ہوئی۔ بہن کے اکیلے پن اور پریشانی نے اسے بھی سخت بے چین کر دیا تھا۔

”ہاں......“ اس نے دھیمی آواز میں بتایا۔

”وہ نِنی کدھر ہے؟“ بندیا نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

”نِنی چلی گئی...... میرا مطلب ہے چھٹی پر چلی گئی......“ وہ بے ربط سی بولی تھی۔ فون انگیجڈ تھا، کیا پتا...... عیسیٰ کال کر رہا ہو، اس کا سارا دھیان اسپتال کی طرف تھا تبھی بے دھیانی میں بول رہی تھی۔

”اچھا، تم پریشان نہ ہو...... ہم لوگ یہاں چاچو کے لیے دعا کرتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا......“ بندیا نے بھرائی ہوئی آواز میں تسلی دی تھی۔ تب مالا نے سسک، سسک کر روتے ہوئے کہا تھا۔

”بندیا...... دعا کرنا، چاچو کو کچھ نہ ہو...... انہیں کچھ ہو گیا تو عیسیٰ سنبھل نہیں پائے گا، تمہیں نہیں پتا، یہ باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھے بنا رہ نہیں سکتے۔“ مالا کے آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے۔ وہ دوپٹے کے کونے سے آنسو صاف کرتی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پاکستان میں جانے اس وقت کیا ٹائم تھا......؟ مالا سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ یہاں جرمنی میں تو چوبیس گھنٹوں والا سسٹم چلتا تھا۔ دوپہر بارہ بجے کے بعد ایک دو استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ تیرہ اور چودہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اس وقت عیسیٰ کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے مگر فی الحال کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

مالا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ جانے کون سی خبر کان سننے والے تھے؟ دل کو دھڑکا سا لگا تھا پھر بندیا کے بعد ممی اور شامی نے بھی بات کی تھی۔ اس کا دل اپنے بھائیوں سے اداس ہونے لگا تھا...... خصوصاً شامی اسے بہت یاد آتا تھا...... نٹ کھٹ سا چُلبلا...... بالکل آفاق جیسا باتونی لگتا تھا اور ذی تو گھر میں نہیں تھا، ابھی تک ہاسٹل میں قیام تھا اس کا...... اور ذیشان سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ ممی سے اور بندیا سے بات کر کے دل کچھ پُرسکون ہو گیا تھا۔ ماں بھی کیسی ہستی ہے، اتنے فاصلوں پر بھی دل گھبرانے سے جان گئی تھی کہ سمندر پار موجود بیٹی کو کسی پریشانی نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔

ممی اور بندیا کے بعد ڈیڈی نے بھی کال کی تھی۔ حسیب چاچو کے لیے وہ بہت پریشان اور بے چین تھے پھر انہوں نے عیسیٰ کا سیل نمبر لے کر اسے بھی کال کی تھی۔ مالا نے ڈیڈی سے بات کر کے فون رکھا تب ڈور بیل بج اٹھی تھی۔ وہ قدرے متوحش رہ گئی تھی۔ گھر میں اس وقت کون آ سکتا تھا؟ وہ کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مگر یہ خوف لمحاتی تھا، کچھ دیر بعد اسے ایک اور فون کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا...... اب کے آفاق کی کال آ گئی تھی۔ مالا تو فون سنتے سنتے خبطی سی ہونے لگی تھی۔ عیسیٰ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا...... جس کی کال کا اسے انتظار تھا سوچا کہ سیل فون پر کال کرلے مگر عیسیٰ نے اس کی کال پک ہی نہیں کی تھی۔ ابھی آفاق کی غیر متوقع آواز سُن کر مالا ٹھٹک گئی تھی جبکہ وہ چھوٹتے ہی منت کرنے لگا تھا۔

”اب تو دروازہ کھول دو، میں گھنٹیاں بجا، بجا کر تھک گیا...... یہ سامنے والے تمہارے نئے پڑوسی بھی اب تو آتے جاتے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“ آفاق گویا رو دینے کو تھا۔ ادھر مالا سرتاپا حیران رہ گئی تھی۔ تو کیا، کل آنے والا وہ چھلاوا آج ہی پہنچ گیا تھا؟ مالا پریشان نہ ہوتی تو کیا کرتی؟ اسے دروازہ کھولنا چاہیے تھا یا نہیں......؟ اس بارے میں عیسیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آفاق کو کیا جواب دے، چاچو کی پریشانی الگ تھی اور اب یہ آفاق نئی مصیبت کی طرح نازل ہو گیا تھا۔

”تم...... آج ہی آ گئے......؟“ آفاق کے دوسری مرتبہ دہائی دینے پر مالا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا۔ اگرچہ اسے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا تھا مگر آفاق نے قطعاً برا نہیں مانا تھا۔

”جی ہاں...... سرکار بلائیں اور ہم نہ آئیں......“ وہ لہک لہک کر گا رہا تھا مگر آواز پہلے کی طرح رونے والی تھی۔ یقیناً وہ ان سوالات پہ زچ ہو رہا تھا۔

”میں سمجھی نہیں......“ اسے آفاق کی بکواس اس لمحے زہر لگ رہی تھی۔ وہ جلدی، جلدی بات کر کے فون بند کرنا چاہتی تھی تاکہ عیسیٰ اگر کال کرے تو اسے

مشکل نہ ہو۔

''مالا خاتون! آپ کی سمجھ بھی میری سمجھ کی طرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں بھی سامنے والی باتیں اور صاف دکھائی دینے والی چیزیں نہ دیکھ پاتا ہوں نہ سمجھ پاتا ہوں۔'' آفاق نے انتہائی برے وقت میں فلسفہ جھاڑا تھا۔ مالا کے پلّے کچھ نہیں پڑا تھا تبھی بھنا کر بولی تھی۔

''گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں...... تم پھر کبھی آجانا۔'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

''میں جانتا ہوں گھر میں اس وقت کوئی نہیں...... اسی لیے تو آیا ہوں......'' آفاق نے مالا کی بات کاٹ کر بے ساختہ کہا تھا پھر اسے اپنے لفظوں کے ہیر پھیر کا احساس ہوا تو ایک مرتبہ پھر برجستہ بولا۔

''بلکہ اسی لیے تو بلوایا گیا ہوں۔'' اس نے قدرے وضاحت کی تھی مگر مالا پھر بھی نہ سمجھی تھی بلکہ کچھ اور ہونق ہوگئی۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو، صاف، صاف بات کرو، پہلیاں بجھوانے کی ضرورت نہیں۔'' اس کی آواز میں سخت ناگواری تھی تبھی آفاق جلدی سے بولا تھا مبادا مالا کو غصہ آجائے۔

''مجھے عیسٰی نے فون کرکے بلایا ہے، تم دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے دو، سامان رکھ کر پھر اسپتال چلا جاؤں گا۔ اگر دروازہ نہیں کھولو گی تو یہ حوض کے پار سڑک کی دوسری طرف مکان ہے ناں جس میں کوئی نئے لوگ شفٹ ہوئے ہیں آج...... ان کی ایک بیٹی آتے جاتے مجھے گھورتے ہوئے نکلتی ہے یا میرے سامان کو دیکھتی ہے یا مجھے...... شاید وہ سمجھ رہی ہے، تم نے مجھے گھر سے سامان سمیت باہر نکال دیا ہے اور اب میں دروازے پر بیٹھا منتیں کر رہا ہوں...... اب یہ نہ ہو، میری دہائیاں سن کر اس نازک حسینہ کو مجھ پر ترس آجائے اور وہ مجھے گھر لے جانے کی آفر کردے...... دیکھ لو، میں کسی کا دل نہیں توڑ سکتا...... پھر عیسٰی خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہوجائے گا اور عیسٰی کی خفگی کا سارا ذمہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ فٹافٹ کھول دو دروازہ۔'' آفاق نے ایک ہی سانس میں سامنے والے گھر پر نگاہ جما کر مالا کو حواس باختہ کر دیا تھا اور مالا کے ذہن میں صرف عیسٰی کی ناراضی کے ذمے والی بات گھوم رہی تھی۔ سو اس نے دروازہ کھول دیا تھا تبھی آفاق سامان سمیت اندر آگیا۔ اس کی روئی روئی صورت کو نظر انداز کرتا وہ اپنی لن ترانیوں میں مصروف تھا۔

''اللہ، اللہ! اتنی منتیں کروائیں، اتنی تفتیش کی...... میرا تو حلق خشک ہوگیا...... پر آپ تردّد مت کیجیے گا...... میں پانی نہیں پیوں گا۔'' آفاق کوئی بات سیدھے طریقے سے منہ بگاڑے بغیر نہیں نکالتا تھا۔ اب مالا جان گئی تھی کہ اس کی بات کا کیا مقصد ہے۔ ظاہر ہے، وہ پانی ہی پینا چاہتا تھا۔ مالا چپ چاپ کچن سے جوس نکال لائی۔

''بڑی مہربانی، آپ تو خاصی ذہین خاتون ہیں۔'' جوس کے دو تین گلاس حلق میں انڈیل کر اب وہ اسپتال جانے کے لیے نکل رہا تھا جاتے، جاتے اسے کچھ ہدایات دینے لگا۔

''دوازہ نہیں کھولنا، پریشان نہیں ہونا اور رونا بھی نہیں۔'' اس کے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر وہ تیز، تیز بولتا باہر نکل گیا تھا۔ مالا حیران رہ گئی پھر اس کی ہدایات کو دُہراتی دروازے تک آئی تھی۔ اس نے اپنے بھیگے چہرے پر غیر ارادتاً ہاتھ پھیرا تھا۔ یہاں وہاں نمی ہی نمی تھی۔ اسے آفاق کا اپنائیت بھرا انداز یاد آیا۔ ''اور رونا بھی نہیں۔'' وہ گویا تنبیہ کرکے گیا تھا۔ مالا کو روتے روتے ذرا سی ہنسی آگئی۔

''یہ آفاق بھی کمال ہے۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا تھا پھر تسبیح اٹھا کر لاؤنج میں آگئی۔ آفاق اپنا سامان ٹھکانے پر لگا کر گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا

کہ وہ اس گھر میں پوری بے تکلفی سے رہتا آیا ہے۔ اس نے مالا سے گیسٹ روم کا نہیں پوچھا تھا بلکہ خود ہی آرام سے اسی طرف چلا گیا۔ مالا، آفاق کو سوچتے ہوئے عیسٰی کی باتیں ذہن میں دُہرانے لگی تھی تو گویا عیسٰی نے آفاق کو بلوایا تھا۔ ''کیا پتا چاچو کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔'' اس کا دل پھیکا پڑ رہا تھا...... اسے چاچو کی ہنستی مسکراتی آواز سنائی دے رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور، تازگی سے بھری...... کوئی اتنا تازہ دم شخص بھی اچانک بیمار پڑ سکتا ہے؟ مالا کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ اسے چاچو ہنستے مسکراتے، چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ کہہ رہے تھے۔ ''لائیو سین دیکھنے کا تو اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔'' وہ کتنے افسردہ موڈ میں بیٹھے تھے گویا عیسٰی اور مالا کی پہلی تازہ، تازہ کھٹی میٹھی جھڑپ دیکھنے سے محروم رہ گئے تھے۔ جھڑپ بھی ایسی جس میں عیسٰی نے مالا کی ڈھیروں منتیں کیں اور پھر وہ... آفس جانا بھی بھول گیا۔ وقت کی شدید پابندی کرنے والا جب بہت دیر سے دفتر گیا ہوگا تو سب ورکرز کی معنی خیز نگاہوں سے خاصا جھنجلایا ہوگا۔ چاچو تصور کی آنکھ سے گویا خوب لطف لے رہے تھے مگر لائیو سین دیکھنے کا تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سو اُن کا قلق جا ہی نہیں رہا تھا۔ مالا نے انہیں تسلی دی تھی۔ ''آپ پھر دیکھ لیجیے گا، دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں۔'' اس نے جیسے بچوں کی طرح ان کو بہلایا تھا۔

''ارے...... پھر کس نے دیکھی ہے۔'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

''آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ پھر سب نے ہی دیکھی ہے، ہم آج رات پھر سے لڑائی والا ماحول بنائیں گے۔'' وہ گویا ہنس رہی تھی۔ اس بات سے...... بے خبر کہ وقت کا خوشنما پانسہ کسی بھی لمحے پلٹ سکتا ہے اور دکھ ایسا دیمک ہے جو ہنسی کو چاٹ جاتا ہے، کچھ دیر پہلے اس گھر میں ہنسی گونج رہی تھی مگر اب سناٹوں کا راج تھا...... وقت اپنا پانسہ کبھی پلٹ بھی سکتا ہے۔ مالا کو پہلے گمان تھا، اب یقین بھی ہونے لگا تھا۔

اسے چاچو کی آواز گھر کے در و دیوار سے سنائی دے رہی تھی۔

''ایں...... ہرگز نہیں، تم لڑنا ضرور، پر جلد مان جانے کے لیے...... لڑائی زندگی کا حسن ہے مگر جب تک طویل نہ ہو۔'' انہوں نے بے ساختہ ٹوکا تھا، مالا کو لگا، وہ اس کے قریب ہی بیٹھے سرزنش کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں بھل بھل بہنے لگی تھیں۔ اب بھلا کسے یاد تھی آفاق کی اپنائیت بھری تنبیہ...... ''رونا بھی نہیں۔''

''میں عیسٰی سے لڑوں گی اور وہ مجھے جلد منالیں گے۔'' اس نے شرارتی لہجے میں بڑے مان سے کہا تھا، یہ کیسی بے خبری اور نادانی بھری بات تھی، ہمارے ایسے اکثر بول جن پر تقدیر کا لکھا مسکراتا ہے...... انسان کچھ باتوں کو لبوں سے ایسے پھسلا دیتا ہے جیسے ہاتھ سے نکلے ریت کے ذرے...... جو بکھر تو سکتے ہیں مگر جمع نہیں ہوسکتے اور کہتے ہیں ناں...... وقت اور نصیب کسی لمحے بھی کسی کو زیر کرسکتا ہے اور برے وقت کی آہٹیں کان پہلے سے ہی سننے لگتے ہیں۔

سے کی لہریں گزرتی جارہی تھیں۔ فون کی گھنٹیاں ابھی تک خاموش تھیں۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا؟ مالا کا دل خوف سے سکڑتا، پھیلتا جاتا تھا پھر ایک گھنٹے سے کچھ وقت پہلے فون کی تو نہیں دروازے کی گھنٹی البتہ ضرور بجنے لگی تھی۔ مالا اٹھ کر دروازے تک آئی۔ دروازے میں لگا عدسہ جس سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا سے باہر جھانکا تو اسے دروازے کے سامنے کوئی لہراتا آنچل دکھائی دیا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' وہ کچھ گھبرا گئی تھی، اتنے عرصے سے اس دروازے پر نفیس کے علاوہ اور کوئی خاتون نظر نہیں آئی تھی۔ پھر اب یہ جانے کون تھی؟ مالا کشمکش میں مبتلا ہوگئی کہ دروازہ کھولے یا نہ

کھولے...... اس دوران کال بیل کا جلترنگ بجتا رہا تھا۔ وہ عدسے سے آنکھ چپکا کر باہر کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لینے لگی تھی۔ سامنے کوئی لڑکی کھڑی تھی، دروازے کی طرف پشت کیے۔ شاید پہلے یا دوسرے اسٹیپ پر، مالا کچھ اندازہ نہیں لگا سکی تھی مگر اس نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے ایک حسین اور نفیس چہرے والی نوخیز لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے نقوش بہت دلفریب تھے، مالا تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہوگئی، کالی آنکھیں، کالے بال، ملکوتی سا حسن، مسکراتے ہوئے نیم وا ہونٹ بے شک جرمنی کا حسن بے مثال تھا...... مگر یہ پری پیکر تو مشرقی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خاصا سرخ تھا اور ناک انتہائی گلابی...... تھوڑی زکام زدہ سی۔ مالا کے اتنے تفصیلی پوسٹ مارٹم پہ بڑے شائستہ انداز میں مسکرائی تھی۔

''ہیلو...... شام کا سلام......'' اس نے جرمن زبان میں سلام کرکے ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا تھا، مالا نے جھجک کر اس کا ہاتھ تھاما اور پھر چھوڑ دینا چاہا تھا مگر مقابل کھڑی لڑکی نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا...... وہ اس کا ہاتھ ابھی تک گرم جوشی سے دبائے کھڑی تھی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' وہی جوش بھرا انداز تھا ایک دم دوستانہ سا۔

''مالا علی عیسیٰ۔'' مالا کو بھی مسکرانا پڑا تھا، زبردستی کی مسکراہٹ بوجھل دل کے ساتھ مسکرانا بھی کتنا مشکل تھا۔ مالا کو اسی پل ادراک ہوا تھا پھر اس نے اپنا تعارف کروایا تھا، مالا چپ چاپ سنتی رہی۔ اس نے اپنا نام اِفی بتایا تھا۔ وہ لوگ بھی پاکستانی تھے، یہاں آج ہی شفٹ ہوئے تھے پھر اس نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا تھا وہ کچھ دیر پہلے یہاں کسی کو باہر بیٹھا دیکھ چکی تھی اور وہ اسی کے بارے میں پوچھنے آئی تھی کہ شاید باہر سامان سمیت بیٹھے لڑکے کو کرائے پر کمرا چاہیے تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے مالا کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

''سیمر فری...... (کرائے کے لیے کمرا خالی ہے)'' اس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں ایک بورڈ پر ''روم فار رینٹ'' لکھا تھا۔ یعنی انگریزی اور جرمن دونوں میں لکھا تھا۔ مالا گویا سمجھ کر مسکرادی تھی پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور انتہائی شکستہ ڈچ میں اسے سمجھایا تھا کہ وہ لڑکا ان کے گھر مہمان آیا ہے، اسے کرائے کے لیے کمرا نہیں چاہیے تھا۔ مالا کی تفصیل سن کر وہ کچھ مایوس ہوئی تھی تاہم اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر اس نے مالا سے مزید کچھ کہا جو اسے سمجھ نہ آیا۔

''آئی ڈونٹ انڈر اسٹینڈ۔'' اس کی شرمندگی محسوس کرکے وہ لڑکی جھٹ اردو میں بولی تھی تب مالا کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔

''تمہیں اردو آتی ہے؟'' اس کے چہرے پر بے ساختہ خوشی امڈ آئی تھی۔ ''اُف، اردو آتی تھی پھر بھی میرا امتحان لینے کھڑی ہوگئی ...... یہ جرمن لوگ بھی ناں......'' مالا نے دل ہی دل میں بے چارگی سے کہا تھا تب اِفی نے زور شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں، میرے پاپا پاکستانی ہیں...... ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے میرا بھائی ان دنوں پاکستان گیا ہوا ہے۔ ہم لوگ اس گھر میں آج ہی شفٹ ہوئے ہیں۔'' اِفی نے بہت دوستانہ لہجے میں اسے بتایا تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ فی الحال یہاں اکیلی تھی۔ مالا اس با اخلاق لڑکی کو اندر لے آئی تھی۔ پھر اِفی، مالا کے ہاتھ سے بنی چائے پی کر ہی گئی۔ جاتے، جاتے وہ اسے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے گئی تھی۔ یوں اس کی سوزن، ہیرا کے بعد اِفی کے ساتھ بھی دوستی کی ابتدا ہوگئی تھی۔

سوزن اور اِفی اجنبیوں کے اس دیس میں مالا کو اپنے دل سے قریب لگی تھیں، دوستی کی وجہ ان کا پُرخلوص ہونا اور ہم زبان ہونا بھی تھا۔ وہ اس کی گفتگو کو اسی کی زبان میں سمجھ لیتی تھیں۔ دوستی کی ابتدا پہلے

"وجہ" پر ہوئی تھی پھر دھیرے دھیرے "وجہ" ختم ہو گئی اور ایک لازوال رشتہ باقی رہ گیا۔ ہیرا کا معاملہ کچھ الگ تھا، وہ اس کی ہم زبان نہیں تھی مگر اچھی کلاس فیلو ضرور تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ ڈوچ بولنے میں ہلکان ہوتی رہتی تھیں۔ بات چیت کی ابتدا پہلے "وجہ" سے ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بہترین "اتالیق" تھیں۔ اتالیق ہونا وجہ تھی، بعد میں وجہ ختم ہوگئی صرف رشتہ رہ گیا۔ ہمدردی، خلوص اور دوستی کا رشتہ۔

"اجنبی راہ اور اندھیرے انجان سفر میں کوئی جگنو ٹکرا جائے تو اسے مٹھی میں دبالینا چاہیے۔ کیا پتا وہ بہ آسانی رستوں کی رہنمائی کر کے منزل تک پہنچا دے۔" یہ علی عیسٰی کی بتائی حکمت بھری باتیں تھیں جن کو مالا نے گرہ میں کس کر باندھ لیا تھا کہ دوستی اور چائے کی حدت اور تیزی ہی ان کی خوبی ہے نہ کہ حد درجہ مٹھاس...... تو گویا اس بات کا مفہوم یہ تھا۔ دوستی میں تلخ رویے اور کبھی کبھی لڑائی بھی سہنا پڑتی ہے۔ انسان کو گرم اور ٹھنڈی دونوں طرح کی چائے پینے کا عادی ہونا چاہیے۔

اس وقت تنہا لاؤنج میں تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک کر سوزن، ہیرا اور رانی کو سوچنا بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ پھر جانے کتنا وقت بیت گیا جبھی عیسٰی کی benz کی آواز آئی۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ مالا بھاگتی ہوئی دروازے میں لگے عدسے میں سے جھانکنے لگی۔ وہ موبائل پہ آج کل (میں شادی شدہ ہوں) کی ٹیون سیٹ کیے ہوئے تھا۔ دروازے کے قریب آ کر موبائل بجنے لگا تھا، مالا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے عیسٰی کا چہرہ تھا۔ انتہائی پژمردہ، مرجھایا ہوا جبکہ سب سے زیادہ اس کی آنکھیں متاثر لگ رہی تھیں۔ انتہائی سرخ جیسے کچن کا پھل ہو، رسیلا اور لہو برساتا ہوا۔ انتہائی سوجے پھوٹے جیسے وہ اسپتال میں اتنے گھنٹے روتا رہا ہو۔ اس کی پلکیں جڑی ہوئی تھیں، بھیگی، نمناک...... گویا واپسی کے سفر پر بھی روتا رہا تھا۔ ہاں، اپنے باپ کی تکلیف اسے اتنی ہی اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اسے اپنے پاپا سے عشق تھا۔ وہ انہیں "درد" میں بے قرار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا، وہ بھاگ کے عیسٰی کو وہیں چھوڑ کر پانی لے آئی۔ عیسٰی لاؤنج میں جوتے اتار کر صوفے پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پانی دیا، عیسٰی نے بنا کچھ کہے گلاس پکڑ لیا۔ مالا کارپٹ پر اس کے قریب ہی دوزانو بیٹھ گئی تھی۔

"چاچو کی طبیعت کیسی ہے عیسٰی؟" مالا کی آواز سن کر وہ بے خیالی میں سر اٹھائے یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ مالا اس کی بوجھل لہو رنگ آنکھوں کو دیکھ کر دہل گئی۔

"اللہ! اتنی سرخ آنکھیں۔" اس کے دل پہ چوٹ سی لگی۔ عیسٰی کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد دوبارہ سر جھکا گیا تھا۔

"پہلے سے کچھ بہتر ہیں۔" اس کا انداز تسلی دینے والا تھا مگر مالا کی تشفی نہ ہوئی۔ جیسے عیسٰی مالا کے بجائے گویا خود کو تسلی دے رہا تھا۔

"تو پھر آئے کیوں نہیں؟" وہ بے قرار ہوئی لیکن عیسٰی کے سامنے روئی نہیں۔ وہ اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اپنی وجہ سے تو ہرگز نہیں۔

"ڈاکٹر نے انہیں ایڈمٹ کر لیا ہے۔ میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر آفاق نے زبردستی بھیج دیا۔ آفاق اچھا لڑکا ہے۔ اپنوں سے بہت بہتر۔" عیسٰی کے لہجے میں ٹوٹے کانچ چبھ رہے تھے۔ وہ اتنا پُراذیت اور دکھی کیوں لگ رہا تھا... چاچو کے لیے؟ شاید کوئی اور وجہ بھی تھی۔

"آپ نے موں کو اطلاع نہیں دی؟" معاً اسے خیال آیا تو عجلت میں بولی تھی۔ شاید علی عیسٰی اسی سوال سے بچنا چاہتا تھا جبھی بے چین سا صوفے پر سے اٹھ گیا۔



''آپ نے بتایا نہیں۔'' مالا اس کے پیچھے ہی آ گئی۔ بیڈ روم کی طرف بڑھتے عیسیٰ کے قدم لحظہ بھر کے لیے رک گئے تھے۔ وہ اس کے پژمردہ روئے، روئے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ نماز کے اسٹائل میں دوپٹا اوڑھے، ہاتھ میں تسبیح لیے وہ اپنے چچا کے لیے بہت غمگین، متفکر اور پریشان تھی۔

''اسے اطلاع دی تھی میں نے۔'' وہ نگاہیں موڑ کر اندر بڑھ گیا...... مالا پھر اس کے پیچھے بھاگی۔

''تو مون کیا آ گئی؟'' اس نے بے چینی دبائے بغیر پوچھا۔ عیسیٰ کچھ پل کے لیے رک گیا تھا گویا سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

''نہیں......'' عیسیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہہ دیا۔

''کیوں......؟'' اس نے بے تابی سے کہا تھا تب عیسیٰ گہری سانس کھینچ کر پلٹا...... وہ اس کے چہرے پر لکھی بے چینی اور پاپا کے درد کی اذیت کو بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ کچھ چہرے کھلی کتاب کے مانند ہوتے ہیں بغیر تردّد کے پڑھتے چلے جاؤ۔ مالا کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا اور اس کی بے چینی بھی معمولی نہ تھی، وہ مون کے بارے میں جاننے کے لیے اکثر بے تاب رہتی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کا دل چاہتا تھا وہ اسے شیخ سعدی کا ایک قول بار بار سنائے تاکہ وہ اس کے زرخیز دماغ میں بیٹھ جائے۔ وہ مالا کو بتانا چاہتا تھا کہ ظاہر پہ جانے والے خسارے میں رہتے ہیں، آگ دیکھنے میں سرخ نظر آتی ہے مگر جلا دے تو سیاہ راکھ کے علاوہ کچھ نہیں بچتا مگر مالا ابھی ادراک کے لمحوں سے بہت دور تھی۔ وہ وقت سے پہلے مالا کو اتنا سیانا نہیں کر سکتا تھا۔ اس پل بھی مالا کے چہرے پر بکھرے سوز و گداز کو محسوس کر کے آہستگی سے بولا تھا۔

''زیادہ سوال کبھی کبھی عذاب لگتے ہیں مالا......!'' وہ بیزار نہیں تھا، بس تھوڑا شکستہ دل تھا مگر مالا سمجھی نہیں تھی، بس چپ سی رہ گئی۔ عیسیٰ بولنے کے موڈ میں نہیں تھا پھر وہ اسے کیسے تنگ کرنے کی کوشش کرتی......؟ اس کی خاموشی نے مقابل کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ وہ اپنا کوٹ، ٹائی اور [illegible] ایک، ایک چیز صوفے کی طرف اچھالتا گیا۔ صوفے کی ترتیب کچھ بدل گئی۔ کشن آڑھے ترچھے ہو کر گر گئے اب صوفے پر پہلے جیسا روپ نہیں [illegible] وہ بے ترتیب اور الجھا، الجھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں [illegible] بھلا لگنے والا نہیں تھا۔ مالا کچھ الجھ گئی تھی اور عیسیٰ [illegible] الجھن سے ہی نکلنا چاہتا تھا۔

''اسی کو بے ترتیبی کہتے ہیں مالا! زندگی میں [illegible] رویوں میں، کبھی دل کو سکون نہیں دیتی، نہ نظر کو بھلی [illegible] ہے، کچھ لوگ اپنی زندگی میں بے ترتیبی کو پسند کر[illegible] ہیں اور پھر خواہش رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی ان [illegible] غلط عمل کی پیروی کریں...... جب ایسا نہیں کیا جا[illegible] ان کی انا اور میں کو دھچکا لگتا ہے۔ مون انہی لوگوں میں سے ہے۔ وہ پاپا کی تکلیف کا سن کر نہیں آئی۔ اس[illegible] نے آنے سے انکار کر دیا...... وہ سمجھتی ہے، پاپا اُ[illegible] واپس بلانے کے لیے روز، روز ڈرامے کرتے ہیں۔ وہ کسی تھیٹر کی اداکارہ نہیں جو معمولی سا رول ملنے [illegible] بھاگتی چلی آئے۔'' عیسیٰ کی آنکھوں میں شفاف پانیوں کا طوفان امڈ آیا تھا مگر ضبط نے آگے بڑھ کر اسے ڈھارس پہنچائی تھی۔ وہ کچھ پل خاموش کھڑا رہا۔

''مون ہم سے اتنی دور چلی گئی ہے کہ پلٹ آنے کی امید نہیں...... وہ بدگمان ہے اور فاصلے مٹانے کے بجائے اور بڑھا رہی ہے۔ تم نے کہیں پڑھا تو ہوگا، فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور نہیں پڑتے، کبھی کبھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ انتظار مرتا نہیں، آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے، ہاں بس آنکھیں مرجاتی ہیں...... اور مون میرے باپ کی آنکھوں کے اس انتظار کو منجمد کر دینا چاہتی ہے۔'' عیسیٰ کے ضبط کا بندھن کانچ کے مانند ٹوٹ گیا تھا پھر وہ عجلت میں پلٹا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا جبکہ مالا کسی مجسمے کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے مون

جیسی خود غرض، عجیب، سنگ دل اور انتہائی ظالم کوئی اور بیٹی آج تک نہیں دیکھی تھی۔

☆☆☆

ایک، دو، تین، چار...... پوروں پر گنتی کے تھے دن مالا کے پیارے چاچو ہشاش بشاش سے گھر واپس لوٹ آئے تھے۔ مالا ان کی صحت یابی کی خوشی میں دیوانی سی ہو گئی تھی۔ پاکستان اطلاع کر دی گئی تو ممی نے چاچو کے لیے بہت سی خیرات کی۔ ادھر مالا نے خود شکرانے کے نفل پڑھے۔ آیتِ کریمہ پڑھایا اور نیاز بھی خود پکائی۔ چاندی کے ورق سجا کر انتہائی لذیذ کھیر بنائی تھی مگر جب تک آیتِ کریمہ نہ پڑھا گیا اس نے کسی کو ایک چمچہ کھیر نہیں چکھائی تھی۔

یہ چھوٹی سی مقدس تقریب تھی جس میں ہیرا اور اس کے ڈاکٹر شوہر ابوبکر نے شرکت کی تھی۔ مالا نے اپنی اور اس کی فیملی کو بھی انوائٹ کیا تھا...... سوزن کو بھی کال کی مگر اس نے معذرت کر لی تھی۔

سب نے بڑے دل کے ساتھ انتہائی خشوع و خضوع سے آیتِ کریمہ پڑھا تھا۔ مہمان تو سارے کافی دیر سے آئے تھے جبکہ مالا نے آفاق کو صبح سے تسبیح دے کر بٹھایا ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد کا بیٹھا ہوا وہ ابھی تک آیتِ کریمہ پڑھ رہا تھا۔ بیچ میں اس نے بہت دفعہ بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر مالا کی دھمکی سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔

لنچ کے قریب تو آفاق کو چکر آنا شروع ہو گئے تھے حلق خشک ہو گیا اور بھوک سے معدہ چلّانے لگا تب حسیب چاچو اور عیسیٰ کو اس پر ترس آ گیا تھا۔

''زبردستی کی عبادت ایسے درخت جیسی ہے جس پر پتے تو آ جائیں مگر پھل اور پھول کبھی نہ آئیں۔'' عیسیٰ کے الفاظ پر آفاق کو کرنٹ لگا تھا۔ وہ سخت برا مان گیا...... عیسیٰ کی گہری باتیں اکثر اسے اختلاجِ قلب میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

"تم میرا عمل ضائع کرنا چاہتے ہو؟" آفاق روہانسا ہوگیا...... سفید جالی کی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی، تسبیح کو آنکھوں سے چوم کر لگایا۔

"میں کون ہوتا ہوں نیکی، بدی، جزا سزا میں فیصلہ کرنے والا...... تم میری بات سمجھ کر پلٹ جاؤ تو یہ اور بات ہے۔" عیسیٰ نے مسکراہٹ دبالی تھی۔ آفاق تھوڑا کھسیا گیا تھا۔

"تمہاری باتیں کم ہی کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔ اتنی مشکل باتیں جو کرتے ہو۔" اب وہ عیسیٰ پر چڑھائی کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان نوک جھوک تو اکثر چلتی ہی رہتی تھی۔ مالا کے لیے اب کچھ نیا نہیں تھا جبکہ مہمان بھی انجوائے کر رہے تھے۔

"بات مشکل نہیں ہوتی، نہ الفاظ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بس لہجے کو سمجھ لینے سے ساری مشکل حل ہوجاتی ہے۔" عیسیٰ نے مہمانوں کی تواضع کرتی مالا کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

مالا کو بھی آفاق نے ..... تھوڑا تھوڑا بدل دیا تھا...... اب وہ بھی کھل کر ہنسنے لگی تھی۔ آفاق کے سنائے لطیفوں پر قہقہوں کی بوچھاڑ سے پاگل ہوجاتی...... آفاق کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ وہ اسے فیشن سے لے کر کوکنگ تک چیدہ، چیدہ باتیں اور مشورے دیتا...... چاچو تو گویا آفاق کے چلے آنے سے تازہ دم ہوگئے تھے۔

آفاق گویا ہر فن مولا تھا، کبھی مشین لگا کر سارے کپڑے دھو دیتا، کبھی مالا سوئی ہوئی ہوتی تو ناشتا بنادیتا ...... اب نمی بس صفائی کے لیے آیا کرتی تھی۔ باقی کے کام مالا اور کبھی کبھی آفاق کردیتا...... گھر کی بہت ساری ذمے داریاں آفاق نے اپنے کندھوں پر اٹھالی تھیں۔ چاچو کے ویکلی چیک اپ سے لے کر گھر کا سودا سلف لانے تک ہر کام بخوبی کیے جاتا تھا۔ اس نے یہاں رہنے کے بعد آنے سے بھی پہلے عیسیٰ سے ... تھا کہ وہ شکایت کا موقع آنے... نہیں دے گا۔ درا... گھر کے کاموں پر تو عیسیٰ کو کبھی اعتراض نہیں ہوا ... کبھی اس نے آفاق کو ٹوکا تھا بلکہ وہ دفتری امور ... پہل ٹھیک سے انجام نہیں دیتا تھا۔ اپنے پہلے قیام ... آفاق نے عیسیٰ کو ناکوں چنے چبوائے تھے سو اب ... آفیشل معاملات کو اچھی طرح سے سمجھ کر ہینڈل کر... تھا۔ پہلے قیام کے دوران عیسیٰ کو سب سے بڑی ... آفاق سے شکایت تھی وہ کچھ یوں تھی کہ آفاق ... وقت پر تیار ہوکر دفتر نہیں پہنچتا تھا اور اب آفاق صاحب صبح سویرے، منہ اندھیرے اٹھ کر ٹوپلیس ... ٹائی شائی لگائے، بالوں کو جیل سے سنوارے عیسیٰ کے بیڈ روم کے سامنے کھڑے اعلان کیے جاتا۔

"عیسیٰ اٹھ جاؤ...... اتنے بج کر اتنے منٹ ہوچکے ہیں۔" وہ منہ اندھیرے ہی الارم بجاتے پھرتا تھا۔ ناشتا بھی بنادیتا...... اخبار حفظ کر کے عیسیٰ کے تیار ہوکر آنے تک ایک، ایک خبر مرچ مسالے سمیت سنا ڈالتا...... اب عیسیٰ کا اخبار پڑھنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا اور یوں بہت کم مدت میں عیسیٰ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ "آفاق جی، تسی بڑے گریٹ ہو۔" یہ الفاظ کم از کم آفاق کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تو ان جملوں، تعریفی لفظوں کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکا لیتا...... مالا اس کی حرکتوں پر اکثر چوٹ کیے جاتی، خصوصاً اس وقت جب عیسیٰ اس کی تعریف کرتا اور آفاق اپنی تعریف پر پھول کے کُپا ہوا جاتا۔

"صد شکر، کنجوسِ اعظم نے تعریف تو کی۔" وہ شکر ادا کرتے ہوئے نہال ہوجاتا تھا۔ عیسیٰ کی تعریف آفاق کو دنوں مسرور رکھتی تھی۔ اسی طرح گھر کے دیگر معاملات میں مالا اس سے بہت خوش تھی۔ مالا کے کہنے پر وہ نئے گملے اٹھا لایا تھا۔ حوض کے لیے نئی موٹی تروتازہ دو عدد بطخیں بھی لے آیا۔ گھر کے بیرونی سرسبز احاطے کو آفاق کے فارغ اوقات کی محنت نے گل و گلزار بنادیا تھا۔ انی اکثر ان کے گارڈن کو دیکھ کر جیلس ہوتی اور اکثر آفاق کو چڑانے کے لیے مالا سے کہتی۔

"اپنا مالی چند دن کے لیے ادھار دے دو۔" انی کی شرارت محسوس کر کے آفاق جھٹ سے جواب دیتا۔

"یہ مالی مستقل بھی آپ کی طرف قیام کرسکتا ہے اگر آپ چاہیں تو......؟" وہ آفاق ہی کیا جو ادھار رکھ لیتا...... اس کی انی کے ساتھ اکثر تکرار ہوجاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب آفاق اپنے کوڑے کا ڈرم انی کے ڈرم میں الٹ آتا۔ تب ان دونوں کی خوب لڑائی ہوتی تھی...... اتنی کہ مالا کو سیز فائر کروانا پڑتا تھا یا پھر وہ آفاق کو گھسیٹ کر اندر لے جاتی۔

☆☆☆

اس دن بھی موسم خوب خوشگوار تھا۔ بہت دلفریب ہوا چل رہی تھی۔ آسمان صاف اور گہرا نیلا تھا...... یہاں کی مشہور مرغابیاں موسم کے حسن میں گم تھیں۔ نیلگوں ٹکڑوں میں پرواز کرتے سنہری کئی ایک پرندے اپنے رقص سے دیکھنے والی آنکھ کو مسحور کرسکتے تھے بشرطیکہ کوئی انہیں دیکھنے کے لیے وقت نکال لیتا۔

آج بہت دن بعد مالا، آفاق کے ہمراہ باہر آئی تھی۔ اسے کچھ سبزیاں اور فروٹس خریدنے تھے۔ وہ انی کے ساتھ آنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر انی کو اپنی بہن کے اسکول جانا پڑ گیا تھا۔ سو مالا دل مسوس کر رہ گئی۔ اسے ہفتے بھر کی سبزیاں خریدنی تھیں اس کی اتری شکل دیکھ کر عیسیٰ نے آفاق سے کہا تھا۔

"تم مالا کے ساتھ چلے جاؤ......" وہ آفس ورک کرنے میں مصروف تھے دونوں...... عیسیٰ نے آفاق کو ڈھیر سارا کام بتا رکھا تھا۔ جسے مارے باندھے کرنے پر مجبور تھا...... اب جو جان چھوٹنے کے چانس نظر آئے تو وہ فوراً فائلیں ٹیبل پر پٹخ کر اٹھ گیا۔

"مالا کو این کاؤف سین تروم (مرکز) تک تو نہیں جانا......؟" وہ بال سنوارتا چکا تھا۔ کام سے جان جو چھوٹ گئی تھی۔ عیسیٰ نے نفی میں سر ہلادیا...... تب وہ مسکراتا ہوا مالا کے ہمراہ باہر آگیا تھا...... اب جو قیامت سا موسم نظر آیا تو منہ بسور کر بولا۔

"دیکھ لو، تمہارے بور شوہر نے اس حسین موسم میں بھی فائلوں، لیپ ٹاپ اور کیلکولیٹر میں سر کھپا رکھا ہے۔ بھلا دفتر کو گھر اٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی، بندہ اس موسم میں تفریح کے لیے نکلتا ہے۔" وہ کلستا ہوا فراٹے سے بول رہا تھا۔ مالا نے کندھے اچکا کر کہا۔

"اب تم کیوں جل، جل کر خاک ہو رہے ہو، تمہاری جان تو چھوٹ گئی۔" مالا اپنے ہینڈ بیگ میں سے کچھ مارک (جرمن کرنسی) نکال کر الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ اسے پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ عیسیٰ نے اپنا خزانچی ساتھ بھیجا تھا۔ مالا کچھ مطمئن سی ہوکر چلتی رہی جبکہ آفاق اپنا لیدر بیگ بغل میں دبائے مالا سے بھی تیز چل رہا تھا۔ ایک وارین ہاؤس سے کچھ چیزیں خرید کر اب وہ سبزی اور پھلوں کی مارکیٹس تک آگئے تھے۔ مالا یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اس نے سبزی اور پھلوں کی شفاف شیشے کی چمکتی دکانوں کو دیکھا تو حیران رہ گئی...... من ہائیم کے افسانوی کردار یہاں بھی بستے تھے۔ وہ ہی شفاف رائل روڈ کے اطراف میں بنے چمکتے دمکتے بڑے، بڑے اسٹورز انتہائی خوب صورت اور صحت مند سیل گرلز...... ان کے ہونٹوں سے چپکی میٹھی مسکان گویا چینی کی گڑیائیں شیشوں میں سجی تھیں۔ صفائی کا اتنا اعلیٰ اہتمام تھا کہ پھل، سبزیاں صاف ستھری چمکتی دمکتی نظر آرہی تھیں۔ مالا کی طرح آفاق بھی حیران در حیران تھا...... آنکھوں اور لہجے میں حسرت لیے وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔

"کاش میرا پاکستان بھی ایسا ہوجاتا۔" اس کی

آواز میں بھی حسرت در آئی تھی تب مالا نے بڑے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

''جب تمہارے جیسے جوان پردیس بھاگ آئیں گے تو پھر پاکستان بچوں اور بوڑھوں کے رحم و کرم پر کہاں تک آگے جاسکتا ہے؟'' اس کے لہجے میں واضح چبھن تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ عیسیٰ کے ہمراہ واپس چلی جاتی کبھی یہاں نہ آنے کے لیے...... اجنبی وطن تو اجنبی ہی رہتا ہے۔ چاہے سال گزاریں یہاں یا صدیاں......

''کوئی شوق سے تو دَر دَر کی خاک نہیں چھانتا۔ وطن تو ہمارا ہے، پر کیا کریں حکمران ہمارے نہیں...... ڈگریوں کو گھن لگ رہا تھا، گھر میں پڑے، پڑے کتنے لوگوں کی آنکھوں میں خواب مرتے دیکھ چکا تھا۔ سو میں نے وقت ضائع نہیں کیا...... نہ ڈگریوں کو دیمک لگنے دی ہے۔ پتا نہیں، میرا فیصلہ غلط ہے یا صحیح......؟ تاہم مطمئن ضرور ہوں...... رزقِ حلال کماتا ہوں جلد ہی ماں، باپ کو حج کرواؤں گا۔ دادی کو سونے کے کنگن لے کر دیئے ہیں...... بہنوئیوں کو سیٹلڈ کرنا ہے...... کیا ہوا جو اپنی ذات خسارے میں چلی گئی، خیر، خسارہ بھی کیوں......؟ اپنوں کے لیے جینا ہی تو زندگی ہے، یہ میرا نہیں، تمہارے شوہر عیسیٰ کا قول ہے۔'' اب وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ بظاہر لاابالی سا یہ لڑکا اندر سے کتنا گہرا تھا۔ مالا کچھ کچھ حیران رہ گئی تھی۔ پھر آفاق نے زیادہ دیر اسے سوچنے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ خریداری میں بری طرح مگن ہوگئے تھے۔

واپس آتے ہوئے بڑے، بڑے تھیلے پکڑے مالا نے نوٹ کیا تھا کہ آفاق نے ایک اور تھیلا بھی گھریلو سامان کا فل کروا رکھا تھا۔ مالا کے پوچھنے پر آفاق نے بے پروائی سے بتایا۔

''سامنے والی جنگلی بلی لسٹ پکڑا گئی تھی۔ اسے بہن کے اسکول جانا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا سامان بھی لے چلوں...... بے چاری کا بھائی ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' آفاق سادگی سے بول رہا تھا جبکہ مالا آہم آہم کرتی رہ گئی تھی۔

''جنگلی بلی، بے چاری......'' مالا کو ڈھیروں ہنسی آگئی تھی۔ اسی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں کے دوران گھر قریب آگیا تھا جبکہ مالا اسے مسلسل چھیڑتی رہی تھی۔

گھر کے سامنے رک کر آفاق نے کچھ تھیلے اسے پکڑائے اور افی کا تھیلا پکڑے اس کے گھر کی طرف دیکھ کر بولا۔

''روم فار رینٹ......'' بورڈ پر ابھی تک لکھے الفاظ رو رہے تھے۔ آفاق کو بے تحاشا ہنسی آگئی...... ''ان لوگوں کو ابھی تک کرائے دار نہیں ملا...... لگتا ہے، ان کے نصیب کا کرائے دار میں ہی ہوں...... پہلا اور آخری......'' وہ افی کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مالا کچھ ٹھٹک گئی پھر سر جھٹک کر اندر چلی گئی تھی۔

سچ تو یہ تھا...... آفاق کے آنے سے اسے بہت سہولت ہوگئی تھی...... وہ اندر باہر کے سارے کام نمٹا دیتا تھا۔ آفس بھی باقاعدگی سے جاتا بڑی لگن اور محنت سے کام کر رہا تھا...... گھر والوں کو ڈھیروں رقم بھی بھیجتا...... اپنا خرچہ تو اس کا تھا نہیں، تھوڑا خرچہ رکھ کے باقی سب پاکستان بھجوا دیتا۔

آفاق کے آنے سے رونق بھی خوب لگ گئی تھی۔ سامنے والے گھر سے افی اور ایمی بھی آجاتی تھیں پھر عیسیٰ اور آفاق کا کرکٹ میچ ہوتا...... کبھی بیڈ منٹن کھیلتے...... خوب ہنگامہ آرائی، ہلا گلا ہوتا، فنکامہ ٹائپ زندگی بن چکی تھی۔ چاچو کو شور اور قہقہے بہت پسند تھے۔ وہ خود بھی گارڈن میں آکر بیٹھ جاتے...... اکثر ویک اینڈ پر ہیرا اور ابوبکر بھی آجاتے تو رونق دوبالا ہوجاتی تھی۔ کاش کہ زندگی یوں ہی گزر جاتی، ایک خواب کی طرح...... کسی پھول کی طرح، خوشبو کی طرح، چمکتے چاند کی طرح، بہار کی خوشبو و تازگی اور

مہکار کی طرح۔

چاندنی رات کے ہاتھوں پہ سوار اتری ہے
کوئی خوشبو میری دہلیز کے پار اتری ہے

آہ...... خوشبو، جو لمحوں کا دھوکا ہوتی ہے، آتی ہے اور آکر چلی جاتی ہے، ایک چھناکے سے ٹوٹ جانے والے خواب کی طرح...... بس ایسی ہی کوئی کیفیت اس کا دل دھڑکائے رکھتی تھی۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ جیسے کچھ ہونے کے قریب تھا۔ دل کے وسوسے زبان تک آنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

بڑے بوجھل سے دن تھے۔ بڑی اداس سی شامیں تھیں۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر پھر بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اپنی الجھی کیفیات میں مگن تھی سوان دنوں الجھے، الجھے آفاق پر بھی غور نہیں کرسکی...... وہ بہت پریشان اور متفکر تھا۔ پہلے کی طرح نہ ٹھیک سے کھانا کھاتا نہ باتیں کرتا...... آفس سے آکر باہر نکل جاتا تھا...... گویا وہ ماحول سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانے اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا......؟ اسے پریشانی کیا تھی؟ چاچو بھی اب تو چونکنے لگے تھے۔ آفاق پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ وہ ہنسی، وہ قہقہے خواب نظر آتے تھے۔ عیسیٰ اسے کوئی میچ رکھنے کو کہتا تو وہ سہولت سے انکار کر دیتا تھا۔ عیسیٰ بھی اس کی بدلتی کیفیت پر حیران تھا۔ آفاق کے دم سے جو رونق لگی تھی اب اس کا خاتمہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

پھر وہ دفتر سے آکر رات گئے تک غائب ہوجاتا...... یہ بات عیسیٰ کو پسند نہیں تھی۔ اس نے آفاق کو ٹوکا تو وہ دوبارہ جلدی گھر آنے لگا تاہم مالا نے اکثر رات بھر اسے جاگتے دیکھا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی تھی۔ صبح سرخ آنکھیں لیے دفتر چلا جاتا تھا، وہ بھی بغیر ناشتا کیے...... وہ کھانے پینے اور سونے سے غافل ہو رہا تھا۔ آخر اسے کیا ہوا تھا؟ مالا کو تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ وہ کچھ بتاتا بھی نہیں تھا۔ مالا تو پوچھ، پوچھ کے تھک چکی تھی۔

پھر ایک دن وہ وقت سے پہلے گھر آگیا تھا۔ عجیب تھکا، تھکا اور پژمردہ سا...... وہ بغیر کچھ کھائے پیے معمول کی طرح اپنے کمرے میں بند ہوگیا تھا۔ کیونکہ اب اسے عیسیٰ باہر جانے نہیں دیتا تھا۔ آج چونکہ مالا کا ضبط جواب دے گیا تھا سو وہ ساری احتیاط بھلا کر گیسٹ روم کی طرف آگئی تھی۔

اس کے کمرے میں داخل ہو کر مالا کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مالا نے اسے پہلی مرتبہ سگریٹ پیتے دیکھا تھا تبھی تقریباً دنگ رہ گئی تھی جبکہ آفاق اسے دیکھ کر اسپرنگ کی طرح اچھل پڑا تھا۔

''تم یہاں......؟'' وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ اسے امید نہیں تھی، مالا اس طرح چھاپا مار دے گی۔ اسی لیے کچھ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

''اتنے حیران کیوں ہو......؟ اور یہ سگریٹ کیوں پھونک رہے ہو؟'' مالا کو گویا تپ ہی چڑھ گئی تھی۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے کھینچ کر دور پھینک دیا تھا۔ آفاق گویا ششدر رہ گیا۔ ایسی جرأت کی بھی اسے امید نہیں تھی۔

''آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے غضبناک ہو کر پوچھا تھا پھر آدھا گھنٹا طویل بحث کے بعد آفاق کچھ منہ سے پھوٹنے پر رضامند ہوگیا تھا تاہم اس دوران مالا کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ آفاق کی سرخ آنکھیں، بڑھی شیو اور یہ...... جوگیوں والے انداز اسے کچھ، کچھ ٹھٹکا تو رہے تھے مگر وہ اپنے خدشات کو بیان نہیں کرسکتی تھی۔ اِدھر آفاق سر جھکائے کارپٹ کی نرم فر کو کھرچتا کسی الجھن میں کھڑا تھا۔ اس کے بالوں کا گچھا سفید پیشانی کو ڈھکے ہوئے تھا۔ نوکدار پلکوں کی جھالر آنکھیں ڈھکے تھی۔ وہ اس جوگیوں والے روپ میں بھی کسی کا

آئیڈیل ہوسکتا تھا۔ کسی کے بھی حواسوں پر بجلی گرا سکتا تھا اور اس نے دھیمی آواز میں کچھ بولتے ہوئے مالا کے حواسوں پر بجلی گرا ہی دی تھی۔

''مجھے محبت ہوگئی ہے۔'' اس نے گویا اعترافِ جرم کیا تھا۔ جھکے سر اور جھکی آنکھوں کے ساتھ...... مالا ایک دم دہل کر رہ گئی۔

''کس سے......؟'' وہ بھنچی آواز میں بولی تھی۔ تبھی کمرے کے باہر ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ آفاق کا دھیان بھی دروازے کی چرر...... اور آہٹ کی طرف چلا گیا تھا تاہم وہ سابقہ الجھے، الجھے لہجے میں بے ربط اور اٹک، اٹک کر بولنے لگا۔

''تم سے......'' آفاق کے اگلے الفاظ لبوں میں ہی دبے رہ گئے تھے، دروازہ اب پوری طرح کھل چکا تھا۔ مالا اور آفاق کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''تم سے...... اس لیے شیئر کر رہا ہوں کہ مجھے لگتا ہے، اس محبت کا اب میں اکیلے بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔'' آفاق نے اٹک' اٹک کر ہی سہی تاہم بات مکمل کردی تھی۔ مالا کی غیر معمولی حد تک کھلی آنکھیں لمحے بھر میں نارمل ہوگئیں...... خوف کے مارے دھڑکتا دل تھم سا گیا تھا جبکہ آفاق کسی اور کی موجودگی محسوس کرکے اصل بات چھپالینا چاہتا تھا پھر صورتِ حال ایسی دیکھ کر سچ بتانے سے خود کو روک نہ پایا حالانکہ کوئی اور وقت ہوتا تو فی الحال وہ عیسیٰ کو کچھ نہ بتاتا۔

چونکہ علی عیسیٰ اچانک اس طرف آیا تھا، ابھی اس نے آفس سے آکر کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ یقیناً وہ مالا کو ڈھونڈتا ہوا آفاق کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ آفس سے آنے کے بعد مالا، مالا پکار کر جب تک اسے دیکھ نہ لیتا، اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ سو وہ اپنی تسلی کرنے مالا کو ڈھونڈتا ہوا اِدھر آیا تھا۔ اسے امید تھی مالا آفاق سے انویسٹی گیشن کررہی ہوگی۔ عین انسانی فطرت کے تحت آفاق کی بدلی کیفیت اور مجنونانہ انداز نے مالا کو بھی ٹھٹکا رکھا تھا سو وہ آج معاملے کی تہ میں اترنے کی کھوج لیے آفاق کے کمرے تک آگئی تھی۔ عیسیٰ کو امید نہیں تھی آفاق اسے دیکھ کر بھی سچ بول دے گا' وہ آفاق کے بدلے تیور کب سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کھٹکا تو تھا ہی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور یہ کالا نظر بھی آگیا تھا۔ اب عیسیٰ کے ہاتھ جیسے آفاق کی کمزوری آگئی تھی۔

''اوہ...... تو یہ بات تھی۔'' عیسیٰ نے مصنوعی گھرے طنز سے کہا۔ ''میں تمہارے جوگیوں والے روپ کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ مینڈکی کو بھی بالآخر زکام ہوگیا ہے۔'' وہ مسکراہٹ دباتا آفاق پر صاف چوٹ کر رہا تھا...... دراصل آفاق بھی عیسیٰ کے اچانک چلے آنے پر بوکھلا گیا تھا، کچھ صورتِ حال بھی ایسی تھی کہ اگر ''وہ تم سے......'' کے بعد ایک دفعہ پھر رک جاتا تو ڈھیروں غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔ عام حالات میں وہ فی الحال عیسیٰ کو اپنی محبت کے بارے میں ہرگز نہ بتاتا کیونکہ عیسیٰ نے اس کا ریکارڈ لگا دینا تھا مگر فی الوقت آفاق کو سچ بتانا ہی پڑا تھا اور اس کا سچ سن کر عیسیٰ کے چہرے پر غیر محسوس قسم کا سکون بھی اتر آیا تھا۔ تبھی آفاق کو تلملانے کے لیے مزید چوٹ کر رہا تھا۔ آفاق چونکہ سنبھل چکا تھا اسی لیے بے ساختہ عیسیٰ کی بات ٹوک کر بولا۔

''یہ مینڈکی سے مراد کیا ہے تمہاری؟'' ماتھے پر بل ڈالے اس نے خفا، خفا سے لہجے میں پوچھا۔

''سمجھدار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے جبکہ تمہارے جیسے احمق وضاحت مانگنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔'' عیسیٰ نے چہک کر کہا۔

''میں تمہیں اسی لیے کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ مالا کم از کم تمہاری طرح طنز نہیں کرتی...... تم اچانک جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہو۔'' آفاق نے روٹھے، روٹھے لہجے میں کہہ کر منہ بسورا تھا۔ اس کی غمنا کی کو

محسوس کرکے کب سے ہونق کھڑی مالا کی طرف اشارہ کرکے عیسیٰ مزے سے بولا تھا۔

''مالا کو تو ایسے بتا رہے ہو گویا تمہاری لو اسٹوری میں یہ بڑا اہم کردار ادا کرے گی۔'' اس نے بھنائے ہوئے کھڑے آفاق کو پھر سے چھیڑا۔

''بہن ہے میری...... کیوں نہیں اہم کردار ادا کرے گی، ہر کوئی تمہارے جیسا نہیں ہوتا...... بدلحاظ اور طنز کرنے والا، خود تو میسج پر بھی میں شادی شدہ ہوں...کی ٹیون سیٹ کر رکھی ہے اور دوسروں کو محبت بھی نہیں کرنے دیتے۔'' آفاق غصے میں الٹا سیدھا بولے جا رہا تھا۔ عیسیٰ کو ہنسی تو بہت آئی مگر چھپا گیا تھا۔

''میں نے کون سا کرفیو لگا رکھا ہے؟'' عیسیٰ نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

''پر میری محبت کی رام کہانی تم سے برداشت نہیں ہوسکی فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگئے۔ میں نے مالا سے بات کرنے کے لیے اتنی مشکل سے ہمت مجتمع کی تھی۔'' آفاق کو عیسیٰ کی اچانک نٹری پر غصہ تھا اور یہ غصہ اسے مالا پر بھی تھا جو عیسیٰ کو دیکھ کر ایسی ہونق ہوئی تھی کہ ابھی تک مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ کم از کم آفاق سے یہ تو پوچھ لیتی کہ ''اسے محبت کس سے ہوئی تھی؟'' شاید وہ آفاق کے ''تم سے'' کے بعد ایسی چپ ہوئی کہ دوبارہ وضاحت کرنے پر بھی بول نہیں سکی تھی حالانکہ آفاق نے اس کا سوال نظر انداز کرکے ہی یہ الفاظ بولے تھے کہ ''تم سے اس لیے شیئر کر رہا ہوں، مجھے لگتا ہے اس محبت کا میں اکیلے بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔'' وہ سوچ رہا تھا، مالا سے کچھ شیئر کرکے اس کا من شانت اور بوجھ ہلکا ہوجائے گا جبکہ عیسیٰ اس کے من کا بوجھ مزید بڑھانے پہنچ گیا تھا۔

''آہ...... ہمت...... تو اب کہاں گئی تمہاری ہمت......؟'' عیسیٰ نے بھولپن کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا۔ آفاق کا دل چاہا، پاس رکھا لائٹر اس کے منہ پردے مارے مگر اتنے سے لائٹر نے عیسیٰ کا بھلا کیا بگاڑ لینا تھا۔

''مجھے نہیں پتا.... جاؤ تم یہاں سے۔'' آفاق بھنا کر رہ گیا...... تب عیسیٰ کو اس کی حالت پر رحم آہی گیا...... اس نے آفاق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بے ساختہ اسے پچکارا تھا۔

''اچھا، مجھ سے شرم آتی ہے؟ میرے سامنے بتانا نہیں چاہتے؟ ٹھیک ہے، میں باہر چلا جاتا ہوں، تم مالا کو بتادو، اس امید کے ساتھ کہ مالا تمہارا راز لیک آؤٹ نہیں کرے گی۔'' عیسیٰ نے اس کا کندھا دبا کر نرمی سے کہا تھا پھر مالا کو رک جانے کا اشارہ کیا...... حالانکہ وہ عیسیٰ سے بھی پہلے باہر نکلنا چاہتی تھی اور اس وقت یہ پچھتا بھی رہی تھی جب اس نے آفاق سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا تھا۔

کچھ دیر پہلے آفاق کے جملے اور اس کے پہلے دو لفظوں نے اس کی جان نکال دی تھی پھر اچانک عیسیٰ کا کمرے میں آجانا۔ مالا کو لگ رہا تھا وہ مجرم، نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی ہے پھر عیسیٰ اور آفاق کی نوک جھوک نے اس کے من کو ڈھارس پہنچائی تھی۔ کچھ دیر پہلے والی اعصاب شکن صورتِ حال کا خاتمہ ہوچکا تھا مگر پھر بھی مالا کچھ کھٹک رہی تھی کہ ''کیا پتا عیسیٰ کو دیکھ کر آفاق نے بات بدل دی ہو۔'' مگر جب آفاق نے اتنے مان بھرے لہجے میں کہا کہ ''مالا میری بہن ہے۔'' تب اسے اپنی کچھ دیر پہلے والی سوچ پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے آفاق کی نیت پر شک کیا تھا، چاہے لمحے بھر کے لیے ہی سہی تاہم اسے اپنی سوچ پر خفت ضرور تھی۔ اداسی و شرمندگی کے باعث وہ فی الفور منظر سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر عیسیٰ کی بات نے اسے رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔

''مالا تمہارا راز لیک آؤٹ نہیں کرے گی۔'' عیسیٰ کے لہجے میں کیسا مان اور اعتماد بول رہا تھا۔ مالا کو اس لمحے اپنے ہم سفر پر فخر محسوس ہوا۔ اسے لگا، وہ

زمین سے دو انچ اور اونچی ہوگئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیوں کی چمک بھر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر الوہی خوشی چمکنے لگی۔ یہ کیسا اعتماد اور اعتبار کا رشتہ تھا؟ یہ کیسی محبت تھی؟ یہ کیسا خلوص تھا؟ مالا کو آج گویا دو جہاں کی خوشیاں میسر آگئی تھیں۔ علی عیسیٰ اس پر اعتبار کرتا تھا...... اس سے محبت کرتا تھا، اس کی عزت کرتا تھا اور وہ کبھی مالا سے بدگمان ہونے والا نہیں تھا۔ یہ احساس معمولی نہیں تھا، یہ احساس معمولی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

''تم مالا سے کچھ بھی شیئر کر سکتے ہو تاہم اگر میری ضرورت پڑی تو ہاتھ نہ آؤں گا۔'' وہ جاتے جاتے بھی دھمکانے سے باز نہیں آیا تھا تب آفاق نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

''مجھے تمہاری بڑی ضرورت ہے اور اگر مالا میرا ''راز'' تم تک پہنچا دے گی تو یہ میرے لیے عین سعادت ہوگی۔'' آفاق نے انکساری کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا پھر عیسیٰ کے باہر نکلتے ہی مالا کی طرف متوجہ ہوگیا...... وہ ابھی تک گم صم سی کھڑی تھی، عیسیٰ کے مہکتے لفظوں کے اثر میں کھوئی، کھوئی سی، آفاق نے گلا کھنکھار کے ڈرامائی لہجے میں ہانک لگائی تھی۔

''اللہ، تیرا شکر ہے بلا ٹل گئی۔'' اس کے انداز میں بھرپور شرارت تھی جبکہ بلا سے مراد اس کا اشارہ عیسیٰ کی طرف تھا۔ مالا کو اتنا برا لگا کہ حد نہیں وہ جو کچھ دیر پہلے جوگی بنا ہوا تھا، اتنے دن سے آزردہ، رنجیدہ، افسردہ، غمگین اور جانے کیا، کیا دکھائی دے رہا تھا، اب پھر سے پرانی جون میں لوٹتا نظر آرہا تھا...... یہ عیسیٰ کی نرمی کا کمال تھا یا پھر کچھ دیر کے لیے وہ سابقہ کیفیت سے باہر نکل کر فریش ہونا چاہتا تھا۔ مالا سمجھ نہیں پائی تھی تاہم آفاق کا عیسیٰ کو بلا کہنے والا انداز اسے آگ لگا گیا تھا۔

''کیا بکواس ہے؟'' اسے ہنستا دیکھ کر مالا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مالا کا غصہ دیکھ کر اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے تھے۔

''ابھی بکواس کی کہاں ہے؟'' آفاق نے پھر سے دانت نکوسے تھے۔ مالا الجھ گئی۔

''تم منہ تو اپنا بند کرو...... اور یہ سگریٹ کے بھبکے...... اُف......'' مالا نے ناک چڑھا کر سفید نائیلون کا جالی والا پردہ ہٹا کر سلائڈ کھول دیے تھے، کمرے میں تازہ ہوا کی آمد ہوئی تو کچھ تازگی کا احساس ہوا تھا۔

''یہ اسموکنگ کی لت کیوں لگائی؟ اور کب سے لگائی؟'' اب وہ بڑے جارحانہ تیور لیے پوچھ رہی تھی تب آفاق نے ڈرتے، ڈرتے بتایا۔

''جب سے محبت ہوئی۔'' اس کا انداز مسکینی لیے تھا۔ اتنا کہ مالا کو غصہ آتے آتے رہ گیا...... پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر آفاق کو دیکھا تھا جو ہاتھوں سے بال سنوارتا اب پہلے کی طرح افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔

''اور محبت کب سے ہوئی؟'' اس نے تیکھے چتونوں سے آفاق کو گھور کر پوچھا۔ یعنی اس کا شک بھی درست ہی نکلا تھا۔ جناب محبت کا روگ سینے سے لگائے پھر رہے تھے۔

''جب سے اسے دیکھا ہے یوں سمجھو...... پہلی نظر کی محبت......'' آفاق گویا کھوسا گیا تھا۔ مالا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

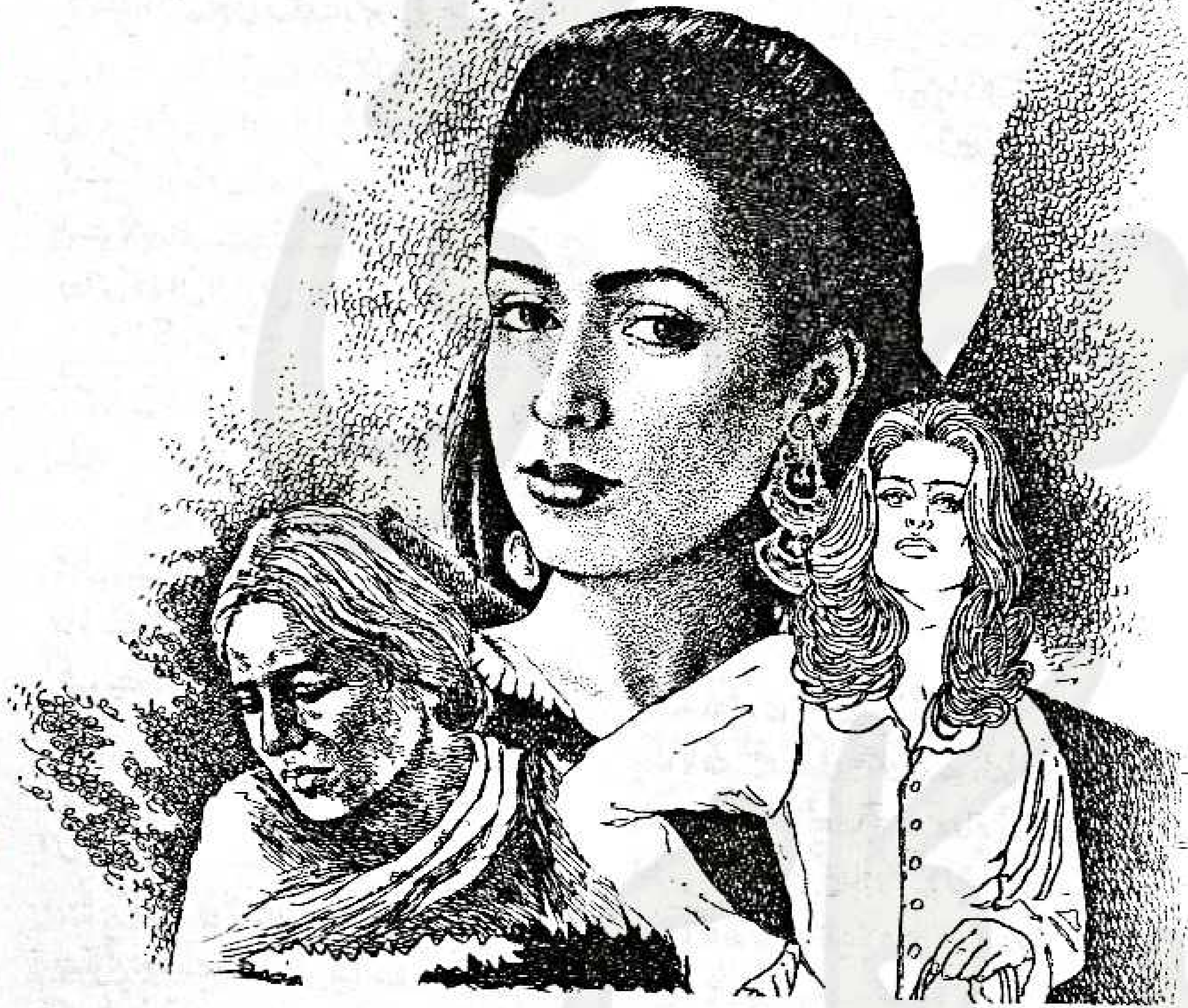
''اوہ...... تو میں پوچھ سکتی ہوں، وہ خاتون ہیں کون؟'' اسے فطری سا تجسس لاحق ہوا تھا۔ تبھی ذرا تیز لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''تم......'' وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا جبکہ مالا نے اتنی زور کی چیخ ماری تھی کہ سیل فون کی طرف متوجہ ہوتا آفاق دہل کر رک گیا۔

مالا علی عیسیٰ کی زندگی میں آفاق کیا گل کھلانے والا تھا اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی کیونکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی یہ سب ضرور جانیے لیکن اگلے ماہ!

ماڈل گرل

سعدیہ رئیس



''رضوانہ، اب اٹھ بھی جاؤ شام ہوگئی ہے۔ ابھی مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔'' ماں کی آواز پر وہ چونکی۔

وہ اپنے کمرے میں بند بیزاری بیٹھی تھی جبکہ کمرے کے باہر چہل پہل کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر زندگی کے رنگ اور رونقیں تھیں لیکن اب اس کا دل ان روشنیوں اور رنگوں سے مایوس ہوگیا تھا۔

اس کی زندگی اُس کے لیے عذاب بن گئی تھی بلکہ ایک ایسا امتحان بن گئی تھی جس میں چاہتے ہوئے بھی وہ کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

دروازے کی کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی اسی لیے دستک کی تھاپ سے دروازہ تھوڑا سا کھل گیا اور روشنی کی لکیر اس کے اندھیرے کمرے میں یوں سرسراتی، دندناتی داخل ہوئی کہ مجبوراً رضوانہ کو بستر چھوڑنا پڑا۔

☆☆☆

وہ فریش ہوکر لاؤنج میں آئی تو غزالہ نے اسے مسکرا کر خوش آمدید کہا اور اس کی یہی مسکراہٹ اسے کچھ روز سے بری لگنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

''تم کیسے آگئیں.....ابھی دو دن پہلے تو آئی تھیں آج پھر نازل ہوگئیں؟'' وہ لہجے کی تلخی کو چھپا نہ سکی۔

''ہاں، ہاں......چار دن میں ہی سب مجھے بھول گئے اور میرا آنا برا لگنے لگا۔'' وہ کچھ اٹھلا کر برا ماننے والے انداز میں بولی مگر خوشی اس کے انگ، انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ چہرے پر چمک اور روپ بھی خوب چڑھا تھا وہ بھی صرف زبانی طور پر برا مان رہی تھی درحقیقت تو اپنے گھر میں وہ بہت خوش تھی اور اس کی یہی خوشی اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

''ہاں بھئی لڑکیوں کا تو مان ہی میکے کے دم سے قائم ہوتا ہے......کیوں نہ آئے گی وہ اور آج تو خاص طور پر تمہاری وجہ سے آئی ہے وہ۔'' امی نے فوراً ہی غزالہ کی حمایت کی۔

''کیوں......مجھ سے کیا کام تھا؟'' ابرو چڑھا کر اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''پہلے ہی دیر ہوگئی ہے چائے پی کر جلدی سے تیار ہوجاؤ تم...... کچھ مہمان آنے والے ہیں آج۔'' غزالہ کے بجائے ماں نے جواب دیا بلکہ حکم جاری کیا تھا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حسبِ توقع اس کا مزاج برہم ہوگیا۔

''میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ آئندہ آپ مجھے اس طرح کسی کے سامنے جانے پر مجبور نہیں کریں گی۔ آخر کب تک میں اپنی نمائش کرتی رہوں گی اور معاف کیجیے گا امی نمائش میں بھی اچھی چیزوں کو رکھا جاتا ہے۔'' دکھ کی شدت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

''اُفوہ......ایک تو یہ تمہارا کامپلیکس......ارے بھئی جب نصیب کھلنے کا وقت آتا ہے تو سب کچھ ہوجاتا ہے۔ کیا کمی ہے تم میں آخر......'' غزالہ کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے بات کاٹ دی۔

''خدا کے لیے مجھ پر اپنے حسن کی بڑائی جتانا چھوڑ دو۔ تمہاری خود کی شادی ہوگئی تو خواہ مخواہ مجھ پر مسلط ہو رہی ہو۔ میں کوئی سولہ سترہ سالہ لڑکی نہیں ہوں۔ تیس کی ہوجاؤں گی اس سال...... مجھے معلوم ہے کہ میرے اس بدصورت چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی میرے لیے جھولی نہیں پھیلائے گا۔'' اس کے لفظ، لفظ میں زہر بھرا ہوا تھا۔

ہمیشہ کی طرح بہن اور ماں کے چہرے اس کے کانچ لفظوں کی چبھن سے متغیر ہوگئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ وہ خود اذیتی اور خود ترسی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے زندگی کی ہر خوشی دینا چاہتی تھیں مگر اب تک ناکام رہی تھیں۔

☆☆☆

رضوانہ ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی پھر حماد اور احمر تھے اور سب سے چھوٹی غزالہ تھی۔ گزشتہ برس ہی بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے غزالہ کی شادی کردی تھی کیونکہ اس کے بہت رشتے آرہے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بڑی کے انتظار میں چھوٹی کی بھی عمر گزر جائے اور پھر جب تک چھوٹی گھر میں تھی ہر آنے والا اسی کو پسند کرتا تھا کیونکہ وہ کم عمر بھی تھی اور بڑی کے مقابلے میں زیادہ اچھی اور دلکش لگتی تھی۔

اسی مصلحت کی وجہ سے انہوں نے غزالہ کی شادی کردی تھی مگر اس کے بعد سے رضوانہ کا برتاؤ ان سب سے ہی الگ ہوگیا تھا۔

وہ بہن سے جلنے لگی تھی اور اس کا گھر آنا بھی پسند نہیں کرتی تھی حالانکہ غزالہ کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ شکل صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے اور رضوانہ خود بھی اتنی بدصورت نہ تھی ہاں بس بچپن کے چیچک کے کچھ داغوں نے اس کے چہرے کی رعنائی کو ختم کردیا تھا۔ اس کی رنگت بھی کافی دبتی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ صالحہ بیگم ابھی تک اس کا رشتہ کروانے میں ناکام رہی تھیں۔

رضوانہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسے آج بھی وہ ناگوار فریضہ انجام دینا پڑا۔ وہ مہمانوں کے سامنے چائے بھی پیش کرنے گئی مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے خاص طور پر تیار ہونے کی زحمت نہ کی۔ جو کپڑے ماں نے اسے پہننے کے لیے کہے تھے وہ اسی طرح ہینگر میں لٹکے رہے اور ہمیشہ کی طرح وہی ہوا کہ لڑکے والوں نے معذرت کہلوادی۔

اس روز گھر میں پھر وہی تماشا ہوا جو ہر بار ہوتا تھا۔ رضوانہ نے جان بوجھ کر کانچ کے برتن توڑے، دروازے پٹخے اور سب کا بائیکاٹ کرکے کمرا نشین ہوکر رہ گئی۔ اس روز اس نے کھانا کھایا اور نہ کسی سے بات کی۔ وہ روز بروز...چڑچڑی اور غصیلی ہوتی جارہی تھی اور گھر میں یہ بات باعثِ تشویش بنتی جارہی تھی۔

''اس لڑکی نے تو حد ہی کردی...... اتنی بدمزاجی نے رہی سہی شکل صورت بھی خراب کردی۔ میں اس کے لیے بہت پریشان ہوگئی ہوں۔'' صالحہ بیگم تو روہانسی ہوگئی تھیں۔ غزالہ نے ہر ممکن طریقے سے ان کی دلجوئی کی۔

''آپ نے بھی تو حمیدہ خالہ پر اکتفا کیا ہوا ہے کوئی دوسرا ذریعہ بھی تو نکالیں۔ ارے ہاں......کیوں نہ ہم شادی دفتر والوں سے رجوع کریں۔'' اسے نیا خیال آیا اور انہیں بھی غزالہ کا آئیڈیا برا نہیں لگا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے حمیدہ خالہ نے انہیں آسرا دے رکھا تھا۔ ہر بار وہ نئی امید اور لگن کے ساتھ رشتے کے لیے آنے والوں کو خوش آمدید کہتیں۔ ان کے لیے پُرتکلف ناشتے پانی کا اہتمام کرتیں اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات اور اب تو انہیں رضوانہ کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی بدمزاجی سے بھی خوف آنے لگا تھا وہ جلد سے جلد اس کے ہاتھ پیلے کرکے اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔

دراصل شادی دفتر والوں پر اعتبار کرنے سے وہ بہت ڈرتی تھیں۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ وہ خود بہت گھریلو قسم کی خاتون تھیں اور کچھ یہ خوف بھی تھا کہ بالکل انجانے اجنبی لوگ کہیں غلط نہ نکل آئیں۔ حمیدہ خالہ پر یوں بھروسا تھا کہ وہ ایک حد تک اپنی طرف سے گارنٹی دیا کرتی تھیں اور پھر یہ کہ وہ صالحہ کے گھر کے ماحول کو بھی اچھی طرح سمجھتی تھیں اسی لیے ان سے مطابقت رکھتے ہوئے رشتے لے کر آیا کرتی تھیں مگر رضوانہ کے نصیب پر تو جیسے قفل پڑ گئے تھے۔

غزالہ کے حوصلہ دلانے پر انہوں نے شادی دفتر والوں سے رجوع کرلیا مگر اس سے پہلے اپنے شوہر شفیق احمد سے بھی اجازت لے لی۔ انہوں نے بھی کچھ پس و پیش کے بعد اجازت دے دی کیونکہ درحقیقت اب وہ بھی رضوانہ کی شادی کے لیے پریشان ہوگئے تھے۔ ایک بار پھر نئی امنگ، نئے حوصلے اور نئی امید کا دامن تھام کر صالحہ ہر روز دروازے پر نگاہیں ٹکائے منتظر سی بیٹھی رہتیں کہ جانے کب بیٹی کی زندگی کی خوشیاں اچانک آجائیں لیکن یہاں پر بھی ایک بڑا امتحان ان کا منتظر تھا۔

دراصل رضوانہ خود ان کے لیے آزمائش بنتی جارہی تھی۔ اس کا غصہ، بدمزاجی اور زبان درازی انہیں بہت تکلیف پہنچاتی تھی۔ جس روز شادی دفتر والوں کی طرف سے پہلی بار کچھ لوگ اسے دیکھنے کے لیے آئے تو رضوانہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ کر کمرے میں بند ہوکر بیٹھ گئی۔ ہزار منّت اور خوشامد کے بعد جب وہ اپنے عام سے حلیے میں بیزار صورت بنائے تیوریاں چڑھائے ان لوگوں کے سامنے گئی تو کچھ اور بھی بدصورت لگنے لگی۔ حسبِ توقع نتیجہ ناکامی کی صورت میں سامنے آیا۔

''اری بدبخت، یہ بدمزاجی تو تجھے اور بھی زیادہ برا دکھاتی ہے۔ کیوں میرا دل دُکھاتی ہے کیا تھا جو اگر تم خوش اخلاقی سے ان سے مل لیتیں۔'' جب برداشت کی حد ختم ہوئی تو اماں اس پر برس پڑیں۔

''میں جیسی ہوں انہیں ویسی ہی دکھائی دیتی ہوں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے خواہ مخواہ کی خوشامد اور چاپلوسی کی۔ مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔'' اس نے تڑخ کر انہیں جواب دیا اور حسبِ عادت ہاتھ میں تھمی پلیٹ زور سے سیلپ پر پٹخ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو صالحہ بھی مایوس اور افسردہ ہوگئیں۔ ان کے وظائف اور عبادتوں کا دورانیہ بھی طویل ہوتا جارہا تھا۔ کئی دفعہ کی نمائش کے بعد رضوانہ نے انہیں آئندہ کسی کے سامنے بھی جانے سے صاف منع کردیا تھا اور اسی بات سے ان کا دل زیادہ دُکھا تھا مگر پھر جیسے خدا ان پر بھی مہربان ہو ہی گیا۔

خلافِ توقع شادی دفتر والوں نے لڑکے والوں کی طرف سے رشتے کا سندیسہ بھیجا تو لمحے بھر کے لیے صالحہ پر شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اِدھر رضوانہ بھی یہ خبر سن کر جہاں کی تہاں گنگ سی اپنی جگہ پر بیٹھی رہ گئی اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اسے بھی کسی نے پسند کرلیا ہے۔

اگلے چند دن آپس کے مذاکرات میں گزر گئے۔ لڑکے کی تصویر بھی خاصی معقول تھی۔ رضوانہ نے بھی تصویر دیکھی اور رضامندی ظاہر کردی۔ دو ماہ بعد کی شادی کی تاریخ رکھنے پر غور کیا جانے لگا۔ صالحہ اور غزالہ، شفیق احمد کے ساتھ جاکر لڑکے کو بھی دیکھ آئے تھے۔ وہ سب بہت خوش تھے مگر رضوانہ کو یہ خوشی راس نہیں آئی۔

لڑکے والوں نے انہیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی مگر قسمت سے وہ ان کے دام میں آنے سے بچ گئی۔ جس لڑکے سے ان لوگوں کو ملوایا گیا تھا وہ دراصل ان صاحب کا بیٹا تھا مگر وہ صاحب خود پینسٹھ سال کے تھے وہی اصل اُمیدوار تھے.... جب بھائی حماد، غزالہ کے شوہر کے ساتھ ان کے آفس پہنچے تو چند مہربان لوگوں کی نشاندہی پر دھوکے اور فریب کا احوال اِن پر کھل گیا۔ ان لوگوں نے بھی انجانے میں ان پر یہ مہربانی کی تھی مگر آفس میں بیٹھے قدرے فربہ اور گنجے سے ادھیڑ عمر شخص کو رضوانہ کے ہونے والے شوہر کے روپ میں دیکھ کر ان دونوں ہی کو جھٹکا لگا تھا۔

جس طرح چٹ پٹ کرکے رشتہ طے ہوا تھا اسی طرح توڑ بھی دیا گیا لیکن رضوانہ کے اندر کی توڑ پھوڑ آتش فشاں کی طرح لاوا بن کر ابل پڑی۔ پہلے تو وہ جی بھر کر چیخی اور اٹھا پٹخ کی، اس کے بعد وہیں سب کے سامنے بیٹھ کر خوب روئی اور پھر اسے گہری چپ لگ گئی۔ صالحہ کو اسے یوں خاموش دیکھ کر ہول آنے لگے وہ پہلے سے بھی زیادہ پژمردہ، اداس اور بجھی بجھی سی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر رونق تھی نہ امید کی چمک... اس کی حالت دیکھ کر ماں کا دل کٹنے لگتا۔

کسی نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ بیٹی کے رشتے کے لیے کسی بزرگ سے رجوع کریں تاکہ اس کے رشتے پر جو بندش کی گئی ہے اس کا خاتمہ ہوسکے اور یہ بات ان کے دل کو ایسی لگی کہ وہ دن رات اسی فکر میں الجھی رہتیں۔ کبھی کہیں تو کبھی کسی کے پاس پہنچ جاتیں اور بیٹی کی فکر میں جیسے وہ گھر کی دوسری ذمے داریوں سے غافل ہوگئی تھیں۔ آنکھیں تو جب کھلیں جب ایک روز انہوں نے اُڑتی، اڑتی یہ خبر سنی کہ ان کا بیٹا احمر کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔ خبر نہیں تھی تو صرف انہی کو نہیں تھی ورنہ آس پڑوس اور محلے والے بھی اس کے افیئر کے بارے میں جانتے تھے۔

''یہ میں کیا سن رہی ہوں احمر..... تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟'' وہ اس پر چڑھ دوڑیں۔

''اماں پسند کی شادی کرنا گناہ تو نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کو آپ کی اور ابا جی کی دعاؤں کے ساتھ اس گھر میں لانا چاہتا ہوں۔ آپ ابا جی سے بات تو کریں۔'' ان کی توقع کے برخلاف احمر نے ان سے بدتمیزی کرنے کے بجائے عاجزانہ درخواست کی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

ویسے ماں تھیں اس لیے فوراً ہی دل پسیج گیا اب وہ اتنی بھی تنگ نظر نہ تھیں کہ اپنی بیٹی کے لیے بیٹے کی زندگی حرام کردیتیں۔ بہت سوچ کر انہوں نے نپے تُلے لفظوں میں شوہر سے بات کی لیکن وہ اپنے غصے کو دبا نہ سکے۔

''صاحبزادے کا دماغ خراب ہوگیا ہے، عشق کا بخار چڑھ گیا ہے اسے..... ارے پہلے کچھ بن کر تو دکھائے یا یونہی خالی ہاتھ پیروں پر شادی کرکے لائے گا اسے۔'' وہ بدستور بگڑے رہے۔

معاملہ اتنا سیدھا نہ تھا۔ صالحہ انہیں رام نہ کرسکیں۔ گھر میں ایک نیا محاذ کھل گیا اور وقتی طور پر رضوانہ کا معاملہ پسِ پشت چلا گیا۔ باپ بیٹے میں رسّا کشی جاری ہوگئی اور ماحول پر تناؤ چھا گیا۔ احمر کی نکلتی جوانی اسے باغی بنارہی تھی۔ صالحہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ

سسرال چلو

نچوانے اپنے بال چلو
کھنچوانے اپنی کھال چلو
لٹوانے اپنا مال چلو
ہونا ہے اگر کنگال چلو
سسرال چلو، سسرال چلو

دو تحفے سالیوں سالوں کو
کچھ اُن کے قرابت والوں کو
شیرینی بچوں بالوں کو
ٹپکانے منہ سے رال چلو
سسرال چلو، سسرال چلو

ماں باپ کی مت پروا کرو
ہاں ساس، سسر کی چاہ کرو
یوں اپنے تئیں گمراہ کرو
غیرت کو پیچھے ڈال چلو
سسرال چلو، سسرال چلو

دانا ہو اگر نادان بنو
انسان نہیں حیوان بنو
بیوی کے گاڑی بان بنو
اپنی نہیں اُس کی چال چلو
سسرال چلو، سسرال چلو

سسرال جو ہر دم جاتے ہو
کیوں اپنی ساکھ گنواتے ہو
کیوں خود کو چغد کہلاتے ہو
مت ایسے میرے لال چلو
سسرال چلو، سسرال چلو

شاعر: گل بادشاہ
مرسلہ: شبینہ گل، راولپنڈی

سرکشی پر اتر آیا ہے۔ ایک طرف شفیق صاحب تھے جو کسی طور پر بھی اس لڑکی کو اپنانا تو کجا اسے دیکھنے پر بھی رضامند نہ تھے دوسری طرف احمر تھا جو ہر حال میں انہیں لڑکی سے ملوانا چاہتا تھا۔ سب ہی نے اسے سمجھالیا۔ غزالہ نے اور اس کے شوہر نے بڑے بھائی نے حتیٰ کہ رضوانہ نے بھی کوشش کر ڈالی مگر وہ اپنی بات پر بضد تھا۔ باپ نے اس لڑکی سے نہ ملنے کی قسم کھالی تھی۔

عجیب تناؤ زدہ ماحول ہوگیا تھا۔ انہی دنوں غزالہ کی ایک دوست کے توسط سے رضوانہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے تھے۔ اس گرما گرمی کے ماحول میں رضوانہ کی اکڑ بھی کچھ کم ہوگئی تھی یا یہ کہ غزالہ کی دوست اقرا کے دوستانہ مزاج اور شیریں بیانی کا اثر تھا کہ رضوانہ چوں بھی نہ کرسکی۔

اقرا نے شادی سے پہلے گرومنگ کا کورس کیا تھا اور آج کل وہ ایک پارلر بھی چلا رہی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے رضوانہ کو تیار کیا۔ سارا دن لگا کر اس نے رضوانہ پر اتنی محنت کی کہ اس کی مرجھائی ہوئی شکل، ڈل رنگت اور مایوس تاثرات جانے کہاں غائب ہوگئے۔ اقرا میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ مقابل سے اپنی بات منوالیا کرتی تھی سو رضوانہ بھی اس کے آگے کچھ نہ بول سکی۔

تیار ہونے کے بعد اس نے آئینے میں اپنے سنورے روپ کو دیکھا تو اسے خود بھی یقین نہیں آیا۔ اس پر ستم اس کے ڈھیلے بالوں سے نکلی لٹیں اسٹائلش سے انداز میں اس کے گالوں پر جھولتی بے حد خوب صورت تاثر پیش کررہی تھیں اور شاید پہلی بار وہ بِنا تیوریاں چڑھائے خود کو سنوار کر یوں بردکھوے کے لیے تیار ہوئی تھی۔

مہمانوں کے آنے میں ابھی وقت تھا اس لیے وہ فرصت سے بیٹھی ان لوگوں کا انتظار کررہی تھی مگر وقت سے پہلے ہی دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ غزالہ نے جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ احمر اس لڑکی کو ملوانے کے لیے گھر... لایا ہے اور اس کے بعد گھر، گھر نہیں میدانِ کارزار بن گیا۔

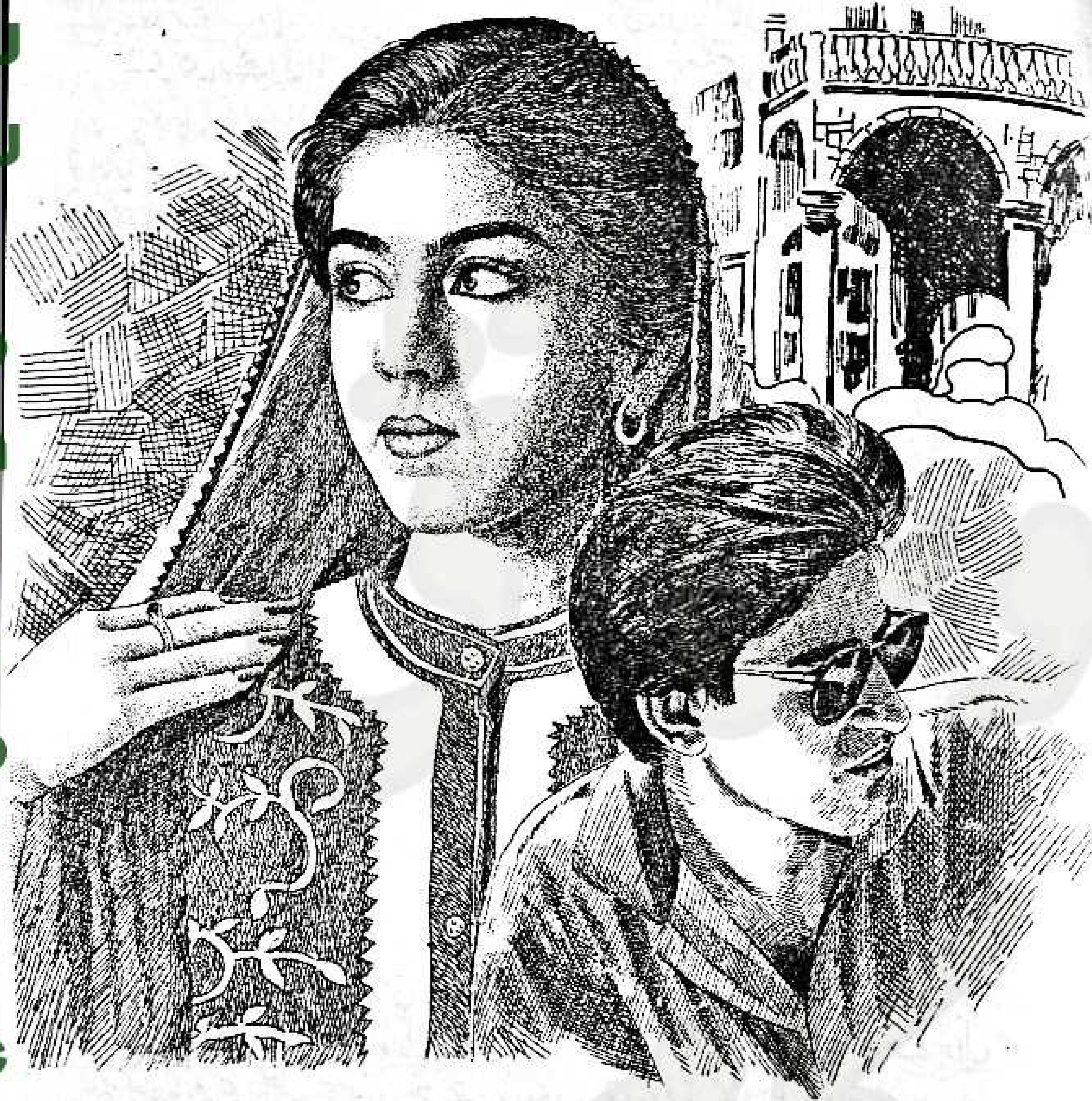
شفیق احمد کی باتوں کی گھن گرج توپ کے گولوں کی طرح بیٹے پر برسنے لگی اور اس گھن گرج میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا کہ جب حماد نے انہیں یہ اطلاع دی کہ وہ لڑکی ایک ماڈل گرل ہے۔

''ہائے افسوس...... ولی کے گھر شیطان، ارے تم نے تو اپنے بزرگوں کی اور اپنے خاندان کی عزت نیلام کردی۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں اپنی پسند پر اختیار ہے لیکن ماڈل گرل سے شادی......؟ تف ہے تم پر...... ارے وہ ماڈل گرل جو سارے زمانے کے سامنے سج بن کر اپنی نمائش کرتی ہے۔ ارے خود سوچو وہ ایک بدنامِ زمانہ، بے حیا لڑکی ہے۔ تیار ہوکر اپنی اداؤں سے سب کو رجھاتی ہے اپنے حسن سے سب کو زیر کرتی ہے۔ آخ...... کہاں یہ ماڈل گرل اور کہاں ہم جیسے خاندانی لوگ۔ ارے یہ جوڑ تو کہیں سے بھی نہیں ملتا۔ یہ ایک ماڈل گرل اور پھر ہم عزت دار لوگ ہیں۔'' شفیق احمد غصے سے بے قابو ہوکر کف اُڑا رہے تھے اور اندر بیٹھی رضوانہ کے کانوں میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا تھا۔

آئینے میں اس کا سجا سنورا روپ اپنے جلوے دِکھا رہا تھا اور اس کے کانوں میں شفیق احمد کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''یہ ایک ماڈل گرل...... یہ ایک ماڈل گرل......!'' ان کے ایک ہی جملے کی تکرار اس کے ماؤف ذہن میں کسی دیوانے کی طرح سر پٹخنے لگی۔ اس نے پتھرائی نظروں سے آئینے میں نظر آنے والی اس سجی سنوری لڑکی میں اپنا آپ ڈھونڈنا چاہا مگر وہاں تو صرف ایک ماڈل گرل نظر آرہی تھی جسے کچھ دیر بعد خود کو نمائش کے لیے پیش کرنا تھا۔





ناولٹ

دیپ دل کے جلے

تابندہ جبیں

ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے نام کے ساتھ عبدالحئی کا نام سنا تھا۔ بچپن میں جب وہ شازیہ کے ساتھ مل کر گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتی تھی تب ایک دن شازیہ نے اسے رازداری سے بتایا تھا۔

''پتا ہے فروزاں جب تُو بڑی ہوجائے گی تب حئی بھیا کی دلہن بن کر ہمارے گھر آکر رہنا پڑے گا۔'' شازیہ اس کی سگی تایازاد، پکی سہیلی اور عبدالحئی کی چھوٹی بہن تھی۔ شازیہ کی بات پر غور کیے بنا اس

جاسکتا تھا۔ اس گھر کی گاڑی کھینچنے کے لیے کسی کو تو اپنے خوابوں کی قربانی دینی تھی سو عبدالحیٔ نے دے دی۔ فروزاں کے والد کو پتا چلا تو خوب خفا ہوئے۔

"بی ایس سی میں تیسری پوزیشن لینے کے بعد یہ دکان ہی سنبھالنی تھی تو کیا ضرورت تھی خود کو مشقت میں ڈالنے کی۔ یہ کام تو میٹرک یا ایف اے کے بعد بھی کیا جاسکتا تھا۔"

"اگر میٹرک یا ایف اے کے بعد میرے گھر کو میری ضرورت پڑتی تو میں جب بھی اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کردیتا۔" عبدالحیٔ نے ٹھنڈے لہجے میں چاچا کو جواب دیا۔ کچھ دنوں سے اسے چاچا کا رویّہ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

بھاوج کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک تو نصیرالدین نے بھائی اور بھائی کے گھر والوں کی پورے خلوص سے دل جوئی کی تھی مگر اب وہ کچھ بیزار اور اکتائے ہوئے لگتے تھے۔ عبدالحیٔ کو بہت جلد ان کے بدلتے رویّے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ محلے میں آج کل ایک نیا خاندان آکر آباد ہوا تھا۔ فیض عالم منڈی میں بڑا آڑھتی تھا۔ خوب چلتا ہوا کام تھا۔ اس گھرانے کے رہن سہن سے ہی ان کی مالی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ تین جوان بیٹے بھی کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ فروزاں کے والد اور فیض عالم میں بہت جلد گہرا یارانہ ہوگیا۔ گھر والے بھی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔ فیض عالم کی بیوی کو شہزادیوں جیسا حسن رکھنے والی فروزاں اتنی بھائی کہ اپنے بڑے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگ لیا۔ فروزاں کی ماں نے فروزاں کی بچپن کی نسبت کے بارے میں بتا کر سبھاؤ سے انکار کرنا چاہا۔

"بھابی ہمیں جواب کی کوئی جلدی نہیں، اچھی طرح سوچ کر جواب دیں بلکہ نصیرالدین بھائی سے مشورے کے بعد ہی کوئی جواب دیں اور خود سوچیں وہ معمولی دکان دار آپ کی بیٹی کو کیا دے گا۔ فروزاں ہمارے گھر میں آکر رانی بن کر راج کرے گی۔ اسے جو ٹھاٹھ باٹ ہمارے گھر آکر نصیب ہوگا آپ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں، اسے اپنے تایا کے گھر بیاہیں گی تو اس کا حسن رُل جائے گا۔ وہ دو کمروں کا مکان فروزاں جیسی شہزادی کے رہنے کے قابل ہے بھلا۔" زرینہ بیگم، شائستہ کے انکار کو خاطر میں ہی نہ لائی تھیں۔

"فروزاں بچپن کی منگ ہے عبدالحیٔ کی۔ یہ بندھن اتنی آسانی سے تھوڑی ٹوٹتے ہیں۔" شائستہ بیگم نے اس بار کچھ بے رخی سے جواب دیا۔ انہیں زرینہ کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔ اگر اس کی مالی حیثیت آڑے نہ آتی یا کسی پرانی پڑوسن نے اس قسم کی کوئی بات کی ہوتی تو وہ اسے جھاڑ کر رکھ دیتیں لیکن شوہر کی ان نئے پڑوسیوں سے بہت جلد بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ زرینہ کو کوئی سخت جواب دینے پر نصیرالدین برا مناتے سو شائستہ نے بات ٹالنا ہی مناسب جانا لیکن دو دن بعد نصیرالدین نے خود یہ موضوع چھیڑ کر شائستہ کو حیران کردیا۔

"فیض عالم کی بیوی تمہارے پاس آئی تھی؟" رات سونے سے پہلے جب شائستہ حسبِ معمول شوہر کی ٹانگیں دبا رہی تھی جب نصیرالدین نے بیوی کو مخاطب کیا۔

"وہ تو ہر دوسرے دن ہی آتی ہے۔ فارغ بندی ہے نوکروں پر گھر چھوڑ ہوا ہے۔ جب دیکھو محلے کے گشت پر نکلی ہوتی ہے۔" شائستہ کو اب زرینہ کی شیخی مارنے... والی عادت سے کچھ چڑ ہونے لگی تھی اس وقت بھی زرینہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"اس نے ہماری فروزاں کا رشتہ مانگا اور تم نے مجھ سے ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" نصیرالدین نے جیسے بیوی کی بات سنی ہی نہ تھی۔ اس نے شائستہ کو ٹھنڈے انداز میں مخاطب کیا۔

"یہ کوئی بتانے والی بات تھی بھلا فروزاں کے ابا!" شائستہ خفا ہوئی۔

"میں فروزاں کا باپ ہوں شائستہ بیگم۔ اس کے مستقبل کے متعلق کوئی بھی فیصلہ تم اکیلی کرنے کی مجاز نہیں ہو۔" آج نصیرالدین کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔

"کیسی باتیں کررہے ہو نصیرالدین۔ فروزاں کے مستقبل کا فیصلہ ہوچکا ہے اور مجھ اکیلی نے نہیں کیا تم اور تمہارے بھائی، بھاوج، یہ ہم چاروں کا متفقہ فیصلہ تھا اور اب تو بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ ان کے دل میں بھی آگیا ہے۔"

"وہ بہت پرانی بات تھی۔" نصیرالدین نے بے پروا سا انداز اپنایا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو نصیر؟" شائستہ کو کسی انہونی کا خیال لرزا گیا۔

"دیکھ شائستہ ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کر۔" نصیرالدین اٹھ بیٹھا اب اس کا لہجہ بہت دوستانہ تھا۔

"فروزاں ہماری اکلوتی بیٹی ہے اور اللہ کے کام اللہ ہی جانے کہ اس نے ہم غریبوں کے گھر ایسی شہزادیوں جیسی بیٹی کیوں بھیجی۔ تو خود بتا فروزاں کی ماں..... تو نے دور نزدیک میں اپنی فروزاں جیسی خوب صورت کوئی اور لڑکی دیکھی ہے کیا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ شائستہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کس بات کی تمہید باندھنے جارہا تھا اسے کچھ، کچھ اندازہ ہوگیا تھا پھر بھی وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ اس کا ہر اندیشہ، ہر اندازہ غلط ثابت ہو۔

"ٹھیک ہے عبدالحیٔ میرا بھتیجا ہے، مجھے بہت پیارا ہے وہ...... لیکن اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر نہیں پھر اس کا مستقبل ہی کیا ہے۔ چلو پڑھ لکھ کر افسر بن جاتا کوئی اچھی سی سرکاری ملازمت مل جاتی بھلے سے کسی اسکول، کالج میں پڑھانے ہی لگتا۔ پنشن، گریجویٹی کا تو آسرا ہوتا پھر ہر سال حکومت سرکاری ملازموں کی تنخواہ میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ بڑھتی مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ تو ہوتا عبدالحیٔ کے پاس۔ اب وہ معمولی سا جنرل اسٹور جس سے بھائی جان ہی تین بچوں کو مشکل سے پالتے تھے عبدالحیٔ اس سے کتنا کما لیا کرے گا بلکہ جو تھوڑی آمدنی پہلے ہوجاتی تھی اب اتنی ہونا بھی ممکن نہیں۔ عبدالحیٔ کے پاس دکان داری کا تجربہ نام کو نہیں۔ ساری عمر بھائی جان نے دکان کے قریب نہ لگنے دیا کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر افسر بنے گا اور جب افسر بننے کا وقت آیا تو خود مصلّیٰ سنبھال کر بیٹے کو دکان داری پر لگا دیا۔" نصیرالدین کے لہجے میں تنفر سمٹ آیا تھا۔ شائستہ چپ چاپ اسے سنے جارہی تھی۔

"میں اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے ایک مشقّت بھری مشکل زندگی کی طرف نہیں دھکیل سکتا اور جب قدرت کی طرف سے گھر بیٹھے بہترین رشتہ مل رہا ہو تو کیا ہمیں اس سے انکار کرکے کفرانِ نعمت کرنا چاہیے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"تم اپنی مرحومہ بھاوج کو کیا منہ دکھاؤ گے نصیرالدین؟" شائستہ کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"او جھلئے یہ وقت ان جذباتی باتوں کا نہیں ہے۔"

"تمہارا بھائی جو بیوی کے مرنے کے بعد تقریباً حواس کھو بیٹھا ہے کیا یہ مزید صدمہ سہار پائے گا؟" نصیرالدین کے خونی رشتوں کا خیال شائستہ کو تڑپا رہا تھا۔

"تو خود ہی تو کہہ رہی ہے کہ بھائی حواس کھو بیٹھا ہے۔ کیا فرق پڑے گا اسے اس بات سے۔" شائستہ نے اسے دکھ سے دیکھا۔ اولاد کی محبت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی لیکن یہ کیسی محبت تھی وہ اپنی بیٹی کو آسائشات والی زندگی تو دینا چاہ رہا تھا مگر اس کا دل اجاڑ رہا تھا اور یہی بات شائستہ نے اسے سمجھانی چاہی تھی۔

"فیض عالم کے بیٹے سے فروزاں کو بیاہنے کا

مطلب سمجھتا ہے تو...... تیری بیٹی کے ہونٹوں سے ہنسی ہمیشہ کے لیے روٹھ جائے گی۔ بہت چاہتی ہے وہ عبدالحیٔ کو۔ اس کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔" وہ فروزاں کی ماں تھی جانتی تھی عبدالحیٔ اس کی بیٹی کے دل کی دھڑکن ہے۔

"دیکھ شائستہ، افسانوی باتیں مت کر۔ میں جانتا ہوں وقتی طور پر فروزاں کو دھچکا لگے گا لیکن جب وہ نوید کی دلہن بن کر فیض کے گھر جائے گی تو اسے اندازہ ہوجائے گا کہ باپ نے جو سوچا اس کے بھلے کے لیے سوچا۔ تجھے ان لوگوں کی دولت کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ تو عارضی طور پر یہ مکان خرید کر یہاں رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔ شہر سے باہر جو نئی کالونی بن رہی ہے ناں وہاں اتنا شاندار بنگلا زیرِ تعمیر ہے کہ کیا بتاؤں...... فروزاں کی شادی سے پہلے یہ لوگ وہاں شفٹ ہوجائیں گے۔ دو، دو گاڑیاں، نوکر چاکر، زندگی کی ہر آسائش، ہر سہولت...... ارے راج کرے گی ہماری فروزاں وہاں۔"

"تو جو مرضی کہہ لے نصیر...... اگر میری بیٹی کی زندگی کا فیصلہ کرتے وقت میری رائے کو اہم سمجھے گا تو میری طرف سے سو بار انکار ہے۔" شائستہ نے قطعیت سے جواب دیا۔

"احمق عورت، جاہل، بے وقوف تیری رائے کو میں اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہوں۔ میں باپ ہوں فروزاں کا۔ اس کے متعلق ہر قسم کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف میرے پاس ہے۔" نصیرالدین کی برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔ فیض عالم کی دولت کی چکا چوند نے اس کی بینائی سلب کرلی تھی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہوچکی تھیں۔ شائستہ نے اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔ لڑ جھگڑ کر، منت ترلے کرکے، رو دھو کر۔ وہ اپنی بیٹی کے دل کی خوشی کے لیے ہر حربہ آزما گئی تھی لیکن نصیرالدین کا دل تو شاید پتھر کا ہوگیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ بیٹی کی بھلائی چاہ رہا تھا۔ شائستہ اس کے نزدیک جذباتی اور کم عقل عورت تھی، اسے اپنی لاڈلی فروزاں کی ویران آنکھیں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ ماں، باپ کی ہر وقت کی بحث اس کے علم میں یہ معاملہ لے آئی تھی اور جب اس کی ماں اس کا مقدمہ ہار گئی تو اسے سینے سے لگا کر آنسو بہاتے ہوئے اسے نئی صورتِ حال سے سمجھوتے کی تلقین کرنے لگی۔

اسی شام چھوٹے بھائی گڈو کی انگلی پکڑ کر فروزاں تایا کے گھر جا پہنچی تھی۔ عبدالحیٔ دکان بند کرکے ابھی لوٹا تھا۔ آج جانے کیوں اس کے دل میں عجیب سا اضطراب پھیل رہا تھا وہ وقت سے پہلے دکان بند کرکے گھر آگیا تھا۔ شازیہ اسے چائے کا کپ پکڑا رہی تھی جب ہراساں سی فروزاں بنا دستک دیے دروازہ کھولتی اندر داخل ہوئی۔ تائی کے مرنے کے بعد وہ دن میں شازیہ کے پاس کئی چکر لگاتی تھی ہاں شام کو عبدالحیٔ کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ اس سے پہلے ہی واپس لوٹ جاتی لیکن آج وہ خلافِ معمول اس وقت آئی تھی۔ اس کا انداز کسی انہونی کا احساس دلا رہا تھا۔

"کیا ہوا فروزاں، خیریت تو ہے؟" شازیہ جلدی سے اس کی سمت بڑھی۔

"تایا کدھر ہیں؟" اس نے شازیہ کی بات جیسے سنی ہی نہ تھی۔

"ابا اندر ہیں کمرے میں، خیریت تو ہے ناں؟" اس بار شازیہ کے بجائے عبدالحیٔ نے جواب دیا تھا۔ فروزاں اسے بھی نظرانداز کرتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ عبدالحیٔ اور شازیہ اس کے پیچھے لپکے تھے۔

"تایا ابا!" اس نے انہیں پکارا۔ تایا آنکھیں موندے لیٹے ہوئے تھے۔ ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"تائی اماں چلی گئیں ہم تو زندہ ہیں ناں۔"

"کیا ہوا پتر؟" انہوں نے نحیف آواز میں پوچھا وہ چند مہینوں میں ہی بہت بوڑھے اور کمزور ہوگئے تھے۔

"بچپن میں جب بھی ابا اور اماں کا جھگڑا ہوتا تھا تو میں بھاگ کر آپ کو بلانے آجاتی تھی پھر آپ ابا کو سمجھاتے تھے اور انہیں ڈانٹ کر چپ کروایا کرتے تھے اور ابا آپ کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ آپ کے ڈانٹنے کے باوجود کبھی پلٹ کر جواب نہ دیتے سر جھکا کر خاموش ہوجاتے۔" وہ بہت پرانی باتوں کا حوالہ دے رہی تھی۔ حفیظ الدین اسے ناسمجھی سے تکنے لگے۔

"ہوا کیا ہے فروزاں؟" عبدالحیٔ نے اسے پکارا۔ فروزاں نے ایک بار پھر اس کی بات سنی ان سنی کردی وہ صرف تایا سے مخاطب تھی۔

"تایا ابا، خدا کے لیے ابا کو آکر سمجھائیں۔ بھلے ان سے لڑیں جھگڑیں، انہیں ڈانٹیں لیکن اپنے بڑے بھائی والا اختیار استعمال کریں۔ ابا میری شادی فیض عالم کے بیٹے سے کرنا چاہ رہے ہیں۔" آخر میں وہ تایا کا ہاتھ تھام کر بلک ہی پڑی۔

"سن لیا تم نے؟" عبدالحیٔ غضب ناک ہوکر شازیہ کی طرف مڑا۔ "میں نے جب بھی تم سے کہا کہ چاچا کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ تم فروزاں سے تصدیق کرکے بتاؤ تو تم ہمیشہ مجھے سمجھانے بیٹھ جاتی تھیں کہ لوگ تو بے پر کی اڑاتے ہیں، ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو بھیا...... محلے کے کتنے لوگوں نے مجھے قبل از وقت آگاہ کرنا شروع کردیا تھا کہ چاچا اور فیض عالم اپنی دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور میں ہمیشہ تمہاری باتوں میں آکر لوگوں کی بات ایک کان سے سنتا دوسرے کان سے نکال دیا کرتا تھا۔" عبدالحیٔ بہن پر برس رہا تھا۔

"اسے کیوں ڈانٹ رہے ہو اس کا کوئی قصور نہیں۔ ہمت ہے تو میرے ابا سے آکر جھگڑا کرو۔

اقوالِ حضرت علیؓ

☆ دولت مٹی کی طرح ہے...... اور مٹی پاؤں کے نیچے رہنی چاہیے۔ سر پر چڑھاؤ گے تو قبر بن جائے گی اور قبریں زندہ انسانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

☆ انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے کا ماہر ہے لیکن...... نعمتوں کا حساب رکھنا بھول جاتا ہے۔

☆ غصہ ہمیشہ تنہا آتا ہے لیکن جاتے ہوئے اپنے ساتھ عقل، سمجھ، اخلاق، ذہانت اور شخصیت کی خوب صورتی بھی لے جاتا ہے۔

مرسلہ: عظمیٰ عنبرین، ڈی جی خان

تین عبادات

آپ کا مقدر بدل سکتی ہیں

1۔ استغفراللہ کی کثرت

2۔ کلمۂ طیبہ کا ورد

3۔ درودِ پاک کی کثرت

مرسلہ: ڈاکٹر نفیسہ نہال، لاہور

سالگرہ کا خصوصی تحفہ قارئین کے لیے

1۔ سورۂ یٰسین فجر کے بعد پڑھنے سے ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔

2۔ سورۂ واقعہ عشا کے بعد پڑھنے سے کبھی فاقہ وفقر نہیں آتا۔

3۔ سورۂ کوثر دشمنوں کی عداوت سے بچنے کا بہترین ہتھیار ہے۔

4۔ سورۂ کافرون، موت کے وقت کفر سے بچاتی ہے۔

5۔ سورۂ اخلاص منافقت سے بچاتی ہے۔

6۔ سورۂ فلق حاسدوں سے اور حادثوں سے بچاتی ہے۔

7۔ سورۂ ناس وسوسوں سے بچاتی ہے۔ (معوذتین پڑھنا نظرِ بد سے نجات دلانے میں مددگار ہے)

از: ماہ نور قیصر، راول پنڈی

انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے جو کرسکتے ہو کرو۔'' فروزاں نے بچپن کے بعد شاید پہلی بار بڑی جرأت سے عبدالحیٰ کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ شازیہ چپ چاپ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

''چاچا ایسا کیسے کرسکتے ہیں؟'' اس نے روتے روتے فروزاں کو مخاطب کیا۔

''پیسہ نصیرالدین کی ہمیشہ کمزوری رہا ہے پتر۔ پر یہ پہلی بار ہوا ہے کہ اسے پیسے اور خونی رشتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑ رہا ہے۔ مال اور اولاد کو ایسے ہی تو آزمائش نہیں کہا گیا ہے اور نصیرالدین کو تو اولاد کی محبت مال کی طرف کھینچ رہی ہے۔ اگر معاملہ اس کی اپنی ذات کا ہوتا تو ہوسکتا ہے وہ سمجھ جاتا مگر تجھ میں تو جان ہے میرے بھائی کی پتر۔ وہ تجھے محل کی رانی بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ تو کیوں دو بھائیوں کو آمنے سامنے کروانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس نے ساری زندگی مجھے ''نہ'' نہیں کی۔ بڑھاپے میں یہ ایک اور غم میرے سینے پر کیوں سجانا چاہتی ہے۔ جا باپ کی مان لے۔'' تایا نے کتنے دنوں بعد اتنی طویل اور باربط بات کی تھی۔ اس نے حیران ہوتی شکوہ کناں نگاہوں سے تایا کو دیکھا۔

''میں رات کو آؤں گا چاچا سے بات کرنے اب تم گھر جاؤ۔'' فروزاں نے خالی، خالی نگاہوں سے عبدالحیٰ کو دیکھا پھر گڈو کی انگلی پکڑ کر تایا کی دہلیز پار کرگئی۔ رات کو عبدالحیٰ واقعی آگیا تھا۔ تایا اس کے ساتھ نہ تھے۔

''میں آپ سے ضروری بات کرنے آیا ہوں چاچا۔'' اس نے بہت تحمل اور ررسان سے نصیرالدین کو مخاطب کیا۔

''ہاں کہو۔'' نصیرالدین اس مرحلے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا اچھا تھا یہ قصہ آج ہی ختم ہوجاتا۔

''اماں کے بعد ہمارے گھر کو عورت کی شدید ضرورت ہے۔ ابا کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا ہے۔ واصف اسکول اور اسکول کے بعد ٹیوشن پھر شام کو دیر سے گھر لوٹتا ہے۔ شازیہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے، میں چاہ رہا ہوں کہ آپ جلد از جلد میری اور فروزاں کی شادی طے کردیں۔ کوئی نزدیک کی تاریخ رکھ لیں۔ یہ کام جتنی جلدی اور جتنی سادگی سے ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اگر اماں ہوتیں تو ظاہر ہے یہ بات وہ خود کرتیں لیکن خیر کسی کے جانے سے زندگی کے کام تھوڑی رکتے ہیں اور پھر اماں کی روح کو تو خوب خوشی اور اطمینان نصیب ہوگا۔ مرنے سے پہلے بھی ان کی یہ خواہش تھی کہ فروزاں جلد از جلد دلہن بن کر ان کے آنگن میں قدم رکھے۔''

''تم شازیہ کی شادی کا کیوں نہیں سوچتے۔ اس کے اکیلے پن اور تنہائی کا خیال ہے تو پہلے اسے گھر بار کا کرنے کا سوچو۔'' کچھ بھی تھا نصیرالدین ایک دم بھتیجے کو انکار نہ کرپائے۔ ہوسکتا ہے کچھ دنوں کی ٹال مٹول کے بعد وہ خود ہی سمجھ جائے کہ نصیرالدین اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرنے کا خواہش مند نہیں ہے۔ ذرا دیر پہلے عبدالحیٰ کی شکل دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ قصہ آج ہی ختم ہوجائے گا لیکن عبدالحیٰ نے بہت تدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے چاچا سے الجھنے یا جھگڑنے سے گریز کیا تھا اور بالکل جائز طریقے سے اپنی خواہش چاچا کے آگے رکھی تھی جواب میں نصیرالدین نے بھی اس پر بگڑنے کے بجائے شازیہ کی شادی کا مشورہ دے دیا۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے چاچا جان میں خود اس نہج پر سوچ رہا ہوں۔ شازیہ کے لیے بڑے ماموں نے اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ بھی دے دیا ہے لیکن آپ خود سوچیں، لڑکی کے جہیز کی تیاری مردوں سے کب ممکن ہے۔ ہمارا کام تو ہاتھ پر پیسہ رکھنا ہے۔ کپڑے لتوں کی خریداری، جہیز کی تیاری یہ تو سب عورتوں کے کرنے والے کام ہیں ناں میری شادی ہوجائے گی تو نند، بھاوج مل کر اپنی پسند سے

سامان خرید لیں گی اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ شازیہ کے بیاہ کے بعد ہمارے گھر کا چولھا چکی کون سنبھالے گا۔ پیچھے بچے گا کون۔ میں، ابا اور واصف...... گھر کی دیکھ بھال تو یقیناً عورت بہتر طور پر کرسکتی ہے۔'' عبدالحیٰ نے سنجیدگی سے انہیں مخاطب کیا تھا۔

''بہت خوب تو تم میری بیٹی کو ملازمہ بنا کر اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو۔ ہانڈی روٹی کرے گی، برتن مانجھے گی، میلے کپڑے دھوئے گی۔ بس اسی لیے شادی کی جلدی مچا رہے ہو؟'' نصیرالدین نے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔

''یہ سارے کام تو آپ کے گھر میں چاچی بھی کرتی ہیں تو گویا آپ انہیں بھی بیوی کی جگہ ملازمہ کا درجہ دیتے ہیں۔'' آخرکار عبدالحیٰ کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا تھا۔ جب دونوں چاچا بھتیجا جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے دل میں کیا ہے تو کب تک بات گھما پھرا کر ہوسکتی تھی اور آخر نصیرالدین نے ہی جواز فراہم کردیا تھا ان کی بےتکی بات سن کر عبدالحیٰ کو غصہ آگیا تھا بلکہ غصہ تو وہ پہلے سے ہی دل میں دبائے بیٹھا تھا وہ غصہ اب ظاہر ہوگیا تھا۔

''زبان سنبھال کر بات کرو عبدالحیٰ، یہ مت بھولو تم اس وقت میرے گھر میں بیٹھے ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں اسی وقت یہاں سے جانے کا حکم دے سکتا ہوں۔''

''میری امانت آپ کے گھر ہے چاچا، میں صرف آپ کو یہ یاد دلانے آیا تھا۔'' عبدالحیٰ نے بہت بےخوفی سے نصیرالدین کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک لمحے کو نصیرالدین نگاہیں چرا گیا مگر پھر بڑا بےپروا سا انداز اختیار کیا۔

''بچپن میں کیے گئے فیصلوں کو میں قطعی اہم نہیں گردانتا۔''

''آپ بھول رہے ہیں چاچا کہ یہ فیصلہ آپ نے ہمارے بچپن میں کیا تھا اپنے بچپن میں نہیں۔ آپ اس وقت عقل و شعور رکھتے تھے۔ آپ کی مرضی اور خواہش پر فروزاں کو مجھ سے منسوب کیا گیا تھا۔'' عبدالحیٰ تڑخ کر بولا۔

''زبانی بات ہی تھی ناں۔ کون سا میں نے نکاح کیا تھا اپنی بیٹی کا تمہارے ساتھ اور اگر نکاح بھی ہوتا تو ٹوٹ تو وہ بھی سکتا تھا۔ میں فروزاں کا باپ ہوں اس کے لیے جو مناسب سمجھوں گا وہی فیصلہ کروں گا بھلے کسی کو کوئی بھی اعتراض ہو۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔'' نصیرالدین کا لہجہ بالکل بےلچک تھا۔

''آپ اتنی آسانی سے سب کچھ کیسے ختم کرسکتے ہیں چاچا۔ آپ کا جو بھی مطالبہ ہو جو بھی خواہش ہے میں پوری کرنے کو تیار ہوں۔ آپ مجھ سے جو مرضی شرط لکھوالیں۔ میں فروزاں کے نام اپنا مکان تک کرنے کو تیار ہوں۔'' عبدالحیٰ نے یکلخت ہار مانتے ہوئے ملتجیانہ انداز اختیار کیا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اگر ایک بار وقت ہاتھ سے نکل گیا تو وہ اپنی فروزاں کو ہمیشہ کے لیے کھودے گا۔

''ہونہہ، وہ دو کمروں کا مکان، جس کی دیواریں سیلن زدہ ہیں تو دیمک کھائے کواڑ...... میری شہزادیوں جیسی بیٹی کا خوب بول لگایا تم نے عبدالحیٰ۔'' نصیرالدین نے طنز کیا۔ عبدالحیٰ کی کنپٹی کی رگ پھڑکنے لگی۔ اس نے خود کو کچھ انتہائی نامناسب کہنے سے روکا۔

''میں اپنی تعلیم مکمل کرلوں گا پھر مجھے کوئی معقول ملازمت مل جائے گی۔ میں یقین دلاتا ہوں فروزاں کو زندگی کی ہر آسائش فراہم کروں گا۔'' دروازے کی آڑ میں کھڑی فروزاں کی آنسوؤں بھری آنکھوں نے اسے چاچا کے سامنے مزید جھکنے پر مجبور کردیا تھا۔

''دیکھو عبدالحیٰ میں فیصلہ کرچکا ہوں۔ فیض

عالم کو زبان دے چکا ہوں۔ میری فروزاں فیض عالم کی بہو بنے گی۔ تم اپنا اور میرا وقت برباد مت کرو۔“

”زبان تو آپ نے میرے ماں، باپ کو بھی دی تھی۔ اگر فیض عالم سے زیادہ مال دار آسامی مل جائے گی تب دوبارہ زبان سے پھر جائیں گے کیا؟“ اس نے زہرخند انداز میں دریافت کیا۔

”عبدالحیٰ!“ نصیرالدین دہاڑے۔ ”چلے جاؤ یہاں سے اور آئندہ اس گھر کی دہلیز عبور نہ کرنا۔ میں نے بوڑھے بھائی کا لحاظ کر کے تمہیں بہت رعایت دے دی ورنہ جتنی بکواس تم کر چکے ہو صحیح سلامت اس گھر سے نہیں جاسکتے تھے۔ میرے بازوؤں میں اتنا دم خم ہے کہ تم جیسوں کو اٹھا کر گھر کے باہر پھینک سکوں۔“

”میں جارہا ہوں چاچا، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ عبدالحیٰ اٹھ گیا۔

”مجھے پتا تھا چاچا کہ آپ کا فیصلہ نہیں بدلے گا بس اپنی سی کوشش کرنے آیا تھا تاکہ کسی کے دل میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔“ اس کی نگاہیں ذرا کی ذرا اٹھی تھیں۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی فروزاں پر اچٹتی نگاہ ڈال کر وہ واپس پلٹ گیا کسی ہارے ہوئے جواری کے مانند۔

فروزاں بے یقینی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ اتنی آسانی سے اس سے دستبردار ہوجائے گا یہ کیسے ممکن تھا اور وہاں شازیہ بھی بھائی سے اسی بات پر الجھ رہی تھی۔

”آپ چاچا کا انکار سن کر اتنی آسانی سے کیسے چلے آئے بھیا۔ فروزاں آپ کی منگ ہے، آپ کی غیرت ہے وہ۔ آپ اسے کسی اور کا کس طرح ہونے دے سکتے ہیں۔“

”فضول باتیں مت کرو شازیہ۔“ عبدالحیٰ نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

وہ آنکھوں میں آنسو سموئے خفگی سے چپ چاپ بھائی کو تکتی رہی۔

”ہمارا کوئی شرعی اور قانونی رشتہ نہیں تھا۔ ایک زبانی کلامی عہد تھا جس سے چاچا پھر گئے لیکن وہ فروزاں کا باپ ہیں جو اس کے لیے مناسب سمجھتے ہیں انہیں وہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے اور بیٹیاں اپنے باپ کی عزت اور غیرت ہوتی ہیں منگیتروں کی نہیں۔ فروزاں کو حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ میں اسے گھر سے بھگا کر نکاح پڑھوالوں اور میں اس طریقے کو غیرت مندی نہیں بلکہ بے غیرتی خیال کرتا ہوں۔ اپنی محبت کو دنیا میں رسوا کرنا مجھے کسی طور منظور نہیں۔“ بات کے آخر میں عبدالحیٰ کا لہجہ بالکل دھیما ہوگیا تھا اور آنکھوں کے گوشے نم۔

”تم دونوں کا شرعی اور قانونی رشتہ نہیں تھا مگر دل کا رشتہ تو تھا ناں بھائی۔ تم مرد ہو سہار لوگے یہ غم مگر فروزاں، وہ تو جیتے جی مرجائے گی۔“ شازیہ اپنی سہیلی کے دل کا حال جانتی تھی۔ عبدالحیٰ سے اس کے پیار میں کتنی شدت تھی شاید عبدالحیٰ بھی اس سے ناواقف تھا۔

”بھول جائے گی شادی کے بعد سب پرانی باتیں۔ چاچا صحیح کہہ رہے تھے یہاں آکر اسے کیا ملتا۔ فیض عالم کی بہو بنے گی تو عیش کرے گی۔“

”بھائی!“ شازیہ چیخ پڑی۔

”حقیقت کو قبول کرلینا ہی عقل مندی ہے شازیہ۔ یہ پیار محبت سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔ پیسہ آج کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

”بس کرو بھائی۔“ شازیہ نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بھلے سے آپ دونوں کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے لیکن جو پیار آپ دونوں ایک دوسرے سے کرتے ہیں اس کی توہین مت کریں۔ یہ پیار بہت بے لوث ہے سچا اور کھرا......“

”بس پھر غم کاہے کا ہے شازی۔ آج کے دور میں کسی کو خالص پیار نصیب ہوجائے وہ دنیا کا خوش

قسمت ترین بندہ ہوتا ہے۔ پیار مل گیا بہت ہے عمر بھر کے لیے یہی زادِ راہ کافی ہے۔ پیار کرنے والی نہ مل سکی وہ میری قسمت۔“ عبدالحیٰ جیسے خود کلامی کررہا تھا۔ شازیہ روتے ہوئے پلٹ گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد آج پھر اس گھر میں مرگ کا سا سماں تھا اور نصیرالدین کے گھر کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ فروزاں کو ایسی چپ لگی تھی کہ اس کی ماں کو ہول اٹھنے لگے۔ اخبار میں پڑھی خبریں اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں۔

”کچھ تو بول فروزاں...... چپ چاپ لیٹے کیا سوچتی رہتی ہے۔ میرا دل گھبراتا ہے تیری خاموشی پر۔“

”کیوں فکر کرتی ہو اماں۔ میں ایسا ویسا کچھ نہیں سوچ رہی۔ نہ تو زہر کھاؤں گی نہ گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کی کوشش کروں گی۔ گھر سے بھاگوں گی بھی نہیں...... جہاں ابا کہتا ہے سر جھکا کر وہاں شادی کرلوں گی۔ ہاں بس اندر سے مرجاؤں گی لیکن دل کے اندر کون جھانک کر دیکھتا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنس دی اور اس کی ہنسی کا کرب ماں کا دل چیر گیا۔

”آج سے پہلے مجھے اپنی خوب صورتی پر ناز تھا اماں لیکن اب میں آئینہ دیکھتی ہوں ناں تو جی چاہتا ہے یہ خوب صورت چہرہ نوچ، نوچ کر بگاڑ دوں۔ اگر میں کالی کلوٹی، موٹے نین نقش والی ہوتی تو پھر تو کوئی میرا طلب گار نہ ہوتا ناں۔ چاہے عبدالحیٰ بھی مجھ سے زبردستی شادی پر تیار ہوتا لیکن میں اس کی ہو تو جاتی ناں۔ اس کا نام ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے میرے نام سے جڑ جاتا، اماں تم لوگوں نے ہمارا اتنا کچا رشتہ کیوں جوڑا تھا۔ ہم تو بچے تھے، نادان تھے اس کچے بندھن کو بہت مضبوط جان کر دل کا رشتہ بھی جوڑ بیٹھے۔ ہمیں بتادیا ہوتا کہ بچپن میں کیے گئے فیصلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ انہیں ختم بھی کیا جاسکتا ہے، اپنا قول واپس لیا جاسکتا ہے۔“ وہ بے آواز رو رہی تھی۔

”غلطی ہماری ہی ہے میری بچی...... تو بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ یہ فیصلے بچوں کے بچپن میں کرنے والے نہیں ہوتے...... بعد میں حالات کوئی بھی رخ اختیار کرسکتے ہیں۔ جیسے تیرے باپ کی آنکھوں پر دولت کی پٹی بندھ گئی ہے۔ مجھے معاف کردینا میری بچی۔ تیری ماں تیرا مقدمہ ہار گئی۔“ شائستہ نے اسے ساتھ لپٹایا تھا۔ کتنی دیر تک دونوں ماں بیٹی آنسو بہاتی رہیں پھر جیسے دونوں کو ہی صبر سا آگیا۔ بہت لوگوں کے مقدر میں سمجھوتے بھری زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ فروزاں بھی ذہنی طور پر خود کو سمجھوتے کے لیے تیار کرنے لگی۔ دل مرگیا تھا تو کیا ہوا وجود تو باقی تھا۔

اور ایک روز فیض عالم کے گھر والے اسی وجود کو اپنا نام دینے کی غرض سے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا گئے۔ انہوں نے منگنی ہی اتنی دھوم دھام سے کی کہ لوگوں نے حیرت کے مارے انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔ دو سونے کے وزنی سیٹ، دس کامدار جوڑے، میچنگ جوتے، پرس، میک اپ کا بے تحاشا سامان اور بھی بہت کچھ۔

”اے بہن! تم نکاح ہی پڑھا لیتیں پوری بری تو اٹھا لائے ہو۔“ ایک محلے کی عورت نے زرینہ کو مخاطب کیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”آپا بری کی تو تم بات ہی نہ کرو۔ تمہارے تصور سے بھی شاندار بری چڑھاؤں گی اپنی بہو کو۔ جتنی حسین میری بہو ہے سامان بھی تو اس کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔“ زرینہ نے فروزاں کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ان کا پورا گھرانا اس رشتے پر بہت خوش تھا۔ حسن ان لوگوں کی کمزوری تھا۔ خدا نے بے تحاشا دولت سے تو نوازا تھا مگر سب شکل صورت کے معاملے میں مار کھاتے تھے۔ سیاہی مائل سانولی رنگت اور چھوٹا قد اُن کے خاندان کی پہچان تھے اب فروزاں جیسا حسین ترین چہرہ ان کے خاندان میں شامل ہونے جارہا تھا اس پر سب کی خوشی دیدنی تھی۔

فروزاں گھونگٹ میں سر چھپائے اپنی سسکیاں دباتی رہی۔ اپنی عمر کے بائیس برسوں تک وہ عبدالحئی کے نام سے منسوب رہی تھی اب نوید عالم کے نام کی انگوٹھی انگلی میں تو سجالی لیکن دل اب بھی کسی اور کے نام پر دھڑک رہا تھا۔ ذہن نے یہ حقیقت قبول کرلی تھی تو دل کیوں اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ فروزاں دل و دماغ کی کشمکش کے آگے بے بس ہوئی جارہی تھی۔

''چلو خیر سے آج کا فنکشن تو نمٹ گیا۔ شادی کے بارے میں کیا کہہ رہی تھی نوید کی ماں؟'' نصیرالدین نے رات کو بیوی سے پوچھا تھا۔ اس گھر میں صرف وہی تھا جو آج بے حد خوش تھا۔ اس کی فروزاں اتنے امیر کبیر خاندان کا حصہ بننے جارہی تھی یہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

''دیکھو فروزاں کے ابا، یہ بات خود بھی سمجھ لو اور اپنے دوست کو بھی بتادو ہم آٹھ، نو مہینے سے پہلے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ جب اتنے اونچے گھرانے میں بیٹی کا رشتہ جوڑا ہے تو جہیز بھی تو ان کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔ پہلے گھر کی بات تھی سو نہ تمہیں کوئی فکر تھی نہ مجھے۔ چار کپڑوں میں بھی بیٹی بیاہ دیتے تو اعتراض کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اللہ بخشے تمہاری بھابی کو...... بہت درویش صفت عورت تھی وہ ہی خوبیاں اس کے بچوں میں بھی ہیں نہ پیسے کی طلب نہ......''

''افوہ ان کا ذکر بیچ میں کیوں لاتی ہو۔'' نصیرالدین پر وقتی ندامت کا حملہ ہوا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے جھنجلا کر بیوی کو ٹوکا تھا۔ شائستہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ہاں، پاگل ہوگئی ہوں۔ ان بھلے لوگوں کا اب کیا ذکر۔ وہ تو ہماری زندگیوں سے نکل گئے ہیں۔''

''جہیز کا مطالبہ تو فیض عالم کے گھر والے بھی نہیں کررہے۔ یہ بھی اچھے لوگ ہیں، کہتے ہیں ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں بس آپ کی بیٹی چاہیے۔'' اس نے بیوی کو سمجھانے کی اچھائی کا احساس دلانا چاہا۔

''ہاں لیکن دنیا کی زبانوں کو تو کوئی نہیں پکڑ سکتا ناں۔ جب وہ لوگ شاندار بری چڑھائیں گے تو لوگ اس کا جہیز سے موازنہ نہیں کریں گے کیا؟ اپنے جیسوں میں رشتہ جوڑیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا نصیرالدین۔ اب تم نے اپنی سی کرتو لی ہے اب دیکھنا اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔''

''ناشکری عورت کسی حال میں خوش ہی نہیں ہوتی۔ کوئی اور ماں ہوتی تو آج کے دن پھولے نہ سما رہی ہوتی۔ کتنے قدردانوں میں بیٹی جارہی ہے۔ دیکھا نہیں کیسے واری صدقے جارہے تھے۔ خدا کا شکر ادا کر شائستہ ناشکری کی باتیں مت کر۔'' نصیرالدین نے اسے جھڑک دیا۔

''بہر حال میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ جلد شادی پر زور دیں تب بھی ان سے چھ، آٹھ مہینے کی مہلت ضرور لینی ہے۔ تین مہینے بعد ہماری کمیٹی کھلے گی اس کے بعد ہی جہیز کی تیاری شروع کروں گی۔''

''ہاں، ہاں ٹھیک ہے میں کون سا اپنی بیٹی کو اتنی جلدی خود سے جدا کرنے کا سوچ رہا ہوں۔'' نصیرالدین نے رسانیت سے تسلیم کیا۔

''بیٹی کو جدا کرنے کا ہی تو سوچا ہے تم نے نصیر۔ تایا کے گھر جاتی تو سمجھو سدا آنکھوں کے سامنے ہی رہتی۔'' شائستہ نے اس بار صرف دل میں سوچا کچھ کہنا نصیرالدین کو اشتعال دلانے کے مترادف تھا بہر حال اس نے اپنی بیٹی کے لیے مزید مہلت مانگ لی تھی۔ ہوسکتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دل کو قرار مل ہی جاتا مگر یہ شائستہ کی خام خیالی تھی فروزاں ہر گزرتے دن کے ساتھ مرجھاتی جارہی تھی۔ اس کی چمپئی رنگت کملانے لگی تھی۔ وزن بھی تیزی سے گر رہا تھا۔ اس کی ساس جب بھی آتی اپنی تشویش کا اظہار کرتی۔

''اے بھابی تم لوگ جلد شادی کو مان نہیں رہے مگر میری بیٹی کی حالت تو دیکھو...... ہمارے گھر آئے گی تو جسم پر ماس چڑھ جائے گا۔ ماشاءاللہ کھلا کھانا پینا ہے ہمارے ہاں۔ سات کلو تو دودھ ہی آتا ہے۔ موسمی پھلوں سے فریج بھرا رہتا ہے۔ جی چاہا تو کاٹ کر کھالیے جی چاہا تو جوس نکال کر پی لیا۔ ہم تو ملازموں کو ہی اتنا اچھا کھلاتے ہیں کہ جو ایک بار ہمارے گھر کام پر لگ گیا پھر کہیں اور جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔'' زرینہ بیگم اپنی عادت کے مطابق شیخی مارنے سے باز نہ آئیں۔ شائستہ چپ چاپ سننے پر مجبور تھیں۔

''بتا بیٹی تیرے لیے اناروں کی ٹوکری بھجوادوں؟ جوس نکال کر پیے گی تو گالوں پر رونق آجائے گی۔'' وہ دلار سے فروزاں سے مخاطب ہوتی۔

''نہیں خالہ انار کھٹے ہوتے ہیں، میرا گلا پکڑ جائے گا۔'' فروزاں رُکھائی سے جواب دے کر کمرے میں گھس جاتی۔

''وہ کیا کہتے ہیں بھابی کہ ہاں خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔'' زرینہ قہقہہ لگا کر کہتی۔ شائستہ کو بادلِ ناخواستہ مسکرانا پڑتا اور پھر ایک دن تایا کا سب سے چھوٹا واصف شازیہ کی شادی کا کارڈ دے گیا۔ عبدالحئی نے نصیرالدین کے کہے کی لاج رکھتے ہوئے دوبارہ اس گھر کی دہلیز عبور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دونوں گھرانوں میں آنا جانا بالکل ختم تھا۔ شائستہ بہت بار سوچتیں کہ شازیہ سے جاکر مل آئیں لیکن پھر شرمندگی کے مارے وہاں جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ اب موقع ایسا تھا کہ وہ ساری ندامت اور شرمندگی بالائے طاق رکھتے ہوئے وہاں چلی گئیں۔

''تیاری تو ساری ہوگئی ہوگی بیٹا...... پر میرے لائق کوئی خدمت ہے تو ضرور بتاؤ۔'' انہوں نے شازیہ کی پیشانی چوم کر پہلے...... اسے ڈھیر دعاؤں سے نوازا تھا پھر شادی کی تیاری کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

''چاچی بس آپ سے ایک گزارش ہے۔ میری سہیلی کو میری شادی والے دن لے آیئے گا، میں نے کبھی گڑیا، گڈے کی شادی تنہا نہیں کی۔ زندگی کے ہر موڑ پر فروزاں میرے ساتھ ہوتی تھی اب میری اپنی شادی پر ہی میری سکھی موجود نہیں ہوگی تو بتائیں میرے دل پر کیا گزرے گی۔'' اس نے روتے ہوئے شائستہ کو مخاطب کیا۔

''فروزاں آئے گی کیوں نہیں آئے گی بیٹا۔ اسے میں خود لاؤں گی۔'' انہوں نے شازیہ کو یقین دہانی کروائی تھی۔ خلافِ توقع نصیرالدین نے دونوں کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ بِن ماں کی بھتیجی کا لحاظ تھا یا کوئی اور وجہ...... شائستہ کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے لیے یہ اجازت ہی بہت تھی مگر خلافِ توقع فروزاں وہاں جانے سے انکاری ہوگئی۔

''اماں مجھ میں اتنا ضبط نہیں ہے۔ میں خود میں وہاں جانے کا حوصلہ نہیں پاتی۔'' وہ تھکے، تھکے لہجے میں ماں سے مخاطب ہوئی۔

''یہ شازیہ کی خواہش ہے بیٹے۔ تمہارا دکھ اپنی جگہ مگر یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑی خوشی کا دن ہے۔ کیا تمہارے نزدیک اس کی خوشی سے زیادہ اپنا دکھ اہم ہے؟'' شائستہ نے پوچھا تھا۔ فروزاں...... بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی لیکن شازیہ کی بارات والے دن ماں کو اس سے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ پڑی وہ چپ چاپ تیار ہوگئی تھی۔ سفید لباس میں وہ کوئی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ برائے نام میک اپ میں بھی اس کا سوگوار حسن عجیب چھب دِکھلا رہا تھا۔ شازیہ چھوٹے کمرے میں مایوں کا جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ اگرچہ اس کی شادی ماموں کے گھر ہو رہی تھی مگر ننھیال سے آدھے افراد ان کی طرف سے شریک تھے تو کچھ نے بارات کے ساتھ آنا تھا۔ ددھیالی

رشتے داروں میں صرف وہی تھے جو عین وقت پر مہمانوں کی طرح آئے تھے۔شازیہ اس سے لپٹ کر روئی تو اس کے اپنے آنسوؤں کو بھی بہنے کا رستہ مل گیا۔ دونوں سہیلیوں نے آنسوؤں کے دریا بہادیے۔عبدالحیٰ بہن کے رونے کی آواز پر بے چین ہوکر کمرے میں آیا تھا مگر اس کے قدم چوکھٹ پر ہی جم گئے۔فروزاں نے آنسوؤں کی دھند کے پار اس کا مدھم سا ہیولہ دیکھا۔آنسو پونچھے تو وہ موجود نہ تھا۔ نگاہیں پیاسی کی پیاسی رہ گئیں۔شازیہ کی خالہ نے دونوں دوستوں کو الگ کیا۔پانی پلایا، تسلی دلاسا دیا۔ فروزاں کو خود پر قابو پانے میں کچھ پل ہی لگے تھے پھر اس نے شازیہ کے کان میں گھس کر اس سے مدڑ کی بات کرنا شروع کردی۔

شازیہ کے ہونٹوں پر بھی شرگیں مسکراہٹ بکھر گئی۔فروزاں نے دل کی گہرائیوں سے اپنی اس پیاری سی سہیلی کی آئندہ زندگی کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔آخر شازیہ کی رخصتی بخیر و خوبی انجام پائی پھر فروزاں نے صرف رخصتی کے وقت ہی عبدالحیٰ کی جھلک دیکھی تھی۔اپنی بہن کو بازوؤں کے حلقے میں لیے سرخ ہوتی آنکھوں کو بار بار رگڑتے ہوئے سجی ہوئی گاڑی تک چھوڑ آیا تھا۔فروزاں عورتوں کے ہجوم میں چھپی، شازیہ کے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی شازیہ کی رخصتی کے نام پر اپنے کب کے جمع ہوئے آنسو بہاتی رہی۔تایا جانے کہاں تھے ان سے اس کی ملاقات تک نہ ہوئی۔رخصتی کے فوراً بعد وہ ماں کے ساتھ واپس گھر چلی گئی۔اس نے تو دھیان تک نہیں دیا تھا کہ رخصتی سے پہلے جب جہیز کا سامان گھر سے اٹھایا جارہا تھا تو اس میں کیا کچھ شامل تھا لیکن محلے کی کئی عورتوں نے شازیہ کے شاندار جہیز کا تذکرہ کیا تھا۔تایا کی محلے میں بہت عزت تھی۔عبدالحیٰ کی شرافت کے بھی سب گواہ تھے۔نصیرالدین نے بھائی کے گھرانے سے جو زیادتی کی تھی منہ پر نہ سہی مگر سب محلے والے دل ہی دل میں اسے قصوروار گردانتے تھے۔فیض عالم کے گھرانے کو بھی کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔شازیہ کی شادی کے بعد محلے کی کچھ عورتوں نے ہی جتاتے ہوئے انداز میں اس کے شاندار جہیز کا ذکر کیا تھا۔ان ہی عورتوں کی زبانی پتا چلا کہ عبدالحیٰ نے اپنے دوست کے ساتھ اسپیئر پارٹس کا کام شروع کیا تھا۔سرمایہ دوست کا تھا تو بھاگ دوڑ عبدالحیٰ کی۔تجربہ دونوں کے پاس ہی نہ تھا لیکن اللہ نے آغاز میں ہی کام میں بہت برکت ڈال دی تھی۔

''بہت محنتی بچہ ہے۔دن رات ایک کردیا......مگر کام اچھا چل نکلا ہے۔نیت اچھی ہو تو اللہ کام میں برکت ڈال ہی دیتا ہے۔'' یہ پڑوس کی نسیمہ آپا تھیں جو بہت جتاتے ہوئے انداز میں شائستہ سے مخاطب تھیں۔

''اچھی بات ہے آپا، ہماری تو یہی دعا ہے کہ اللہ اس کے کام میں اور برکت ڈالے۔'' شائستہ بیگم نے آپا نسیمہ کی توقع کے خلاف دل کی گہرائیوں سے عبدالحیٰ کی ترقیِ کاروبار کے لیے دعا کی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے عبدالحیٰ کا کاروبار پھیلتا گیا۔اس نے مکان کی ازسرِنو تعمیر کروائی تھی۔رقبہ وہی تھا مگر جدید نقشے کے مطابق تعمیر شدہ مکان ان کی بدلتی ہوئی مالی حیثیت کا سب سے بڑا گواہ تھا۔شائستہ نے ایک دن تو نصیرالدین کو جتا ہی ڈالا۔

''صرف دولت کے پیچھے تم نے فروزاں کی عبدالحیٰ سے نسبت توڑی تھی ناں......دیکھ لو اللہ نے کیسے اسے چھپر پھاڑ کر دولت دے دی اور سو فی صد حلال کمائی ہے۔سب کچھ اللہ کے کرم اور عبدالحیٰ کے زورِ بازو کا نتیجہ ہے۔اگر ذرا سا صبر کرلیتے تو ہماری فروزاں اپنے تایا کے گھر پر ہی راج کرتی۔مادی خواہشات بھی پوری ہوتیں ساتھ ساتھ دل کی خوشی بھی نصیب ہوتی۔تم نے اپنی بچی کا دل توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا نصیرالدین۔'' شائستہ نے خاوند کو احساس دلانا چاہا اور خلافِ توقع نصیرالدین اس پر چڑھ نہیں دوڑا بس خاموشی سے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

☆☆☆

شائستہ کو نصیرالدین کے رویّے میں آج کل واضح تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔جس طرح پہلے وہ فیض عالم کے گھرانے کے قصیدے پڑھتا رہتا تھا، آج کل اس کی زبان سے ان لوگوں کا تذکرہ کم ہی سننے کو ملتا۔ شائستہ کو لگتا نصیر اس سے کچھ چھپا رہا ہے، وہ کافی الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دیتا اور پھر شوہر کی زبانی نہ سہی اسے نسیمہ آپا کی زبانی وہ خبر پتا چل ہی گئی۔

''کچھ سنا تم نے شائستہ! تمہارا داماد جوئے میں کوٹھی ہار گیا ہے۔ابھی تو تعمیر مکمل بھی نہ ہوئی تھی۔ زرینہ بیگم کی شیخیاں سنتی تھیں ناں تم۔ڈبل اسٹوری بنگلا تھا اور بے چاروں کو رہنا بھی نصیب نہ ہوا۔'' نسیمہ آپا تو خبر سنا کر چلی گئیں۔شائستہ اپنی جگہ سن ہوکر رہ گئی۔نصیرالدین گھر آیا تو وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

''اتنی بڑی خبر اور تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھی۔مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ میں کس چیز کا غم مناؤں، نوید کے جواری ہونے کا پتا چلنے کا یا اس کا جوئے میں مکان ہارنے کا؟'' نصیرالدین نے نگاہیں چرالیں۔

''فیض عالم نے سمجھایا ہے اسے۔آئندہ جوا نہیں کھیلے گا وہ۔'' جب وہ بولا تو اس کی آواز بہت پست تھی گویا اسے خود پتا تھا کہ وہ کتنی کھوکھلی بات کررہا ہے۔

''تم جانتے ہو نصیر جوا اور شراب یہ دو لتیں ایسی ہیں جو کسی کو چمٹ جائیں تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔''

''کہا تو ہے اس کا باپ اب اس پر سختی کرے گا۔'' نصیرالدین کا لہجہ اب بھی دھیما ہی تھا۔کوئی اور وقت ہوتا تو شائستہ پر چڑھ دوڑتا مگر اب اس کے اندر سر اٹھاتے پچھتاوے اسے بیوی سے نگاہیں ملانے نہیں دے رہے تھے۔شائستہ کو اندازہ ہوگیا کہ نصیرالدین کو اپنے غلط فیصلے کا احساس ہورہا ہے، اس نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کا فیصلہ کیا۔

''بات سنو نصیرالدین، تم فیض عالم کو انکار کردو۔ ہمارے پاس اب تو جواز بھی ہے ہم کسی جواری کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرسکتے۔ میرے منہ میں خاک شادی کے بعد اگر اس نے......''

شائستہ نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن نصیرالدین اس کی ادھوری بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

''یہ اتنا آسان نہیں ہے شائستہ جتنا تُو سمجھ رہی ہے۔تجھے پتا ہے کہ بیٹی کی نسبت ٹوٹے تو دنیا والے کیسی باتیں بناتے ہیں۔''

''تمہاری بیٹی کی نسبت پہلی بار نہیں ٹوٹے گی نصیرالدین۔پچھلی بار تو تمہیں خیال نہیں آیا کہ بیس برس پرانی نسبت ٹوٹے گی تو دنیا والے کیا کہیں گے؟'' شائستہ چمک کر بولی تھی۔

''تجھے فیض عالم کی خصلت کا نہیں پتا شائستہ......وہ بہت ٹیڑھا بندہ ہے۔ہم رشتہ توڑیں گے تو وہ اسے اپنی بے عزتی تصور کرے گا۔'' آخر نصیرالدین بیوی کے سامنے دل کا خدشہ زبان پر لے آیا تھا اور اس بار شائستہ بھی چپ ہوگئی۔

''ہم کیسے بدنصیب ماں، باپ ہیں نصیر جو جانتے بوجھتے اپنی بچی کو اندھے کنویں میں دھکیل رہے ہیں۔'' اس نے خود کلامی سی کی تھی۔

''اچھا بس نہ خود زیادہ پریشان ہو نہ مجھے کر...... یہ چھوٹی موٹی برائیاں تو دولت مند لوگوں میں عام پائی جاتی ہیں۔شادی کے بعد سر پر ذمے داری پڑے گی تو خود سدھر جائے گا نوید پھر ہماری فروزاں جیسی لڑکی اس کی بیوی ہوگی تو اچھائی، برائی کی تمیز خود سکھا دے گی۔بیوی خوب صورت ہو تو بندہ اس کی ہر بات مانتا ہے۔'' نصیرالدین نے شائستہ سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

''مکان تو جوئے میں ہار گئے اب نیا مکان کہاں بنوائیں گے؟'' شائستہ نے بھی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گویا حقیقت سے سمجھوتا کرتے ہوئے

بات بدلی۔

”ارے دولت کی کمی تھوڑی ہے ان لوگوں کے پاس۔ فیض عالم کہہ رہا تھا کہ اب مکان تعمیر کروانے کی دردِسری نہیں مول لیں گے۔ کسی اچھی سی کالونی میں بنا بنایا گھر خرید لیں گے۔“ نصیرالدین نے اس بار کچھ جوش میں بتایا۔

”ہاں، پیسہ ہاتھ میں ہو تو سب ممکن ہے۔“ شائستہ نے بھی جیسے تسلیم کرلیا۔

”وہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں دولت بڑے، بڑے عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔“ نصیرالدین نے بیوی کو بردباری سے سمجھایا۔

”یعنی میری فروزاں کے مقدر میں عیبوں والا بندہ ہی لکھا ہے۔“ شائستہ صرف دل میں سوچ کررہ گئی۔

فیض عالم کے گھرانے کی واحد خوبی ان کی دولت کو بھی جیسے کسی نظر یا آہ کھا گئی۔ پہلے ان کے گودام میں آگ لگ گئی۔ ملازم کی معمولی سی غفلت مگر لاکھوں کا سامان جل کر خاکستر ہوگیا پھر فیض عالم کی شادی شدہ بیٹی کے گھر ڈاکا پڑگیا۔

”ہائے ہائے ہم تو لٹ گئے، برباد ہوگئے۔ سارا زیور بتول کے گھر لاکروں میں رکھوایا ہوا تھا۔ یہ سوچا ہوا تھا کہ وہاں زیور محفوظ رہے گا۔ یہاں تو محلے کے بیچوں بیچ گھر ہے۔ چوری چکاری کا زیادہ ڈر تھا۔ بتول کے گھر تو چوکیدار بھی تھا۔ میری بچی کا زیور تو گیا سو گیا ہماری بھی عمر بھر کی پونجی لٹ گئی۔“ شائستہ جس وقت افسوس کرنے زرینہ کے پاس گئی، وہ عورتوں کے درمیان بیٹھی بہ آواز بلند واویلا کررہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور دوپٹا ندارد۔ بس سینہ کوبی کی کسر رہ گئی تھی۔ زرینہ کو اس حالت میں دیکھ کر شائستہ کو دلی افسوس ہوا۔ ویسے وہ ہر وقت کیسے بن ٹھن کر تیار رہتی تھی اور اب پہچانی ہی نہیں جارہی تھی کہ یہ وہی زرینہ ہے۔ اس کی بیٹیاں بھی اونچی آواز میں نامعلوم ڈاکوؤں کو کوسنے دیتے ہوئے ماں کی ہمنوا تھیں۔

”اللہ جانے کس کی نحوست ہے جو ہمارے پر چھاتی جارہی ہے۔ پہلے بنگلا ہاتھ سے گیا پھر گو... میں آگ لگی اور اب ڈاکا پڑگیا۔ ہائے، ہائے ... سے فریاد کریں ہم تو برباد ہوگئے۔“ زرینہ بیگم ... واویلا جاری تھا۔ اس کی شائستہ پر نگاہ پڑ گئی تھی مگر ... ہی اس نے رخ پھیرلیا۔

شائستہ نے اس کے رویّے کو غم کی زیادتی ... محمول کیا۔ اس بے چاری کو کیا خبر کہ کون آرہا ... کون جارہا ہے۔ شائستہ نے اس کی بیٹی سے ... اظہارِ افسوس کرڈالا۔

”دو چار دن میں امی آپ کی طرف ... لگائیں گی۔“ تمنا نے اس پر چبھتی ہوئی نگاہیں ڈا... کر رکھائی سے مخاطب کیا۔ شائستہ ان لوگوں ... رویّے پر غوروفکر کرتی واپس آگئی۔ دماغ الجھ رہا ... مگر الجھن کا سرا ہل کر نہ دے رہا تھا اور تین دن بعد ... اس الجھن کا خاتمہ ہوگیا۔ زرینہ بیگم اپنی ایک بیٹی اور ... دونوں کرانیوں کو لے کر صبح ہی صبح ان کے گھر پہنچ گئیں ...

نصیرالدین ابھی، ابھی کام پر نکلا تھا۔ فروزاں اور شائستہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر ناشتا کرنے میں مصروف تھیں۔

”آئیں زرینہ بہن ناشتا کریں۔“ شائستہ نے خوش دلی سے مخاطب کیا۔

”ہمارے حلق سے لقمہ نیچے نہیں اتر رہا اور تم کہتی ہو ناشتا کریں۔“ زرینہ نے منہ بگاڑ کر نخوت سے کہا تھا۔ شائستہ کو اس کا انداز سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے فروزاں کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ فروزاں جلدی سے ناشتے کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں گھس گئی۔

”اس روز میں آئی تھی بہت افسوس ہوا تمنا بیٹی کے گھر ڈاکے کا سن کر...... آپ کا صدمے سے برا حال ہورہا تھا اس لیے آپ کے پاس آنے کی ہمت نہیں پڑی۔“ شائستہ نے بات کا آغاز کیا۔

''بڑی مہربانی کی تم نے ہمارے گھر چلی آئیں لیکن آئندہ یہ مہربانی کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو رشتہ ہم نے بے وقوفی میں تم لوگوں سے جوڑا تھا میں وہ آج ختم کرنے آئی ہوں۔'' زرینہ بیگم نے لگی لپٹی کے بجائے فوراً ہی دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' شائستہ کے لبوں سے پہلی بات یہی نکلی تھی۔

''ہاں بی بی، ٹھیک کہہ رہی ہوں میں.... ہم بے وقوف لوگ ہیں چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس پر ریجھ بیٹھے ورنہ تمہاری بیٹی میں سوائے چٹی چمڑی کے اور ہے ہی کیا۔ اس کی نحوست ہمارے گھر کو کھا گئی۔ جب سے نوید سے اس کا رشتہ جوڑا ہم بجائے ترقی کرنے کے نیچے کی طرف جانے لگے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ زوال...... ہاں ہمارا زوال شروع ہوگیا۔ جب صرف منگنی پر یہ حال ہوا ہے تو اللہ جانے شادی کے بعد ہمارا کیا بنتا پھر تو ہم بالکل فٹ پاتھ پر ہی آجاتے۔ ہمیں ایسی منحوس لڑکی نہیں چاہیے۔ جہاں مرضی شادی کرو اس کی بس ہمارے بیٹے کی جان چھوڑو۔'' زرینہ بیگم کی زبان آگ برسا رہی تھی۔

''آپ نے رشتہ ختم کرنا ہے تو سو بسم اللہ، یہ آپ کی نہیں آپ سے زیادہ ہماری دلی تمنا تھی لیکن میری بیٹی کے بارے میں فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر مزید کچھ الٹا سیدھا کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' شائستہ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ پڑ گیا۔

''سچائی ہر کسی کو کڑوی لگتی ہے اور تم تو ماں ہو۔ بنتا ہے بھئی تمہارا غصہ بنتا ہے۔'' زرینہ بیگم نے جیسے ان کی حالت سے حظ اٹھایا تھا۔

''اور خوب کہی تم نے کہ رشتہ توڑنا تمہاری دلی خواہش تھی۔ ارے تم ٹٹ پونجیوں کی اوقات ہی کہاں تھی کہ ہمارے گھرانے میں بیٹی بیاہنے کا خواب بھی دیکھتے، وہ تو ہم تمہاری بیٹی کی خوب صورتی پر مر مٹے، کیا پتا تھا کہ یہ خوب صورت چہرہ ایک منحوس ڈائن کا چہرہ ثابت ہوگا۔ سب کچھ نگل گئی کم بخت ہمارا۔''

''زرینہ بیگم مزید ایک لفظ نہیں۔'' شائستہ چیخ ہی تو پڑی۔

''اے بہن چیخنے چلّانے سے کیا سچائی پر پردہ پڑ جائے گا۔ خود سوچو تمہاری بیٹی جب تک اپنے تایا کے بیٹے سے منسوب رہی کیا معمولی سا دکان دار تھا وہ لیکن جیسے ہی اس کی زندگی سے تمہاری بیٹی کی نحوست دور ہوئی کیسا شاندار کاروبار چل پڑا اس کا...... اور ہم جو لاکھوں، کروڑوں میں کھیل رہے تھے، زمین پر آ لگے۔'' زرینہ بیگم چیخ کر بولی تھیں اس بار شائستہ کچھ نہ بول پائی۔

''ہوگئی ناں خاموش، سچائی کڑوی تو ہوتی ہے بہن مگر اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔''

''آپ جا سکتی ہیں زرینہ بیگم، میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔'' شائستہ نے اسے تنفر سے دیکھا۔

''ہاں، ہاں، ہمیں بھی یہاں بیٹھنے کا شوق نہیں۔ ہم تو سامان واپس لینے آئے ہیں۔ اب تک جو تمہاری بیٹی کو دیا ہے واپس لوٹا دو۔ تم نے تو خیر سے ایک انگوٹھی اور چار جوڑے دیے تھے منگنی پر وہ میں لے آئی ہوں۔'' زرینہ نے ملازمہ کو اشارہ کیا جس نے بڑا سا شاپر شائستہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کچھ لمحوں کے لیے شائستہ کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اتنا خلافِ توقع اور اچانک تھا کہ شائستہ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوگئیں لیکن چند لمحوں کے بعد فروزاں بہت سے ڈبے اٹھائے آگئی۔

''دیکھ لیں کوئی کمی بیشی تو نہیں؟'' اس نے سرد مہری سے پوچھا۔ زرینہ اس کو ایک ایکشن کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ ڈبے ملازماؤں نے سنبھال لیے۔

''اور یہ پیسے جو مختلف مواقع پر آپ نے مجھے دیے تھے۔'' اس نے مٹھی میں دبے ہوئے بہت سے نوٹ بھی زرینہ بیگم کے حوالے کر دیے۔

''گن لیں۔'' اس نے انہیں مخاطب کیا۔

زرینہ بیگم اس پر تیکھی نگاہ ڈال کر اٹھ گئیں۔ دونوں ملازمائیں اور بیٹی بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اٹھ گئیں۔

"جارہے ہیں ہم یہاں سے بھی اور تمہارے پڑوس سے بھی۔ اب اپنے نوید کی شادی اپنی خالہ کی پوتی سے کررہی ہوں۔ شکل صورت کی ماٹھی ہے تو کیا ہوا، جہیز میں یہ شاندار کوٹھی دے رہے ہیں۔ وہیں شفٹ ہورہے ہیں ہم۔ تم کنگلوں سے رشتے داری کے بعد نری پریشانی کے کچھ نہیں ملا۔ شکر ہے اس منحوس چکر سے نکلے ہم۔" زرینہ بیگم نخوت بھرے انداز میں کہتی ہوئی دہلیز پار کرگئیں۔ شائستہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

فروزاں نے باورچی خانے کا رخ کیا تھا اور ذرا دیر بعد وہ ٹرے میں پھر ناشتا سجائے آگئی۔

"آئیں اماں ناشتا کریں۔ ناشتے سے فارغ ہوکر میں واشنگ مشین لگاؤں گی، میلے کپڑوں کا ڈھیر جمع ہورہا ہے۔" وہ معمول کے انداز میں ماں سے مخاطب تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شائستہ نے بہ مشکل آنسو ضبط کیے تھے۔ پتا نہیں اس کی بیٹی کی قسمت میں مزید کیا کچھ ہونا باقی تھا۔ جہاں ایسے کم ظرف لوگوں سے رشتہ ٹوٹنا باعثِ اطمینان تھا وہاں زرینہ کی لن ترانی سن کر دل ڈوبا جارہا تھا۔ آج اس کی کچھ دن پہلے کی گئی باتوں کا مفہوم بھی سمجھ آرہا تھا، اس دن سب عورتوں کے بیچ بیٹھ کر بین کرتے ہوئے وہ جس منحوس ہستی کی نحوست کا بار بار ذکر کررہی تھی وہ یقیناً اس کی فروزاں تھی۔ عورتیں ویسے بھی کانوں کی کچی اور پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں جانے یہ بات کہاں سے کہاں تک پھیلے گی۔ فروزاں کی آئندہ زندگی پر اس کے کیا اثرات ہونے تھے۔ چند لمحوں میں ہی شائستہ نے کیا کچھ نہ سوچ لیا تھا۔ نصیرالدین کے ایک غلط فیصلے نے زندگی کو مشکل ترین بنادیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ نصیرالدین اس کے سامنے آئے اور وہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے اپنی بیٹی کی زندگی کی کٹھنائیوں کا حساب لے لیکن جب نصیرالدین کے علم میں ساری بات آئی تو اس کی اپنی حالت اتنی غیر ہوگئی کہ شائستہ کا اس سے لڑنے کا ارادہ بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گیا۔

"فیض عالم کے تیور مجھے بھی بہت دنوں سے اکھڑے، اکھڑے لگ رہے تھے وہ لوگ بات ختم کردیتے مگر ہماری فروزاں پر نحوست کا ٹھپّا تو نہ لگاتے۔" جو خدشات شائستہ کو ستا رہے تھے ان ہی خدشات نے نصیرالدین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فروزاں اسے کھانا دینے آئی تو وہ بیٹی کے سامنے ہی رو پڑا۔

"مجھے معاف کردینا میری بچی، دنیا میں مجھ جیسے بدقسمت باپ بھی ہوتے ہیں جو اولاد کی ہنستی بستی زندگی کو غلط فیصلوں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔" نصیرالدین اپنی کم عقلی کا ماتم کرتے ہوئے بولا۔

"جو ہوا سو ہوا ابا، اب سوچ، سوچ کر خود کو ہلکان مت کریں۔" اس نے رسانیت سے باپ کو دلاسا دیا تھا لیکن نصیرالدین کے پچھتاوے کی شدت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

"حوصلہ کرو فروزاں کے ابا، اللہ سے بہتری کی دعا کرو۔ وہی ہے جو ہماری بچی کا نصیب کھولے گا۔" اس روز بھی جب نصیرالدین خود کو کوسنے میں مصروف تھا تو شائستہ نے اسے سمجھایا۔ شوہر کی حالت دیکھ کر اب اسے اس پر ترس آتا تھا۔

"کیا ہیرا لڑکا تھا عبدالحیٔ، میرا اپنا خون، نیک، شریف، خوب صورت، حلال روزی پر یقین رکھنے والا۔ میں نے تو اپنی بیٹی کے نصیب خود ہی کھوٹے کردیے۔" وہ مسلسل خود احتسابی کے دور سے گزر رہا تھا۔ عبدالحیٔ کی وہ خوبیاں جو پہلے کسی گنتی میں شمار نہ تھیں سب یاد آنے لگیں۔

"وہ باب اب بند ہوچکا ہے فروزاں کے

ابا..... بار بار کیوں اس کا ذکر کرتے ہو۔ جتنا ذلیل کرکے تم نے عبدالحیٔ کو اس گھر سے نکالا تھا وہ دوبارہ یہاں کا رخ کرنے کا سوچے گا بھی نہیں۔" شائستہ کے لہجے میں بھی یاسیت گھل گئی۔

"معلوم ہے شائستہ اور کس بات کا غم منا رہا ہوں۔" نصیرالدین نے تھکے، تھکے انداز میں خود کلامی کی۔

☆☆☆

دو دن بعد کی بات تھی۔ دروازے پر بڑی مانوس سی دستک ہوئی۔ نصیرالدین اور شائستہ مل کر چارپائی بُننے میں مصروف تھے۔ دستک سن کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر نصیرالدین نے لپک کر دروازہ کھولا۔ سامنے حفیظ الدین کھڑے تھے۔

"بھائی حفیظ آپ؟" نصیرالدین کو بصارت پر یقین نہیں آیا۔ دو گلیاں چھوڑ کر حفیظ الدین کا گھر تھا مگر اتنے مہینوں سے گلی، محلے میں بھی دونوں بھائیوں کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ حفیظ الدین اپنے گھر کے پاس والی مسجد میں ہوتے تھے یا وہاں سے سیدھے اپنے گھر۔

"تم نے تو بھائی کی خیر خبر لینا ہی چھوڑ دی کہ بڑا بھائی زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ میں نے سوچا خود ہی مل آؤں۔" حفیظ الدین گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔ شائستہ بھی صحن کے بیچوں بیچ بے یقینی کی کیفیت میں گھری کھڑی تھی۔

"دلہن سلام بھی بھول گئیں؟" حفیظ الدین آج پرانے والے حفیظ الدین لگ رہے تھے۔ شائستہ نے ہڑبڑا کر سلام کیا۔ نصیرالدین جھٹ برآمدے میں سے کرسی اٹھا لایا۔

حفیظ الدین کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ نصیرالدین ان کے پاس ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ بڑے بھائی کا ادب اس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا تھا بس درمیان کے کچھ عرصے میں جانے عقل پر کیسا پردہ پڑا کہ دکھوں سے چُور بھائی کو اس نے خود بھی زخم دے دیا لیکن آج دل ہی دل میں نصیرالدین اس بات پر شکر کررہا تھا کہ اس تمام عرصے میں بڑے بھائی سے سامنا نہیں ہوا ورنہ جس طرح عزیز از جان بھتیجے کو ذلیل کرکے گھر سے نکالا تھا اگر اس وقت بڑا بھائی جواب طلبی کرنے آجاتا تو یقیناً نصیرالدین ان سے بھی کچھ الٹا سیدھا بول دیتا لیکن اللہ نے اسے ندامت سے بچالیا تھا۔ وہ باپ جیسے بھائی کے سامنے زبان درازی سے محفوظ رہا تھا۔

"کہاں ہیں بچے؟" حفیظ الدین نے شائستہ کو مخاطب کیا۔

"چھوٹے تو دونوں ٹیوشن پڑھنے گئے ہیں، فروزاں کمرے میں ہے۔ فروزاں...... فروزاں باہر آؤ دیکھو تو تمہارے تایا ابا آئے ہیں۔" شائستہ نے جھٹ فروزاں کو آوازیں دیں۔ چند لمحوں بعد فروزاں کمرے سے نکلی تھی۔ تایا کے پاس آکر دھیرے سے انہیں سلام کیا۔

"جیتی رہو، خوش رہو، سدا آباد رہو۔" انہوں نے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ وہ یاسیت جو تائی جان کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ آج وہ اس کیفیت سے نکلے ہوئے لگ رہے تھے۔

"شام کی چائے کا وقت ہے۔ چائے نہیں ملے گی گیا؟" حفیظ الدین نے بھاوج کو دیکھا۔

"کیوں نہیں بھائی جان، جا فروزاں جلدی سے چائے بنالا۔" اس نے جھٹ فروزاں کو باورچی خانے بھیجا۔

"شازیہ کے جانے کے بعد چائے، پانی کی بہت تنگی ہوگئی ہے۔ عبدالحیٔ بیٹا بہت فرمانبردار ہے لیکن ہے ایک نمبر کا پھوہڑ۔ چائے تک ڈھنگ کی نہیں بناسکتا۔ میں آج خاص طور پر اسی مقصد کے لیے آیا ہوں کہ مجھے تاریخ اور دن بتادو کہ ہم فروزاں کو لینے کب آئیں لیکن کوئی نزدیک کی تاریخ دینا۔ ہمارا گھر تعمیر و مرمت کے بعد نیا تو لگنے لگ گیا

ہے مگر بہت سُونا ہوگیا ہے، فروزاں آجائے گی تو آباد ہوجائے گا۔'' حفیظ الدین اتنے معمول کے انداز میں شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے جیسے باقی سارے معاملات طے ہوچکے ہوں یا پھر درمیان کے عرصے میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شائستہ اور نصیرالدین آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتے رہے پھر نصیرالدین بھائی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''حفیظ بھائی مجھے معاف کردیں۔'' وہ لمبا چوڑا مرد بچوں کی طرح آنسو بہانے لگا تھا۔ شائستہ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایسی اعلیٰ ظرفی، ایسی کشادہ دلی۔ یہ فرشتہ صفت انسان تھا تو ہمیشہ سے ہی ایسا مگر اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی وہ بغیر کچھ جتائے فروزاں کا رشتہ مانگ لیں گے یہ شائستہ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

''بچپن سے تیری یہ ہی عادت ہے نصیر۔ پہلے غلطی کرتا ہے پھر فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ کر رونا دھونا مچاتا ہے۔ چل اٹھ شاباش سارے کپڑے میلے ہوجائیں گے۔'' انہوں نے شگفتگی سے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا۔

''میری غلطی بہت بڑی ہے بھائی، اتنی آسانی سے معاف کیوں کیا۔'' نصیر الدین نے بھرّائے ہوئے لہجے میں بھائی کو مخاطب کیا۔

''او نہیں یار، غلطی میری بھی ہے۔ بلقیس کے جانے کے بعد دنیا تیاگ بیٹھا۔ عبدالحیٔ پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لاد دیا۔ گھر کے معاملات بھی اسی کے سر پر چھوڑے اور کھانے کمانے کی ذمے داری بھی اسی کے سر پر تھوپ دی۔ میرے ہونہار اور قابل بچے کی پڑھائی بیچ میں رکی۔ اِدھر تو نے رشتہ توڑا تب بھی.... بے چارہ عبدالحیٔ ہی بھاگا بھاگا تیرے پاس آیا۔ میں نے گھر سے نکلنے کی زحمت نہیں کی ورنہ بتا کیا تو میری بات ٹال سکتا تھا بھلا؟'' حفیظ الدین نے بھائی کو مخاطب کیا۔ یہ یقیناً ان کی کشادہ دلی تھی کہ وہ حقیقتِ حال جانتے ہوئے ماضی کے متعلق خوش گمانی میں مبتلا تھے۔

''پتا نہیں بھائی جان، مجھ بدبخت کی آنکھوں پر اُن دنوں ایسی پٹی بندھی ہوئی تھی کہ میں آپ کو بھی انکار کرسکتا تھا، اللہ کا شکر ہے اس نے اس بدتمیزی سے بچالیا۔'' نصیرالدین نے شرمندہ لہجے میں سچائی کا اعتراف کیا تھا۔

''تو بیچ میں بس خود کو گھسیٹ لیا کر۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ غلطی میری بھی تھی۔ میں عبدالحیٔ کو ہر طرح کی ذمے داری سونپ کر خود اس بہشتن کا غم منانے بیٹھ گیا۔ عبدالحیٔ نے بہن کی شادی کی۔ سارا انتظام کیسے ہوا مجھے نہیں پتا۔ میں نے اپنی دانست میں اللہ سے لو لگالی تھی لیکن یار حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوئی کمی بیشی ہو بھی جائے تو اوپر والا معاف کرسکتا ہے لیکن حقوق العباد سے منہ موڑا جائے تو مسئلہ بڑا گڑبڑ ہوجاتا ہے بھائی...... اولاد سے زیادہ ماں، باپ پر کس کا حق ہے۔ اللہ کا شکر ہے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے بیٹے کی زندگی میں اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹاؤں...... جب عبدالحیٔ نے دیانت داری سے اپنے تمام فرائض ادا کردیے تو میں اپنے فرض سے کیسے چشم پوشی اختیار کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے کل رات کو ہی بتایا کہ فروزاں کی نسبت ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے اس سے ایک ہی سوال پوچھا کہ بیٹا اگر تجھے اپنی انا پیاری ہے تو تیرے چاچے نے جو تیری بے عزتی کی تھی اسے یاد رکھ اور فروزاں کو بھول جا لیکن اگر تجھے اپنی محبت پیاری ہے تو بھول جا تیری اور فروزاں کی نسبت کبھی ٹوٹی بھی تھی۔ نہ کبھی زندگی میں فروزاں کو طعنہ دیجیو نہ کبھی چاچے کو اس کی غلطی کا احساس دلا کر شرمندہ کیجیو۔ وہ بولا ابا جی آپ مجھے اتنا کم ظرف سمجھتے ہیں۔ بس بھائی مجھے جواب مل گیا اسی لیے تمہارے پاس حاضر ہوا ہوں۔ بتاؤ پھر اگلے چاند کی چودہ تاریخ کیسی رہے گی؟'' حفیظ الدین نے بات کے اختتام

پر سوالیہ نگاہوں سے بھائی، بھاوج کو تکا۔

''آپ کا حکم ہمارے سر آنکھوں پر بھائی جان۔ فروزاں آپ کی امانت ہے ہمارے پاس...... جب جی چاہے اپنی امانت لے جائیں۔'' شائستہ اور نصیرالدین پر شادیٔ مرگ طاری ہوگئی تھی۔

''ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چائے تو پیتے جائیں بھائی، فروزاں چائے بنانے میں اتنی دیر لگادی بیٹا۔'' شائستہ نے فروزاں کو آواز دی تھی۔

''او بھلیے لوکے اب باقی کی سای عمر اپنی فروزاں کے ہاتھ کی ہی چائے پئیں گے۔ اب چلوں گا نماز کا بھی وقت ہو رہا ہے اور تمہارا بھتیجا بھی میری راہ تک رہا ہوگا۔'' حفیظ الدین مسکراتے ہوئے اٹھے تھے۔ شائستہ اور نصیرالدین انہیں دروازے تک چھوڑنے گئے تھے۔

''اللہ نے کتنا کرم کردیا۔ آج تو میں بھی مسجد میں نماز پڑھ کر شکرانے کے نفل ادا کروں گا۔ جا شائستہ میری ٹوپی لادے۔'' نصیرالدین نے بیوی کو مخاطب کیا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اور جب وہ وضو کرکے گھر سے نکل گیا تو شائستہ نے باورچی خانے میں جھانکا، فروزاں پیڑھی پر بیٹھی سر جھکائے ماچس کی تیلی سے فرش پر نادیدہ لکیریں کھینچنے میں مصروف تھی۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہے۔ تو نے سن لی ناں اپنے تایا کی باتیں...... آج تو بہت بڑی خوشی کا دن ہے فروزاں۔''

''آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر تایا کو ہاں کیوں کی اماں۔ مجھے اس رشتے سے انکار ہے۔'' فروزاں نے مدھم لہجے میں ماں کو مخاطب کیا۔ شائستہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مجھے عبدالحیٔ سے شادی نہیں کرنی اماں۔'' اس نے اس بار اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ کے واسطے فروزاں، بس کردے اتنی مشکل سے سب ٹھیک ہونے جارہا ہے۔ اب تیری کھوپڑی کیوں گھوم گئی؟'' شائستہ نے روہانسی ہوکر پوچھا۔

''اماں میں کوئی موم کی گڑیا نہیں ہوں جیتی جاگتی انسان ہوں۔ میری زندگی سے متعلق فیصلوں میں میری مرضی اور خوشی بھی شامل ہونی چاہیے۔''

''تو کیا عبدالحیٔ کا ساتھ تیری زندگی کی سب سے بڑی خوشی نہیں؟'' شائستہ نے پوچھا تھا۔

''ہے اماں بالکل ہے، یہ میری خوشی تو ہے پر میری مرضی نہیں ہے۔ میں اتنی خودغرض نہیں ہوں اماں کہ اپنی خوشی کے لیے کسی اور کی زندگی مشکل میں ڈال دوں۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مخاطب تھی۔

''تو کہنا کیا چاہ رہی ہے فروزاں۔ تیری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔'' شائستہ عاجز آتے ہوئے بولی۔

''اماں تجھے زرینہ خالہ کی باتیں بھول گئیں کیا ...... بے شک مجھے اس عورت سے نفرت کی حد تک چڑ تھی۔ زہر لگتی تھیں مجھے اس کی باتیں لیکن اس روز اس نے بالکل سچ بات کی تھی اماں۔ جب تک میں عبدالحیٔ کی زندگی میں شامل رہی وہ بالکل معمولی زندگی گزارتا رہا۔ نہ پیسے کی فروانی تھی نہ اس نے زندگی میں کوئی ترقی کی تھی اور جیسے ہی میں اس کی زندگی سے نکلی وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ شاید میری نحوست ہی تھی جس نے عبدالحیٔ پر بہتر زندگی کے دروازے بند کیے رکھے۔'' فروزاں خود اذیتی کی انتہا پر تھی۔

''تو اس خبیثن کی باتوں میں آگئی فروزاں۔ پگلی یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔''

''وہی تو اماں، میں اتنی نصیبوں والی نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ عبدالحیٔ کی زندگی کیوں خراب کروں۔ اسے تو کسی بہت اچھی بھاگوان عورت کا

www.paksociety.com

ساتھ ملنا چاہیے۔ بس تم تایا کو انکار کر دیا۔ عبدالحیٔ کے سوا جس سے بھی کہو گی چپ چاپ شادی کرلوں گی۔'' فروزاں نے آنکھوں کے نم گوشے صاف کیے۔

شائستہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ جانتی تھی فروزاں اول تو ضد کرتی نہیں لیکن اگر کبھی کسی بات پر اڑ جائے تو پیچھے نہیں ہٹتی۔ فی الحال اس نے بحث کرنا مناسب نہیں جانا۔ ابھی وہ جذباتی ہو رہی تھی ہو سکتا ہے کچھ وقت گزرنے کے بعد اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا۔ شائستہ چپ چاپ اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ اگلے دن ہنستی مسکراتی شازیہ آن پہنچی۔ شادی کے بعد دونوں سہیلیوں کی پہلی ملاقات تھی۔ فروزاں سے ملتے ہوئے شازیہ کے لب مسکرا رہے تھے جبکہ آنکھوں کا فرش گیلا تھا۔

''تم لوگ کس مٹی کے بنے ہو شازی، ہماری غلطی اتنی چھوٹی تو نہ تھی کہ فوراً بھلا کر ہنستے ہنستے ملنے پہنچ گئے۔'' فروزاں نے اسے عجیب سے لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

''اگر اپنے، اپنوں کی غلطیاں نہ بھلائیں فروزاں تو وہ اپنے تو نہ ہوئے وہ تو غیر ہوئے ناں۔'' شازیہ نے اسے محبت سے مخاطب کیا۔

''مجھے اپنا سمجھتی ہو شازی؟'' فروزاں نے پوچھا تھا۔

''ہاں دنیا میں سب سے زیادہ اپنا لیکن مدثر کے بعد۔'' شازیہ شوخی سے کھلکھلائی تھی۔

''میں بھی تم لوگوں کو اپنا سمجھتی ہوں شازیہ اس لیے تم لوگوں کا برا چاہ ہی نہیں سکتی۔'' فروزاں بات کی تمہید باندھ رہی تھی۔ شائستہ نے بوکھلا کر اسے دیکھا روکنا چاہا مگر روک نہ پائی۔ فروزاں نے شازیہ کے سامنے اپنے فیصلے کا دوٹوک اظہار کر دیا تھا۔ شازیہ حیرت سے منہ پھاڑے اس کی شکل دیکھتی رہی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے فروزاں، خود کو کسی اور کی آنکھ سے کیوں دیکھ رہی ہو...... بکواس کی تھی اس عورت نے۔ رشتہ توڑنے کا بہانہ چاہیے تھا انہیں۔ ان لوگوں کو اپنے گرتے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے کے لیے مالدار آسامی کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے وہ بکواس پھیلائی تھی۔ تمہاری پڑوسن نسیمہ آپا کی زبانی مجھے سب پتا چل گیا تھا۔ ہم تو چلو تمہارے اپنے ہیں، تم سے پیار کرتے ہیں لیکن آس پڑوس میں کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں جس نے اس گھرانے کی ذہنیت کی برائی نہ کی ہو۔ شکر ہے ایسے بدبخت لوگوں سے یہ محلہ پاک ہوا۔'' شازیہ کو سارے سیاق و سباق کا بخوبی علم تھا۔

''میں مانتی ہوں شازی وہ لوگ صحیح نہیں تھے لیکن زرینہ بیگم کی بات مجھے غلط نہیں لگی۔ میں نہیں چاہتی میری نحوست عبدالحیٔ کی زندگی کو گہنا دے۔'' اس نے کہا تو شازیہ کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ اس کی عقل میں جو بات سما گئی تھی اس کا نکلنا مشکل تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے بابا، جو تم نے کہا ہم نے مان لیا۔ بات ختم پیسہ ہضم۔'' شازیہ نے چاچی کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے بات ٹال دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فروزاں کے دماغ کا خناس اب کون نکال سکتا ہے۔ اسی لیے اس نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے شائستہ کو مخاطب کیا۔

''چاچی میں آج رات ابا جی کی طرف ہی رک رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں شام کو ڈاکٹر نائلہ کی طرف چکر لگا لوں۔ آپ چلیں گی میرے ساتھ۔'' اس نے علاقے کی مشہور گائنا کالوجسٹ کا نام لیا تھا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، خیر کی خبر ہے ناں!'' شائستہ اس کی بات سن کر بے تحاشا خوش ہو گئی تھی۔ جیٹھ کے بچوں کو انہوں نے ہمیشہ دل سے ہی چاہا تھا کہ درمیان میں جو عرصہ نصیرالدین کے غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھا تھا اس تمام عرصے میں بھی شائستہ کی خاموش دعاؤں میں یہ بچے شامل رہے تھے اور شازیہ، چاچی کے سوال پر شرماتے ہوئے نہیں چپکے، چپکے کچھ بتانے لگی۔ فروزاں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شادی کے بعد ہم عمر ہمجولیاں کیسی معتبر بن جاتی ہیں۔ اس نے شائستہ اور شازیہ کو باتوں میں مشغول پا کر کچن کا رخ کیا۔ کچھ بھی تھا آج اس کی سکھی کتنے بہت دنوں بعد گھر آئی تھی۔ وہ اس کی بھرپور خاطر کرنا چاہتی تھی۔ کچھ وقت گزار کر شازیہ چلی گئی تھی۔ اس نے دوبارہ فروزاں سے اس کے اور عبدالحیٔ کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ شام کو عصر کی نماز پڑھتے ہی شائستہ بھی چادر اوڑھ کر جیٹھ کی طرف چلی گئیں۔

''تمہارے ابا آئیں تو بتا دینا شازیہ کو لے کر لیڈی ڈاکٹر کے گئی ہیں۔ ڈاکٹر نائلہ کے کلینک پر تو رش بھی بہت ہوتا ہے۔ دو تین گھنٹوں سے پہلے باری آنا مشکل ہے۔ تم اندر سے کنڈی لگا لو۔ گڈو، نومی تھوڑی دیر تک ٹیوشن پڑھ کر آ ہی جائیں گے۔'' شائستہ ہدایات دے کر چلی گئی۔ فروزاں دروازہ بند کر کے صحن میں بچھی چارپائی پر نیم دراز ہو گئی۔ دل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس نے عبدالحیٔ کی بہتری کے لیے اس سے دستبرداری کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن یہ قربانی بہت مشکل تھی۔ وہ اسے پا سکتی تھی مگر اس کا ساتھ عبدالحیٔ کی زندگی کو کٹھنائیوں میں مبتلا کر دیتا اور یہی وہ سوچ تھی جو اس سے اتنی بڑی قربانی دلوا رہی تھی۔

زرینہ بیگم کی باتیں بار بار اس کے ذہن میں گونجتیں انہوں نے حالات و واقعات کا جس انداز میں تجزیہ کیا تھا فروزاں کو وہ بالکل درست معلوم ہوتا۔ اب بھی وہ دل گرفتگی سے اپنے اور عبدالحیٔ کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ ان کی قسمتوں نے کتنے پلٹے کھاتے تھے اور بالآخر جدائی ہی ان کا مقدر تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی سوچا تھا شام کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن کی راہ لی جائے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی شاید گڈو وغیرہ

ٹیوشن پڑھ کر آ گئے تھے۔ وہ کنڈی کھول کر پلٹ آئی۔ دروازہ گڈو نے خود کھول لینا تھا لیکن گڈو دروازہ دھکیل کر اندر نہیں آیا اس نے پھر دروازہ بجا دیا۔

''بہرے ہو گیا، کنڈی کھلنے کی آواز نہیں آئی تھی کیا؟'' فروزاں نے دروازہ کھول دیا تھا لیکن پھر پتا چلا کہ وہ گڈو کا غصہ کسی اور پر نکال چکی ہے۔

''دستک اجازت لینے کے لیے دی جاتی ہے، اندر آ سکتا ہوں میں؟'' عبدالحیٔ نے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ اس نے بوکھلا کر گردن ہلا دی۔

''راستہ دو گی تب ہی اندر آ سکوں گا ناں۔'' عبدالحیٔ نے احساس دلایا تو وہ فوراً شرمندہ ہوتے ہوئے ایک طرف ہٹی تھی۔ گھر میں داخل ہو کر عبدالحیٔ نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تھا۔

''گڈو تو یقیناً باہر ہے نومی بھی نہیں ہے کیا؟'' اس نے فروزاں کے سب سے چھوٹے بھائی کی بابت پوچھا تھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے پھر یہیں صحن میں بیٹھ جاتا ہوں۔'' وہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

''اماں تو آپ لوگوں کی طرف ہی گئی ہیں۔'' فروزاں نے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے بتایا تھا۔ شازیہ کی شادی کے بعد وہ آج عبدالحیٔ کو دیکھ رہی تھی بلکہ دیکھ بھی کہاں رہی تھی ہمیشہ کی طرح اس دراز قد شخص کی آنکھوں میں دیکھنا اسے مشکل لگ رہا تھا وہ نظریں جھکائے اس سے مخاطب تھی۔

''مجھے معلوم ہے، میں چاچی سے گھر میں مل لیا تھا۔'' اس نے اطمینان سے آگاہ کیا۔

''ابا بھی ابھی کام سے نہیں لوٹے۔'' فروزاں نے مزید بتایا۔

''میں ان سے ملنے بھی نہیں آیا ہوں۔'' عبدالحیٔ کے اطمینان میں کوئی فرق نہ پڑا۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر سے اپائمنٹ لی ہوئی ہے۔ تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ تمہارا چیک اپ کروانے جانا ہے۔“ اس نے فروزاں کو مخاطب کیا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ فروزاں نے حیران سے پوچھا۔

”دماغ خراب۔“ عبدالحیٔ نے ایک پل کی تاخیر کیے بنا جواب سے نوازا۔

”ایسے کیا گھور رہی ہو، سچ کہہ رہا ہوں میں۔ دماغ والے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا ہے تاکہ تمہارے دماغ کا اچھی طرح معائنہ کروا سکوں۔“ عبدالحیٔ نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بظاہر بڑی سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

”میرا کوئی دماغ خراب نہیں ہوا۔“ فروزاں نے خفگی سے منہ پھیر لیا تھا۔

”پھر ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ اس رب کی مہربانی سے ہمیں پھر اکٹھا ہونے کا موقع ملا ہے اور اس بار تم خود ہمارے ملن میں رکاوٹ بن رہی ہو۔ کیوں فروزاں، آخر کیوں؟“ عبدالحیٔ نے اسے بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنے سامنے کیا تھا۔ فروزاں چپ چاپ نگاہیں جھکا گئی۔ جو بات شازیہ اور شائستہ کے سامنے آسانی سے کہہ گئی تھی وہ اس شخص کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنا کتنا مشکل تھا اور دل تو ویسے بھی بے ایمان ہوا جا رہا تھا۔

”میں بہت سیدھا سادہ بندہ ہوں فروزاں، ہر کام کو مناسب وقت پر کرنے کا قائل ہوں لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اظہارِ محبت جو میں اب تک اپنے سینے میں کسی خوب صورت دن کے انتظار میں چھپائے بیٹھا ہوں وہ تم سے ابھی کر دوں۔ مشکل الفاظ مجھے آتے نہیں ہیں فروزاں، آسان الفاظ میں تم سے یہ ہی کہہ سکتا ہوں کہ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ جب تم میری زندگی سے نکل گئی تھیں تو میرے لیے زندگی کی ساری رعنائی اور دلکشی ختم ہو گئی تھی۔ میں جیتے جاگتے انسان سے محض ایک مشین بن گیا تھا بلکہ یوں کہہ لو کہ پیسہ کمانے کی مشین۔ میری ماں نے میری تربیت ایسی نہیں کی کہ میں اپنا غم غلط کرنے کے لیے حرام چیزوں کا سہارا لوں۔ تجارت حلال پیشہ ہے میں نے اپنا دھیان کاروبار کی طرف لگا دیا۔ نیا کام تھا مگر اللہ نے برکت ڈال دی لیکن اگر وہ پیسہ تمہیں اپنے اور میرے درمیان رکاوٹ محسوس ہوتا ہے تو مجھے ایسے پیسے کی حاجت ہے نہ خواہش۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور خواہش تم ہو۔ بتاؤ میں ایسا کیا کروں کہ تمہارے فضول کے وہم اور خدشات ختم ہو جائیں؟“ اس بار وہ حقیقتاً سنجیدگی سے مخاطب تھا۔

”میں تمہارے لیے بھاگوان نہیں ہوں عبدالحیٔ۔ کسی نصیبوں والی عورت کو تمہارا ساتھ ملنا چاہیے۔“ فروزاں نے آنسو پیے تھے۔

”پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔“ عبدالحیٔ جھنجلا گیا تھا۔ ”ٹھیک ہے میں کسی اور لڑکی سے شادی کر لیتا ہوں تو اس کے نصیبوں کی گارنٹی تم دو گی مجھے؟“ اس نے ڈپٹتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے تم سے ہر بے وقوفی کی امید تھی فروزاں مگر کم از کم اس جہالت کی نہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا انتخاب ایسے کمزور ایمان اور ضعیف عقیدے والی عورت ہے۔ ارے بے وقوف، روزی میں کمی یا زیادتی تو اوپر والے کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں آزمائش ہے۔ اگر تنگی ترشی میں گزر بسر ہو تو صبر اور قناعت سے اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے اور اگر اللہ رزق میں فراوانی دے تو وہ زیادہ بڑی آزمائش ہے۔ شکر کے ساتھ ساتھ اس پیسے کو اللہ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر خرچ کرنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے اور میں کون سا ایسا لینڈ لارڈ ہو گیا ہوں جو تمہیں یہ خدشہ ہے کہ کہیں میں پھر سے پہلی والی پوزیشن پر نہ چلا جاؤں اور فرض کر لیتے ہیں کہ تمہارے نصیب اتنے

زور آور نہیں اور میں دوبارہ وہی معمولی سا جنرل اسٹور چلانے لگوں تو کیا تمہیں عبدالحیٔ سابقہ حیثیت میں قبول نہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ فروزاں نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”گویا تم کہہ رہی ہو نہیں۔“ عبدالحیٔ نے مصنوعی حیرانی ظاہر کی اس بار فروزاں نے بوکھلا کر نفی میں گردن ہلا دی۔ عبدالحیٔ کھل کر ہنس دیا۔

”تو پاگل لڑکی جب تمہیں صرف میرا ساتھ عزیز ہے، روپے کی چاہے تنگی ہو یا فراوانی تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو کیا تم نے عبدالحیٔ کے پیار کو ایسا بودا سمجھ لیا کہ وہ ان مادی اشیا کو تم پر فوقیت دے گا۔ مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے فروزاں باقی کسی چیز کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

فروزاں چپ رہی۔

”تو تمہاری چپ کو میں اقرار سمجھوں؟“ اس نے اسے محبت سے مسکرا کر دیکھا۔ فروزاں کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ بکھر گئی۔

”پاگل لڑکی تمہارے ذہن کی رسائی کتنی محدود ہو گئی ہے۔ تمہیں تو اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ اس نے خود بخود ہمارے راستے کی مشکلات ختم کر دیں۔ ہمیں ہماری صاف نیت کا پھل دیا۔ مجھے تمہارے پیار پر اتنا بھروسا تھا کہ اگر میں اس وقت چاہتا تو تمہیں چاچا جی کے خلاف بغاوت پر مجبور کر دیتا مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی محبت کے حصول پر تمہاری عصمت و حرمت کو فوقیت دی اگر ہم اس وقت کوئی غلط قدم اٹھا لیتے تو میرا تو کچھ نہ بگڑتا مگر چاچا بھی دنیا میں رسوا ہو جاتے اور تمہاری عزت پر بھی حرف آتا۔ میں نے اپنا مقدمہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اسی کی مدد چاہی اور دیکھو جو بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی وہ ہو گئی۔ کتنی آسانی سے وہ لوگ تم سے دستبردار ہو گئے ورنہ وہ جتنے ٹیڑھے قسم کے لوگ تھے چاچا خود رشتہ توڑتے تو نہ جانے ان لوگوں کا کیا ردِعمل ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ چاچا، چاچی بھی بہت دنوں سے ان لوگوں سے پیچھا چھڑوانے کے چکر میں تھے۔ اللہ نے سب کچھ ہمارے حق میں بہتر کر دیا اور تم اپنی بے وقوفی سے سب کچھ پھر بگاڑنے پر تلی تھیں۔“

”جس طرح تم نے مجھے سمجھایا ہے کسی اور نے سمجھایا بھی تو نہیں تھا۔“ فروزاں نے دھیمے لہجے میں اعتراف کیا۔

”تمہیں سمجھانے کی ذمّے داری میں نے تیسری جماعت سے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ ریاضی کے سوال سمجھانے ہوں یا گرائمر کے قواعد...... تمہیں عبدالحیٔ کے سوا کسی کا کہا سمجھ بھی تو نہیں آتا تھا، ہے ناں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ شرارتی مسکراہٹ ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ فروزاں جھینپ کر ہنس پڑی۔

”چاچی ایسے ہی پریشان ہو رہی تھیں کہ فروزاں ہٹ کی پکی ہے جو بات دماغ میں گھس جائے نکلنا مشکل ہے مگر مجھے اپنے پیار پر بھروسا تھا جانتا تھا کہ مجھے اپنی فروزاں کو قائل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اسی لیے شازیہ کو آج پیسے دے کر بھیجا ہے اگر ڈاکٹر کے پاس سے جلد فارغ ہو جائیں گے تو بازار کا چکر لگا لیں گے۔ ابا جی تو اگلے مہینے کی کوئی تاریخ رکھنا چاہ رہے ہیں۔ شازیہ کا بار بار سسرال سے آنا مشکل ہے اسی لیے میں نے کہہ دیا کہ شادی کی جتنی شاپنگ ممکن ہو دو تین دن میں نمٹا لیں۔ دو تین دن تو شازیہ کو روک ہی لوں گا......... اور ہاں شازیہ اور چاچی کا خیال ہے کہ شادی والے دن کا جوڑا سرخ رنگ کا ہونا چاہیے جبکہ میرا خیال ہے کہ تم پر سفید رنگ سب سے زیادہ خوب صورت لگتا ہے اسی لیے......“

”آپ نے مجھے سفید لباس میں کب

دیکھا؟'' فروزاں نے حیرت سے اس کی بات کاٹی اور پھر اسے خود ہی یاد آ گیا۔ ''شازیہ کی شادی والے دن؟'' اس نے پوچھا عبدالحیٔ نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اس روز آپ نے مجھ پر ایک نگاہ تک نہیں ڈالی تھی۔'' بے ساختہ شکوہ لبوں سے پھسلا۔

''غلط کہہ رہی ہو، ایک نگاہ ڈالی تھی میں نے ہاں دوسری نگاہ ڈالنے کی تاب نہیں تھی مجھ میں۔ میری چیز جو میری ہی دسترس سے باہر تھی اگر غصہ آ جاتا ناں تو شازیہ اور مدثر کے نکاح کے ساتھ اپنا اور تمہارا نکاح بھی پڑھوا لیتا۔ ہاں اب بات دوسری ہوگی۔ جب تم شرعی اور قانونی طور پر میری ہو جاؤ گی تب کون روک سکے گا مجھے چاہے صبح سے شام تک بیٹھ کر تمہیں دیکھتا رہوں۔''

''ہاں پھر تایا آپ کو جوتے لگائیں گے۔'' فروزاں کو ہنسی آ گئی۔

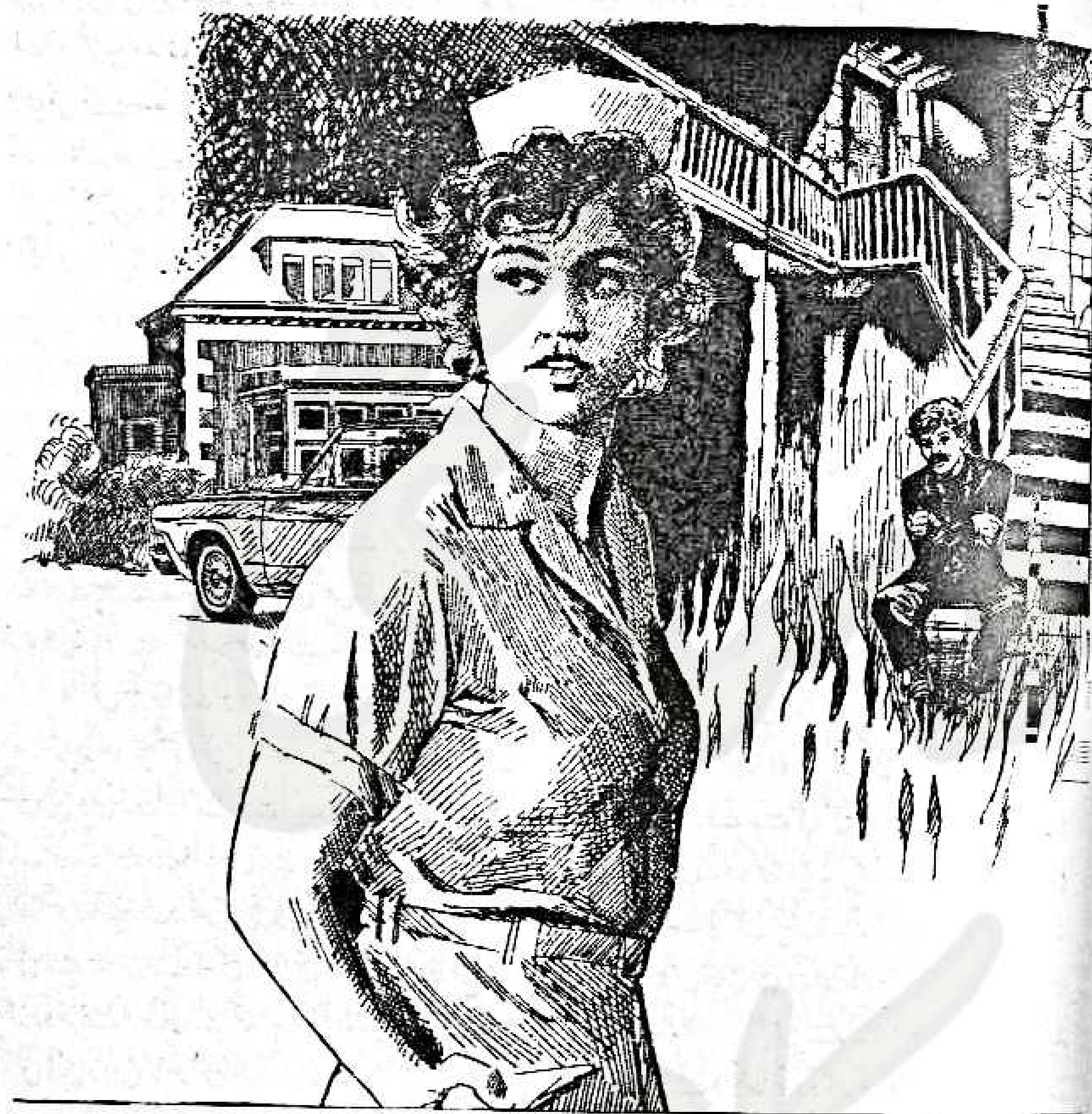
''تو کھا لیں گے تمہارے تایا کے جوتے بھی...... بچپن میں بھی تمہاری وجہ سے کم مار پڑی ہے مجھے۔ جب بھی تمہیں تنگ کرتا شازیہ فوراً شکایت لگا دیتی اور اماں بھی فوری ایکشن لیتے ہوئے میری فوراً ہی ٹھکائی لگا دیتیں۔'' اس نے لطف لیتے ہوئے بچپن کا حوالہ دیا۔ فروزاں کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ بکھر گئی مگر ساتھ ہی تائی جیسی شفیق ہستی کی یاد نے آنکھوں کے گوشے نم کر دیے۔ عبدالحیٔ اس کی دلی کیفیت سمجھ گیا تھا۔ اسے خود بھی ماں کی شدت سے یاد آئی لیکن وہ جانتا تھا کہ ماں کی لاڈلی اس کی زندگی میں شامل ہو جائے گی تو ان کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ چند پل بے نام خاموشی کی نذر ہوئے تھے پھر عبدالحیٔ نے ہی مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''پھر شازیہ کو فون کر دوں میں... تمہیں سفید جوڑے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''کیوں نہیں ہے؟ ضرور ہے...... دلہنیں سرخ جوڑے میں ہی اچھی لگتی ہیں اور اب آپ جائیں ابا آنے والے ہوں گے۔'' فروزاں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لو تم مجھے گھر سے نکال رہی ہو۔'' عبدالحیٔ نے مصنوعی خفگی دکھائی۔ فروزاں نے مسکرا کر بنا کچھ کہے دروازہ کھول دیا۔

''ٹھیک ہے فروزاں صاحبہ، آپ کی مرضی۔ فی الحال تو گھر سے نکال رہی ہو لیکن جب گھر والی بنو گی تب گن، گن کر بدلے لوں گا۔ آخر اگلے مہینے چاند کی چودہ میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔'' عبدالحیٔ ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا دہلیز پار کر گیا۔ فروزاں کی نقرئی ہنسی نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ عبدالحیٔ کے لب بھی آپ ہی آپ مسکرا اٹھے۔ راستے کی دوریاں سمٹ گئی تھیں۔ اللہ نے کرم کیا تھا اس کی محبت کو ہی اس کا مقدر کر دیا تھا۔ اس کا رُواں، رُواں اپنے رب کا شکر گزار تھا اور بند کواڑوں سے پشت ٹکائے دل کی دھڑکن کو سنبھالتی فروزاں کے اپنے دل کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں موند کر دل کی گہرائیوں سے رب کا شکر ادا کیا تھا۔ ایسے سلجھے ہوئے شخص کی رفاقت ٹھکرا کر وہ کتنی حماقت کا ثبوت دینے چلی تھی۔ شکر ہے کہ عبدالحیٔ اس کے انکار کو انا کا مسئلہ نہ بناتے ہوئے اسے سمجھانے چلا آیا اور کتنے دو ٹوک الفاظ میں اس نے فروزاں سے اپنے پیار کا اظہار کیا تھا۔ فروزاں نے دل میں اس کی باتیں دُہرائیں تو گال آپ ہی آپ دہک اٹھے۔ عبدالحیٔ کہہ رہا تھا چاند کی چودہ تاریخ میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اس نے چپکے، چپکے انگلیوں پر حساب لگایا اور پھر جیسے خود سے بھی شرما کر اندر بھاگ گئی۔



آتشِ زر

سمیرا حمید

سفید روغن سے سجی یہ خوش باش گھرانے کے مکینوں کی پُر آسائش عمارت ہے...... آسمان کی طرف کو اٹھی ہوئی عمارت...... جسے ابنِ آدم گھر کہتا ہے...... زمین کی سطح پر بنی یہ عمارت جس کے لیے ہی ابنِ آدم بہت کچھ کرتا ہے، اس عمارت میں رہنے والے مسرور و شاداں ہیں، شاداب اور بامراد ہیں اتنا کہ کبھی اس کے لکڑی کے فرش اور قیمتی قالینوں پر آہ و ملال کے آنسو تک نہیں گرے...... کھڑکیوں،

دروازوں کی چوکھٹوں پر کوئی اداسی لیے دل پکڑ کر کھڑا نہیں ہوا...... مگر پھر کیوں انجائے مرج (تباہی) ہے......؟

اس گھر کے داخلی دروازے کے باہر ہری بھری گھاس کی کئی روشیں ہیں جو اتنی سرسبز اور تازہ ہیں کہ آنکھوں میں مستی سی بھر دیتی ہیں ایسے گھروں کے باہر اُگی مستی بھری گھاس کہ ہاتھ پھیرنے سے گھاس کی تازگی پر فرق آسکتا تھا' یہاں ہر ہفتے کی رات بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور دوستوں' احبابوں کی پُرتکلف ضیافت کی جاتی ہے۔ لوگ ان کے سلیقے، طریقے اور انواع واقسام کی نعمتوں سے بھرے خوانوں کے بہت بڑے مداح ہیں۔ اس گھر میں اجمل جلیل کا خاندان آباد ہے...... صاعقہ بنتِ رحیم کا خاندان......

اجمل تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا یہ حصہ شاید گھر کا قیمتی ترین حصہ ہے...... مختلف النوع قیمتی چیزوں کے حوالے سے ایک کونے میں لکڑی کی ایک خوب صورت الماری ہے جو اجمل جلیل کے من پسند مشروبات سے بھری پڑی ہے اور ہر وقت مقفل رہتی ہے۔ اس نے ابھی الماری کا لاک کھولا ہی تھا کہ دوسرے کونے سے کھُد بد کی آوازیں آئیں پھر کسی ذی روح کا سر بھی نظر آ گیا۔

''چپکے، چپکے کیا نکال رہے ہیں گرینڈ پا......؟''

''تم پھر سے یہاں آئیں...... اوپر تمہاری ماما تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔''

''لیکن میں تو کھیل رہی تھی۔'' وہ مسکرائی۔

''چلو اب جاؤ...... سب تیار ہو چکے ہیں ورنہ وہ تمہیں یہیں چھوڑ جائیں گے۔''

''آپ نہیں جا رہے ناں...... میں آپ کے پاس رہ لیتی ہوں۔''

''میں کل جاؤں گا...... ابھی تم جاؤ ورنہ سب چلے جائیں گے...... اور شادی میں خوب مزے کریں گے...... تم پھر روؤ گی......''

''اچھا...... میں روؤں گی...'' ننھی سارہ سوچنے لگی۔

''دیکھو وہ سب گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں...... تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں، جاؤ جلدی کرو۔'' وہ فوراً ڈر کر اپنا سرخ لہنگا اور چھوٹا سا دوپٹا سنبھالتے ہوئے اوپر کی طرف لپکی۔

''آپ اکیلے گھر میں کیا کریں گے آپ کو ڈر نہیں لگے گا پھر آپ بھی روئیں گے گرینڈ پا......'' وہ جانے سے پہلے پلٹ کر گرینڈ پا کو ڈرانے لگی۔

''میں نہیں ڈرتا ورتا...... روتا دھوتا...... میں تو مووی دیکھوں گا۔''

''اچھا...... کون سی مووی......؟'' وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پھر بولا۔

''سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں، جاؤ جلدی......'' اور نتیجتاً وہ بھاگ گئی تھی۔ بھاگنے سے پہلے وہ جس کونے سے نکلی تھی اس پر دوبارہ نظر ڈالنا نہیں بھولی تھی۔ وہ کونا ایک بیکار سے لکڑی کے کاؤچ کے پیچھے تھا۔ اجمل جلیل نے اپنے پسندیدہ آبِ ممنوع کی بوتل نکالی ہی تھی کہ سارہ پھر سے آ گئی۔

''سارہ......'' اس نے لہجے کو قدرے سخت کیا اور گھور کر اسے دیکھا تو وہ ڈر کر اور کچھ خفا سی ہو کر وہاں سے چلی گئی اور جاتے، جاتے دروازے کو باہر سے مقفل کر گئی۔ اجمل جلیل ہنس دیا تھا۔

سارہ کی عادت تھی کئی بار وہ اپنے دو سالہ بھائی فرقان کو اوپر اپنے کمرے کی الماری میں مقفل کر چکی تھی اور اجمل جلیل کو یہاں اس تہ خانے میں تو بہت ہی بار...... ایک چابی یہیں الماری میں رکھی ہوئی تھی اور اسے اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے اپنا مشروب گلاس میں انڈیلنے لگا جب سے صاعقہ حج کر کے آئی تھی وہ ان مشروبات کو اوپر گھر میں کہیں بھی جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھی، پہلے کی بات اور تھی اب وہ حج کر آئی تھی...... حلال،

حرام میں تمیز کرنے لگی تھی...... پانچ میں سے ایک دو وقت صلوٰۃ بھی ادا کرنے لگی تھی اور کبھی کبھار کلام پاک بھی پڑھ لیا کرتی تھی۔ اس سب سے پہلے یہ سارے مشروبات ان کے بیڈ روم میں تھے کچھ ہی دیر میں وہ سب تیار ہو کر تقریب میں جانے کے لیے روانہ بھی ہو جائیں گے اور خالی گھر میں وہ آزادی سے اوپر اپنی نشست گاہ میں کوئی تھرلنگ مووی...... دیکھتے ہوئے پی سکتا تھا۔

ایک پیک پی چکنے کے بعد اس نے اٹھ کر الماری میں سے چابی نکالنی چاہی لیکن چابی وہاں نہیں تھی...... اس نے ایک، ایک کر کے ایک' ایک بوتل کو اٹھا کر چابی کو ڈھونڈنا چاہا لیکن ناکام رہا، اِدھر اُدھر بھی دیکھا کہ شاید کہیں آگے پیچھے، اوپر، نیچے ہو لیکن وہ نہیں تھی وہ دروازے تک گیا اس نے دروازہ بجایا...... ہینڈل گھمایا لیکن گھر والے جا چکے تھے اور دروازہ مکمل مقفل ہو چکا تھا۔

اس کی بہو کی بہن کی آج مہندی تھی...... چار پانچ گھنٹے سے پہلے شاید ہی کوئی واپس آتا اس کا موبائل بھی اوپر اس کے کمرے میں تھا...... وہ سارہ کو گالی دیتے، دیتے رہ گیا۔ بس ایک زور دار مُکّا دروازے پر دے مارا...... ایک بار پھر سے چابی تلاش کرنی چاہی لیکن وہ نہیں ملی...... ناچار گلاس مزید بھر کر بیٹھ گیا...... تہ خانے میں کافی الم غلم بکھرا پڑا تھا زیادہ تر کتابیں تھیں جو اس کی شادی شدہ بیٹی کی تھیں اور جو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر نہیں لے کر جا سکتی تھی...... کچھ لکڑی کا پرانا اور بیکار فرنیچر...... پرانے اخبارات، رسالے' چیرٹی کی غرض سے نکالے گئے کپڑے، جوتے دیگر فالتو سامان...... وہ ایک کتاب کھول کر بیٹھ گیا اور گلاس سے چسکیاں لینے لگا اس سے تو اچھا تھا کہ وہ بھی شادی میں چلا جاتا...... اور اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ گیا کیوں نہیں...... شام تک تو وہ خود بھی تیار تھا جانے کے لیے پھر ایک دم سے اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا...... بلکہ کچھ ایسا ہوا تھا کہ اس نے دو تین بار اپنے سینے کو مسلا...... گھبراہٹ نامی کوئی چیز تھی جو اندر کہیں پھڑ پھڑا رہی تھی...... صاعقہ کو انکار کیا کہ وہ نہیں جا رہا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ وہ تیاری میں مصروف ہو گئی تو وہ نیچے چلا آیا تھا۔

کتاب کی ورق گردانی کرتے اسے کسی بدبو کا احساس ہوا...... یقیناً یہ جلنے کی بدبو تھی...... شاید آگ تھی...... قرب وجوار میں آگ کا ہونا ناممکن تھا لیکن سارہ کا سوچ کر وہ اچھل کر کھڑا ہوا...... سارہ کا پسندیدہ کھیل تھا آگ جلانا...... آگ لگانا...... وہ سب سے نظر بچا کر ایک یہی کام کرتی، ایک ہی کھیل کھیلتی...... کھلونوں کے صوفے...... پردے...... میز کرسیاں...... اخبارات کے ٹکڑے، گڑیوں کے کپڑے۔ اس نے ہر، ہر چیز کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی حد یہ ہے کہ جب وہ ان چیزوں کو آگ لگائے اس خطرناک کھیل میں مصروف دکھائی دیتی تو پوچھنے پر سینہ تان کر کہتی۔

''میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ جلے گی تو کیسی لگے گی۔'' کیسی لگے گی کہ چکر میں وہ اپنے قیمتی کھلونے، فراکیں، کتابیں جلا چکی تھی، گھر کے افراد اس پر اب کڑی نظر رکھتے تھے پھر بھی وہ کہیں نہ کہیں اپنا کام دِکھا جاتی...... اور وہ یہاں اپنا کام دِکھا چکی تھی...... جس لکڑی کے کاؤچ کے پیچھے سے وہ برآمد ہوئی تھی اس کا پایہ آگ پکڑ چکا تھا۔ پائے کے پاس کپڑے کی کترنیں اور اخبار جلے پڑے تھے۔ اب آگ کاؤچ کے نیچے آس پاس بکھرے کاغذوں' لکڑی کے ڈبوں تک پھیل چکی تھی، کاؤچ کی پشت اتنی اونچی تھی کہ دوسرے کونے میں بیٹھے اسے نظر ہی نہیں آسکی۔

آگ کا پھیلاؤ دیکھ کر اب وہ حواس باختہ سا ہو گیا، وہ کتابوں، کپڑوں پر ایسے پھیل رہی تھی جیسے کنکر پھینکنے پر پانی میں لہریں پھیلا کرتی ہیں......

''ارے یہ آگ ایسے کیسے پھیل گئی ہے...... کیسے وجود پھیلائے رقص کناں ہے...... یہ یہاں وہاں کس کھیل میں ہے...... اور یہ آگ...... آگ کیسے بنی...... کس نے لگائی تھی پہلی آگ...... کیونکر...... بھڑکائی گئی یہ آتش...... ابنِ آدم نے ایسا راکھ کردینے والا سودا کب اور کیسے کرلینا سیکھ لیا......؟''

اس نے آس پاس نظریں دوڑائیں...... اس جگہ موجود کس چیز سے وہ آگ کو بجھاتا؟ وہ موٹی، موٹی جلد والی کتابوں کو آگ پر پھینکنے لگا...... اور جلد آگ پکڑ لینے والے سامان کو اٹھا، اٹھا کر وہ دوسرے کونے میں لے جانے لگا اور اسی دوران اس کی کھلی بوتل اور بھرا ہوا گلاس میز سے زمین پر گرے اور آگ کی ایک لمبی لکیر بنتی چلی گئی لمحوں میں میز نے آگ پکڑ لی...... لمحوں میں ہی...... کیا اتنا کچھ ہوجاتا ہے......؟ آتش یوں بھڑکی جیسے جہنم کے نچلے درجے سے عہد لے کر آئی ہو...... کہ وہ یوں پھیلے گی یوں بھڑکے گی کہ آدمی کو انجام دِکھا ڈالے گی۔ اجمل جلیل ساکت وششدر تھا۔

''رک جاؤ اب تم...... اور تماشا دیکھو...... اب تم کچھ نہیں کرسکو گے۔''

''ہاں ابتدائے مرج...... ابتدائے مرج...... اب تو فقط دیکھ۔'' اسے اپنے ضمیر کی صدا سنائی دی۔

''نار...... نار...... یہ ایسے کیسے......؟'' خوف سے اس نے چلّانا چاہا لیکن چلّا نہیں سکا خود کو آگ سے محفوظ کرتے اس نے پھر دروازے کی چابی تلاش کرنا چاہی...... لپک کر دروازے کو زوردار دھکا مار کر گرانا چاہا...... لیکن باہر جانے کے لیے اب چابی کیوں ملتی...... دروازہ دھکے سے کیوں کھلتا...... دروازہ لکڑی کا ہی تھا...... اب تو وہ بھی جلے گا تو ہی کھلے گا...... اور وہ تب جلے گا جب اندر سب کچھ جل چکا ہوگا...... ہاں اس سمیت سب کچھ...... برآمدگی کا ایسا پھاٹک...... مقامِ فکر...... اجمل جلیل کی کنپٹیاں تپ کر پھیلنے سکڑنے لگیں...... اپنی بہن کی مہندی میں اس کی بہو ناچ رہی ہوگی...... بیوی اس ناچ پر تالیاں پیٹ رہی ہوگی...... بیٹا اپنی بیوی کی موویٰ بنا رہا ہوگا...... بہو کو ناچتے، بیوی کو تالیاں بجاتے اور بیٹے کو موویٰ بناتے خیال تک نہیں آئے گا کہ اس سفید پُرتعیش گھر کے تہ خانے میں کیا ہو رہا ہے...... ہری بھری گھاس کے پار بچھی سڑک پر سے بھولے بھٹکے گزرتے کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ تماشا لگانے والا تماش بین بنا بیٹھا ہے۔ وہ امریکا کے مضافات میں اجمل ہاؤس بنائے اپنے تئیں بہت عیش وآرام سے شوروغل سے دور عیاشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح پرانے کمبلوں کو اٹھا کر آگ پر پھینکنا شروع کردیا مگر وہ آگ اور بھڑکنے لگی...... شومئی قسمت تہ خانے میں پھیلی ہوئی آگ سے باہر کی دنیا بے خبر تھی، اس کی اتنی تپش تھی کہ اب ناقابلِ برداشت تھی۔

''اگر اس کے بدن کو چھو لے گی...... جب اس کے وجود میں پھیل جائے گی تو پھر کیا ہوگا......؟'' اس تصور سے ہی اس نے ایک ہیبت ناک چیخ ماری...... کہ شاید ناچتی ہوئی بہو...... تالیاں پیٹتی بیوی سن سکے...... چیخ صرف اس کے اپنے کانوں نے سنی...... انہی کانوں نے وقفے، وقفے سے اور کئی چیخیں سنیں...... ایک چیخ ماضی کے پردے پھاڑ کر اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ناچنے لگی۔

☆☆☆

''وہ ابتدائے مرج تھی۔'' ابتدا صرف اتنی تھی کہ اسے سب کچھ چاہیے تھا مگر محنت کے بغیر...... وہ کام کرکے لاکھوں جمع کرنے کے چکر میں نہیں تھا کہیں سے لاکھوں ہاتھ میں رکھ کر کاروبار کرنے کے چکر میں تھا...... اسے پیسے کی ضرورت تھی...... اور بہت زیادہ تھی...... وہ ایسا کچھ سہل پسند بھی نہیں تھا...... وہ خطرناک حد تک دماغ لڑا لیا کرتا تھا اور وہ اپنی صلاحیت کا خود ہی بہت بڑا مداح تھا۔ وہ

اجمل جلیل تھا۔ مبشرہ اس کی چچا زاد تھی اور وہ اپنے ساتھ شادی کے لیے اسے پرفیکٹ سمجھتا تھا۔ خوب صورت، پڑھی لکھی، کم بولنے اور کم سوچنے والی...... اس کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ اس کے سامنے سوالیہ نشان کبھی نہیں بنتی تھی...... ''بیٹھ جاؤ......'' بیٹھ گئی...... ''کھالو......'' کھالیا...... ''سو جاؤ...... مبشرہ......'' ''سوگئی مبشرہ...... وہ کیوں؟ کیا؟ کب؟ پوچھ کر وقت ضائع نہیں کرتی تھی...... بڑی بھلی مانس تھی مبشرہ......

اسے نرس بننے کا شوق تھا اور وہ بن بھی گئی تھی اسے اچھے سرکاری اسپتال میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ وہیں ایک قابل سرجن ڈاکٹر تھے جن کا ایک اچھے علاقے میں اپنا ذاتی اسپتال بھی تھا۔ ان کے کہنے پر وہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر ان کے اسپتال میں چلی گئی کچھ ہی عرصے میں وہ ہیڈ نرس ہوگئی تھی...... اپنی محنت اور سرجن صاحب کی حد درجہ مہربانی سے وہ مال دار بھی ہوگئی، جب اپنی ذاتی گاڑی میں بیٹھ کر وہ رشتے داروں میں جایا کرتی تو کسی بڑے اسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی سے کم نہیں لگتی...... مزاجاً وہ سادہ لوح اور پُرخلوص تھی جبھی تو سرجن صاحب سے بے لوث محبت کرنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی مہربانیوں کے آگے وہ بچھ، بچھ جاتی...... اس کی سادگی کا فائدہ اس کی سہیلیاں اور کزنز بھی خوب اٹھاتیں اور لوگ اسے بڑی آسانی سے بے وقوف بنا جاتے تھے...... اس کی سہیلیاں اس سے اس کی چیزیں استعمال کے لیے مانگ کر لے جاتیں اور بعد ازاں آتے ہی کہہ دیتیں کہ فلاں بندے تو گم ہوگئے...... فلاں سینڈلز، بیگ، دوپٹا، گھڑی، انگوٹھی اور ایک بار تو اس کی سونے کی چین بھی، وہ کبھی نہ پوچھتی...... کب...... کیسے، کہاں گم ہوگئیں یہ چیزیں مل کر نہیں دیں۔ یہی سہیلیاں اور خاندان کے دوسرے لوگ اس کی کار کئی، کئی دن لیے، لیے پھرتے...... تو ایسی بے چاری اور اللہ

لوک، سادہ لوح اور خوب صورت کماؤ لڑکی کو اجمل جلیل نے اپنے لیے پسند کیا تھا...... ہاں صرف اپنے لیے...... لیکن اس کے دل و دماغ پر تو سرجن کا راج تھا اس سے قطع نظر کہ وہ پہلے سے ہی شادی شدہ اور دو بچیوں کا باپ تھا۔

''تمہاری شادی اس سرجن سے نہیں ہوگی۔'' ابا نے سنا تو فوراً کہہ دیا۔ تو اس نے بھی پہلی بار سوالیہ بن کر ''کیوں......؟'' پوچھ ڈالا۔ اسے سرجن سے واقعی محبت تھی یہ ابا نے جان لیا تھا...... اماں نے جان لیا تھا، مبشرہ نے لفظ ''کیوں'' اتنی بار پوچھا کہ خاندان بھر نے جان لیا...... جلیل نے چچا، چچی کو جی جان لگا کر بھڑکایا...... ساتھ ہی تو گھر تھا...... وہ ہر وقت دونوں کو بھڑکاتا رہتا۔

''سرجن عیاش ہے...... ٹھرکی ہے...... پہلی بیوی سے چھپ کر شادی کر رہا ہے...... دو دن بعد ہی اسے چھوڑ دے گا...... اور...... اور...... یہ کار...... یہ نت نئے ملبوسات، زیورات یہ سب وہی اسے لے کر دیتا ہے مطلب یہ...'' صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کے کردار پر انگلی اٹھا رہا تھا۔

نمازی و پرہیز گار باپ بھڑک اٹھا...... کار پر تیل چھڑک کر آگ لگانے دوڑا...... ملبوسات...... زیورات اٹھا، اٹھا کر باہر پھینکے...... مبشرہ اس رات بہت دیر روتی رہی...... وہ بار بار اپنی ماں کے پاس ایک ہی سوال لے کر جاتی رہی۔

''میں ان سے محبت کرتی ہوں...... ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں...... ان کے بغیر کیسے رہ لوں...... میری ان سے شادی کر دیں یا آپ مجھے ان سے شادی کی اجازت دے دیں۔''

اس کی شادی کی گئی نہ اسے اجازت دی گئی اور وہ خود ہی گھر سے چلی گئی...... اور سرجن سے شادی کر لی...... نکاح کے بعد وہ آئی تھی لیکن ابا نے اسے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا...... زندگی میں پہلی بار وہ خود غرض ہوئی تھی، وہ بھی صرف اپنی محبت پانے کے لیے۔

اجمل کے لیے جیسے سارا کھیل ہی ختم ہو گیا...... اسے مبشرہ سے اتنی جرأت کی توقع ہرگز نہیں تھی...... مطلب صاف تھا کہ وہ واقعی سرجن پر مرتی تھی۔

اگر وہ چچا کو نہ اتنا بھڑکاتا تو چچا اسے اجازت دے ہی دیتے۔ یہی آغاز راہِ مرج تھا۔ سرجن اچھا خاصا امیر تھا۔ اب اجمل نے بازی پلٹنا چاہی تھی جبھی وہ چچا، چچی سے چھپ کر مبشرہ کے پاس آنے جانے لگا جس سے خاندان بھر قطع تعلق کر چکا تھا۔ ایک محبت وہ پا چکی تھی لیکن چھوڑے جانے والوں کے لیے وہ اب روتی تھی۔ اجمل اکثر اس کی دلجوئی کے بہانے آتا، اسے بہلائے رکھتا اور اسے تسلیاں دیتا رہتا۔

''یہ گھر کس کا ہے مبشرہ......؟'' ایک روز وہ پوچھ بیٹھا۔

''میرا ہے...... اجمل بھائی......''

''اچھا! تمہارے نام ہے...... گڈ...... یہ تو بہت اچھا ہوا۔''

''نام......؟ نام کا تو نہیں پتا اجمل بھائی......''

''تم چچا، چچی کو ڈاکٹر صاحب کے لیے چھوڑ بیٹھی ہو، کل کو ڈاکٹر صاحب نے تمہیں چھوڑ دیا تو تمہارے پاس کیا رہ جائے گا؟''

''وہ مجھے بھلا کیوں چھوڑیں گے؟'' وہ ہنسی اور دیر تک ہنستی رہی۔

''ان کی دو بیٹیاں ہیں، بڑی بھی ہوں گی تو اپنے پاپا کو بھڑکا سکتی ہیں اور ان کی پہلی بیوی بھی تو ہے۔'' اس نے نیا انداز اختیار کیا۔

''ہما اور مناہل ہفتے میں ایک دن میرے پاس رہ کر جاتی ہیں...... ہم خوب مزے کرتے ہیں...... ہاں آپا پہلے بہت ناراض تھیں پر اب تو ہم کبھی کبھار فون پر بات بھی کر لیتی ہیں...... سب ٹھیک ہو رہا ہے...... خرم کہتے ہیں اماں، ابا جان بھی مان جائیں گے آخر کب تک ناراض رہیں گے۔'' مبشرہ نے

اپنے تئیں تسلی دی۔

''بہت بھولی ہو تم مبشرہ...... آج تو ڈاکٹر خرم کی بیوی تم سے خوش ہے، ایک بیٹے کی ماں بن گئی تو دیکھنا اور وہ بھی ڈاکٹر خرم کو دکھانے کے لیے تم سے بات کر لیتی ہوگی کہ کب اُن کے سر سے تمہاری محبت کا بھوت اترے اور وہ تمہیں نکال باہر کریں...... اور چچا، چچی بھی یہی سمجھتے ہیں اسی لیے ناراض ہیں...... کہتے ہیں جی بھر گیا سرجن کا تو ہاتھ پکڑ کر باہر کرے گا، یہ پیسے والے ایسے ہی ہوتے ہیں...... ایسا کرو تم یہ گھر اپنے نام لکھوا لو چچا، چچی بھی مان جائیں گے کہ ہاں برابری کا درجہ دیا ہے تمہیں ڈاکٹر خرم نے......'' اجمل نے اپنی خباثت کے زیرِ اثر اسے نئی پٹی پڑھانی چاہی۔

''وہ مجھے بہت چاہتے ہیں...... برابری کیسی...... میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟''

''چچا، چچی بھی تمہیں چاہتے ہیں...... تمہیں یاد کر کے روتے ہیں...... تم گھر اپنے نام لکھوا لو پھر میں ان سے کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب تمہاری بہت قدر کرتے ہیں۔''

''تو کیا اماں، ابا مان جائیں گے؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''ہاں، کیوں نہیں...... خاندان والوں کو بھی معلوم ہوگا کہ کسی عام انسان سے شادی نہیں کی مبشرہ نے...... پر تم میرا ذکر نہ کرنا ڈاکٹر صاحب سے...... خود سے کہنا...... اگر اتنی محبت کرتے ہیں تم سے تو دو منٹ نہیں لگائیں گے اور گھر تمہارے نام کر دیں گے...... شادی تو اب تم نے کر ہی لی ہے۔ کچھ ماں، باپ کا بھی سوچ لو...... کیوں اپنی آخرت خراب کرتی ہو...... انہیں راضی رکھنا زیادہ ثواب ہے۔'' وہ چپ کی چپ سی ہو گئی اور پھر رات گئے اجمل کا فون آیا۔

''اجمل بھائی میں نے ان سے بات کر لی ہے گھر کی...... وہ تھوڑے سے ناراض تو ہوئے...... کہنے لگے ارے اتنی بے اعتباری، وہ تھوڑے سے خفا ہیں...... میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے نہیں لکھوانا گھر اپنے نام......'' وہ ڈر گئی تھی۔

''تو بھول جاؤ اپنے اماں، ابا کو...... کیوں روتی ہو میرے سامنے کہ وہ تمہیں یاد آتے ہیں...... جنہوں نے پال پوس کر بڑا کیا ان کے لیے تو تمہارا دم نہیں گھٹتا...... ان کے لیے تو نہیں تڑپتیں......'' اس نے سسکی سی بھر کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

پھر چند مہینے لگے اور گھر مبشرہ کے نام ہو گیا۔

''اماں، ابا اب تو مجھ سے ملیں گے ناں......؟'' اس نے کاغذات اجمل کے آگے کیے۔

''ہاں کیوں نہیں...... تم یہ کاغذات مجھے دو...... میں چچا، چچی کو دکھا کر لاؤں......'' اور وہ کاغذات لے گیا لیکن چچا، چچی کو دکھانے نہیں چند دن بعد لا کر اس نے اسے کاغذات واپس کر دیے۔

''تھوڑا وقت لگے گا چچا کو منانے میں لیکن وہ مان جائیں گے۔''

''آپ نے کہا تھا گھر کا سن کر وہ...''

''ہاں کہا تھا...... مجھے کیا معلوم تھا چچا اتنے ضدی ہو جائیں گے۔''

''چلیں، میں خود ایک بار ان کے پاس جاتی ہوں۔''

''یہ غلطی نہ کرنا...... تھوڑا وقت دو انہیں...... ان کا غصہ اور ٹھنڈا ہو جانے دو...... ایسے تو بات اور بگڑ جائے گی۔''

''جی...... ٹھیک ہے اجمل بھائی......''

وہ حالات مزید ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہی اور ایک دن کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو گیا سب کچھ......

☆☆☆

کھانستے، کھانستے اس کے پھیپھڑے باہر آنے

لگے تھے وہ سیکڑوں بار دروازے پر کے برسا آیا تھا ٹھڈے مار آیا تھا۔ لکڑی کے زینے کے آگ پکڑنے کی دیر تھی اب...... اس نے چند پرانے کوٹوں کو اپنے اوپر چڑھالیا تاکہ اس کی کھال کو آگ لگنے میں دیر لگے...... مدد، مدد چلاتا اس نے بند کردیا تھا...... وہ لکڑی کے زینے کے آخری کنارے پر بیٹھا تھا...... اس دروازے کے پاس جس کے راستے وہ خود اندر آیا تھا۔ وہ آگ کو دیکھ رہا تھا جسے سارہ نامی گوٹ کے ہاتھوں قدرت نے بھڑکایا تھا...... شرارے بھڑک، بھڑک کر پورے جوبن پر تھے...... اللہ جانے ملک کے کس کونے میں اس کا گھر تھا کہ جدید ترین امدادی سہولیات اس تک نہ پہنچ پائیں ورنہ تو وہاں ہانڈی بھی جل جانے پر الارم بج اٹھتے ہیں۔ تہ خانے کی بیشتر چیزیں جل چکی تھیں...... وہاں جو کچھ رکھا گیا تھا وہ سب کا سب آگ کی ہی خوراک تھا، کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جو آگ کو بجھا سکتی...... وہاں...... نیکی...... ترس...... رحم...... خوف...... اور توبہ...... کچھ بھی تو نہیں تھا...... وہاں تو سب ”گ“ تھا...... گ سے تھ تو صرف گناہ وہ بھی ایک نہیں ڈھیروں گناہ، چنگاریاں اڑ، اڑ کر اس کے سر، ہاتھوں پر گرنے لگیں...... اس نے ایک دل خراش چیخ ماری۔

☆☆☆

”اجمل بھائی......“ مبشرہ کی گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

”جلدی آجائیں...... خدا کے لیے آجائیں...... مجھے بچالیں...... بھائی جان...... جلدی آجائیں......“

”کیا ہے مبشرہ......؟“

”بھائی جان آپ آجائیں...... یہ مجھے گھر سے نکال رہے ہیں۔“ جب وہ وہاں پہنچا تو ڈرائنگ روم میں چند اجنبی افراد بیٹھے تھے اور مبشرہ اور ڈاکٹر خرم لاؤنج میں تھے...... مبشرہ بری طرح سسک رہی تھی۔

”اپنے دو ملازموں کو گواہ بنا کر میں نے اسے ایک طلاق دے دی ہے، اجمل صاحب...... کاغذی طلاق بھی بجھوادوں گا......“

”آپ نے اتنا بڑا فیصلہ ایسے کیسے......؟“ بظاہر وہ حیران نظر آنے لگا۔

”بڑا فیصلہ......؟ نہیں...... اپنی بہن سے پوچھیں...... اس نے کتنا بڑا دھوکا دیا...... کیا الو کا...... سمجھ رکھا تھا مجھے......؟“

”بھائی جان میری بات سنیں......“ مبشرہ لپک کر اجمل کے قریب آکر بیٹھ گئی...... خرم اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا بریف کیس اٹھالیا۔

”خرم آپ کہاں جارہے ہیں...... میری بات تو سنیں......“ مبشرہ تڑپ اٹھی...... اور اس کا بازو تھام لیا۔

”دور رہ مجھ سے بدذات عورت...... مجھے ہاتھ...... مت لگا (گالی) بند کر اپنا یہ ڈراما......“

”ڈاکٹر صاحب بیٹھ کر بات تو کریں......“

”بات صرف اتنی سی ہے اجمل صاحب کہ میڈم مبشرہ نے یہ گھر اپنے کسی یار کے نام لگادیا ہے اور وہ یہ گھر ان لوگوں کو بیچ بیٹھا ہے جو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں...... وہ گھر کا قبضہ لینے آئے ہیں...... ان کے پاس پکے کاغذات ہیں...... آپ خود جاکر دیکھ لیں...... اس عورت کو یہی سب کچھ چاہیے تھا مجھ سے...... جانتا ہوں کس کے لیے کیا ہے اس نے یہ سب...... کئی بار اسے گھر کے آس پاس منڈلاتے دیکھ چکا ہوں...... میں نے اپنی صابر بیوی کا صبر سمیٹا ہے...... اصل میں اسے مجھ سے دولت چاہیے تھی...... ابھی تو بہت کچھ پھر بھی بچ گیا...... ورنہ تو یہ مجھے کنگال کرکے جاتی...... اب سمجھ آئی کہ یہ بھاگ، بھاگ کر کیوں میرے پیچھے آتی تھی...... مجھے اپنے جال میں پھنسایا......“

”میں آپ سے محبت......“ مبشرہ کا جملہ منہ ہی منہ میں رہ گیا۔

”ہونہہ، محبت یا ڈھونگ......!“ خرم دہاڑا تھا

مبشرہ جھٹ اس کے قدموں میں گرگئی۔

”مجھے مار ڈالیں، میرے ساتھ یہ سب نہ کریں...... میں نے کچھ نہیں کیا...... پتا نہیں یہ کیا ہورہا ہے۔“ خرم نے اسے ایک ٹھوکر ماری۔

”تیرے کرتوت سامنے آئے ہیں ذلیل عورت...... جا ایک کروڑ کی اس کوٹھی پر خوش ہوجا...... میں تجھ پر تھوکنا بھی بے غیرتی سمجھتا ہوں......“ وہ سخت طیش میں تھا۔

”خرم یہ سب جھوٹ ہے...... یہ دیکھیں......“ وہ لپک کر سامنے رکھی الماری کی طرف بڑھی جس میں سب سے اوپر قرآن پاک رکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے قرآن پاک کو اٹھا کر اسے چومتی واپس ان کے پاس آئی۔

”یہ دیکھیں، میں اس پاک کلام پر ہاتھ رکھتی ہوں...... میں نے کچھ نہیں کیا یہ سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں...... معلوم نہیں انہیں کیا غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”وہ جھوٹ بول رہے ہیں یا تو......؟ بتا تو کسی جاوید کو نہیں جانتی......؟“

”ہاں...... ہاں میں کسی جاوید کو نہیں جانتی آپ کی قسم......“

”میری قسم نہیں کھا...... یہ گھر جاوید کے نام کس نے کیا......؟ کیسے کیا......؟ کاغذات کہاں ہیں گھر کے......؟“

”میں کہہ رہی ہوں میں جاوید کو نہیں جانتی...... میں نے اپنے کمرے کی الماری کے سیف میں رکھے تھے وہ کاغذات...... ابھی لاکر دیتی ہوں۔“ وہ قرآن پاک واپس رکھ کر پلٹی۔

”وہ وہاں ہوں گے تو ملیں گے ناں...... بس آج سے تم مجھ پر حرام ہو...... اسی لیے تم نے گھر اپنے نام کروایا تھا...... بدکردار عورت......“

”خرم پلیز......“ مبشرہ کی چیخ نکلی اور وہ خرم کے پیروں سے لپٹ گئی، خرم نے اسے زور سے جھٹک کر خود سے دور کیا۔

مبشرہ کی چیخوں سے ایک کروڑ کی کوٹھی گونجنے لگی...... وہ پاگلوں کی طرح خرم کے قدموں میں جھکی آہ وفغاں کررہی تھی اور خرم اسے خود سے الگ کررہا تھا۔ یکایک اس نے زوردار تھپڑ مبشرہ کے گال پر مارا...... اور چیخ کر بولا۔ ”بند کرو اب یہ ڈراما......“ مبشرہ غش کھا کر وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

دراصل اجمل گھر کے اصل کاغذات کی نقل بنوا کر مبشرہ کو دے گیا تھا اور بعدازاں وہ نقلی کاغذات بھی مبشرہ سے کسی بہانے نکلوا لیے تھے...... یہ سب کچھ اجمل جلیل کا کیا دھرا تھا اس نے سادہ لوح مبشرہ کو اچھی طرح لوٹا تھا اور کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اجمل جلیل خود تو پیچھے رہا اور سامنے انہی کاموں کے عادی فراڈی آدمی کو رکھا۔ یوں دھوکا دہی سے وہ مبشرہ کا گھر برباد کرنے اور اس کی کوٹھی بھی ہتھیانے میں کامیاب رہا۔

جس وقت اجمل، مبشرہ کو ٹیکسی میں لیے گھر آیا، اس کی چیخوں سے محلے والے اپنے، اپنے گھروں سے باہر نکل آئے...... وہ اجمل کے قابو میں نہیں آرہی تھی...... جو لوگ اسے مرضی کی شادی کرنے پر لعن طعن کیا کرتے تھے وہ اب اسے دیکھ کر ترس کھا رہے تھے۔ اس کے گھر کے آنگن میں آس پاس والے سب جمع ہوگئے۔ ماں، باپ جو روٹھے بیٹھے تھے وہ تڑپ، تڑپ کر اسے سنبھالنے کی کوششیں کررہے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب نے اسے گھر سے باہر نکال دیا ہے۔“ اجمل نے سب کے درمیان کھڑے ہوکر کہا۔

خاندان بھر جس بات کی پیش گوئی کیے بیٹھا تھا وہ آج سچ ثابت ہوئی تھی۔ کبھی وہ اپنی ماں کے تو کبھی باپ کے پیروں میں گرجاتی اور رو رو کر کہتی۔

”مجھے خرم کے پاس لے جائیں ابا جی...... انہیں بلوادیں...... وہ مجھے آکر لے جائیں......“

مبشرہ آنگن میں لوٹ پوٹ ہورہی تھی......

اسے بے ہوشی کا انجکشن لگوایا گیا...... خاندان بھر کو اس نے بتادیا کہ ڈاکٹر صاحب، مبشرہ پر الزام لگارہے ہیں کہ اس نے گھر اپنے کسی یار کے ساتھ مل کر جلایا ہے...... غیرت مند چچا اس الزام پر اپنا دل پکڑ کر رہ گئے۔

"ارے گھر سے نکال باہر کرتا مگر یہ الزام تو نہ لگاتا...... اے کاش...... میری بچی تو اس کے ساتھ کب سے کام کررہی تھی اس نے کبھی شک نہیں کیا مگر اب اسے کیا ہوگیا تھا۔" بیٹی کی حالت دیکھ کر چچا الگ ہلکان ہوئے جارہے تھے۔ پورے آٹھ گھنٹے بعد وہ اٹھی تو پھر سے وہی حالت ہوگئی کہ گھر کا آنگن پڑوسیوں سے بھر گیا...... محلے کی وہ چھوٹی بچیاں جو مبشرہ کو سفید براق یونیفارم میں ملبوس کار میں بیٹھتے دیکھتیں تو اپنی ماؤں سے ضد کرتیں...... میں تو بڑے ہو کر نرس بنوں گی...... اب وہی بچیاں آنگن میں کھڑی اپنی ماؤں کے پیچھے چھپی صرف اس کی چیخیں سن رہی تھیں...... اب انہیں مبشرہ جیسی نرس نہیں بننا تھا۔

اگلے ہی دن انہیں طلاق کے کاغذات مل گئے تھے...... مبشرہ کو کئی دن انجکشن لگا کر سلانا پڑا...... جب بھی کچھ ہوش میں آتی بس ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب کی رٹ لگاتی۔ ماں، باپ، چھوٹی بہن سب کے لیے وہ سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ حقیقتاً اس کے باپ کو اس دن خبر ہوئی کہ ان کی بیٹی نے ان کی مرضی کے خلاف اس شخص سے کیوں شادی کی تھی...... اس لیے کہ وہ ڈاکٹر خرم کو بہت چاہتی تھی...... اس نے لالچ میں نہیں بلکہ عشق کی انتہا تک انہیں چاہا تھا۔ کچھ دن بعد وہ خاندان کے چند بڑے بزرگ لے کر ڈاکٹر صاحب کے اسپتال بات چیت کرنے گئے...... لیکن صد افسوس کہ ڈاکٹر صاحب ملک سے باہر جاچکے تھے...... اس خبر کے بعد وہ مکمل طور پر ذہنی مفلوج ہوگئی...... پہلے پہل تو اجمل کا خیال یہی تھا کہ نیا، نیا صدمہ ملا ہے، ٹھیک ہوجائے گی پھر وہ اس سے شادی کرلے گا گھر کی رقم تو اس نے ہتھیا ہی لی تھی مگر شادی کا خیال ایک خواب بن کر رہ گیا...... وہ ہر وقت بڑ بڑاتی رہتی...... "وہ مجھے جان سے مار ڈالتا...... پر ایسے تو نہ پل، پل مارتا...... وہ مجھے ایک دفعہ ہی مار ڈالتا......"

اجمل نے مبشرہ کی چھوٹی بہن صاعقہ سے شادی کرلی۔ یہاں بھی اس نے دماغ لڑایا اور چچا، چچی کو راضی کیا کہ گھر صاعقہ کے نام کردیں...... کہیں ڈاکٹر خرم کوئی انتقامی کارروائی نہ کرڈالے اور مبشرہ تو اس قابل نہیں تھی کہ جائیداد سنبھالتی۔ صاعقہ شکل صورت کی پیاری ضرور تھی لیکن مبشرہ جیسی خوب صورت نہیں تھی پر گھر کی مالکہ ضرور تھی۔ اجمل ایک کروڑ کی کوٹھی میں سے اپنا حصہ وصول کرکے اور کچھ چچا، چچی سے لے کر صاعقہ کے ہمراہ امریکا آیا اور یہاں اپنا دماغ لگا کر اسٹورز کی چین کھول لی۔ وہ اپنے تئیں بہت مطمئن زندگی بسر کررہا تھا۔

☆☆☆

تن پُتلا ہے خاک کا اسے دیکھ مت بھول
ایک دن ایسا ہووے گا ملے دھول میں دُھول

وہ اب پورا زور لگا کر چیخ رہا تھا۔ اب وہ صرف یہی کرسکتا تھا...... بھاگنے پھرنے کے لیے بھی اس کے پاس جگہ نہیں رہی تھی، زینے کے اوپر آخری کنارے پر سکڑ کر چوزے کی طرح بیٹھے جھڑکی سی کپکپی طاری تھی...... اس کے پاس جھک کر پیشانی کو زمین پر جھکانے تک کی جگہ بھی نہیں تھی...... یہ جگہ اس نے چھوڑی ہی کہاں تھی...... یہ جگہ تو وہ خود ہی چاٹ بیٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ امریکا آگئے...... چچا، چچی چھ سال کے اندر آگے پیچھے وفات پاگئے۔ گھر کو صاعقہ اور اجمل نے باہمی مشورے سے فروخت کردیا اور...... مبشرہ، مبشرہ کو بے آسرا لوگوں کے مرکز چھوڑ آئے۔

☆☆☆

اجمل جلیل نے اذیت ناک چیخ ماری...... اس کا تن بدن آگ کی تپش سے جھلس رہا تھا...... آگ نے اسے آن پکڑا تھا...... اس نے لگاتار اذیت ناک چیخیں ماریں اور پھر ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔

ڈاکٹر خرم کی آنکھوں پر شک کی ایسی سیاہ پٹی بندھی کہ انہوں نے مبشرہ کو جیتے جی مار ڈالا...... اور پٹی بڑے طریقے سے اجمل نے باندھی جس کی چیخیں آج تہ خانے سے باہر نہیں جا پارہی تھیں۔

صاعقہ کو شادی میں ایک خاتون کے گلے میں قیمتی ہار دیکھ کر یاد آیا کہ وہ اپنا قیمتی ہار پہن کر آنا ہی بھول گئی ہے...... اس نے بیٹے احمد کی منت کی کہ وہ گھر جا کر اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہار لے آئے...... احمد گھر آیا، اپنی چابی سے دروازہ کھولا لاؤنج سے گزر کر بیڈ روم میں جا کر ہار اٹھایا تو اس نے محسوس کیا باپ کہیں نظر نہیں آرہا...... اس کا خیال تھا باپ باتھ روم میں ہوگا...... اس نے باتھ روم دیکھا، لاؤنج میں آیا...... کچن میں گیا...... پھر آوازیں دیں...... پھر وہ تہ خانے کی طرف آیا کہ وہاں سے وہ اپنا پسندیدہ مشروب نکال کر پیا کرتا تھا۔ تہ خانے کے راستے کی طرف آتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ کچھ جل رہا ہے۔ چابی کی ہول میں لگی ہوئی تھی...... اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا اسے ڈھیر بنا باپ اور شعلوں سے بھڑکتا تہ خانہ ملا...... اجمل جلیل کو ابھی کچھ اور سہنا تھا وہ جھلسا تو ضرور مگر بچ گیا۔

کئی دن اسپتال میں رہنے کے بعد جب وہ گھر آیا تو صاعقہ کو پاکستان فون کرنے کے لیے کہا۔

"میری ابھی مبشرہ سے بات کراؤ...... احمد تم میری سیٹ کروادو...... مجھے پاکستان جانا ہے فوراً جلدی کرو۔" تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پاکستان سے فون آچکا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے...... مبشرہ جل کر مر چکی تھی۔ وہ مرکز کے کچن میں کام کررہی تھی جبھی اس کی چادر نے آگ پکڑلی تھی پھر اس کے کپڑوں نے آگ پکڑلی اور پھر اس کے وجود نے...... جدائی ونفرت کی آگ جو اس کے اندر بھڑک رہی تھی اس کے آگے اس آگ کی اسے ذرا پروا نہیں ہوئی...... اُس وقت لوگوں نے جانا کہ وہ کتنی غائب دماغ رہتی تھی...... اتنی کہ اس نے ایک چیخ بھی نہ ماری...... اس کا جسم جلتا رہا...... اور جل کر راکھ ہوگیا...... آخری سانسوں کے دوران بھی کسی نے اس کے منہ سے ایک آہ...... ایک سسکی نہ سنی...... جو تمام عمر ماتم کناں رہی تھی وہ دنیا سے جاتے پر آہ بھی نہیں کرسکی تھی۔ جل اور مر تو وہ بہت پہلے ہی گئی تھی...... اب تو صرف ایک ظاہری طور پر رسم ادا ہوئی تھی۔

صاعقہ نے اسے بتادیا...... اور وہ کئی لمحے صاعقہ کو دیکھتا رہا...... اور پھر...... پھر...... وہ گھر کی ایک، ایک چیز کو آگ لگانے بڑھا...... اسے قابو میں رکھنے کے لیے سکون آور ادویات دی جانے لگیں...... ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ اتنے قریب سے آگ کو دیکھ کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔

اسے آگ سے اتنی محبت ہوگئی کہ وہ ہر، ہر چیز کو جلتے دیکھنا چاہتا تھا۔ جلا ڈالنا چاہتا تھا...... جو سب اس نے اکٹھا کیا تھا اس سب کو...... سب آگ ہی تو اکٹھی کی تھی ناں اس نے...... پھر اسے سکون آور انجکشن لگائے جانے لگے...... وہ کسی کے قابو میں نہ آتا...... بالآخر اسے خاص اسپتال منتقل کردیا گیا کہ وہ کوئی بڑا نقصان نہ کر بیٹھے۔

اب پاگل خانے میں وہ "سب آگ ہے، یہ آگ ہے، تو آگ ہے، ہم آگ ہیں۔" جیسے جملے چیختا چلاتا ہوا پایا جاتا...... یہی انتہائے مرج ہے...... یا نہیں ابھی تو جہنم...... کی آگ بھی اُسے سہنی ہے۔

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 15



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود دُرّانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی ہے جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا اور ایک دن طیارے کے دھویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یشل، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جا سکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ زوئی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے...... عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا میسج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ یشل، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہو گئی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کانٹیکٹس آزما لینے دیں۔ مہرزاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر یشل حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آ رہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ دانیال، بینش سے کہتا ہے کہ وہ اسے پروپوز کرنا چاہتا ہے۔ زرنگار کو ایک شخص لینے آتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ اس پر یہ احسان کرے کہ اس کی زندگی ختم کر دے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ مہرزاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ وہ مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدلے...... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گا اس کا محرک مہرزاد نہیں ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیوسی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہرزاد کے سامنے لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ مہرزاد، زرنگار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے اب یہاں کوئی خطرہ نہیں...... وہ یہاں محفوظ ہے لیکن زرنگار کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آتا...... امراؤ بیگم کو پولیس پکڑ لیتی ہے، فہد، چیف منسٹر سے ملتا ہے لیکن اسے چیف منسٹر سے مل کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حمزہ، نگین کو بتاتا ہے کہ اس نے سیالکوٹ والا گھر ماموؤں سے خرید لیا ہے۔ بینش کی ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر رہی ہے۔ نادر، زوئی سے کہتا ہے کہ اس کے پاس ایجنسی والوں کا فون آیا تھا۔ مہرزاد، عافیہ کو ملنے کے لیے بلاتا ہے۔ مہرزاد نے عافیہ سے مل کر ان کی بدگمانی، شکوک کو ختم کر دیا تھا۔ سلیم اپنی ماں کو منع کرتا ہے کہ وہ اپنے ماموں کے گھر بینش کا رشتہ کرنے کا سوچے بھی نہ...... میرال اب وہاں رہتے ہوئے اکتانے لگی تھی۔ عافیہ، دانیال کو سمجھاتی ہیں کہ مہرزاد سے مل کر انہیں اندازہ ہوا کہ مہرزاد ویسا انسان نہیں ہے جیسی باتیں اس کے لیے مشہور کی جا رہی ہیں۔ حمزہ، اشعر سے کہتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ نگین گھریلو ذمے داریوں میں جکڑے جانے کے لیے نہیں بنی یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نانا جان، مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ ان کی صرف ایک فرمائش تھی اور اگر وہ اس کمٹمنٹ سے ہٹ گیا تو بہت برا ہوگا۔

اب آگے پڑھیں

بینش کے بھائی کلیم نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکے کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے اس کی دکان پر آیا تھا اور کپڑا دیکھنے یا خریدنے کے بجائے سیدھا کیش کاؤنٹر پر بیٹھے کلیم کی طرف آ گیا تھا۔

''جی بھائی فرمائیں۔'' کلیم نے پہلے اسے ایک ایسا گاہک جان کر مؤدبانہ انداز میں سوال کیا جس کو دکان کے سیلز مینوں کے بجائے براہِ راست دکان کے مالک سے بات کرنے کا شوق ہوتا ہے۔

''مجھے آپ سے ملاقات کرنی ہے، آپ کلیم صاحب ہی ہیں ناں؟'' لڑکے نے جواباً کہا۔

''جی، جی...... بیٹھیں، بیٹھیں...... اوئے تاج جا بھاگ کر جا دو ٹھنڈے پکڑ لا، آپ کیا لو گے جی سیون اپ یا کوکا کولا!'' کلیم نے اس لڑکے سے جان پہچان نہ ہونے کے باوجود دکان داری کے سنہری اصولوں میں سے ایک پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں پلیز، میں فزی ڈرنکس نہیں پیتا، آپ زحمت نہ کریں پلیز۔'' لڑکے نے ہاتھ اٹھا کر منع کرتے ہوئے کہا۔

''فزی، فوزی نہیں جی کولڈ ڈرنک منگواتا ہوں آپ کے لیے، چلو مرنڈا یا فانٹا منگوا لوں پھر؟'' کلیم نے اس کی بات قطعاً نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں کلیم بھائی پلیز میں یہاں کچھ کھانے پینے نہیں، آپ سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔'' لڑکے نے کہا۔

''ہیں باتیں کرنے آیا ہے؟'' کلیم دل ہی دل میں مایوس ہوا۔ ''میں تو اسے کسٹمر سمجھ کر ڈیل کر رہا تھا، پر یہ تو لگتا ہے کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ، باتیں کرنے آیا ہے۔'' کلیم نے اس کی طرف چونک کر دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

''اوئے تاج، رہنے دے یار بھائی صاحب کو نہیں پسند یہ سب سفید اور کالی بوتلیں۔'' اس نے سیلز مین کو کچھ بھی لانے سے منع کر دیا۔ اسی دم اس کے پاس ایک گاہک پے منٹ کے لیے آ گیا۔

''جی باؤ جی فرماؤ، کیا بات کرنی ہے۔'' کھٹا کھٹ پے منٹ لے کر پیسے اپنے سامنے رکھے کیش کی دراز کے مختلف خانوں میں پھینکنے کے بعد اسے بند کر کے لاک لگاتے ہوئے اس نے آنے والے کی طرف دیکھا۔ ایک اور انشورنس ایجنٹ کے تصور ہی سے اس کا دل بیزار ہونے لگا تھا۔

''میرا نام دانیال جہانگیر ہے بھائی کلیم......'' لڑکے نے کہنا شروع کیا اور اپنی آمد کا مقصد بتانے لگا۔ جتنی دیر وہ بولتا رہا کلیم کا منہ کھلا رہا اگرچہ اس کے زاویے بدلتے گئے۔

''اب سمجھ آیا اس دن اماں مامے ممتاز کے لڑکے کے رشتے کی بات کیوں کر رہی تھی۔'' اس لڑکے کی بات سنتے ہوئے خیال آیا تھا۔ ''لگتا ہے اماں کو بھی اس کی باتوں کی سو (خبر) لگ گئی کدھر سے۔'' اس نے لڑکے کی کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے سوچا تھا۔

☆☆☆

''تم نے ہم سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا اور خود ہی اس کے بھائی سے بھی جا کر مل آئے۔'' اس رات کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے دانیال کی بات سن کر عافیہ کے ہاتھ میں پکڑا ڈونگا ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

''جی ہاں!'' اس نے بے نیازی سے کھانا کھاتے ہوئے جواب دیا اور پھر عافیہ کے ہاتھ پر نظر پڑنے پر ڈونگا ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

''میں امید کرتا ہوں کہ تم کسی کے ساتھ مذاق نہیں کر رہے ہو، نہ ان لوگوں سے نہ ہی ہم سے۔'' جہانگیر

نے اس کی بات کے جواب میں اپنا ردِعمل ظاہر کیا۔

"یقیناً نہیں۔" اس نے کن انکھیوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔" عافیہ اب بھی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دانیال نے ان کے ہاتھ سے ڈونگا لے لیا تھا لیکن بے دھیانی میں ان کا ہاتھ یونہی ہوا میں کھڑا تھا جیسے ڈونگا اب بھی ان کے ہاتھ میں ہو۔

"ریلیکس ممی، آپ کیوں اتنی tensed ہوگئیں۔" اس نے ماں کو یوں حیرانی کے عالم میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"دانیال! میرا خیال ہے کہ تم دوبارہ سے ایڈونچرس ہو رہے ہو...... حالانکہ تم ایڈونچرس ہونے کا انجام جانتے ہو۔" عافیہ نے چونک کر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ممی آپ کچھ زیادہ ہی ٹینسڈ ہوگئیں۔" دانیال نے کہا۔ "میرے دل میں ایک خیال، خواہش کی طرح ابھرا ہے، میں نے آپ کو بتانے سے پہلے ان لوگوں سے اس لیے بات کی کہ مجھے اندازہ ہوسکے اس بات کو کرنے کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں۔"

"پھر؟" جہانگیر نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ان سے بات کرکے لگا...... بات کرنے کا کوئی فائدہ ہے؟"

"لگتا ہے کہ فائدہ ہے، جب ہی آپ سے بات کررہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے لگا فائدہ ہے؟" جہانگیر نے عافیہ کی طرف دیکھتے ہوئے دانیال سے سوال کیا۔ "جبکہ تم بتا رہے ہو کہ وہ بہت ٹریڈیشنل اور آرتھوڈوکس قسم کے لوگ ہیں، شاید کچھ بیک ورڈ سے بھی ہیں پھر انہوں نے تمہاری بات سن کیسے لی؟"

"یقیناً اپنے کانوں سے سنی۔" دانیال نے اس تناؤ زدہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی مگر ماں اور باپ دونوں کے ہی سنجیدہ چہرے دیکھ کر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

"میں بھی سمجھیں سر پر کفن باندھ کر وہاں گیا تھا۔ اگرچہ میں ڈرا نہیں کیونکہ ایک مرتبہ میرے سر پر بندھا کفن کافی طویل عرصے کے بعد کھل چکا، اب مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔"

"یہ ایک فلیٹ جوک ہے دانیال۔" عافیہ نے اسے ڈانٹا۔

"آئی ایم سوری ممی!" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ ایک مس میچ ہوگا تمہارے اور ان کے بیک گراؤنڈ میں خاصا فرق نظر آرہا ہے۔" جہانگیر کا ذہن ایک نکتے پر اٹک گیا تھا۔

"خیر بیک گراؤنڈ کی تو آپ رہنے دیں، اگر ان دونوں کے درمیان اچھی انڈراسٹینڈنگ ہو تو بیک گراؤنڈ اور اسٹیٹس جیسے ایشوز کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔" عافیہ نے کہا۔ "لیکن یہ سنجیدہ بھی ہے یہ کیسے پتا چلے۔" انہوں نے دانیال کی طرف دیکھا۔

"میں ایک مُردے کی طرح سنجیدہ ہوں ممی آپ کو نہیں لگ رہا کیا؟" دانیال نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اس روز جب میں بینش کو گھر لے کر آیا تھا آپ اسی روز سمجھ گئی ہوں گی جبکہ میں کسی بھی دوست کو یوں بے تکلفی سے گھر نہیں لے کر آیا کرتا۔"

"ہاں میں چونکی تو تھی لیکن پھر اسی روز سے یہ میرال والا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔" عافیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ لوگ سمجھ نہیں پا رہے کہ ہم اور وہ......" جہانگیر نے کہنا چاہا۔

"اللہ معاف کرے، یہ آپ کیا بار بار دُہرائے چلے جارہے ہیں، میں نے کہا ناں کہ یہ کوئی ایشو نہیں۔" عافیہ نے شوہر سے کہا۔ "ہاں اب تم بتاؤ اس کے بھائی نے تمہیں کیا جواب دیا؟"

"ہاں وہ۔" دانیال، ماں کی لمحے بھر کی ناراضی دور ہوتے دیکھ کر بولا۔ "پہلے تو وہ بھڑکتے دکھائی دے رہے تھے لیکن پھر......" اس نے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ "ڈیڈی کا ریفرنس سن کر وہ ٹھنڈے پڑ گئے اور بولے بہتر ہے اپنے ماں، باپ کو ہمارے گھر بھیجو ہم سوچیں گے۔"

"اچھا جب ہی اب ہمیں بتا رہے ہو کیونکہ ہماری ضرورت پڑ گئی۔" وہ خفا سے ہوگئے۔

"ارے نہیں ڈیڈی، اگر پہلے آپ کو بتا دیتا اور آپ دونوں کے جانے پر وہ انکار کردیتے تو یہ میرے لیے زیادہ بری سچویشن ہوتی۔ صرف مجھے انکار کی بات اور تھی۔"

"Jahangir, he is wiser than you" عافیہ نے اس کی بات سن کر شوہر کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیے۔

☆☆☆

دارالحکومت میں ایک گمبھیر سی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف خوف اور سراسیمگی کا راج نظر آرہا تھا۔ زندگی کا کاروبار اگرچہ معمول کے مطابق چل رہا تھا لیکن اس روز شہر میں ہونے والے ایک اہم واقعے نے ہر آنکھ اور کان کی توجہ اپنی طرف مبذول کررکھی تھی۔ پارلیمنٹ لاجز، پارلیمنٹ کی طرف جانے والے راستوں، شاہراہ دستور اور وی آئی پی ریذیڈینسز میں غیر معمولی نقل وحرکت نوٹ کی جارہی تھی۔ پریس کلبز، ٹی وی نیوز رومز اور ریڈیو نیوز رومز میں بھی کھلبلی سی مچی نظر آرہی تھی۔ ملک کے چھوٹے بڑے شہروں اور دور دراز علاقوں تک میں جہاں سیٹلائٹ ٹی وی کی نشریات دیکھی جاسکتی تھیں۔ ٹی وی اسکرینز پر ایک بریکنگ نیوز بار بار چل رہی تھی۔

"شہر میں ایک اعلیٰ حکومتی عہدیدار اپنے ہی محافظ کی چلائی گولی لگ جانے سے شہید ہوگئے۔"

خبر گرم تھی اور اس پر ہونے والی گفتگو اس سے بھی زیادہ گرم۔ قیافوں، قیاس آرائیوں اور چہ میگوئیوں کا بازار اس سرد موسم میں بھی گرم ترین تھا۔

☆☆☆

ہر طرف خون کا، سراسیمگی کا، چہ میگوئیاں اور معتبر وغیر معتبر ذرائع سے آنے والی خبروں کا راج تھا۔ مرنے والا پارٹی کے پرانے، ادنیٰ اور مستقل خادموں میں سے ایک تھا، ایک طویل مدت کی خاکساری اور خدمت کے عوض اسے حکومت کی طرف سے خصوصی عہدہ عنایت فرمایا گیا تھا اور اس عہدے کے ذریعے اس نے حکومت مخالفین وناقدین کی اکثریت کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔

"کیسی شیروں جیسی دہاڑ تھی شہید کی۔ راتوں رات شہید بن کر شہادت کی ایک روایتی داستان بن ...." جانے والے اس شخص کے بارے میں ٹی وی چینلو کے ٹاک شوز اور خصوصی پروگرام نوحہ کناں تھے۔ وہ نہ صرف ایک منجھا ہوا سیاست دان تھا بلکہ ایک دانشور اور صاحب علم شخص بھی تھا۔ اس کے خاندان کا علم وادب سے گہرا تعلق تھا اور اپنے سرکاری عہدے کے ان چند سالوں میں تو وہ ہر میدان میں ہی خبروں میں اس قدر موجود رہا تھا کہ اس کی موت کی خبر نے ہر کان کو ہر آنکھ کو ششدر کرکے رکھ دیا تھا۔ اتنی اچانک اور ایسی موت ٹی وی اسکرینز اس کی جائے شہادت اور گاڑی کے فوٹیجز بار بار چلا رہے تھے۔ اس کے قاتل کو دو انگلیوں سے فتح کا

نشان بناتے پولیس وین میں سوار ہوتے ہوئے بھی بار بار دکھایا گیا جیسے اس نے کوئی عظیم معرکہ سرانجام دیا ہو۔

''گو قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مگر امید نہیں کہ اسے سزا ملے گی۔'' اس کی موت پر تبصرہ کرنے والوں کے ایک گروپ کی یہ رائے بھی تھی۔

''قاتل کو سرِعام پھانسی پر لٹکایا جائے۔'' چندروز پہلے مرنے والے کے انسانی حقوق کی حمایت میں جاری ہونے والے بیان کی مخالفت کرنے والے بھی نعرے لگا رہے تھے۔

''اس ملک کی تاریخ میں آج تک نہ تو کوئی قاتل بے نقاب ہوا نہ ہی کوئی سازش...... اور جو پکڑے گئے وہ بھی دندناتے پھرتے رہے، یہ ہی حال اس کیس کا بھی ہوگا۔'' کوئی تبصرہ فرما رہا تھا۔

''انسان کو ایسا آؤٹ اسپوکن بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جو منہ میں آئے کہہ ڈالے، مرنے والے نے اپنے بلند و بانگ لفظوں کی سزا پائی۔'' کسی کا خیال تھا غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور خبروں اور تبصروں کے اس گرم بازار سے ذرا ہی فاصلے پر موجود ایک بڑی سرکاری عمارت میں مقیم مرنے والے کا بڑا صاحب، شطرنج کی بساط سامنے بچھائے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا...... اکیلا ہی بیٹھا مہروں کی پوزیشنوں پر نظر رکھے۔ زیرِلب مسکرا رہا تھا۔

''فدوی نے تو عرض کیا تھا سائیں کہ اتنا زور سے مت ہنسو، یہ جو وقت ہے ناں اپنے چوبیس گھنٹوں کے سائیکل میں ہر گھڑی دنیا کے کسی نہ کسی انسان پر ہنس رہا ہوتا ہے، تم نہ ہنسو زور سے۔ کدھر یہ وقت اس گھڑی تم پر بھی نہ ہنس رہا ہو اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ ارے میں نے تو بابا خبردار کیا تھا مگر کیا، کیا جائے کہ تم غور کرنے کے عادی نہ تھے اسی لیے تو سمجھنے سے رہ گئے۔ قہقہے لگاتے ہی چلے گئے۔ ذرا بھی رک کر نہ سوچا کہ یہ بڑا صاحب مجھے کیوں کہہ رہا ہے کہ تمہارا وقت آگیا ہے۔ ہاں بھئی سردارزادے کی دشمنی نے تمہارے کانوں کے اسپیکر ہی خلط ملط کر رکھے تھے سائیں، تمہارے کانوں کا میکنزم خراب ہو چکا تھا جب ہی ہر سنی بات کو سردارزادے کی دشمنی کی روشنی ہی میں ڈی کوڈ کرتے رہ گئے۔ اُفوہ تم بیچارے، دل تمہارے جانے پر اداس بھی ہے سائیں، پرانے وقتوں کے منظر بھی نظر کے سامنے آرہے ہیں۔ مگر کیا، کیا جائے تمہارا وقت آچکا تھا۔ تمہیں تو جانا ہی تھا۔ تم کیوں گئے سائیں، گولی سردارزادے کی طرف جاکر بریکنگ نیوز بننے کے بجائے تمہاری طرف کیوں مڑ گئی یہ تو ایک سربستہ راز ہے بابا۔ مگر تم چلے گئے اور تمہاری خدمتوں کو یاد کرکے تمہیں سیلوٹ کرنے کو بھی جی چاہ رہا ہے، کیا بڑے مفکر تھے تم بابا...... کیا عمدہ دانشور اور کیا کائیاں سیاست دان۔'' بڑا صاحب شطرنج کی بساط پر بچھے مہروں کی پوزیشنز دیکھتے ہوئے زیرِلب مسکراتا سوچے جا رہا تھا۔

''چلو خیر ایک بار باضابطہ اور سرکاری طور پر تم کو خدا حافظ کہہ چکا اب ایک بار تمہاری روح کو جو یقیناً ابھی در و دیوار میں آکر چنگھاڑا کرے گی کو بھی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سیلوٹ کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں گڈ بائے کامریڈ سائیں گڈ بائے۔''

☆☆☆

''شیروں کی دہاڑ دہاڑنے والا کتے کی موت مر گیا جناب والا۔'' پارٹی کا ایک مقبولِ عام کارکن مہرزاد خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ وہ اس موت سے گویا محظوظ ہو رہا تھا جبکہ یہ ہی وہ شخص تھا جو کچھ دیر پہلے ہی مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرکے آیا تھا۔ ''اندر کھاتے کے حالات کون نہیں جانتا سردار صاحب، ہم سے کم میں تو خوب ہی جانتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''مگر ستم ظریفی شاید اسی کو بولتے ہیں کہ آج جنازہ پڑھنے کے لیے ہیلی پیڈ پر آپ وزیراعظم کے ساتھ ہیلی کی سیڑھیاں اترے اور مرنے والا لکڑی کے تابوت میں

خاموش پڑا تھا۔ کون، کون ایسا نہیں آیا تھا وہاں جس کا ذکر کرتے مرحوم انگارے چبایا کرتا تھا۔ مگر دیکھ لیں جی موت کی بے بسی کیسی ہوتی ہے، کیسا متکبر، مغرور، دوسروں کو کچھ نہ سمجھنے والا شخص، اتنے سارے ناپسندیدہ مہمانوں کی آمد پر کچھ بول سکتا تھا نہ کسی کو گیٹ آؤٹ سگنل دے سکتا تھا...... توبہ، توبہ جی۔'' کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے وہ بولا۔ ''بڑے، بڑے بول بولتا تھا، ساری بیوروکریسی کو آگے لگایا ہوا تھا۔ بڑے صاحب نے بھی اسے کچھ زیادہ ہی چھٹی دی ہوئی تھی۔ کیسی کیسی باتیں منہ سے بے دھڑک نکال دیا کرتا تھا مگر دیکھ لیں جی کیسی معمولی سی بات موت کا بہانہ بن گئی۔ اپنے ہی محافظ کو ایسا طیش دلایا گیا کہ اس نے سیدھے فائر مار دیے، توبہ...... ہے تو افسوس کی بات مگر آپ سمجھیں خس کم جہاں پاک جی......''

مہرزاد، اپنی گھنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی بات سن رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کئی پرانے منظر، ملاقاتیں، فلم کی طرح گزر رہی تھیں۔ گزشتہ دنوں سنی ہوئی کئی باتیں اس کے ذہن میں ڈی کوڈ ہو رہی تھیں الفاظ کے اصل معنی جب مجسم حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں تو کیسا لگتا ہے، اسے اس روز اندازہ ہو رہا تھا۔

''ملک صاحب، بس کردیں۔'' پھر وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوا تھا۔ ''دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجناں وی مر جاناں۔'' اس کا سرائیکی لہجہ درشت ہوگیا۔

''سردار صاحب میں خوشی نہیں منا رہا۔ صرف مرحوم کہ جسے آج سے شہید ہی کہہ کر یاد رکھا جائے گا...... کے غرور کی بات کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جائے گا ہفتے دس دن کے اندر، ساری ڈیلنگز، سب ہتھکنڈے، ساری چالیں، سب سازشیں اِدھر کی اِدھر ہی رہ گئیں اور بندہ بس ایک گولی کی مار ثابت ہوا۔'' ملک نے اپنے رویّے کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''او چھڈو جی'' اسی دوران پارٹی کا ایک صفِ اوّل کا رہنما جو آکر ان کے درمیان بیٹھ چکا تھا ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''محافظ فورس بدنام ہوگئی پوری کی پوری اس واقعے سے، ایک ایک کی شامت آئی ہوئی ہے کل رات سے۔''

''محافظ فورس تو فیس سیونگ کے لیے استعمال ہوئی اصل میں تو چٹی چمڑی والوں سے مال مارنے کا چکر ہے جی سارے کا سارا، اب یہ تو کسی کو پتا نہیں چلے گا ناں کہ کس کے کون سے اکاؤنٹ میں کتنا منتقل ہوا ان بیچارے کو پھڑکانے کے بعد۔'' ملک نے لہجہ اور بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہی، ہی، ہی۔'' دونوں مہمان گھٹی، گھٹی ہنسی ہنس رہے تھے۔

''واہ بھئی تم تو یونہی بڑے بول، بول کر بڑے صاحب کی نظروں میں اپنا مقام مزید بڑا بنانے کے چکر میں مارے گئے۔'' مہرزاد نے ان دونوں کی ہنسی سنتے ہوئے جانے والے کو تصور میں مخاطب کیا۔ ''ٹریگر پر انگلی میرے لیے رکھوانے آئے تھے تم فیڈرل کیپٹل میں صاحبزادے سمیت، اس انگلی کے رکھے جانے سے پہلے ہی کسی دوسرے نے تمہارا نشانہ لے کر کوئی اور ٹریگر دبا دیا۔'' اس کے دل میں عجیب سی اداسی گھر کرنے لگی تھی۔ ''بس اتنی ہی سی حقیقت ہے زندگی کی، بس یہاں تک ہی موت زندگی کی حفاظت کر پاتی ہے اس کے بعد زندگی کی جگہ وہ خود لے لیتی ہے۔ زندگی قہقہے لگاتی رہتی ہے، موت جامد خاموشی کا نام ہے۔ دونوں میں سے طاقتور کون ہے؟ زندگی ایک پرچھائیں یا موت ایک اٹل حقیقت؟'' اس کا دل گھبرا سا گیا، اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی پوزیشن بدلی اور اپنے سامنے بیٹھے حضرات کی گفتگو سننے لگا۔

اسی شام ٹی وی نیوز چینلو نے سردارزادہ مہرزاد خان کو صدرِ مملکت کے ساتھ مرحوم کے اہلِ خانہ کے ساتھ تعزیت

کرتے دکھایا تھا۔ مرحوم کا صاحبزادہ تعزیت وصول کرتے ہوئے سردار مہرزاد خان کے عین سامنے بیٹھا تھا۔
اسی شام مرحوم کی یاد میں جائے شہادت پر شمعیں جلانے والے سول سوسائٹی کے ارکان کے ساتھ وفاق کی یک جہتی کے اظہار کے طور پر بھی سردار زادہ مہرزاد خان ان کی اوّلین صفوں میں موجود تھا۔
''سنا ہے یہ جو وقت ہے ناں چوبیس گھنٹوں کے سائیکل میں ہر گھڑی کسی نہ کسی انسان پر بڑی زور سے ہنس رہا ہوتا ہے۔''

☆☆☆

''ہا ہائے...... اوے کلیم تیری عقل چولھے میں گر کر سواہ (راکھ) تو نہیں ہوگئی۔ تجھے پتا بھی ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔'' بینش کی اماں نے بیٹے کی بات سن کر اور سمجھ کر ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے اچھی طرح پتا ہے اماں میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' کلیم نے کشمیری چائے کے پیالے کی سطح پر تیرتی بالائی کی ایک موٹی سی تہ کو انگلیوں سے اٹھا کر زبان پر رکھتے ہوئے کہا۔
''نہ خاندان، نہ برادری، نہ گوت...... تو یہ بات کہہ کس بنیاد پر رہا ہے خانہ خراب!'' اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کوئی بھاری شے اُٹھا کر بیٹے کے سر پر دے ماریں۔ جس کی عقل پھر جانے میں انہیں کوئی شک نہیں رہا تھا۔
''او چھڈّو اماں جی۔'' کلیم نے خوشبودار چائے کا گھونٹ سڑکتے ہوئے کہا۔ ''اب کدھر زمانہ رہ گیا ہے خاندان، برادری، گوت، قبیلے دیکھنے کا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے میں ضم ہو رہے ہیں۔''
''لوگوں کا زمانہ نہیں رہا ہوگا۔'' اماں نے ہاتھ ہلا کر حقارت سے کہا۔ ''ہم تو حسبی نسبی لوگ ہیں، ہمارا زمانہ اب بھی وہی ہے۔ ذات کے کشمیری کھرے، اصلی نسلی۔''
''نہ کریں اماں جی ایسی باتیں۔'' کلیم ہنسا۔ ''آپ لڑکے کو دیکھیں گی تو بھوک مٹ جائے گی آپ کی ایسا سُچّے ہیرے جیسا لڑکا ہے اوپر سے میں تو یہ سن کر ہی گونگا ہوگیا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم کیا اور ہمارا خاندان کیا، وہ لوگ تو نسلوں سے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والوں میں سے ہیں، اسی لہور شہر کے ناں...'' اس نے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ''پانچ بڑے خاندانوں میں سے ایک ان کا خاندان ہے۔ لوگ جھک، جھک کر سلامیں کرتے تھے ان کے وڈوڈیروں (بڑوں) کو۔''
''سلامیں کرتے تھے، ہونہہ۔'' اماں نے ہتک آمیز لہجے میں کلیم کی بات دُہرائی۔ ''ہمیں کیا ہماری طرف سے پوری دنیا سلام کرتی پھرے انہیں...... جو ذات کے کشمیری نہیں تو فائدہ کیا۔''
''کیا خاص بات ہوگئی بھئی آج۔'' اسی دم سلیم بھی دکان بند کر کے گھر واپس پہنچ چکا تھا اور دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے اماں کی گرما گرم آوازیں اسے بھی سنائی دے چکی تھیں۔
''اماں بڑی گرم ہو رہی ہیں، لگتا ہے آج بونگ کا گوشت اچھا نہیں ملا اماں کو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''بونگ پر نہیں اس تیرے بھائی کی بونگیوں پر دماغ گرم ہو رہا ہے میرا۔'' اماں نے کلیم کی طرف اشارہ کیا۔
''کیوں، کیا ہوا؟'' سلیم چولھے کے قریب رکھی نیچی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''آج دوپہر کو جب تو گھر آیا ہوا تھا ناں کھانا کھانے، پیچھے سے سَیت لگ گئی اس اَنّے موے (اندھے) کی عقل پر۔'' اماں نے ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔
''ہیں!'' سلیم چونک کر بولا۔ ''وہ کیسے؟''
اماں نے سارا معاملہ تفصیل کے ساتھ سلیم کے گوش گزار کیا۔

''اچھا...... اچھا، اچھا'' پوری بات سن کر سلیم کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ ''جب ہی ریاض کہہ رہا تھا کہ یا سلیم آج ادھر ایک گاہک آیا تھا جس کے نیچے بڑی قیمتی گڈی (گاڑی) تھی چم چم کرتی، خرید کر تو کچھ نہیں گیا پا کلیم سے باتیں کرتا رہا۔ میں سمجھا فیصل آباد والے شیخ کا بیٹا ہوگا کیونکہ وہ کہہ گیا تھا اس دفعہ کے ''مال'' کے نئے ریٹوں کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے میں نہیں، میرا بیٹا آئے گا۔''
''یا سلیم، اماں تو ٹھہری پرانے خیالات کی۔'' کلیم کو بات کرنے کا موقع ملا تو وہ سہولت سے بولا۔ ''اگر اس فیملی کے ساتھ ہمارا رشتہ جُڑ گیا ناں تو فیصل آباد والے سارے کے سارے ہمارے پاس آ کر ہم سے ریٹ مانگا کریں گے، اوئے ادھر ڈبی بازار کی مین دکان کی برانچیں ہی برانچیں کھل جاتی ہیں پورے لہور شہر میں، گلبرگ کیا تو ڈیفنس کیا تو مال کیا، تو لبرٹی کیا، اور ریگا میں تو پورا ایک فلور ہے ان کا جناب۔ میں نے تو سنتے ہی اندازہ لگا لیا تھا مال آف لہور میں بھی دکان نہ ملی ہمیں تو نام بدل دینا میرا۔'' کلیم کا جوش اور سانسیں یہ بات سناتے سناتے تیز ہوئے جا رہے تھے۔
''وے فٹے منہ وے تیرا اوے کلیم!'' اماں یہ کاروباری دلچسپی کے معاملات سن کر اور بھی بھڑک اٹھیں۔ ''بہن بیاہنی ہے کہ بیچنی ہے تو نے، وے ہوش کے ناخن لے وے جھلیا پاگلا۔'' غصے کے مارے اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کلیم کو سیدھا چولھے ہی میں جھونک دے اور غصے کے اس اظہار کے دوران وہ کن انکھیوں سے بڑے بیٹے کے تاثرات بھی جانچنے کی کوشش کر رہی تھی جو کلیم کی بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔
''ارے آرام سے اماں آرام سے۔'' اماں کی بات ختم ہونے پر سلیم بھی اپنی سوچ سے باہر نکل آیا۔

”بات کا کوئی آگا پیچھا بھی تو دیکھنے دیا کرو، آپ تو ایک دم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتی ہیں۔“

”ہیں۔“ اماں کے ہاتھ میں پکڑا افرائی پین ایک دم نیچے گر گیا۔ سلیم کی بات اور اس کا لہجہ انہیں بہت کچھ سُجھا گیا تھا۔

”اماں وہ رشتہ لے کر خود ہمارے تک آیا۔ ہم تو نہیں گئے ناں!“ سلیم نے اماں کے تپتے دماغ کی حرارت کو مزید تیز کرتے ہوئے کہا۔

”اسے تمہاری اس لاڈلی بہن نے تمہاری طرف بھیجا ہوگا، وہ یونہی نہیں آ گیا منہ اٹھا کے۔“ اماں چمک کر بولیں۔

”بات یہ ہے پا سلیم۔“ کلیم نے اماں کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”اماں ٹھہریں پرانے وقتوں کی، اماں کو کیا پتا اچھے رشتے نہیں ملتے آج کل ڈھونڈنے سے بھی، ایسے میں یہ جو رشتہ آیا ہے ناں اس کا یہ پہلو چھوڑ دو کہ وہ بینش کے ساتھ پڑھتا ہے یا وہ اپنی برادری کا نہیں...... تو تمہیں خود نظر آئے گا کہ یہ رشتہ چھوڑنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”یہ بھی چھوڑو، وہ بھی چھوڑو، بے غیرت بن کر اکیلے لڑکے کے ساتھ لڑکی رخصت کر دو۔“ اماں نے ایک مرتبہ پھر درمیان میں لقمہ دینا چاہا۔

”آپ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوں اماں تو میں کچھ سوچوں ناں......“ سلیم نے جھنجلا کر کہا۔ اماں سلیم کے لہجے پر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

”اگر وہ لڑکا تم سے خود رشتے کی بات کرنے آیا تھا تو اس سے یہ تو پوچھنا تھا کہ بھائی تمہارے ماں، باپ کدھر ہیں؟“ کچھ دیر غور کرنے کے بعد سلیم نے بھائی کو مخاطب کیا۔

”کہا تھا اس سے میں نے، وہ بولا آپ اجازت دیں گے تو انہیں بھیجوں گا ناں۔“ کلیم نے مسکرا کر جواب دیا، اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات سلیم کے دل کو لگی تھی۔ اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے وہ دونوں بھائی جو صرف منصوبے ہی بناتے رہتے تھے ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سمگلوں کے خاندان سے رشتہ جُڑ جانے سے بہتر موقع اور کیا مل سکتا تھا۔

”چل پھر اسے فون لگا کر کہہ دے کہ اپنے ماں، باپ کو بھیجے ہمارے پاس۔“ سلیم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور اماں دونوں بیٹوں کا باری، باری منہ ہی دیکھتی رہ گئیں۔

”پر سلیم...... ذرا یہ سوچ، برادری والے کیا کہیں گے، میرے تو پسرور والے پیکے (میکے) چھوٹ جانے ہیں جب انہیں پتا چلا کہ غیر برادری میں لڑکی دے دی ہم نے۔“ اماں لاچار ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔

”مامے ممتاز کے بیٹے کے ساتھ جو جوڑی چوگاٹھ کا کام کرتا ہے لڑکی بیاہ دینے سے پیکے راضی رہتے ہیں کیا؟“ کلیم بڑے بھائی کی شہ پا کر بلند آواز میں بولا۔

”لڑکی کی زندگی خراب کر دینے سے آپ بھی راضی، برادری بھی راضی، واہ اماں کیا عقل پائی ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”یہ رشتہ اگر واقعی ہو بھی گیا ناں، اماں تو یہی برادری والے ہمیں سلام کرتے پھریں گے۔“ سلیم نے نرمی سے کہا۔

اور اماں، قسمت کی اس ستم ظریفی پر کہ جوان بھائی ہی بہن کی اپنے لیے لڑکا پسند کرنے والی اتنی جرأت و جسارت کو نظر انداز کرتے ہوئے خوش ہو رہے تھے...... بے چاری اماں جو اس کنزیومر سوسائٹی میں آنے والے

www.paksociety.com

اعلٰی توقعات اور اونچی خواہشات کے انقلاب سے ناواقف تھیں، وہ بیٹوں کے اس رویئے کو کہاں سمجھ سکتی تھیں۔

☆☆☆

''آپ نے اپنی چینی چپٹی بہو کو قبول کرلیا، اب یہ بتائیں ولیمہ کب کررہی ہیں اس کا؟'' نادر کی آپا جو زوئی کو گھر میں بہو کا مکمل مقام پائے دیکھ کر برداشت نہیں کر پاتی تھیں اپنے غصے کا زور اپنی اماں پر نکالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''بہت جلد......'' اماں نے اطمینان سے کہا، وہ بہو کے سکھائے طریقے سے شملہ مرچ اور گاجریں باریک باریک کاٹ رہی تھیں۔

''بڑے دنوں سے سن رہے ہیں بہت جلد، بہت جلد۔'' آپا نے تھال میں سے گاجر اٹھا کر دانتوں سے کتری اور پھر آخ تھو کرتے ہوئے گاجر واپس تھال میں پھینک دی۔ ''توبہ میرے اللہ، یہ کیسی گاجریں ہیں، کہاں سے اٹھا لائیں، نہ رنگ نہ ذائقہ......''

''یہ......'' اماں چھری والا ہاتھ روک کر شرارت بھرے انداز میں مسکرائیں۔ ''یہ چینی گاجریں ہیں چینی، چائنا سے آئی ہیں۔''

''بس چار دن اور رہ لینے دیں بہو صاحبہ کو اِدھر، دیواروں اور دروازوں پر بھی چینیت برسنے لگے گی۔'' آپا جل کر بولیں۔

''مجھے یقین ہے جلد ہی وہ آپ کو بھی مینڈک اور چوہے کھانے پر لگا دے گی۔''

''ارے توبہ کرو۔'' اماں نے جھٹ سے بہو کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو کہتی ہے پاکستان میں جیسے دکاندار مرغیاں کاٹتے ہیں مجھے ان پر قطعی بھروسا نہیں، اللہ جانے تکبیر بھی پڑھتے ہیں کہ نہیں، گردن پر چھری پھیری اور گندے مندے مکھیوں اور غلاظت سے بھرے ڈرم میں تڑپنے کو پھینک دی، ایک کے بعد ایک دبا دب اور پھر اسی وقت نکال کر پر، کھال سب نوچ، ناچ ٹکڑے کاٹ کر شاپر میں ڈال کر گاہک کے ہاتھ میں پکڑا دیا' چل میرے بھائی، جا حرام مرغی بھون کر کھا جا۔'' ارے وہ تو زوئی نے ہی مجھے دکھایا، اماں ذرا مرغی کے گوشت کو غور سے دیکھیں، اس کی رگوں میں خون جما ہوا ہے، ظالموں نے ٹھیک طریقے سے نہ حلال کیا نہ تڑپنے دیا۔'' اماں نے سر جھٹکا۔

''اب تو وہ نادر سے ہفتے بھر کے لیے زندہ مرغیاں منگواتی ہے اسی سے چھری پھروا کر اسے صاف کرواتی ہے خود ہی کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے بنا کر فریزر میں محفوظ کر لیتی ہے۔ اتنی تو وہ حلال، حرام کی تفریق کرنے والی ہے، وہ کاہے کو چوہے، مینڈک کھائے گی بھلا۔''

''افوہ......آپ کے خیال میں تو وہ ہم سے بھی بڑی مسلمان نکلی...... ویسے تو نہیں کہیں ذرا پتا کروا لینا تھا اس عفت پروین کا۔'' آپا کو اماں کی طرفداری کہاں اچھی لگ سکتی تھی۔

''ہاں ہم سے بڑی مسلمان ہے۔'' اماں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہم نام کے مسلمان، نہ باقاعدہ نمازی نہ باقاعدہ روزے دار، وہ نمائشی مسلمان نہیں ہے اسے سب پتا ہے کہ زندگی ایک مسلمان نے کیسے گزارنی ہے۔''

''تو پھر ولیمہ تو کرلیں، عفت پروین کا نکاح بھی حلال ہو جائے گا۔'' آپا جل کر کباب ہوتے ہوئے بولیں۔

''کریں گے ولیمہ جلدی کریں گے، نادر بتا رہا تھا زوئی کا ایک کام پھنسا ہوا ہے کہیں، وہ ہو جائے تو ولیمہ بھی کریں گے۔''

”کام پھنسا ہوا ہے؟“ آپا کو نئی سوجھی۔ ”غیر قانونی طریقے سے آئی ہوگی ناں پاکستان، اسی لیے کام پھنسا ہوا ہے۔... کیا پتا کوئی جاسوس ہو یا نہیں کوئی بندے آئے تھے نادر کے پاس جب ہمیں پہلی بار پتا چلا تھا ...زوئی کے بارے میں۔“

”چلو......“ اماں نے سر جھٹکا۔ ”تم کوئی نئی کہانی گھڑلو۔“ وہ سبزی کا تھال اٹھا کر کھڑی ہوگئیں۔ ”اے بی بی ہم بڑے سکون سے رہ رہے ہیں اپنے گھر میں، ہمارا سکون قائم رہنے دو، نہ سناؤ نئی نئی ہمیں۔“ اماں کچن کی طرف چل دیں اور آپا ہکا بکا ہوکر ماں کو دیکھ رہی تھیں جو پہلے ان کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھیں اور اب جن کے حواسوں پر چینی چپٹی بہو چھا چکی تھی۔

☆☆☆

”میرے شوہر کے قاتل کو فی الفور سزا دی جائے۔“ شہید کی بیوہ کی التجا۔

”میرا باپ شہادت کی موت مرا، اسے شہادت نصیب ہوئی مگر ہم اسے مارنے کی سازش کرنے والوں کو بے نقاب کرنے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“ شہید کے بیٹے کا اعلان۔

”ہم وفاقی حکومت سے درخواست اور امید کرتے ہیں کہ وہ شہید کے خاندان کو تحفظ فراہم کرے گی۔“ شہید کے ساتھیوں کے اظہار خیالات۔

”شہید کا قتل ایک فردِ واحد کا عمل ہے، اس کے پیچھے کسی سازش کا عمل دخل نہیں۔“

”شہید کی پارٹی کے لیے خدمات کے عوض خصوصی اعزاز کا اعلان کیا جائے۔“ پارٹی رہنما بھائیو اور بہنو ہم آپ کے مجروح جذبات کا حال جانتے ہیں، پارٹی کی تاریخ شہدا کے خون سے لہو رنگ ہو چکی ہے، ملک کا بچہ، بچہ جانتا ہے کہ جمہوریت کی بقا کے لیے جتنی قربانیاں ہماری پارٹی نے دیں کسی اور نے نہیں دیں مگر میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ صبر سے کام لیں جیسا کہ ہمارے دین کا حکم بھی ہے، روایت بھی، ہم پارٹی کی خون رنگ روایتوں کے امین ہیں اور اس امانت کو اسی عزم کے ساتھ لے کر آگے چلیں گے جس کے ساتھ اب تک چلتے آئے ہیں۔“ پارٹی چیئرمین کا شہید کی یاد میں منعقد ہونے والے ریفرنس سے خطاب......

مہرزاد خان نے سب اخبارات کی چھوٹی بڑی سرخیوں پر نظر ڈالی اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے نظر خلا میں موجود کسی نقطے پر مرکوز کرلی۔

”رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے قاتل، اعترافِ قتل، آلۂ قتل سمیت گرفتاری اور وجۂ قتل کے بیان کے بعد بھی سازش کی بو؟“ سوچتے، سوچتے ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

”میں ان سارے اتفاقات پر ششدر ہوں میرال صلاح الدین، جو تمہارے راستے صاف کررہے ہیں، جو تمہیں ایک پُرسکون مستقبل کی طرف لے جارہے ہیں، تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانے کی راہ میں، میں جس کانٹے سے سب سے زیادہ خائف تھا دیکھو وہ کیسے نکلا......اب تو مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ تمہیں جس شخص نے دعا دی وہ اللہ کا کوئی خاص ہی بندہ تھا کاش کبھی میں بھی ان سے ملا ہوتا، شاید جو اِن کے فیضانِ نظر سے میرے راستے میں اُگے ببول بھی گلزار بن جاتے لیکن......“ اس نے آرام کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند کر سوچا۔ ”تمہیں تو بقول تمہارے صرف تمہارے اپنے بڑے بولوں کی فصل کاٹنی تھی سو وہ جلد کٹ گئی مگر میرے سامنے تو نسلوں کے بولے گئے بڑے بولوں کی فصل تیار کھڑی ہے جو مجھے کاٹنی ہے اور میری درانتی کُند ہونے لگی ہے اور میرے ہاتھ شل ہورہے ہیں۔“ اس کے چہرے پر کرب پھیل رہا تھا۔

”سر آج آپ کی خصوصی میٹنگ شیڈولڈ ہے بڑے صاحب کے ساتھ۔“ اس کے پی اے نے آکر اسے مؤدبانہ انداز میں مخاطب کیا، اس نے آنکھیں کھول کر پی اے کی طرف دیکھا۔

”ٹائم......؟“

”رات ساڑھے نو بجے۔“

”اور کیا ہورہا ہے آج؟“ اس نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے آنکھوں کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”سر، شہادت کے سلسلے میں پریس کانفرنس ہے۔“

”وہ تو وزارتِ داخلہ کا معاملہ ہے۔“

”منسٹری آف انفارمیشن بھی انوالوڈ ہے سر۔“ پی اے کو یقیناً حیرت ہورہی تھی کہ ایک جانے بوجھے شیڈول کو وہ نئے سرے سے کیوں جاننا چاہ رہا تھا اور اگر جاننا بھی چاہ رہا تھا تو غیر متعلقہ سوال کیوں کررہا تھا۔

”مس یشل اپنے ڈیسک پر موجود ہیں یا نہیں......؟“ اس نے سیدھے ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ موجود ہیں سر اور انہیں خود بھی آپ سے ملاقات کرنی تھی، وہ کئی بار مجھ سے پوچھ چکیں کہ ان کو ملاقات کا ٹائم کب دیا جائے گا۔“

”ہوں......“ اس نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین اسکرول کرنا شروع کی...... ”نوٹس تو وہ مجھے فارورڈ کرچکیں۔“ اس نے پی اے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کی نظروں میں سوال تھا۔ نوٹس فارورڈ ہوچکے تو اب یشل کو اس سے کس سلسلے میں ملنا تھا۔

”جی سر......وہ اپنا ہوم ورک گھر ہی سے مکمل کرکے بھیج دیتی ہیں۔“ پی اے نے سوال کا جواب دیا۔

”یشل نے ڈی ایچ اے میں جس پلاٹ کی بات کی تھی، اس کا کیا ہوا؟“ مہرزاد کو اچانک یاد آیا تھا۔

”وہ تو اسی روز او کے ہوگیا تھا سر جس روز آپ نے ملک صاحب سے بات کی تھی۔“

”ہوں......“ اس نے میز کی سطح پر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو قینچی کی شکل میں جوڑتے ہوئے دونوں انگوٹھے ہلائے، وہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ یشل کے سلسلے میں ایسی کون سی بات ہوسکتی تھی جس کے لیے وہ ملاقات کا وقت چاہنے لگی تھی۔

”اور سر مجید خان بھی آپ سے ملاقات کا متمنی ہے۔“ پی اے نے موقع غنیمت جان کر ایک اور درخواست اس کے سامنے رکھی۔

”مجید خان؟“ مہرزاد بری طرح چونکا۔ ”اسے جو ڈائریکشنز دی گئی تھیں کیا ان پر عمل نہیں ہوا، وہ ابھی تک کیپٹیل میں ہی موجود ہے کیا؟“

”سر! اسے اپنے بیوی، بچوں کا تحفظ درکار ہے۔“

”ہیل وِد......“ مہرزاد خان طیش میں آکر بولا۔ ”اس حرام خور سے کہا تھا کہ فوراً نکل جائے، وہ (گالی) کا بچہ ابھی تک بیوی، بچوں کا تحفظ مانگ رہا ہے۔“

”غریب آدمی ہے سر۔“ پی اے نے طرفداری کی ہمت کی۔

”شٹ اپ......وہ غرایا۔ ”غریب آدمی کا بچہ......کیا تم لاعلم ہو کہ اس کے پرسنل اکاؤنٹ میں کتنا مال ٹرانسفر ہوا ہے اور اس مال کا اسپانسر کون ہے؟“

www.paksociety.com

"میں جانتا ہوں سر۔" مہر زاد خان کا یہ وہ موڈ تھا جس کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت کوئی بھی نہیں کیا کرتا تھا۔

"why then you didn't try to shut your big mouth up?" وہ غرایا۔

"سر......" پی اے سیدھا کھڑا ہوا۔

"اس سے بولو شکل گم کرے اپنی آدھے گھنٹے کے اندر، اندر ورنہ وہ جہاں ہوگا اس کے بیوی بچوں کی روحیں اس جگہ کا تصور کر کے ہی فنا ہو جائیں گی۔"

"جی سر......" پی اے نے موقع غنیمت جان کر فائلیں بغل میں دبائے باہر نکلنے کی، کی۔

"اور سنو......" مہر زاد نے پیچھے سے آواز دی۔ "مس پٹیل کو فوراً بھجوا دو میرے پاس پچیس منٹ ہیں صرف۔"

"سر......" کھلتے دروازے کے درمیان سے آواز آئی تھی۔

☆☆☆

"آپ تو...... آپ تو جانتے ہیں انکل، آپ تو سب سمجھتے ہیں، ساری کہانی کا علم ہے آپ کو۔"

"ارے، رے، رے میرا بچہ...... نہ، نہ، بابا اپنی آواز قابو میں کرو سائیں، تم تو شیر کی اولاد ہو، آواز کیوں کانپنے لگی تمہاری۔"

"جو ہوا ہے انکل، آپ کو سب پتا ہے، ڈیڈی وہ معاملہ کلیئر کر چکے تھے جو قتل کی وجہ بیان کیا جا رہا ہے سر...... محافظ فورس کے اس رکن کو خصوصی طور پر ہدایت دے کر یہ کام کروایا گیا ہے انکل، آپ اس کی ملازمت کی ہسٹری چیک کر لیں سر، وہ کس، کس کے ساتھ رہ چکا ہے سر۔"

"آرام سے بیٹا جی، آرام سے سائیں...... تمہاری سانس کیوں پھولنے لگی، ایک، ایک کر کے سناؤ ناں باتیں، میرے دو کان ہیں سائیں، دونوں ایک وقت میں ایک ہی بات کیچ کرتے ہیں، دو دو نہیں۔"

"انکل آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"ارے توبہ میری توبہ بابا، ایسے میں مذاق کس کافر کو سوجھتا ہے سائیں، تم گھبرا زیادہ گئے ہو اس لیے ہر چیز، ہر بات الٹی محسوس کر رہے ہو۔"

"آپ ہماری سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کریں انکل، ڈیڈی بھلے چنگے اپنے عہدے کے پورے طمطراق کے ساتھ میڈم کے بلاوے پر دارالخلافہ گئے تھے اور ان کی زندہ واپسی ہوئی ہی نہیں، ڈیڈی بھی گئے، عہدہ بھی گیا۔"

"ارے بابا، اب سمجھا ڈیڈی کے ساتھ ساتھ عہدہ بھی تو گیا، ہاں، ہاں بھتیجے جو تمہاری حالت ہے اس کی وجۂ خاص سمجھ میں آنے لگی ہے۔"

"انکل...... آپ سمجھنے کی کوشش تو کریں...... جو ڈیڈی کو مار سکتا ہے، وہ مجھے، ماما کو اور میری بہنوں کو بھی تو مار سکتا ہے۔"

"وہ کیسے مار سکتا ہے؟ بابا تم لوگوں کو...... from behind the bars کوئی کسی کو کیسے مار سکتا ہے سائیں۔"

"انکل میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟"

"ارے تم کھسیانا اور گڑگڑانا بند کرو تو میں کچھ سمجھوں ناں بابا......"

"انکل آپ کے پاس اس وقت پوری فورس ہے، آپ ہمارا ساتھ دیں تو ہم اس ٹریجڈی کا سامنا کر سکتے ہیں۔"

"فورس تو پوری لگا دی تمہارے ساتھ، تمہارے باپ کے جنازے پر کون تھا جو نہیں گیا بابا، پرائم منسٹر سے

لے کر پوری کیبنٹ، پارٹی عہدیدار، اپنے غیر سب، تمہارے گیٹ پر تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے، بتاؤ اس سے آگے اور کیا مدد کی جا سکتی ہے...... ہاں تم اور تمہاری ماں جو جی میں آرہا ہے ان کیمرے اور مائیک والوں کے سامنے بیٹھ کر بولتے جا رہے ہو، نہ کسی بیان میں تال میل ہے نہ ہی کوئی consistancy ہے، تمہارا البتہ میں کیا انتظام کر سکتا ہوں بھئی جب قاتل خود گرفتاری دے گیا، قبول بھی کر گیا، پھر میرے تیرے پر الزام بازی کیوں کرتے ہو سائیں تم لوگ......"

"انکل اس کے خلاف کیس کچا درج کیا گیا ہے، فیک شواہد، فیک آئی ڈیز والے گواہ، اسے چھوڑ دیا جائے گا میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں، اس نے جس کسی کی شہ پر گولی چلائی وہ دندناتا پھر رہا ہے، وہ آپ کی حکومت کی طرف سے پریس اور الیکٹرانک میڈیا کے سامنے پارٹی کی طرف سے ڈیڈی کا کیس ڈسکس کرتا پھر رہا ہے۔ اس (گالی) پر ہاتھ نہیں ڈالتے آپ...... جبکہ ڈیڈی نے مجھے اسی صبح بتایا تھا کہ آپ نے انہیں یقین دلایا ہے کہ اس کا ٹائم ختم ہو چکا ہے۔"

"ارے بابا...... کیسا جھوٹا آدمی تھا تمہارا باپ، میں نے ٹائم آجانے کی بات کی تھی، ٹائم ختم ہونے کی بات کہاں کی تھی میں نے، لو دیکھو تو سائیں جاتے، جاتے بھی مجھ غریب سے غلط بات منسوب کر گیا۔"

"افوہ انکل، مجھے نہیں لگتا، میں آپ کو قائل کر سکتا ہوں لگتا ہے ہسٹری کے تمام سیاسی مرڈرز کی طرح یہ مرڈر بھی ایک مسٹری بن کر فائلوں تلے دب جائے گا۔ I can well understand the game مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ کون کس کا پیادہ ہے اور کون کس کا فیل ہے، ویل...... ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے انکل بتا رہا ہوں آپ کو، بعد میں شکایت نہ کیجیے گا۔"

"بڑی ہی ٹریجڈی ہے بھئی، ایک تو تمہارے باپ کا مرڈر پارٹی کے لیے ہیڈک بنا ہوا ہے، اوپر سے تم چیلنج کرنے پر اتر آئے ہو وہ بھی ہمیں ہی...... واہ بھئی واہ......"

"میں اس سردار زادے کی بات کر رہا ہوں انکل، اب ہماری اس کی کھلی جنگ ہے۔"

"کمال کے شاطر ہو بابا، چال چلنے سے پہلے ہی اعلان کر دیتے ہو کہ فلاں، فلاں چال چلنے والے ہو۔ داد دینی پڑے گی تمہارے پلان آف گیم کی، شاہ کے سارے پیادے، فیلے، وزیر، مشیر سب محفوظ اور تم شاہ مات کی آواز لگا رہے ہو، ہوش کرو سائیں تمہارا باپ بھی اپنی ایسی ہی بونگیوں کے جال میں الجھ گیا، تمہاری فیملی کی یہ کوئی ٹریڈیشن سی ہی نہیں بن گئی جال میں پھنس کر وا ویلا کرنے کی۔"

"this is the limit uncle مجھے سب اندازہ ہو رہا ہے، آپ اسی ہفتے نیا چہرہ سامنے لا کر ہمیں وہاں سے بے دخل بھی کرنے والے ہیں، سرکاری سیکیورٹی بھی واپس لے لی جائے گی اور مراعات بھی، صوبے میں چھوٹا صاحب گھات لگائے بیٹھا ہے اور وفاق میں آپ کا وہ پٹھا...... ساری گیم سمجھ میں آرہی ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے وقت یہ بھی گزر جائے گا انکل، چو مکھی لڑائی بھی لڑے جانے کے بعد ایک دن ختم ہو ہی جاتی ہے۔"

"بسم اللہ سائیں، بسم اللہ...... تم اپنا غصہ اپنا طیش بھلے کیسے بھی دور کرنا چاہو کر گزرو...... ہاں نئے چہرے کی جہاں تک بات ہے تو وہ تو سرکاری مجبوری ہے بابا...... عہدے خالی رکھے جا سکتے ہیں نہ ہی عہدوں کی مراعات عہدیداروں کے سوا کسی اور کو دی جا سکتی ہیں۔ نیا چہرہ تو لانا ہی ہوگا ناں سائیں...... اور پھر تمہارا کیا ہے، تمہاری ماں کے پاس کروڑوں کی جائداد ہے، اس نے ان چند سالوں میں ملینئر سے بلینئر بننے تک کا سفر طے

کیا ہے، سرکاری مہمان رہتی رہی ہے وہ آخر، منہ بھرا، اکاؤنٹس بھرے، دل نہیں بھرا البتہ، اسے بول دینا سائیں، انکل بولتے تھے دل نہیں بھرا۔ ہمارا دوست نہیں رہا تو کیا ہوا...... اس کے ساتھ پرانی یاد اللہ ہے جب چاہے آئے، دیدہ و دل کیا کہتے ہیں ا سے فرشِ راہ ہیں بابا۔''

''میں چلتا ہوں انکل۔''

''دانت پیس کر اور سانس پُھلا کر جاؤ گے ناں بیٹا...... تو دانتوں اور سانسوں کی تو کوئی گارنٹی نہیں کب گر جائیں کب ختم ہو جائیں۔''

''میرے دانت intact ہیں انکل اور سانس بھی...... میرے زیرو بم تو صرف a face behind the veil دیکھ لینے پر a masked face کے نظر آ جانے پر اِدھر اُدھر ہوئے ہیں انکل۔ I must say this is a freezing scene''

''freezing scene ہے تو سب dissolve ہو گیا ناں سائیں...... wise guy میں سمجھتا تھا عقل سے پیدل ہو، ارے بابا اصل میں تو تمہاری عقل فراری کی سواری کر رہی ہے۔''

''how blind a man I am مجھے یا میری فیملی کے کسی اور ممبر کو کچھ ہوا ناں انکل، تو ڈائریکٹ ذمّے داری آپ پر آ جائے گی...... میں نوٹ لکھ کر بھجوا رہا ہوں رجسٹرار آف سپریم کورٹ کو۔''

''بسم اللہ سائیں بسم اللہ......''

''خدا حافظ...... گڈ بائے فار گڈ......!''

''گڈ بائے سائیں...... ایک yellow کارڈ تمہارا باپ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر یہاں سے گیا تھا آخری بار جاتے ہوئے، ایک مختلف قسم کا...... یلو کارڈ تمہارے ہاتھ میں نظر آ رہا ہے مجھے...... اب اللہ سائیں کی کرنیاں تو اللہ ہی جانے ناں...... فدوی کبھی خود تو بساط پر بیٹھا ہی نہیں، بس پردے کے پیچھے بیٹھ کر بساط پر چلی جانے والی چالوں کا نظارہ کرنے کا البتہ بہت شوقین ہے۔ ہاہاہا......''

☆☆☆

''بے چاری امراؤ بیگم......'' تاؤ شریف نے مہین پردوں سے پار تخت پوش پر بیٹھی امراؤ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''جیل کی سیر سے چھوٹ کر واپس آ گئی تو ٹھکانے کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا...... راج پاٹ تمام ہوا...... ملتان والی نے اس کی عدم موجودگی میں ادھر آ بسیرا کیا، کاروباری نقطۂ نظر سے امراؤ بیگم سے زیادہ سیانی نکلی، دن دُگنی رات چوگنی ترقی ہوئی، ہم ایسے غریب غربا سازندے بھی حضور بندگی کرنے پر لگ گئے۔ ''بندگی جناب'' کا نعرہ مارنے والوں کو اپنے پیٹ کے سوا کس چیز کی فکر ہوتی ہے، ہمیں کیا کہ جس کے سامنے جھک کر فرشی سلام جھاڑ رہے ہیں وہ بادشاہ گر ہے یا خود ہی بادشاہ ہے، نئے پرانے سے بھی ہمیں فرق نہیں پڑتا، رزق آنا چاہیے بس اور وافر آنا چاہیے...... ہمارے سازوں کے کِل پیچ زنگ آلود نہ ہونے پائیں، ہماری دلچسپی تو اتنی ہی ہے زندگی میں۔'' وہ سوچتے، سوچتے مسکرایا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ''مگر بے چاری امراؤ بیگم ایسی پھنسی چوہے دان کے اندر کہ سارے کس بل نکل گئے، نہ کوئی تعلق کام آیا نہ رشتہ...... سب سے زیادہ بڑا تعلق تو اس سے تھا جس بیچارے کا باپ سنا ہے اپنے ہی محافظ کے ہاتھوں مر گیا...... چچ، چچ کیسے بڑے، بڑے دعوے کیا کرتا تھا، وہ یہاں ہی بیٹھ کر سردار زادے کی نسلیں تک پُن (کھنگال) چھوڑتا تھا، اس بیچارے کے ہاتھ بھی کچھ نہ لگا، زرنگار کو لے اُڑنے کے دعوے کرتا تھا اور سردار زادے کو ختم کروا دینے کے مگر کیسا وہ سردار زادہ

صاف زرنگار کو نکال لے گیا یہاں سے، اللہ کرے زرنگار خیریت سے ہو، میری تجربہ کار نظروں نے تو پہلے ہی دن جانچ لیا تھا کہ سردارزادہ آیا ہی زرنگار کے لیے تھا یہاں اور پھر اس نے اسے اپنے نام کرلیا، بیچاری بچی بڑے خاندان کی لگتی تھی، امراؤ بیگم پر ایسے ہی تو مار نہیں پڑی ناں زمانے کی، جیل کی ہوا کھا آئی، ٹھور ٹھکانا راج پاٹ گیا، اب سفید جھاٹا (بال) لیے ایسے ہی کسی روز اس کا دم نکل جانا ہے، اللہ جانے اوپر والے کا سامنا کس منہ کے ساتھ کرے گی روزِ حشر۔'' تاؤ شریف نے اپنے عقب سے آتی چپلوں کے گھسٹنے کی آواز سنی اور اپنے سازوں کے غلاف اتارنے میں مشغول ہوگیا۔

☆☆☆

''یہ میرا استعفیٰ ہے۔'' مہرزاد نے یشل رئیس کی آواز سنی اور پھر اپنے سامنے میز پر رکھے سفید لفافے پر نظر ڈالی۔

''اس کی ایک سافٹ کاپی میں آپ کو میل کرچکی ہوں لیکن شاید آپ نے وہ میل دیکھی نہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''نہیں۔'' مہرزاد نے یشل کی طرف دیکھے بغیر میز پر سے لفافہ اٹھایا، کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے سامنے آجانے پر اپنے احساسات کو سرد مہری اور بے نیازی کی تہ کے نیچے کیسے چھپایا جاتا ہے یہ مہرزاد خان سے بہتر کون جانتا تھا۔ اس نے لفافے کی سیل توڑی اور پھر اس میں رکھا کاغذ نکالے اور پڑھے بغیر لفافہ واپس میز پر رکھ دیا۔

''تمہارے پاس یقیناً اس کی وجوہات ہوں گی۔'' اس نے بازو میز کی سطح پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''یقیناً......'' یشل نے مہرزاد خان کی بے نیازی پر دل میں اٹھنے والے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''کیا یہ اس کے لیے اتنی ہی معمولی بات ہے کہ جس کا نوٹس بھی نہ لیا جائے؟'' اس نے سوچا۔ ''میں مزید اس سسٹم کا حصہ نہیں بنے رہنا چاہتی۔'' اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ وجوہات کی تفصیل نہیں پوچھے گا مگر کیونکہ وہ خود اسے تفصیل سے بتانا چاہتی تھی اس لیے اس نے خود ہی بتانا چاہا۔

''اچھی بات ہے۔'' مہرزاد نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ ''اگرچہ تم براہِ راست کسی بھی سسٹم کا حصہ نہیں ہو...... پھر بھی خود کو اہم جاننا ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔'' طیش اور بے بسی کی ایک لہر یشل کے جسم میں دوڑ گئی۔

''یاد رہے میں آپ کے لیے ایک استعمال شدہ ٹشو پیپر کی حیثیت سے جانے جانا نہیں چاہتی، میرے سینے میں بہت سے راز محفوظ ہیں اور میں نے کسی آئین، قانون یا فردِ واحد سے وفاداری کا حلف بھی نہیں اٹھا رکھا۔'' اس نے تیز آواز میں کہا۔

''اوہ......'' وہ بے اختیار مسکرایا اور یشل کی طرف دیکھتے ہوئے داد دینے کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بلیک میلنگ......!'' اس نے ابرو چڑھائے...... ''جبکہ تم سے بہتر کون جانتا ہوگا...... مجھے اس دھمکی کے جال میں پھنسانے کے خواب دیکھنے والا احمقوں کی جنت میں رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا کرتا۔''

''آپ کی سوچ ہے، میری اس ایک بات کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔'' یشل ہمیشہ کی طرح مہرزاد خان کی خود اعتمادی سے مرعوب ہوئی مگر اس نے اپنے لہجے کا اعتماد کھونے نہیں دیا۔

''میں بہت کم عرصے میں ''میکسیمم چھپے ہوئے'' سے بھی گزر چکا ہوں میم، آپ مزید مجھے کیا نکال کر دکھائیں گی، شوق سے چھپے ہوئے کو بارہا نکالیے مگر یاد رکھیے گا کہ تھوکا صرف چاند پر ہی جاتا ہے اور اس تھوکنے کے عمل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، آپ ماشاء اللہ ذہین، فطین، حد سے زیادہ پڑھی لکھی باشعور خاتون ہیں۔'' وہ ایک ہی جست میں تم سے آپ پر آگیا تھا۔

''مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آرہی ہے کہ میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا اور آپ کیا نکلے...... ایک لڑکی کی خاطر اپنے وعدے، دعوے اور نعرے داؤ پر لگا دینے والے روایتی سردارزادے!'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو فار دی کمپلیمنٹ...... !'' مہرزاد نے گردن ذرا سی ٹیڑھی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''وہ سب جو میں نے آپ کے لیے لکھا، ہر وہ فورم جہاں پر کھڑے ہو کر میں آپ کے وکیل ہوئی، ہر وہ لفظ جو میرے قلم سے اور میرے منہ سے آپ کی خاطر نکلا میں اس پر شرمندہ ہوں۔'' یشل نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

''آپ شوق سے اپنے لکھے اور بولے ہوئے الفاظ واپس لے سکتی ہیں، یہ کوئی بڑی ڈیل نہیں ہوگی۔'' مہرزاد نے اس کے طیش کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

''مگر اب میرا قلم جو آپ کے لیے لکھے گا اور میرا منہ جو آپ کے لیے بولے گا اس پر یقیناً میں کبھی شرمندہ نہیں ہوں گی، آپ کو علم نہیں ہوگا کہ گزشتہ چند ہفتوں میں آپ نے جو کچھ کیا، جس، جس سے ملے جو، جو کہا، وہ سب میرے پاس نوٹ ہوا پڑا ہے۔''

''مجھے حیرت ہو رہی ہے نہ ہی میں چونکا ہوں، مجھے معلوم ہے آپ جیسوں کو دوسروں کو اسٹاک کرنے کی لت لگی ہوتی ہے، آپ لوگ عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔'' مہرزاد نے یشل کے اشتعال کو مزید ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''چلیں دیکھتے ہیں، کس کو لگی کون سی لت کیا رنگ لاتی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اپنی نوکری میں گزرے میری زندگی کے بُرے ترین دنوں پر میں آپ کی بہر حال مشکور رہوں گی، آپ نے مجھے خوب سکھایا۔''

''میں نے آپ کو خوب سکھایا؟'' وہ زیرِ لب مسکرایا۔ ''سوائے پیڑ پر چڑھنے کے، اب آپ پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے جا رہی ہیں، میری ہمدردیاں آپ کی تمام ہڈیوں اور پسلیوں کے ساتھ رہیں گی۔''

''دھمکی مت دیں، کوئی نئی بات کریں......'' یشل نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے کوئی نقصان پہنچا تو سب جانتے ہیں کہ میں کس کی نوکری سے استعفیٰ دے رہی ہوں۔''

''ارے آپ خود کو اتنا اہم کیوں سمجھ رہی ہیں کہ میں آپ کو دھمکی دوں گا، شاید آپ نہیں جانتیں زندگی کا نظام انسانوں کے آنے یا جانے سے کبھی نہیں رکتا۔''

''آپ میری باتوں کو جتنا لائٹ لینے کی اداکاری کر رہے ہیں، حقیقت میں وہ اتنی ہلکی ہیں نہیں......'' یشل نے کچھ دیر تک مہرزاد خان کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔ ''خدا حافظ......'' پھر وہ جوتوں کی ایڑیوں پر گھومی اور تیز قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

یشل کے جانے کے بعد مہرزاد خان نے میز پر رکھا سفید لفافہ اٹھا کر اسے بغیر پڑھے پھاڑ کر پرزوں کی شکل دینے کے بعد ٹریش بِن میں ڈال دیا اور خود میز پر رکھے رنگ برنگ ٹیلی فونز میں سے ایک خصوصی فون کا چونگا اٹھا کر کسی سے بات کرنے لگا۔

☆☆☆

بینش کے لیے دانیال کا خود اس کے بھائی کلیم کے پاس آکر اپنا مدعا بیان کرنا ایک بہت بڑا اور جرأت مندانہ قدم تھا۔ جب اسے اس آمد اور ملاقات کا علم ہوا تو ایک دو پل کے لیے تو اس کا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا لیکن تیسرے پل میں اس کے دل کو اس بات پر غور کرنا پڑا کہ اپنا مدعا بیان کرنے کی اس جرأتِ رندانہ پر اس کے بھائیوں کا ردِعمل کیا ہو سکتا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ اس ایکسٹریم سچویشن کا ری ایکشن بھی اتنا ایکسٹریم ہوگا۔'' دانیال نے اس کو بوکھلائے

ہوئے دیکھ کر بے نیازی سے کہا۔وہ ایک بڑے سے لفافے میں سے مسالا لگے پاپ کارن نکال کر کھانے میں مگن تھا۔ ”میرا بھی تمہاری طرح ایک خیال یہ بھی تھا کہ تمہارا بھائی مجھے اپنے سیلز مینوں کی مدد سے اٹھوا کر دکان سے باہر پھنکوا دے گا۔ ایسے میں بھی کچھ نہ ہوتا سوائے میری بہ مشکل جڑی چند ہڈیوں کے دوبارہ سے کریک ہو جانے کے مگر تمہارے حصول کی خاطر ہڈیوں کا دوبارہ ٹوٹ جانا کوئی بڑا ایشو نہیں ہوتا۔“

”میں حیران ہوں بھائی نے ایسا کیوں نہیں کیا......؟“ بینش نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”شاید انہیں ہم دونوں کی معصوم سی لو اسٹوری پر ترس آ گیا ہو۔“ وہ مسکرا کر بولا اور خالی لفافے کو ہلا کر اس میں بچے کھچے پاپ کارن کی موجودگی کا اندازہ کرنے لگا۔

”تمہاری سوچ ہے ایسا ہوا ہوگا؟“ بینش نے سر ہلایا...... ”ہو سکتا ہے تمہاری شکل صورت اور ٹھاٹھ کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ ایسا کرنے سے رک گئے ہوں کہ ایسا کرنے سے انہیں لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے لیکن میں تو پوری طرح ان کے اختیار میں ہوں، وہ مجھے قتل کرنے سے کم کسی اقدام پر شاید ہی راضی ہو پائیں۔“

”اچھا......“ دانیال نے خالی لفافہ ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے رک کر بینش کی طرف دیکھا۔ ”تو پھر کیا ہے یار، ہو جانا قتل، شہیدِ عشق کہلاؤ گی تاریخ میں۔“ اس کے چہرے پر شرارت پھیل گئی۔

”میں مذاق نہیں کر رہی......“ بینش نے ناراض سی شکل بناتے ہوئے اپنے مخصوص اندرونِ لاہوری لہجے میں کہا اور دانیال دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا ڈیڈی کا خیال درست ہے کہ میرے اور بینش کے لائف اسٹائل میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ مشکل سے ہی میرے ماحول میں ایڈجسٹ کر پائے گی۔“ اس نے سوچا۔ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔ بھورے بال سیدھے تھے اور چٹیا کی شکل میں بندھے اس کی پشت پر لٹک رہے تھے...... اس نے سفید زمین پر ہلکے سبز پھولوں کے پرنٹ کی عام سی کاٹن کی قمیص پہن رکھی تھی اور اس کا سفید دوپٹا گلے میں بے پروائی سے پڑا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی اور شکل پر کسی قسم کی تیزی طراری کے بجائے معصومیت جھلکتی تھی۔ اس نے اس کی سیدھی لانبی سفید انگلیوں کو دیکھا، اس کے ہاتھ جو دیکھنے پر ہی کسی پیدائشی تخلیق کار کے ہاتھ نظر آتے تھے اور یہیں آ کر اس کی نظریں رک گئیں۔ بینش ان دنوں کیلی گرافی پر کام کر رہی تھی اور منی ایچر پینٹنگ پڑھ رہی تھی، دانیال اس کا کام اور شوق دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ آنے والے سالوں میں ذرا سی مدد اور رہنمائی کے ذریعے وہ اس میدان میں بہت آگے جانے والی تھی۔

”وہ مددگار اور رہنما میرے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا......“ اس نے اپنی ممی کو اس بحث کے دوران کہ بینش سے شادی کا اس کا فیصلہ کیسا رہے گا بتایا تھا۔ ”آپ یقین جانیں ممی، میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا اور اس کا ہمیشہ کا ساتھ ہے جیسے میں بنا ہی اس کے لیے ہوں یا جیسے مجھے دوبارہ زندگی ملنے کی مصلحت میں ایک وجہ یہ بھی شامل تھی کہ مجھے اس لڑکی سے ملنا اور اسے اپنانا تھا۔“

”دانیال نہ جانے کیوں مجھے تمہاری باتوں سے خوف آ رہا ہے۔“ ممی نے کہا تھا...... ”تم اس معاملے میں ویسے ہی کریزی ہو رہے ہو جیسے فلائنگ سیکھتے ہوئے تھے اور اس کریز کا انجام تم جانتے ہو۔“

”وہ محض ایک حادثہ تھا ممی، دنیا کی تاریخ میں ہونے والے کروڑہا حادثوں میں سے ایک حادثہ، میں فلائنگ کے سلسلے میں کریزی نہ بھی ہوتا تو میرا صرف شوق ہی مجھے اس حادثے کی طرف لے جاتا کیونکہ وہ حادثہ میرا مقدر تھا۔“ اس نے سادہ الفاظ میں ممی کو سمجھایا تھا۔

”اور آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ وہ حادثہ ہم سب کو ایک نئی زندگی، ایک نئی سوچ سے متعارف کروانے کی وجہ تھا۔“ ممی کو بدستور متذبذب دیکھ کر اس نے کہا تھا۔ ”بینش کا انتخاب اسی نئی سوچ کی ہی تو ایک کڑی ہے، حسب نسب، خاندان، ذات، برادری...... سب ہمارے ذہن کی گھڑی غلط اختراعات ہیں۔“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو، شاید اس بار میں جذباتی ہو رہی ہوں۔“ اس بحث کے آخر میں ممی نے بھی تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور اب یہاں وہ لڑکی بینش تھی جو اس خوف سے ہی اس روز گھر واپس جانے سے گھبرا رہی تھی کہ اس کے بھائی یقیناً دانیال سے اس کی دوستی کو بے راہ روی گردان کر بھون کر رکھ دیں گے۔

”تمہارے بھائی نے مجھے اپنے والدین کو تمہارے گھر بھجوانے کا کہا ہے اور آج شام کو وہ مجھ سمیت تمہارے گھر ہوں گے...... تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو......“ دانیال نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بینش کو مژدۂ جانفزا سنایا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا...... میرے بھائی اتنے روشن خیال ہو سکتے ہیں۔“ بینش نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شام تک تمہیں یقین آ جائے گا۔“ دانیال کے لہجے میں یقین تھا اور امید بھی۔

☆☆☆

”اگر آپ میرال صلاح الدین کے کسی خصوصی استقبال کا اہتمام کرنا چاہتی ہیں تو اس کا مناسب وقت آیا ہی چاہتا ہے، آپ اپنی تیاری شروع کر دیں۔“ ایک نامعلوم نمبر سے عافیہ کو پیغام وصول ہوا تھا، انہوں نے اس نمبر پر کال کرنا چاہی تو وہ نمبر بند ملا اور اس پیغام کے جواب میں بھجوایا گیا پیغام اپنی وصولی ناکام ثابت ہونے کا اعلان کرنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔

”سچ کہتے ہیں لوگ، ان گورنمنٹ آفیشلز سے کسی قسم کا بھی معاملہ حیران کن اور مہنگا ثابت ہوتا ہے۔“ عافیہ نے سوچا تھا اور مناسب وقت کا انتظار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

”اتنے دن بعد اچانک تمہیں ہماری یاد کیسے آ گئی جبکہ میں تو سمجھی تھی کہ ہم تمہارے لیے بھولی بسری کہانی بن چکے ہوں گے۔“ علینہ نے فہد کی کال وصول کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ کہانیاں جو انسان نے خوب ہی سن رکھی ہوں اور جو اسے الف سے یے تک رٹی ہوئی ہوں، وہ بھولی بسری کبھی نہیں بن سکتیں۔ وہ اس کے لاشعور میں ہر وقت محفوظ رہتی ہیں۔“ فہد نے جواب میں مسکرا کر کہا۔

”کہو کیسی ہو تم......؟“

”میں ٹھیک ہوں بلکہ ہم دونوں ٹھیک ہیں میں بھی اور ممی بھی۔“

”تمہارے شہر کا موسم کیسا ہے، اس کی شامیں آج کل کے جاتے سرما میں بہت خوب صورت ہو جاتی ہیں، کیا وہ اب بھی ویسی ہی ہیں؟“ فہد نے سوال کیا۔

”میرا شہر......؟“ علینہ نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔ ”کیا یہ تمہارا شہر نہیں ہے؟“

”وہ میرا شہر تھا اب شاید نہیں ہے۔“ فہد کے لہجے میں اداسی اتر گئی۔ ”اب میرے لیے وہ ”شہرِ یاراں“ ہے، اس شہرِ یاراں کی شامیں، مجھے اکثر بہت یاد آتی ہیں، بتاؤ کیا وہ شامیں اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہیں جتنی تب تھیں جب میں بھی اس شہر کا ایک مکین تھا؟“

”ڈیپینڈ کرتا ہے کہ تمہارے شہرِ یاراں میں وہ لوگ موجود یا نہیں کہ جن کی موجودگی اس شہر کی شاموں کو یادگار بنا دیا کرتی تھی۔“ علینہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

''شہریاراں...... ہمیشہ شہریاراں ہی رہتا ہے علینہ...... یاروں کی موجودگی یا عدم موجودگی اس کے ٹائٹل پر کوئی خاص اثر نہیں کیا کرتی اور میرے شہریاراں میں تو تمہارے فارمولے کے مطابق ابھی تم اور تمہاری ممی موجود ہیں لہٰذا میرے لیے تو وہ ہر طرح سے ''شہریاراں'' ہی ہے۔''

''اب بتاؤ اس کی شامیں کیسی ہیں؟'' علینہ کی خاموشی پر اس نے اپنا سوال دُہرایا۔

''تم یہ بتاؤ میرال کا کیا بنا، تمہاری جستجو کہاں تک پہنچی......؟'' علینہ کے جواب پر وہ بے اختیار مسکرادیا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں......؟'' اس نے علینہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''ہاں بتاؤ......؟''

''تم پکی sadist ہو اور تمہیں اس اندازِ فکر سے کوئی بھی بات، کوئی بھی تبدیلی ہٹا نہیں سکتی۔''

''شاید میں ایسی ہی ہوں...... پھر......؟'' جواب میں علینہ نے کہا۔

''پھر کچھ نہیں......'' فہد نے کہا۔ ''تم میرال کا پوچھ رہی تھیں ناں...... تو اس کے سلسلے میں ایک امید افزا حوصلہ افزا بات دانیال نے مجھے بتائی ہے کہ شاید ہم جلد ہی اس سے ملنے والے ہیں۔''

''ہاں، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔'' علینہ نے فوری جواب دیا۔

''سکستھ سینس جاگ گئی کیا تمہاری......؟'' فہد ہنسا۔

''نہیں، میں اتنی لکی کہاں ہوں کہ میری چھٹی حس مجھے اشارے دے، میں نے تو تمہارے ''شہریاراں'' والے جملے سے اخذ کیا، لگتا ہے میرال کے سلسلے میں کوئی اچھی خبر ملی ہے تمہیں۔''

''واہ کیا بات ہے تمہاری، کیسے...... exact logical conclusion نکالتی ہو تم۔'' فہد اس بار کھل کے ہنس دیا۔ ''لڑکی لگتا ہے تمہاری اس sadistic اپروچ پر تمہارے کان کھینچنے پڑیں گے اب۔''

''تم میرے کان کیا کھینچو گے، میرے کان تو حالات نے ساری عمر ہی کھینچے رکھے......''

''پھر وہی ڈارک باتیں......'' فہد نے جھنجلا کر کہا۔ ''مجھے پتا ہے تم مجھے اس ''شہریاراں'' کی شاموں کا حال سنانے سے بچنے کے لیے یہ ساری گفتگو کر رہی ہو۔''

''میرے لیے تو اس شہر کی تمام شامیں ایک سی ہیں، سردی، گرمی، بہار، خزاں کسی بھی موسم میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔'' علینہ اسی انداز میں بولی۔

''چلو اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہاری صبحوں اور شاموں کو نئے، نئے انداز اور رنگ عطا فرمائے۔'' فہد نے اس کے اس انداز کے سامنے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''کل رات میں اپنے اسپیشل شو میں سی فوڈ ریسپیز سکھانے والا ہوں، دیکھنا مت بھولنا۔''

''میں ممی کو بتادوں گی، وہ نہ صرف تمہارا شو باقاعدگی سے دیکھتی ہیں بلکہ تمہاری ریسپیز ٹرائی کرنے کے چکر میں کچن میں بھی جانے لگی ہیں۔''

''گریٹ......!'' فہد خوش ہوگیا...... ''تمہیں اپنی ممی کی تقلید کرنی چاہیے، وہ تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔''

''میں جانتی ہوں، دنیا کا ہر دوسرا فرد مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔'' وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

''چلو پھر مجھے اجازت دو کیونکہ ایک ناسمجھ کے لیے دعا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔'' فہد نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

جاری ہے

''آپ......؟ اس وقت اور وہ بھی بغیر بتائے......'' نعیمہ بیگم حیران پریشان دروازے پر استادہ انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں...... بہن! ذرا دم تو لینے دو پھر بتاتی ہوں، مُوا رکشے والا بھی جانے کہاں، کہاں سے گھما کر لایا ہے۔'' ثمینہ خاتون نے کچھ ہانپتے ہوئے کہا تو نعیمہ بیگم شرمندہ سی ہو کر دروازے سے ہٹ گئیں۔

''آئیں...... اندر آجائیں۔'' ٹھنڈا پانی پی کر اور ائرکولر کی ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوا کھا کر ثمینہ خاتون کی جان میں جان آئی تو حال احوال پوچھنے کا ہوش بھی آیا۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے؟'' انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''فہد کالج گیا ہوا ہے...... جواد، فواد اسکول گئے ہیں اور طوبیٰ نے اسائنمنٹ جمع کروانا تھا وہ یونیورسٹی گئی ہوئی ہے۔'' انہوں نے تفصیلی جواب دیا۔

''اور بھائی صاحب......؟''

''وہ اپنے آفس......''

''پھر تو میں ٹھیک وقت پر آئی۔''

''یا اللہ خیر......'' نعیمہ بیگم کا دل دھڑک اٹھا۔

''میں آپ سے بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں اور اکیلے میں ہی کرنا چاہ رہی تھی۔''

''خیر تو ہے ناں بہن......'' نعیمہ بیگم کے دل میں کسی انجانے سے خدشے نے سر اٹھایا۔ پریشانی ان کے چہرے سے جھلکنے لگی جو ثمینہ خاتون کی نظروں نے فوراً بھانپ لی۔

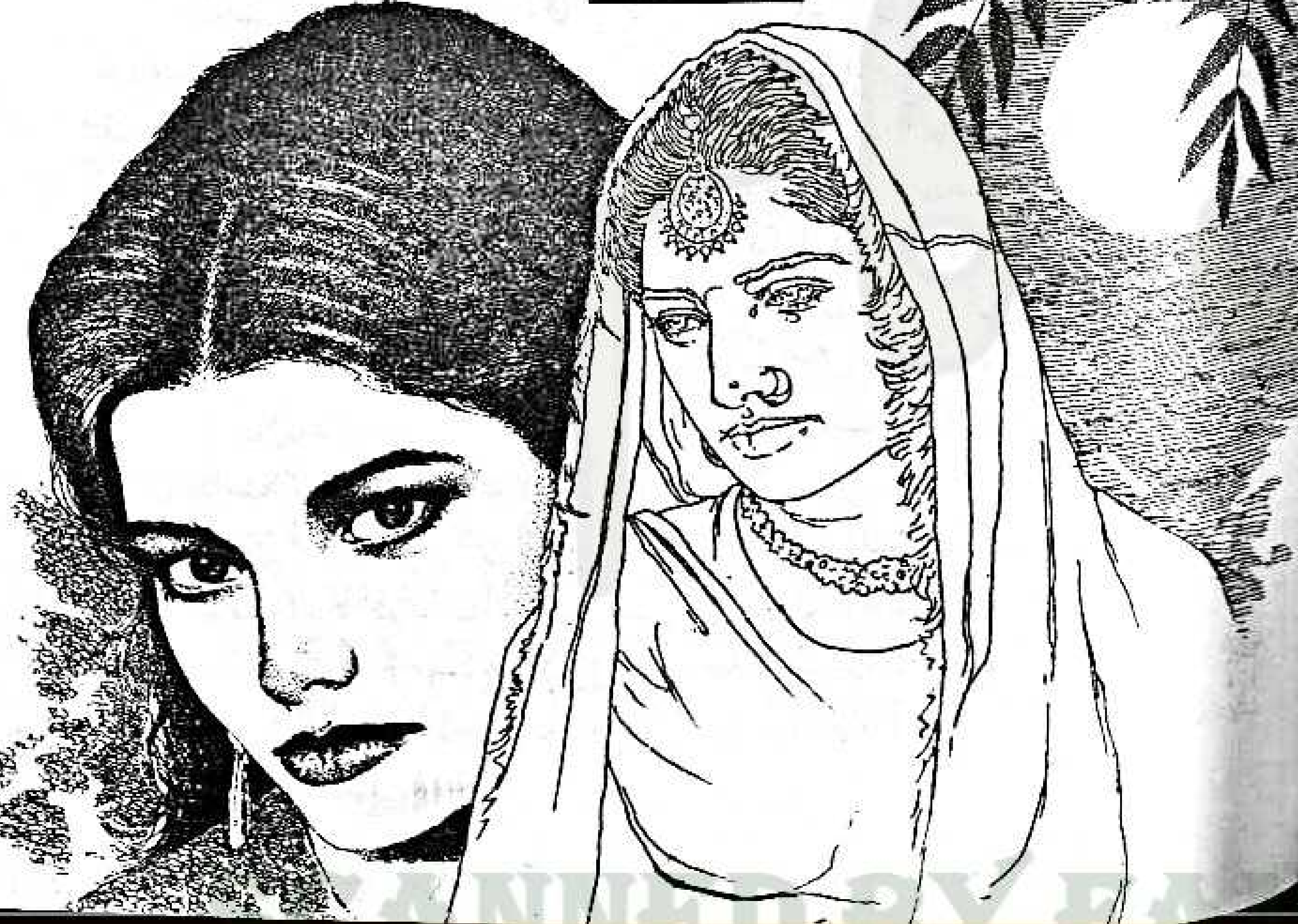
''خیر ہی ہے بہن...... آپ پریشان مت ہوں۔'' ان کی تسلی کے باوجود بھی نعیمہ بیگم کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

''کیا وہ جہیز میں کوئی فرمائش کرنے جارہی تھیں یا پھر کوئی شرط شرائط۔'' انہوں نے سوچا...... اپنی بیٹی کو جہیز تو دے ہی رہی تھیں مگر کہیں جو وہ کار کی فرمائش کر بیٹھیں تو......؟

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں، بہن......'' ثمینہ خاتون کی آواز سے اُن کی سوچوں کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔

سانجھے دکھ

نیر شفقت



''دیکھیں...... ہم اب ایک نئے رشتے میں بندھنے جارہے ہیں، اسی ناتے ہماری خوشیاں اور دکھ بھی سانجھے ہونے چاہئیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......؟'' انہوں نے تائید چاہی۔

''جی، جی...... بالکل...... ہمارے لیے تو آپ لوگ اس رشتے سے پہلے بھی بہت قابلِ احترام تھے۔ اب بیٹی کی سسرال کی حیثیت سے ہمارے دلوں میں آپ کے لیے عزت اور محبت بڑھ گئی ہے۔''

''یہ آپ کا اپناپن ہے بہن......'' ثمینہ خاتون نے انکساری سے کہا۔ ''خیر...... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ......'' نعیمہ بیگم کی سانس جیسے رک سی گئی تھی۔

''آپ اپنی بیٹی کو کوئی جہیز نہ دیں۔'' بالآخر ثمینہ خاتون نے اصل بات کرہی دی۔

نعیمہ بیگم حیران، پریشان نظروں سے بیٹی کی ہونے والی ساس کو دیکھ رہی تھیں جو اپنے منہ سے کہہ رہی تھیں کہ بیٹی کو کوئی جہیز نہ دیں۔ آج کے دور میں جبکہ لوگ اپنے منہ سے جہیز مانگتے ہیں...... یہ کہہ رہی تھیں کہ بیٹی کو تین کپڑوں میں رخصت کردیں۔ کچھ عجیب سا لگا۔

''دیکھیں میری بہن...... میں کوئی رسمی بات نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ میں حقیقتاً ایسا ہی چاہتی ہوں۔'' ثمینہ خاتون ان کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔

''میرا گھر ماشاء اللہ سے بھرا ہوا ہے، ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود ہے۔ یاسر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے، ہمارے بعد وہ گھر یاسر اور طوبیٰ ہی کا تو ہے۔ شادی کے بعد اگر طوبیٰ بیٹی کو ہمارے گھر کی کوئی چیز پسند نہ ہو تو میں خود اسے اس بات کی اجازت دوں گی کہ وہ اپنی مرضی کی چیز خرید لے...... لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گی کہ اس کا جہیز شوکیس میں سجایا پیٹیوں میں بند پڑا سڑتا رہے اور پھر بالآخر یہ جہیز وہ اپنی بیٹیوں کے لیے رکھ چھوڑے۔'' نعیمہ بیگم اُن کی باتیں حیرانی سے سن رہی تھیں۔

''میں یہ باتیں زبانی جمع خرچ کے طور پر نہیں کررہی۔'' انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو میں چار بندوں کے سامنے اپنی واہ، واہ کراتی...... لیکن میں اکیلے میں یہ ساری باتیں آپ سے کرنا چاہ رہی تھی تاکہ آپ میرا موقف سمجھ لیں اور مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ صحیح کہہ رہی ہوں ناں میں......؟''

ثمینہ خاتون نے تائید چاہی تو نعیمہ بیگم چونکیں۔ وہ اب بھی بے یقینی کی سی کیفیت میں تھیں۔

''جی...... جی......'' انہوں نے پُرزور انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا موقف اچھی طرح سمجھ گئی ہوں بہن مگر......''

''کوئی اگر مگر نہیں......'' ثمینہ خاتون نے ان کی بات کاٹی...... ''اگر دنیا کی بات کرتی ہیں تو دنیا والے نہ اِس طرح جینے دیتے ہیں نہ اُس طرح...... پھر ہم دنیا کی پروا کیوں کریں...... ہمیں اپنی اور اپنے بچوں کی آسانی دیکھنی چاہیے نہ کہ دنیا کی مشکلات......''

''ایسا کریں......'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کسی دن میرے گھر آکر دیکھیں...... بلکہ ایسا کریں جب گھر میں کوئی نہیں ہوگا تو میں آپ کو فون کردوں گی، آپ طوبیٰ بیٹی کو بھی لے آیئے گا۔ وہ جو چاہے گی یا جس شے کی ضرورت محسوس کرے گی، وہی اسے لے دیں۔''

''کیسی باتیں کررہی ہیں آپ؟'' نعیمہ بیگم کو ان کے خلوص پر سخت شرمندگی محسوس ہورہی تھی...... لیکن وہ ان کے خیالات اور سوچ سے بے حد متاثر بھی تھیں۔

''اللہ پاک آپ کے گھر کو بھرا پُرا رکھے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ باقی رہا جہیز، تو والدین کا بیٹی کو نئے گھر کے لیے تحفہ ہوتا ہے۔''

''بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے بہن......

والدین بیٹی کو تحفے تحائف ضرور دیں لیکن تحائف دینے کے بجائے کیش بھی دے سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کوئی مطالبہ کررہی ہوں۔ آپ یوں کریں جہیز کے لیے آپ نے جو پیسے جمع کررکھے ہیں وہ اس کے نام سے بینک میں جمع کروادیں۔ طوبیٰ کو اس کا منافع ملتا رہے گا۔ اصل رقم محفوظ رہے گی جسے وہ جب چاہے استعمال میں لاسکتی ہے...... اکاؤنٹ طوبیٰ کے نام پر ہی رہے گا۔''

''یہ بات صحیح لگ رہی ہے مجھے۔'' انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں طوبیٰ کے والد سے مشورہ کرکے آپ کو بتاؤں گی۔''

''ضرور......''

''ایک بات پوچھوں......؟'' نعیمہ بیگم نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ضرور پوچھیں۔''

''تقریباً ہر ساس کو یہ آس ہوتی ہے کہ ان کی بہو ڈھیروں ڈھیر جہیز لے کر آئے...... پھر...... آپ کیسی ساس ہیں جو خود منع کررہی ہیں کہ جہیز نہ دو؟''

ثمینہ خاتون یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''بہت اچھا سوال پوچھا ہے آپ نے...... میں ضرور بتاؤں گی.... آپ کو کہ میں جہیز کیوں نہیں مانگ رہی۔ دراصل میری ساس نے جہیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔'' کچھ توقف کے بعد انہوں نے ماضی کے اوراق پلٹنے شروع کیے۔

''مگر میرے والدین نے مجھے سب کچھ دیا۔ میں نے جس شے پر ہاتھ رکھا انہوں نے لے کردی۔ میں نے جس چیز کی فرمائش کی انہوں نے پوری کی اور ایک، ایک نہیں، دو، دو، تین، تین سیٹ لے کردیے۔

سسرال میں حسبِ دستور استقبال ہوا کہ میں اپنی ساس کی پسند کردہ بہو تھی۔ مہینہ بھر تو ساس، نندوں نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا اور میں خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتی رہی۔ زندگی ایسے ہی خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتی رہتی تو کتنا اچھا ہوتا...... مگر پھر وہ زندگی، زندگی تو نہ ہوتی...... زندگی تو عبارت ہی آزمائشوں اور امتحانوں سے ہے۔

کھیر میں ہاتھ ڈلوانے کی دیر تھی کہ میں بھی زندگی کے امتحانوں کے لیے تیار ہوگئی۔ ذمّے داریوں کا انبار تھا جو میری ساس نے میرے سر پر لاد دیا تھا۔ بڑی بہو ہونے کے ناتے ذمّے داریاں بھی زیادہ تھیں۔ صبح نماز کے بعد ساس، سسر کو چائے بنا کردیتی۔ ایک نند اور دیور علم حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوتے تو انہیں ناشتا بنا کردینا...... اس کے بعد میاں صاحب نے رزق کی تلاش میں نکلنا ہوتا تھا سو انہیں تیاری میں بھرپور مدد دینا۔ وہ جاتے تو ساس، سسر کو باقاعدہ ناشتا کروانا...... اس کے بعد گھر کے نہ ختم ہونے والے کاموں کا ایک پہاڑ میرا منتظر ہوتا...... اس پہاڑ کے علاوہ جو دو بڑے پہاڑ مجھے بے حد ناگوار لگتے، دو بیاہی نندوں کی آمد تھی دونوں قریب ہی رہتی تھیں۔ میاں اور بچوں کو بھیج کر ماں کی پٹی سے آکر لگ جاتیں تو بچوں کا اسکول واپسی پر کھانا بھی اِدھر ہی رہتا اور میاں کے آنے پر رات کے کھانے کی پوٹلی بھی ساتھ جاتی۔

شروع دنوں میں بڑے شوق سے اپنے جہیز کی اشیا استعمال میں لانا چاہیں تو ساس صاحبہ سے اجازت ہی نہ ملی۔ فریج اس لیے نہ چلا کہ دو، دو فریج چلیں گے تو بجلی کا بل اور زیادہ آئے گا، سو وہ بیچ دیا۔ واشنگ مشین اس لیے نہ کھل سکی کہ ساس نے ابھی حال ہی میں نئی واشنگ مشین لی تھی۔ اس کا کیا بنتا...... سو وہ بھی بازار کی نذر ہوئی۔ کراکری اس لیے نہ نکل سکی کہ پھر ساس کی کراکری کہاں جاتی۔ رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔

ڈائننگ ٹیبل اور صوفہ سیٹ اس لیے بک گئے کہ گھر میں جگہ نہیں تھی۔ کچھ اشیا میری نندوں کو پسند آگئیں تو وہ لے گئیں۔ کئی چیزوں کی تو میں نے

پیکنگ بھی نہ کھولی جواَب میں نے اپنی بیٹیوں کو جہیز میں دے دیں۔

کئی اشیا میں نے اب جا کر استعمال کیں لیکن اب وہ ارمان اور شوق کہاں سے لاؤں۔ بس اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ نہ بیٹیوں کو زیادہ جہیز دوں گی اور نہ بہو کے گھر والوں سے مطالبہ کروں گی۔ دونوں بیٹیوں کے سسرال والوں سے بھی بات کر کے میں نے انہیں اتنا ہی دیا ہے جتنا ان کی ضرورت ہے۔ صد شکر کہ ان دونوں کے سسرال والے پڑھے لکھے سمجھدار لوگ تھے۔ انہوں نے اسے انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور میری بات سمجھ کر میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور ایسا ہی تعاون اب میں آپ سے بھی چاہتی ہوں۔"

کئی ثانیے خاموشی کی نذر ہوگئے پھر اس خاموشی کو نعیمہ بیگم کی آواز نے توڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے بہن کہ میں اپنے رب کا شکر کیسے ادا کروں۔" ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں خود بھی آپ سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہ رہی تھی مگر ڈرتی تھی کہ کہیں آپ کچھ غلط ہی نہ سمجھ لیں۔" ثمینہ خاتون نے سمدھن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا گویا بہ زبانِ خاموشی تسلی دے رہی ہوں۔ ان کی تسلی پر نعیمہ بیگم کے لبوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ بات نہیں ہے بہن کہ ہم جہیز نہیں دے سکتے یا دینا نہیں چاہتے۔" نعیمہ نے وضاحت کی۔ "بات صرف اتنی ہے کہ جب کچھ استعمال ہی نہیں کرنا تو شوکیس میں سجا کر اور پیٹیوں میں بند رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے کا کیا فائدہ......" ثمینہ خاتون ہنس پڑیں۔

"جہیز نہ لینے کی وجہ تو میں نے بتادی ہے۔ آپ بھی اگر ایسا ہی چاہتی ہیں تو یقیناً اس کے پیچھے بھی کوئی کہانی ضرور ہوگی۔" انہوں نے بڑے ہلکے پھلکے انداز سے کہا۔

"اور کیا میں امید رکھوں کہ میری بہن میرے سامنے اپنا دل کھولے گی ؟"

نعیمہ بیگم بھی ہنس پڑیں۔

"آپ نے اپنی بہن سمجھ کر اگر میرے سامنے اپنا دل کھولا ہے تو کیا میں اپنی بہن کے آگے اپنا دل نہ کھولوں گی۔" انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

"میری شادی پر ساس نے اپنے منہ سے جہیز مانگا تھا۔ بہت زیادہ شرافت کا زمانہ تھا۔ سو میرے والدین نے خاموشی سے ان کا ہر مطالبہ پورا کیا۔ فریج اور ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر دینے کا زیادہ رواج نہیں تھا مگر میری ساس کے مطالبے پر میرے والدین نے فریج اور ٹی وی بھی دیا۔ یہ تو شکر ہے کہ ابو کی بہت اچھی جاب تھی اور انہوں نے بہ آسانی سب کچھ فراہم کردیا۔ مگر میرے دل میں ساس کے خلاف ایک خلش سی بیٹھ گئی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ فوراً انکار کردوں مگر ساس نے بھی ناک کر وار کیا تھا۔ شادی کے کارڈ بانٹے جاچکے تھے۔ کس طرح والدین کی عزت سے کھیلتی۔ سو چپ چاپ ہی رہی۔

پھر بیاہ کر سسرال آئی تو شاید منہ مانگے جہیز کی وجہ سے شاندار استقبال ہوا۔ مہینہ بھر تو خوب ناز برداریاں ہوئیں...... کام کاج کو ہاتھ لگایا تو بڑے شوق اور ارمانوں سے اپنے جہیز کی چیزیں استعمال کرنا چاہیں مگر ساس نے منع کردیا۔"

"کیا ضرورت ہے بیٹا اپنا سامان نکالنے کی؟ گھر میں ہر چیز تو موجود ہے پھر ضرور اپنی چیزیں خراب کرنی ہیں۔" وہ بڑی محبت سے بولیں۔

جی میں تو آیا کہ پوچھوں پھر منہ بھر کے جہیز کیوں مانگا تھا۔ مگر اب لب سل چکے تھے۔

اور یہ بات تو شادی کے چھ ماہ بعد کھلی کہ منہ بھر کے جہیز کیوں مانگا تھا۔ میرے جہیز کی اسی فیصد چیزیں انہوں

نے اپنی بڑی بیٹی کو جہیز میں دے دیں۔ یہ کہہ کر کہ......

"بیٹا تم نے استعمال کیں یا نگہت نے ایک ہی بات ہے۔ ویسے بھی نگہت تمہاری بہن ہی تو ہے۔" اور تو اور میرے سونے کے دونوں سیٹ بھی نگہت کا نصیب بنے اور چھ چوڑیاں بھی۔

اور میں دن دہاڑے اپنے جہیز کو لٹتا دیکھتی رہی۔ میں نے اپنے ہم سفر کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا مگر ماں کے آگے وہ بھی مجبور تھے۔

اور پھر دوسری بہو کے جہیز سے دوسری بیٹی کا گھر بسایا گیا اور تیسری بہو کا جہیز تیسری بیٹی کے کام آیا۔ بہوؤں کا جہیز تو انہوں نے بیٹیوں کو دے دیا لیکن وہ نصیب کہاں سے لاتیں، تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار رہیں...... بڑی بیٹی بے اولاد ہے، اس کے شوہر نے دوسری شادی کرلی...... دوسری بیٹی کا میاں انتہائی نکھٹو ہے، مرضی کا کام مل جائے تو کرلیتا ہے ورنہ گھر میں چارپائیاں توڑتا رہتا ہے اور وہ خود کپڑے سی، سی کر گزارہ کرتی ہے۔ تیسری بیٹی کا شوہر انتہائی شکی مزاج ہے اور آئے دن ماں بہنوں کے کہنے میں آکر مارتا رہتا ہے۔

سچ ہے کہ والدین بیٹیوں کو سب کچھ دے سکتے ہیں مگر اچھے نصیب کہاں سے لائیں اور پھر زبردستی مانگے تانگے کا جہیز دے کر اچھے نصیبوں کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں۔"

"خیر......" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وقت کے ساتھ امتیاز نے مجھے سب کچھ لے کر دیا بلکہ اگر یہ کہوں کہ گھر بھر دیا تو بے جا نہ ہوگا...... مگر ارمانوں اور شوق سے لی ہوئی چیزوں کو استعمال نہ کرنے کی خلش آج بھی میرے دل میں موجود ہے کیونکہ ماں باپ کی دی ہوئی سوئی بھی بہت قیمتی لگتی ہے۔"

بہت سارا وقت خاموشی کی نذر ہوگیا...... شاید دونوں ہی اپنے دکھ کی گہرائیوں میں اتر گئی تھیں پھر نعیمہ بیگم کو خیال آیا۔

"ارے اتنی دیر ہوگئی...... اب تو بچے بھی آنے والے ہیں اور میں نے روٹی بھی نہیں پکائی۔"

"کوئی بات نہیں۔ آج تندور سے منگوالیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے، شکر ہے میں ہنڈیا پہلے پکا چکی تھی۔"

"نعیمہ بہن......" وہ کچن جانے کے لیے اٹھیں تو ثمینہ خاتون نے انہیں آواز دی۔

"جی......" وہ مڑیں۔

"ایک بات کہنی تھی۔"

"جی کہیے......" وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"جہیز لینا اور دینا بہت آسان ہے، والدین بیٹیوں کو جہیز نہ دیں یا لڑکے والے جہیز لینے سے منع کردیں تو یہ بات لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی اور وہ باتیں بنا، بنا کر جینا عذاب کردیتے ہیں۔"

"جی...... صحیح کہہ رہی ہیں آپ......" نعیمہ بیگم نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ لوگوں کی پروا مت کیجیے گا۔ ہم نے صرف اپنی سہولت اور بچوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں اور یاسر بھی جہیز لینے کے سخت خلاف ہے۔"

"اور اِدھر طوبیٰ بھی جہیز نہیں لینا چاہتی۔" نعیمہ بیگم نے فوراً ٹکڑا لگایا۔ "اور انشاء اللہ میں اپنے بیٹوں کی شادی میں بھی اسی روایت کو برقرار رکھوں گی۔" ثمینہ خاتون کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔

"طوبیٰ آگئی۔" نعیمہ بیگم اٹھتے ہوئے بولیں۔ "میں دروازہ کھول آؤں۔"

دروازے پر دستک جاری تھی۔ خوشیاں اندر آنے کو بے تاب تھیں۔



ناولٹ

ساحل ساحل زنجیر ہوئے

فرحانہ ناز ملک

بپھری ہوئی بارش طوفان کا روپ دھارتی جارہی تھی۔ رات کے اس پہر کہ جب گھٹا ٹوپ گھور اندھیرے کو محض آسمانی بجلی کی خیرہ کردینے والی چمک کی وجہ سے منہ کی کھانی پڑرہی تھی...... وہ گاڑی...... ایک ہیولے کے مانند...... بارش کی تندی کا ساتھ دیتی برق رفتاری سے سرمئی گیٹ سے برآمد ہوئی تھی۔

وہ سختی سے ہونٹ بھینچے...... سامنے نظریں جمائے صرف اس طوفانی صورتِ حال سے ہی نہیں

بلکہ اپنے آپ سے بھی خفا گاڑی چلائے چلا جا رہا تھا۔

آبادی کو پیچھے چھوڑ آنے کے بعد جب بارش بھی برستے، برستے ہانپ چکی، اس نے ایک طرف گاڑی کو بریکس لگائے تھے۔ ایسے میں...... بے نیازی و خفگی کے سارے احساس پل بھر میں ہوا ہوئے...... وہ اپنے برابر کی سیٹ پر بیٹھی اس کی موجودگی سے یک دم باخبر کیا ہوا گویا بے اختیار و بے بس ہوا اسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ وہ جو کسی معصوم بچے کی طرح سسک رہی تھی...... سیاہ چادر میں لپٹا اس کا کپکپاتا سراپا کسی خوف کا آئینہ دار تھا۔ اس کے گال انگلیوں کے نشانات سے سرخ ہو رہے تھے۔ گویا انگلیاں گڑسی گئی ہوں...... ہونٹوں کے کناروں سے رِستے ہوئے خون نے اس کی توجہ کے ارتکاز کو جھنجوڑا تھا۔ اس کا فشارِ خون ایک دم سے بڑھا...... جو جنون سا حاوی تھا...... وہ احتساب کی شکل اختیار کر گیا۔

کیا وہ خود تھا ذمّے دار......؟ ہاں وہ ہی تھا اس کی اس حالت کا ذمّے دار...... وہ جو...... اس سے اس کے ایک، ایک نقش سے اس شدت کے ساتھ ابھی' ابھی متعارف ہو رہا تھا۔ احساسِ جرم کا شکار ہونے لگا۔

اسی احساس نے اس حد تک اسے مغلوب کیا کہ اس نے بے ساختہ، قطعی غیر ارادی طور پر اس کانپتے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔

وہ اچنبھے کا شکار نہ ہوئی۔ درحقیقت وہ اس وقت ہمدردی کی نہیں، ایک لفظ معذرت یا پھر صرف اور صرف محبت کی مستحق تھی اور اس کے گرد حصار باندھے اس شخص نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا۔

بے حد نرمی و توجہ کے ساتھ وہ اس کے ہونٹ کے کنارے سے رِستا خون پونچھنے لگا تھا۔ وہ اپنی بڑی، بڑی آنکھوں میں جھیلیں سموئے اسے یہ سب کرتا دیکھتی رہی۔ کچھ بھی محسوس کرنے کی حس... فی الحال خاموش تھی۔

''سوری۔'' یہ کہہ کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر ایک بازو کا اس کے گرد حلقہ بنائے، دوسرے سے اسٹیئرنگ تھامے اب گاڑی آگے بڑھا رہا تھا۔

☆☆☆

سفید بے داغ، خوب صورت کڑھائی سے سجا کُرتہ شلوار، پالش شدہ چمک دار قیمتی کھیڑی، سلیقے سے جمے بال، مہینوں کی بڑھی شیو سے پاک دُھلا دھلایا صاف چہرہ اور غلیظ چیکٹ ناخنوں کے بجائے ترشے ہوئے صاف ستھرے ناخن...... عام دنوں میں بھی وہ جب جس گلی میں داخل ہوتا۔ سب کو گویا تفریح میسر آجاتی۔ آج تو پھر بات ہی الگ تھی۔

''اوئے للو......'' ایک بچہ پکارتا اور ساری بلیٹن آناً فاناً جمع ہو جاتی۔

''للو...... تُو تو دولھا بن آیا۔'' آن کی آن میں اس کے گرد میلا لگ گیا تھا۔ وہ جو پہلے جھینپ رہا تھا۔ اس بات پر خفگی و اشتعال سے پیر پٹخ کر چلایا۔

''کھبل دال (خبردار) مجھے کسی نے تنگ کیا تو!'' (مجھے کسی نے تنگ کیا تو) وہ بولتے ہوئے تتلاہٹ کا شکار ہوتا تھا۔ اس کی ''کھبل دال'' پر ہی پھلجڑیاں پھوٹ پڑیں۔

''کیوں...... تو آج دولھا بن آیا ہے اس لیے؟'' یہ سن کر للو کے نتھنے مزید پھول گئے۔ مہینوں بعد نہانے دھونے کا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ پہلے تو وہ گھر سے نکلنے پر ہی آمادہ نہ ہوتا، اماں کے بے طرح سمجھانے، پچکارنے پر باہر قدم رکھ بھی لیتا تو پھر یہ منظر استقبال کرتا۔ جو اس کے لیے جھنجلاہٹ، غصے اور آخر میں انتقام تک جا پہنچتا۔ بچے تو بچے محلے کے بڑے بھی کم نہیں تھے۔ بچے نعرے لگا لگا کر تو بڑے باتیں کرنے کے بہانے پاس بٹھا کر گپیں لگا کر بیچ، بیچ میں شروع ہو جاتے۔

''للو تُو دلہن کہاں سے لائے گا؟'' وہ موڈ میں ہوتا تو شرما، لجا کر ایسے، ایسے جواب دیتا کہ سننے والوں کو اپنی بونگیوں کا گویا انعام مل جاتا۔ باتوں، باتوں میں للو سے کئی کام بھی نکلوا لیے جاتے۔ کوئی گھر بھگاتا کہ چاچی یاد کر رہی ہے، وہ بخوشی چاچی سے ملنے جاتا۔ اُدھر چاچی پہلے سے منتظر ملتی دو چار گلے شکوے، پیار بھرے مسکے لگانے کے بعد بالآخر وہ اپنے کام کے لیے دوڑا دیتی۔ ایسے ہی باقی سب بھی رویّہ رکھتے۔ اس کی جیب ہمیشہ بھری، بھری رہتی۔ عموماً اس کی عقل ناکارہ رہتی لیکن جہاں بات پیسوں کی آجاتی وہاں ٹھیک ٹھاک سُدھ بدھ والا بن جاتا۔ سو ایسے تو اس سے پیسے اینٹھنے میں مسئلہ ہوتا ویسے نکلوا لیے جاتے۔

''یار للو، آج سگریٹ کے کش تو لگوا۔''

''للو تیرا باپ زمین کا کیس جیتا ہے...... چرغہ بنتا ہے ناں۔'' یا پھر ''یار للو میٹھی بوتل پینے کو جی چاہ رہا ہے۔'' اور للو خوشی خوشی مان جاتا۔

سب جانتے تھے وہ بھولا ہے پر پاگل نہیں لیکن پھر بھی دماغ کا ہلکا ہے۔ سو ایسے ہی اسے دولھا بنانے، اس کی دلہن لانے کی باتوں کو اس کی چھیڑ بنا لیا گیا۔ وہ پہلے شرماتا، بغلیں جھانکتا، منہ چھپاتا تھا اب جھنجلاتا، مشتعل ہوتا اور مارنے پر آجاتا تھا۔

''یار للو...... تو دانت بھی نئے لگوا لے۔ قسم سے پھر تو تجھے کشمیر کی بھی خوب صورت سی دلہن مل جائے گی۔'' للو کی آج کی سج دھج دیکھ کر کہیں سے مشورہ آیا۔ اس کے دو چار دانت بھی جھڑے ہوئے تھے۔

''تو تُھد لدوالے (تو خود لگوا لے) تو شادی کر، تیرا باپ شادی کرے۔'' حسبِ سابق وہ غصے اور جنون میں آگیا۔

گزشتہ روز ہونے والی بارش نے گلی میں کیچڑ کر دی تھی۔ وہ منہ پُھلاتا، بچوں کی چیخ و پکار پر دھیان نہ دینے کی کوشش کرتا، تیز تیز قدم اٹھاتا جیسے ہی وہاں سے گزرنے لگا کسی نے کیچڑ میں پتھر کھینچ مارا۔ ساری

کیچڑ اس کے سفید کپڑوں کو داغ دار کر گئی۔

''اوئے میرے کپڑے۔'' اس نے تتلا کر کہا اور اس کے بعد مغلظات کا ایک ریلا تھا جو اس کے منہ سے بہہ نکلا تھا۔ بچے کانوں پر ہاتھ رکھے، زبان چڑاتے آگے، آگے تھے اور وہ گالیاں بکتا، ہاتھ میں جو چیز آتی زمین سے اٹھا، اٹھا کر ان کی طرف پھینکتا ان کے پیچھے تھا۔ بچے ماہرانہ طریقے سے جھکائی دے کر بچ رہے تھے ورنہ اس کا ایک پتھر بھی پڑ جاتا تو جیسے جان نکل جاتی۔ وہ اس قوت کے ساتھ پھینک رہا تھا۔

''میں اپنے ابا تو بتاؤں دا۔'' بچے غچہ دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ ہانپ، ہانپ کر دھمکیاں دیتے نہ تھکا۔ سفید کپڑے کیچڑ سے داغ دار ہوگئے تھے۔ کھیڑی کا حال کپڑوں سے بھی ابتر تھا اور آج بھی ہمیشہ کی طرح اماں کی اُسے صاف ستھرا رکھنے کی کوشش ناکام گئی تھی۔

☆☆☆

''میں پیدائشی بدنصیب ہوں۔ اگر یہ بات میں علی الاعلان کہنا شروع کر دوں تو لوگوں کو میرا دماغی توازن خراب ہونے کا یقین آجائے۔ جدی پشتی جاگیردار سرداروں کے گھر پیدا ہونے والا، جائداد، مربعوں کا مالک، اونچے حسب نسب کا۔ بدنصیب ہو بھی کیسے سکتا ہے مگر میں بدنصیب ہوں...... ہاں میں پیدائشی بدنصیب ہوں کیونکہ میں سردار اجلال خان المعروف للو کا بیٹا ہوں۔''

☆☆☆

''ڈیڈی...... ہم یہاں رہیں گے؟'' بڑے سے سرخ اینٹوں کے بنے صحن میں تین کمرے اور برآمدہ سامنے کی طرف تھا۔ کچن ان کمروں سے کافی فاصلے پر دائیں طرف دیوار کے ساتھ جبکہ ڈرائنگ روم کے نام پر ایک کمرا گھر کے بیرونی دروازے کے پہلو میں بنا ہوا تھا۔ باتھ روم کی لاج رکھنے کو ٹوائلٹ اور واش روم بھی بڑی شان و فرصت کے ساتھ یہیں

اِستادہ تھے۔ چند منٹوں میں گھر کا معائنہ کر چکنے کے بعد اسے اصلی کے چکر آ گئے۔ گھر، گھر تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا۔

''فی الحال۔'' ڈیڈی اس کے چہرے پر منڈلاتے مایوسی کے بادل دیکھ کر شفقت سے مسکرائے۔

''اور آپ کے اس فی الحال کا دورانیہ کتنا ہے؟'' اس نے منہ بسورا تھا۔

''آپ کو اس گھر سے کیا پرابلم ہوئی؟''

''مجھے نہیں ہوئی، یہ گھر خود کسی پرابلم سے کم نہیں لگ رہا۔''

''بیٹے گاؤں میں اسی ٹائپ کے گھر ہوتے ہیں۔''

''یعنی بیڈ رومز، ڈرائنگ روم، کچن سب ایک دوسرے سے ناراض، دور دور، الگ الگ۔'' تجزیہ انوکھا تھا۔ ڈیڈی کو ہنسی آ گئی۔ ''اور اٹیچڈ باتھ کا تو کوئی کانسیپٹ ہی نہیں۔'' وہ شاکڈ تھی۔ ڈیڈی نے کندھے اچکا ڈالے۔

''ڈیڈی آپ کو کیوں کچھ نہیں ہو رہا۔ میرا تو یہاں رہنے کا سوچ کر ہی سر چکرا رہا ہے۔''

''صرف آج...... پھر جب آپ ایڈجسٹ ہو جائیں گی تو کچھ غلط محسوس نہیں ہوگا۔'' ڈیڈی مطمئن تھے۔

''مت بھولیں آپ نے کہا ہے.... فی الحال۔'' اس نے انگلی اٹھا کر گویا یاد دہانی کروائی۔

''اور یہ بھی بتا دیں آپ کا یہ فی الحال کچھ ہفتوں کے لیے ہے یا کچھ مہینوں کے لیے؟''

''میرا خیال ہے......'' خود تو مطمئن ہو چکے تھے لیکن اسے مطمئن کرنا کارِ مشکل لگ رہا تھا۔ ڈیڈی نے اتنا کہہ کر قدرے توقف کیا گویا اگلی بات سوچنے کا وقت لیا ہو۔

''کھانے کے لیے ہمیں گھر میں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ آئی ڈونٹ تھنک سو کہ یہاں ہوٹل ہوں گے۔ ہوئے بھی تو ان کا معیار بھروسے کے لائق نہیں ہوگا۔''

''اس کچن میں کیسے کوکنگ ہو سکتی ہے؟'' ایک اور پریشانی۔ کچن میں آتش دان نما جگہ کے اندر مٹی کا ایک چولھا بنا ہوا تھا یعنی اس کے لیے ایک نئی تصویر بلکہ حقیقت۔

''ڈیڈی...... ہم کیوں آئے یہاں؟ اتنی اچھی سیٹلڈ لائف چھوڑ کر، بنا کسی وجہ کے...... میں نہیں سمجھ پا رہی؟'' ڈیڈی کے یہاں آنے کے فیصلے کے بعد اس نے کہیں بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ خوش نہیں۔ یہ فیصلہ اس کی زندگی پر کس حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس نے صرف اپنے تک رکھا مگر یہاں آ جانے کے بعد پہلے گاؤں اور اب یہ گھر دیکھ کر وہ جیسے ایک پل میں ہر چیز سے اچاٹ ہوئی تھی۔ صرف گاؤں اور گھر ہی نہیں ڈیڈی کے فیصلے سے بھی۔

''خوشی......!'' ڈیڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''آپ کو اپنے ڈیڈی پر بھروسا نہیں؟''

''ہے ڈیڈی بلکہ خود سے بڑھ کر ہے۔'' اس نے بنا کسی تامل کے کہا اور وہ جو کہہ رہی تھی وہ اس کے لیے دنیا کا سب سے بڑا سچ تھا۔ وہ اور ڈیڈی ایک دوسرے کا اعتبار تھے۔

''میں ایسا کوئی کام یا فیصلہ نہیں کر سکتا جس میں آپ کی بہتری و بھلائی نہ ہو کیونکہ میرے لیے میری دنیا آپ ہیں اور اپنی دنیا کی بہتری ہر کوئی چاہتا ہے۔''

''آئی نو۔'' آنسوؤں کی ہلکی سی آمیزش اس کی آواز میں شامل تھی جس پر اس نے فوراً قابو پایا کہ ڈیڈی کو اداس کرنا مقصود نہیں تھا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس فیصلے سے میری بھلائی کا کیا تعلق ہے؟'' مگر فوراً بعد اس نے ایسا سوال کیا کہ جس کے جواب کے لیے ڈیڈی کو باقاعدہ سر دُھننا پڑ گیا تھا اور جونہی انہوں نے خود کو جواب دینے کے لیے تیار کیا۔ اس کی پٹاری میں سے ایک اور سوال برآمد ہوا۔

''اور اب جب ہم نے رہنا یہیں ہے تو کیا ضروری ہے اس درجہ ریموٹ ایریا میں رہیں۔ کسی بہتر جگہ، کسی اور شہر میں بھی تو رہائش رکھی جا سکتی ہے۔'' بالکل بچوں کی طرح ایک کے بعد ایک تابڑ توڑ سوال کرنے کی عادی تھی۔ یہ عادت کبھی کبھی ڈیڈی کو زچ بھی کر دیا کرتی تھی مگر اس وقت ان کی بچت ہو گئی تھی۔ وہ پہلے سوال کا جواب دینے سے بحفاظت بچ گئے تھے۔

''مگر مجھے اپنی اسٹڈی کی بھی بہت فکر ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہاں ایسی کوئی سہولتیں ہوں گی۔''

''ابھی آپ ایسا کریں...... تمام پریشانیاں اور فکریں کچھ وقت کے لیے ریسٹ پر رکھ لیں سوائے ایک کے۔''

''وہ ایک کون سی؟'' وہ ڈیڈی کے خوشگوار لہجے سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔

''کھانے کی۔''

''اوہ ہاں......'' اسے جیسے یاد آ گیا۔ ''مجھے تو بھوک بھی لگ رہی تھی۔''

''تھی......؟'' ڈیڈی نے مصنوعی حیرت دکھائی۔

''بھئی اب بھی لگ رہی ہے، کم از کم مجھے تو بہت......'' اور ابھی وہ بات مکمل کرتے کہ دھڑ دھڑاتے دروازے نے باقی سب آوازیں نگل لیں۔

''یہ......'' اس زور سے بجتے دروازے نے اسے خوف سے زرد کر دیا تھا۔

''کوئی آیا ہوگا، میں دیکھتا ہوں۔'' ڈیڈی اس کا گال تھپتھپاتے کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ وہیں بیٹھی ہولتی رہی۔

''بالکل ہارر موویز کے جیسا گھر لگ رہا ہے، ہانٹڈ ہاؤس۔ پتا نہیں میں کیسے رہ پاؤں گی۔'' وہ... با آواز بلند بڑبڑاتی رہی یہاں تک کہ ڈیڈی ہاتھ میں خوشبو اڑاتی ٹرے اٹھائے واپس آ گئے۔

''ابھی تو آپ اللہ کو تھینکس بولیں، آپ کی بھوک کا انتظام ہو گیا۔'' خوشبو نے اس کی بھی توجہ کھینچ لی تھی۔

''واؤ...... یہ کیسے ہوا ڈیڈی؟'' یکایک سب فکروں پر بھوک غالب ہوئی تھی۔

''ضمیر زندہ باد۔''

''وہ کیوں؟'' اس کے سوالوں کی پٹاری پھر سے کھلنے لگی تھی۔ ڈیڈی دہل گئے۔

''بعد میں سوئٹ ہارٹ...... بعد میں... ابھی کھانا کھائیں گرم گرم۔'' وہ بخوشی مان گئی۔

☆☆☆

ایسا ہمیشہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ للو لوگوں کے مذاق کا نشانہ ہی بنتا رہے اور گھر والوں کو خبر بھی نہ ہو۔ جیسا کہ اس شام... شدید گرم سالن گر جانے کی وجہ سے جلی ہوئی پنڈلی کے ساتھ وہ گھر آیا۔

''دتو کے تندور پر سالن گرا۔'' شدید تکلیف کی وجہ سے اس کی تتلاتی زبان شاید ہی کسی کی سمجھ میں آئی مگر وہ ماں تھیں کیونکر نہ سمجھ پاتیں۔

''تجھے کیا آفت پڑی ...تھی، دتو کے تندور پر جانے کی؟'' جلے پھپھولوں کی تکلیف ایک طرف، ماں کی ڈانٹ کے ساتھ پڑے جھانپڑ نے آنسو نکال دیے۔

''جبارے کی ماں کی روٹی لینے گیا تھا۔''

''اس جبارے کی ماں کی تو میں......'' زہرہ خاتون کی آنکھوں میں قہر سمٹ آیا۔ ملازمہ کو لے کر آناً فاناً جبارے کے گھر پہنچی تھیں۔ جہاں بڑی خان زادی کی اچانک اور پُرجلال آواز پر سب بوکھلا گئے تھے۔

''کیوں ری؟'' جبارے کی ماں کو دیکھتے ہی زہرہ خاتون کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ ''تیرے مر گئے تھے جو میرے اجلال کو اپنے پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے دوڑا دیا۔'' انتہائی نفرت و تضحیک آمیز لہجہ تھا۔

جبارے کی ماں ہکا بکا...... ماجرہ کیا ہے؟ وہ تو خود بہو، بیٹوں کے سامنے للو کو بددعائیں دیتے نہیں تھک رہی تھی۔ جو سالن لینے گیا اور ابھی تک نہیں آیا

اور جو پتا ہوتا... زہرہ خاتون نے مؤکل چھوڑے ہوئے ہیں جو اس کی بددعائیں زہرہ خاتون کو بتا آئیں گی تو آواز کا گلا نہ گھونٹ لیتی وہ ....

''سارا سالن اجلال پر گر گیا۔ پوری ٹانگ جل گئی۔'' مگر وہاں معاملہ اور تھا۔ جبارے کی ماں کو اپنی شامت سر پر سوار نظر آئی۔

''معاف کردو بڑی خان زادی۔ یہ تو للّو پتر آیا کھڑا تھا تو میں نے بھول چوک میں اسے ہی بھیج دیا۔ جبار اور غفار ہوتے تو......''

''ہمارے کمی ہو کر ہم پر حکم چلاتے ہو۔'' زہرہ خاتون آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔

''میرے بیٹے کو اس سے زیادہ کچھ ہو جاتا تو میں تجھ سمیت تیرے پورے خاندان کی قبریں کھدوا ڈالتی۔'' جبارے کی ماں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ ''اور اگر آج کے بعد اجلال کو کوئی کام بتایا تو میں ایسا کر بھی ڈالوں گی۔''

''میرے پُرکھوں کی توبہ جی۔ جیسے میرے جبار، غفار ویسے ہی میرے لیے للو...... میں......''

''بکواس بند کر، خبردار جو آئندہ اجلال کو اس نام سے بلایا بھی تو...... زبان اکھیڑ ڈالوں گی... جاہل، بدتمیز۔'' زہرہ خاتون چلی گئیں پیچھے جبارے کی ماں تادیر کلستی رہی۔

''اب للّو کو للو نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ موٹے دماغ والے کو گھر میں زنجیریں ڈال کر رکھے۔'' وہاں حویلی میں زہرہ خاتون رات ہونے تک للو کو اچھے برے، اپنے پرائے، مالک مزارع کی پہچان پر لیکچر دیتی رہیں۔ جو اس کے لیے کسی لوری کی طرح ثابت ہوا۔ وہ شعور کے دروازے کھولے بغیر سو گیا۔

☆☆☆

قصبے کے قریبی شہر میں بابر، نوریا کو پک کرنے گیا تھا۔ وہیں اسے وہ نظر آئی۔ گیٹ پر گاڑیوں، رکشوں اور مختلف قسم کی وینز کا رش تھا۔ چھوٹے سے شہر کی حدود وقیود بھی اسی حساب سے تھیں سو کالج کی لڑکیوں کا حلیہ بھی ویسا ہی تھا۔ اکثریت بڑی، بڑی چادروں اور عبایا میں نقاب کیے کالج سے باہر آ رہی تھیں۔ بہت قلیل تعداد میں لڑکیاں تھیں جو صرف دوپٹوں میں تھیں۔ انہی میں ایک وہ بھی تھی۔ بابر کو کیوپڈ کا تیر چلنا اور پہلی نظر کی محبت جیسی کہاوتوں کے معنی اب سمجھ میں آئے۔ یہاں آج کل نئی کلاسز کے لیٹ ایڈمیشن بھی چل رہے تھے۔ وہ لڑکی یقیناً اسی مقصد کے لیے آئی ہوئی تھی کیونکہ یونیفارم میں نہیں تھی۔ گلابی اور سیاہ رنگ کے شلوار سوٹ میں اس کی دراز قامت اور گوری رنگت بہت نمایاں ہو رہی تھی۔

وہ بنا تعارف کیے بھی بتا رہی تھی کہ وہ اس شہر یا اس علاقے کی نہیں۔ بابر کی وہاں موجودگی کے دوران اس لڑکی نے کوئی دس چکر تو باہر گیٹ کے لگائے۔ وہ گیٹ سے باہر آتی بری طرح گھبرائے انداز اور متلاشی نظروں سے چہار اطراف دیکھتی اور مایوسی کے مارے روہانسی شکل بنائے واپس ہو لیتی۔

کوئی اور دن ہوتا اور نوریا اتنی دیر لگا رہی ہوتی تو اس نے جگہ اور بھیڑ کا لحاظ کیے بنا نوریا کو کھری کھری سنا ڈالنی تھیں مگر آج تو جیسے دل کی تمنا ہی یہی تھی کہ نوریا جتنی مرضی دیر لگائے اور وہ اس ماہ جبیں کی دید سے سیراب ہوتا رہے مگر تمنا تب کہاں پوری ہوتی ہے جب تمنا کی جائے۔ نوریا اگلے کچھ پلوں میں سامنے تھی۔

''دھت۔'' بابر کی حالت غمزدہ ہوگئی۔ ''اور دیر نہیں لگا سکتی تھیں؟'' جب نوریا پجارو میں بیٹھ گئی تب اس نے جل کر کہا۔ نوریا اسے طنز ہی سمجھی۔

''سوری بھائی جان، پریکٹیکل کی وجہ سے دیر ہوگئی۔'' نوریا نے چہرے پر سے نقاب ہٹا لیا تھا۔ وہ کالج عبایا میں آتی جاتی تھی۔ بابر بڑی بے دلی سے گاڑی ریورس کرنے لگا۔ اب یہ طے تھا اس نے اگلے کئی دنوں تک بخوشی نوریا کو پک اینڈ ڈراپ کرنا تھا۔

☆☆☆

پہلے دادی پھر پھپو...... وہ ابھی سکون کی سانس بھی نہیں لے پایا تھا کہ پھپو کے فوراً بعد نوریا آگئی۔

''ہائے شاہجہاں، کب آئے؟'' اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ شاہجہاں کو بری طرح سے خود پر ترس آیا۔ اس وقت وہ جس قدر تنہائی چاہ رہا تھا اسے اتنا ہی ڈسٹرب کیا جا رہا تھا۔

''تھینک گاڈ تم آگئے۔'' اپنے ریشمی بالوں کو حسبِ عادت جھٹکتی وہ بے ساختہ اُمڈتی خوشی کے ہاتھوں بے حال ہوئی۔ ''اور میں جانتی ہوں کہ تم کیوں آئے؟'' شاہجہاں نے ناگواری چھپانے کے سارے جتن منہ کے بل گرائے۔ فی الحال مروّت نبھانے میں نقصان تھا۔

''میری سالگرہ ہے اور تم مجھے وش کرنے کے خیال سے آئے ہو۔ مجھے سرپرائز کرنے ہے ناں؟'' بعض لوگ حقیقت جانتے بوجھتے بھی خوش فہم بنے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسے ویسے کسی بھی خیال سے نہیں آیا تھا اور نوریا اس بات سے بخوبی واقف تھی مگر دل کے خوش کرنے کو ایسا کہہ بھی دیا تو کیا برا کیا۔

''آئی ایم آنرڈ اے ایس پی صاحب تم اپنا قیمتی وقت......''

''نوریا......'' اس نے بالآخر ٹوک دینا مناسب سمجھا۔ ''مجھے نیند آرہی ہے۔'' نوریا بے اختیار چپ ہوئی تھی۔ اس بندے کو دل رکھنا واقعی نہیں آتا اور وہ ہر بار اپنی ہتک آپ کروانے اس کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ خوش امیدی کا سہارا لیے۔

''سمجھا کرو...... میں تھکا ہوا ہوں۔'' اگلا جملہ بھی منہ پر مارنے والا تھا۔ نوریا کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ اس کی ساری بشاشت یک دم اُڑنچھو ہوئی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر سر جھٹک کر ''نائس ڈریم۔'' کہتی باہر بھاگ گئی اور وہ اتنا جانتا تھا یہ ردِعمل وقتی تھا۔ صبح وہ بالکل نارمل نظر آنی تھی۔ اس کے جاتے ہی دروازہ لاک کر کے وہ بستر پر گر سا گیا۔ اسے آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ نہ کپڑے بدلے تھے اور نہ جوتے اتارے تھے۔ جب دادی چلی آئیں۔ خیر خیریت پوچھنے اور بتانے اور پیار دینے کے بعد انہیں گئے پانچ منٹ بھی نہ بیتے ہوں گے کہ پھپو دودھ کا گلاس لیے حاضر ہوئیں۔ پھپو کا وہی کوفت میں مبتلا کر دینے والا مصنوعی پیار جتلاتا انداز جو آج صد شکر مختصر دورانیے کا رہا اور یہ نوریا۔

وہ دونوں ایک ساتھ پروان چڑھے تھے۔ نوریا کی پوری زندگی اس کے سامنے گزری۔ وہ مزاجاً پھپو کا پرتو تھی۔ غیر مستقل مزاج، ضدی، اکھڑ اور قوتِ برداشت کی کمی کا شکار۔ وہ خاصی ماڈرن اور فیشن پرست لڑکی تھی۔ اپنی روایتی اقدار پر بھی کاربند لیکن بلا کی اسٹائلش تھی۔ اس کے مزاج کی تندی اور بے حد ماڈ ہونا بھی شاہجہاں کو گوارا ہو جاتا اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ نوریا بابا کی پسند ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی زندگی کے دیگر اہم ترین فیصلوں کی ڈور اپنی مرضی سے ہلانے والے بابا یہاں بھی اپنی من مانی کریں گے۔ نوریا کو ہی اس کی زندگی کا ساتھی بنائیں گے مگر اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ درحقیقت وہ خود بدل گیا تھا۔ وہ بچپن کا وہ شاہجہاں نہیں تھا جسے ماما اور بابا نے اس کی مرضی کے خلاف بورڈنگ بھیج دیا تھا۔ محض اس لیے کہ بابا کی خواہش تھی اور نہ وہ...... وہ شاہجہاں رہا تھا جسے اعلیٰ تعلیم کے نام پر مقابلے کا امتحان دینا پڑا تھا اور ناپسندیدہ ترین شعبے کو بطور پیشہ اپنانا پڑا تھا کیونکہ بابا چاہتے تھے مگر اب نہیں...... نوریا تو قطعی نہیں...... نیند کے حاوی ہونے تک وہ ڈیڈ کو اپنے تئیں نو مور کہہ چکا تھا۔

☆☆☆

لوگوں کا مذاق حقیقت کا روپ بھی دھار لے گا۔ کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا۔ سردار شمشیر علی

خان ہارٹ اٹیک کے بعد جونہی صحت یاب ہوکر گھر لوٹے۔زہرہ خاتون نے گویا رٹ لگالی۔

''خان صاحب، اجلال کی شادی کردیتے ہیں۔'' شمشیر خان نے حسبِ توقع بات مذاق میں لی مگر زہرہ خاتون نے تو جیسے تہیہ کررکھا تھا اجلال کی شادی کرکے دم لیں گی۔

ایک دن، دو دن بالآخر روز روز کا کہنا کام کرگیا۔شمشیر خان متوجہ ہو ہی گئے۔

''نیک بخت اپنے حواسوں میں رہا کرو۔''

''کیوں، ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟'' وہ برا مان گئی تھیں۔

''اس اللہ لوک سے شادی کون کرے گا اور یہ کیا شادی کے قابل ہے؟ ایک ذمّے داری جو سیدھی عقل والے بندے نہیں اٹھا سکتے تم اس پاگل پر لاد رہی ہو۔''

''کمی کیا ہے میرے بیٹے میں؟'' ان کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔''لوگوں کے اندھے، کانے، گونگے، بہرے شادی شدہ ہوجاتے ہیں تو میرا اجلال کیوں نہیں؟''

''وہ سب دماغ والے ہوتے ہیں۔'' شمشیر علی خان حقیقت شناس تھے۔

''میرے بیٹے کا دماغ بھی پورا ہے، لوگ تنگ نہ کریں تو ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔آپ سے مجھ سے زیادہ سُدھ بدھ والا۔''

''یہ تو تم کہہ رہی ہو ناں۔'' شمشیر خان ہنس دیے۔منّتوں، مرادوں کے بعد پیدا ہونے والا اجلال خان.... وہ بھی کمزور دماغ! سوچ کر تکلیف تو ایسی ہوتی تھی کہ دل بند ہوجائے پر اللہ کی رمزیں اللہ جانے۔آزمائش لینے کے اس کے اپنے طریقے۔

''اور یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہارے دماغ میں آیا کیونکر؟'' اب وہ کیا بتاتیں ایک نہیں بہت سی وجوہات نے ان کا دل سکیڑ رکھا تھا۔دنیا والوں کے لیے وہ بھلے پاگل ہے پر ان کی اولاد تھا خود سے بڑھ کر پیارا۔یہ سوچ کر کہ اس کا خیال رکھنے والے، دنیا کے سرد گرم سے بچانے والے اللہ کے بعد صرف اس کے ماں باپ ہی ہیں اور آج اگر ان دونوں کو کچھ ہوجاتا تو وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔بے شک شمشیر خان کی طرح وہ اکلوتی نہیں تھیں۔ان کا میکا بھرا پُرا اور سلامت تھا مگر زمین جائداد جہاں آجائے وہاں رشتے داری بھی لالچ، طمع اور خوشامد کی مرہونِ منت ہوجاتی ہے اور بس۔

''میں یہ سوچتی ہوں، آج اگر ہمیں کچھ ہوجاتا ہے تو پھر کون ہے جو اس کی دیکھ ریکھ کرے گا؟'' ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔

''اللہ حیاتی دے بلال کو، تم دیکھتی نہیں ہو جان چھڑکتا ہے اجلال پر۔'' شمشیر خان کے لہجے میں حلاوت گھل گئی۔بلال، اجلال سے چھوٹا تھا۔

''بے شک لیکن اپنی اولاد کے سامنے ماں باپ بھی نظر نہیں آتے بہن بھائی کیا چیز ہیں۔آج بلال 'بھائی کو پوچھتا ہے کیونکہ ہم اس کے سر پر ہیں کل کلاں کو ہم بھی نہ رہے اور بلال خود صاحبِ اولاد ہوگیا تو پھر یہی بھائی آنکھوں میں چبھنے لگے گا۔''

''وہم ہیں تمہارے۔'' شمشیر خان کا لہجہ پست تھا۔زہرہ خاتون کی دور اندیشی بالآخر انہیں تائید کے لیے مجبور کررہی تھی۔

''چلیں مان لیا بلال بڑے بھائی کو پیٹھ نہیں کرسکتا لیکن اس کی دلہن؟'' تلخی سے کہتے، کہتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔کیا بتاتیں ابھی دو، روز قبل جب وہ بلال کو اس کے کسی ملنے والے کی اطلاع دینے کے لیے گئیں اور کمرے کے دروازے پر ہی ٹھٹک گئیں اندر زرنگار کہہ رہی تھی۔

''مجھے اجلال سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' ان کی بھویں سکڑ گئیں اور بالکل ان کی طرح اندر زرنگار نے بھی بلال کی طرف سے کسی استفہامیہ لفظ کی توقع کی ہوگی مگر مایوس ہوکر مزید کہنے لگی۔

''بہت عجیب نظروں سے گھورتا ہے۔'' بے ساختہ زہرہ خاتون نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کہنے کو دماغ کا تھوڑا ہے پر جہاں چار عورتیں دیکھتا ہے وہاں عقل واپس آجاتی ہے۔دو کی چھ آنکھیں بن جاتی ہیں اس کی۔'' بہت جان جلاتا تجزیہ تھا۔زہرہ خاتون کی آنکھوں میں شرارے سے جلنے بجھنے لگے۔یہ ان کی پیاری بھتیجی تھی جسے وہ بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں اور جس کے اندر کا زہر آج افشا ہوا تھا۔

''اماں ......آپ......'' معاً عقب سے آواز ابھری تھی۔''یہاں کیوں کھڑی ہیں، اندر آئیں ناں۔'' بلال کو باہر سے آتا دیکھ کر وہ دھواں، دھواں چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گئیں۔دل بہر حال شانت ہوا تھا۔یہ سوچنا کہ زرنگار ایسی گل افشانی بلال کے سامنے کررہی ہے اور بلال چپ چاپ سنے جارہا ہے کسی اذیت سے بھی بڑھ کر تھا۔

''تمہیں بلانے آئی تھی کوئی ملنے آیا بیٹھا ہے۔'' بہ مشکل خود کو سنبھال کر وہ وجہ بیان کرپائی تھیں۔

''آپ سے پہلے وسائی آگئی تھی بلانے۔'' اس نے ملازمہ کا نام لیا تھا۔وہ سرہلاتی وہاں سے ہٹ گئیں۔زرنگار یقیناً فون پر مصروفِ گفتگو تھی۔یہ چھوٹی سی مثال تھی اس کے علاوہ بھی بہت کچھ آنکھوں کے آگے آشکار ہونے لگا تھا۔

''اجلال کے سامنے اوّل تو آتی نہیں، آبھی جائے تو ایسی ہوجاتی ہے جیسے کوئی بھوت نظر آگیا ہو۔میری گناہ گار آنکھوں نے نہیں دیکھا اس نے اجلال کے سامنے کبھی روٹی پانی رکھا ہو میں خود اس کا دھیان رکھتی ہوں۔آج اگر میں مرجاؤں تو میرے بچے کا یہ دانہ پانی بھی بند کردے اتنا تو کِھن کھاتی ہے۔'' اور اب ٹھیک انہی خدشات کا تذکرہ وہ شوہر کے آگے کررہی تھیں۔

''کِھن کھانے کی بات نہیں نیک بخت، دیور بھابی کا رشتہ ہوتا ہی نامحرموں والا ہے۔''

''ارے شریعت اُسے اجلال کو دیکھ کر یاد آتی ہے؟'' ان کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔

''بس آپ اجلال کے لیے کریں کچھ۔مجھے آنے والا وقت ڈراتا ہے۔اجلال کے اپنے بیوی بچے ہوں گے تو پھر پروا نہیں۔'' شمشیر خان اس نہج پر سوچنے کے لیے مجبور ہو ہی گئے۔

☆☆☆

''اجلال کی شادی......'' زرنگار نے سنا تو کتنی ہی دیر یقین کرنے میں متامل رہی۔

''ہاں۔'' زہرہ خاتون کا اطمینان قابلِ دید تھا۔زرنگار کے چہرے پر مٹتے ابھرتے سائے انہیں بہت کچھ باور کروارہے تھے۔

''لیکن پھپو......'' زرنگار کو ردِّعمل چھپانے میں مشکل ہورہی تھی۔

''کیوں، وہ مرد نہیں ہے کیا؟'' زہرہ خاتون نے گویا تمسخر اڑایا۔

''آپ جانتی ہیں وہ کیسا مرد ہے؟'' تب زرنگار نے بھی مصلحت، مروت بالائے طاق رکھ کر دوٹوک

کھجور کھائیے فیض اٹھائیے

ماہِ رمضان کی آمد آمد ہے۔اس میں کھجور کی بہار ہوتی ہے کیونکہ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔

☆ رات بھر بھیگے ہوئے کھجور کا پانی نہار منہ پینے سے جسم کی غلیظ رطوبتیں صاف ہوتی ہیں۔

☆ کھجور کے ذیلی اثرات کو دور کرنے کے لیے دو بادام اور چٹکی بھر خشخاش معتدل اثر رکھی ہے۔

☆ صنوبر کے بیجوں کے ساتھ کھجور جگر کے لیے مزید مقوّی ہوجاتی ہے۔

مرسلہ: فضہ بتول: بہارہ کہو

☆☆☆

بات کی۔ ”ایسے کو کون بیٹی دے گا سوچیں ذرا؟“

”میں نے سوچ لیا اور میں خود اپنے بچے کے لیے لڑکی دیکھوں گی۔“

”آپ کیوں اس لڑکی اور ہم سب کے لیے امتحان کھڑا کرنا چاہ رہی ہیں؟“

”کھل کر بات کرو، تم کیوں اعتراض کر رہی ہو؟“

”کھل کر ہی کہہ رہی ہوں۔ ایک اجلال نہیں سنبھالا جاتا اس کے بیوی بچے کیسے سنبھلیں گے۔ اجلال اپنی خود کی نہیں کر سکتا بیوی بچوں کی کیا کرے گا۔ ہمارے ہی اوپر ان کا گناہ ثواب......“ زرنگار نے اعتراض گنوائے تو رکنے میں نہ آئی۔ زہرہ خاتون کا اشتعال... اس کے ہر اعتراض پر بتدریج بڑھتا گیا۔ زرنگار ایسا بھی سوچ سکتی ہے وہ توقع بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ سچ ہے اپنے بھی مصیبت کے وقت ہی اصلیت دکھاتے ہیں اور وہ نہیں جانتی تھیں کہ زرنگار کی مزید کس، کس سوچ پر پانی پھرنے والا ہے۔

بلاشبہ بلال سے زیادہ اجلال کے نام جائداد تھی۔ شمشیر خان جو نئی زمین یا دکان خریدتے اجلال کے نام کرتے جاتے۔ اب زرنگار منہ سے کہہ کر کیوں بری بنتی۔ اسے یقین تھا کہ دل کے مریض شمشیر خان اور زہرہ خاتون نے ویسے ہی نہیں رہنا پھر اس پاگل کو زمین جائداد کی کیسی سمجھ۔ بڑی آسانی سے بڈھوں کے مرنے کے بعد وہ سب زرنگار کی ہی اولاد کو منتقل ہو جانا تھا مگر......اجلال کی شادی کے بعد ایسا ہوتا تو کیا اس کا تصور بھی بیکار تھا۔

☆☆☆

”مگر زرنگار چچی ٹھیک تھیں۔ میرے باپ کے لیے لڑکی ڈھونڈنا مسئلہ ہو گیا تھا۔

بے شک وہ جاگیرداروں کی اولاد تھا۔ اس کا باپ علاقے کے چیدہ چیدہ سرداروں میں سے ایک تھا مگر یہ ساری خوبیاں پس منظر میں چلی گئیں۔ سب کو نظر آیا تو صرف اس کا پاگل ہونا۔ جائداد، زمین کے لالچ میں کوئی اپنی بیٹی دے بھی دیتا تو زرنگار کی شکل میں ایک خطرہ سامنے آ کھڑا ہوتا۔ ساس، سسر کی زندگی کتنی رہنی تھی بعد میں اجلال کی بیوی نے زرنگار اور اس کے بچوں کی ہی چاکری کرنی تھی۔ زرنگار جیسی تیز طرار اور خاندانی بہو کے سامنے بھلا اجلال کی بیوی کی کیا وقعت ہونی تھی۔

یوں خاندانی، حسب نسب والی لڑکی تو کیا ہی ملتی اپنے مزارعے بھی پیچھے ہٹ گئے۔ تب پھر ابا کے لیے علاقے سے باہر کسی چھوٹی سی بستی کی لڑکی ڈھونڈ ہی لی گئی اور یہاں بھی میری بدنصیبی......میری ماں ایک معصوم، ناسمجھ اور بھولی سی لڑکی نکلی۔ جس کا نصیب میرے باپ کے ساتھ اس وجہ سے جُڑا کہ اس کی ماں سوتیلی تھی اور سوتیلی ماں نے بیٹی کے لیے خیر کی بات کہاں سوچنی تھی۔ اسے تو بیٹی کے بدلے زیادہ ان پیسوں کی مہک نے لُبھایا جو اسے بیٹی کے عوض میرے دادا، دادی نے دیے۔“

☆☆☆

”تمہارے کالج میں نئے ایڈمیشنز ہوئے ہیں؟“ پورا ایک ہفتہ بڑی جانفشانی سے نوریا کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کے باوجود بھی دل کی مراد بر نہ آئی تو شرم، جھجک کو لات مار کر بابر بہن سے پوچھنے لگا۔ یہ چھٹی کا وقت تھا اور نوریا نے قریب ہی موجود ریڑھی والے کو گنے کے جوس کا کہا تھا۔ خلافِ معمول بابر اس کی اس حرکت پر تاؤ میں آنے کے بجائے خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے بیٹھا رہا۔

”ہاں ہوئے تو ہیں۔“ نوریا نے نقاب سرکا لیا تھا۔

”میرے ایک جاننے والی کی بہن نے بھی ایڈمیشن لیا ہے۔“ جھوٹ بولنے میں بابر کو ملکہ حاصل تھا۔ کہانیاں گھڑنے میں ماہر۔ ”تم جانتی ہو گی اسے؟“

”کسے؟“ نوریا کو جوس کا انتظار تھا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے ابھرے پڑے تھے۔ بابر کی بات بھی بے توجہی سے سنی۔

”میرے دوست کی بہن کو جس کا ایڈمیشن ہوا ہے۔“ بابر نے خون کا گھونٹ نگلا تھا عین اسی پل جوس کا گلاس بھی آ گیا یعنی آج پھر دید نامراد رہی اب انہیں یقیناً واپسی کرنی تھی۔ بابر کے دل پر اوس گرنے لگی۔

”مجھے الہام تو نہیں ہوتے کہ فلاں لڑکی تمہارے دوست کی بہن ہے۔ عجیب بات کر رہے ہو۔“ نوریا بھی اس کی بہن تھی بدلحاظی و بے مروتی کا اعلیٰ نمونہ......کہہ کر جوس پینے لگی۔

”اونچی لمبی سی ہے، بہت گوری اور بہت حسین۔ ہمارے علاقے کی نہیں لگتی ارے......“ بات کرتے کرتے بھی چاروں طرف نظریں دوڑانا مفید رہا۔ وہ سینے سے فائل لگائے بیگ لٹکائے تھکی، تھکی سی شکل کے ساتھ گیٹ سے باہر آ رہی تھی۔ آج بھی اس کے میرون کپڑوں میں سیاہ رنگ کا امتزاج تھا۔ اس نے شیفون کا میرون دوپٹا سر پر لے رکھا تھا۔

”وہ رہی۔“ بابر کے جوش نے نوریا کا کام تمام کر دیا۔ جوس کپڑوں پر گر گیا تھا۔

”توبہ ہے۔“ ٹشو سے دوپٹا اور عبایا پونچھنے کے ساتھ اس نے بابر کی نظروں کا تعاقب کیا اور عجیب سی شکل بنالی۔

”یہ......خوش بخت......“ اسے کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں، ہاں یہ۔“ بابر کو گویا گوہرِ مقصود مل گیا۔

”تم ملی ہو اس سے؟“

”نہیں۔“ ناگواری و ناپسندیدگی نوریا کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ ”بہت مغرور ہے، ہر وقت چپ رہتی ہے۔ میں نے اسے کسی کے ساتھ بھی بات کرتے نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کس بات کا غرور ہے۔ دیکھو تو سہی بغیر برقع، چادر کے آتی ہے...پگلے سے دوپٹے میں، بے حیا نہ ہو تو۔“ صاف لگ رہا تھا لڑکی نے نوریا کو بھی گھاس نہیں ڈالی۔ اس کا لہجہ ٹھیک ٹھاک حاسدانہ تھا۔

”خوش بخت۔“ بابر نے دل میں دُہرایا۔ ”چلو کچھ تو ہاتھ آیا تھا، نام ہی سہی۔“

☆☆☆

اور زرنگار غلط نہیں تھی۔ اجلال کی شادی نے ان کے لیے امتحان کھڑے کر دیے۔ وہ جو سوچ رہی تھیں کہ بیوی کے آ جانے سے اجلال کو لگام مل جائے گی۔ وہ گھر میں ٹکنے لگے گا تو غلط سوچتی تھیں۔ سمیعہ میں وہ گُن تھے ہی نہیں جو اجلال جیسے شوہر کو سنبھال، سُدھار یا قابو کر سکتی۔

”بیٹا، اجلال کہاں ہے؟“ وہ پوچھتیں۔

”پتا نہیں۔“ سمیعہ غیر حاضر دماغی سے جواب

دیتی۔ ان کی جان جل کر رہ جاتی۔ حد تو یہ تھی کہ اجلال دو راتیں پوری گھر سے غائب رہا اور سمیعہ نے پرواہی نہیں کی۔

''سمیعہ دھی...... بیویوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔ پتر تو سجا بنا کر، اجلال کی پسند کے کھانے بنایا کر۔ اس کا دل بہلے گا تو وہ تیرے پاس زیادہ وقت گزارے گا۔'' پہلے بیٹے کو سمجھاتی تھیں اب ڈبل ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ بہو کو بھی سمجھانا پڑ رہا تھا۔

''جی اچھا۔'' اور سمیعہ کا رٹو طوطے جیسا جی اچھا وہ سمجھ چکی تھیں۔ سمیعہ کو صرف جی حضوری کرنا آتی ہے کسی بے زبان جانور کی طرح وہ ان کی یا زرنگار کی ہر بات مانتی چلی جاتی۔ اس کی اپنی کہیں کوئی مرضی نہیں ہوتی۔

وہ بھولی نہیں تھی وہ کم دماغ بھی نہیں تھی۔ محض سوتیلی ماں کے کریہہ سلوک کا شکار تھی۔ اس کی شخصیت کو مسخ کرنے میں ان کے تشدد اور خوف کا بھی بہت ہاتھ تھا۔

☆☆☆

''ڈیڈی۔'' بالآخر ڈاکٹر سے کمرے میں جانے کا اجازت نامہ مل گیا تھا وہ بھاگتی ہوئی گئی اور ان کے سینے سے جا لگی۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹے۔'' ڈیڈی اس کا سر تھپکتے رہے۔ اس سے آنسو روکنا محال ہو رہا تھا۔ ''خوشی، میں ٹھیک ہوں، سوئٹ ہارٹ۔'' اس کی سسکاریاں بدستور جاری رہیں۔

''میرے ڈیڈی ٹھیک ہیں ناں؟'' ڈیڈی کے سینے سے سر اٹھا کر وہ قریب کھڑے ڈاکٹر سے یوں پوچھنے لگی جیسے ڈیڈی کی بات کا یقین نہ ہو۔ ڈاکٹر ہمسایوں کے لڑکے زبیر کی مہربانی سے آئے کھڑے تھے اور اس کے شکی لہجے پر مسکرا رہے تھے۔

''آف کورس بیٹا، آپ کے ڈیڈی ٹھیک ہیں۔'' وہ مطمئن ہوئی یا نہیں ڈیڈی سے الگ ضرور ہوگئی۔

''آپ مجھے نسخہ دیجیے۔''

''وہ میں نے زبیر کو دے دیا ہے۔ وہی میڈیسنز لا دے گا۔ اوکے بیٹا، پریشان مت ہوں اور ڈیڈی کو کریں۔ اپنے ڈیڈی کا خیال رکھیں بس۔'' ڈاکٹر الوداعی کلمات کہتے رخصت ہوگئے۔ وہ انہیں بیرونی دروازے تک چھوڑنے گئی۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے صحن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ صحن میں قدم بھی نہ دھرتی مگر اس وقت سب ڈر، سب خوف ختم ہوگئے تھے۔ وہ بھاگ کر کمرے میں آئی۔ ڈیڈی تکیے سے لگے آنکھیں موندے ہوئے تھے۔ وہ وہیں جم سی گئی۔ زرد رنگت کے ساتھ وہ بالکل ایک دم سے کمزور نظر آنے لگے تھے۔

''خوشی...... میرے پاس آؤ بیٹا، رک کیوں گئیں؟'' وہ جاگ رہے تھے۔ خوشی چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے بالکل قریب جا بیٹھی۔

''ڈیڈی ٹھیک ہیں جان۔'' وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے گویا یقین دلا رہے تھے۔ خوشی کے آنسو پھر سے بہنے لگے۔ ''خوشی نہیں بیٹے...... یہ کیا؟'' وہ تڑپ کر اس کے آنسو صاف کرنے لگے۔

''پھر آپ کو درد کیوں ہوا؟ آپ...... آپ بے ہوش کیوں ہوئے؟ ڈاکٹر کے آتے ہی مجھے روم سے باہر کیوں بھیج دیا؟'' وہ ان کے سینے سے لگی چھوٹے بچوں کی طرح روتی جا رہی تھی، بولتی جا رہی تھی۔

''مجھے درد تو بالکل کہیں نہیں ہوا۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا اور بے ہوش میں اس لیے ہوا کہ کام کا اسٹریس شاید زیادہ بڑھ گیا۔ گھر ڈھونڈنا، خریدنے کے مراحل پھر آپ کا ایڈمیشن، آپ کو پک اینڈ ڈراپ کرنا...... یار انسان ہوں وہ بھی کمزور سا، طبیعت اتنا کہاں سہار سکتی ہے۔'' وہ چپ چاپ ڈیڈی کی توجیہات سنتی رہی۔ چہرے پر ثبت پریشانی کے اثرات ہنوز برقرار رہے۔

''اچھا...... چلیں کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یہ بتائیں میرا بیٹا آج مجھے کیا کھلا رہا ہے؟'' ان کی حتی المقدور کوشش تھی خوشی کو اس فیز سے نکالنے کی مگر اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ اس ہستی کا اتنا شدید بیمار ہونا کہ بے ہوش ہو جائے جو اس کے لیے لازم و ملزوم تھی اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔

''اوہو...... میرا بزدل بچہ۔'' ہنستے ہوئے انہوں نے اسے خود سے لگا لیا تھا تب تک تھپکتے رہے جب تک کہ اس نے جی بھر کر رو نہیں لیا۔

☆☆☆

''تم آج واپس جا رہے ہو؟'' اسے یقین تھا یہ سوال پھپھو نے کرنا ہے اور ناشتے کی میز پر کرنا ہے۔ جب بابا بھی موجود ہوں۔ بابا نے استفہامیہ اسے دیکھا تھا اور یہی پھپھو چاہتی تھیں۔ پتا پھینک کر وہ یوں ہوگئیں جیسے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

''جی۔'' بے نیاز نظر آنے کی کوشش کرتا وہ ناشتے میں مگن رہا حالانکہ جانتا تھا کہ بھی نفوس کا مرکزِ نگاہ وہ بن چکا ہے۔

''تم یہاں پوسٹنگ کیوں نہیں کروا لیتے؟'' بابا کی بھاری، پاٹ دار آواز ابھری تھی۔ وہ بدستور ناشتے میں مشغول رہا۔

''ابھی ممکن نہیں ہے۔''

''چھٹیاں تو ممکن ہیں؟''

''وہ میں گزار کر جا رہا ہوں۔''

''دو چھٹیوں کی بات نہیں کر رہا میں۔'' اس کا بے پروا انداز ڈیڈی کو کھل ہی گیا۔

''تمہاری دادی اور پھپھو کا خیال ہے اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔'' ناشتا بھی ہو چکا تھا یعنی مزید بے نیازی ظاہر کرنے کا بہانہ ختم۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے کے بعد اس نے دادی، پھپھو اور آخر میں نورا کو دیکھا جو شرمائی، شرمائی سی لگی۔

''شکر ہے کسی کو خیال آیا۔ تمہاری گاڑی آگے

دکھ

دکھ اس بات کا نہیں ہے
کہ
رشتے کیوں ٹوٹ گئے ہیں
دکھ تو اس بات کا ہے
کہ
میرے اپنے
پاکیزہ رشتوں کو پامال کر رہے ہیں
اور
جب رشتوں کو پامال کیا جاتا ہے
تو
اس سے دل بھر جاتا ہے!

شاعرہ: ایمان زہرا شیرازی
ڈھڈیال، ضلع چکوال

بڑھے گی تو میری اسٹارٹ ہوگی۔'' بابر کی سرگوشی پر وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

''فی الحال آپ بابر کی کر دیں۔ میرا نہ تو موڈ ہے اور نہ فرصت۔'' وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ بابا کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔

''شاہجہاں!'' اور یہ بھی معلوم تھا پیچھے سے پھپھو نے پکارنے کا فریضہ ضرور انجام دینا ہے۔ جلتی آگ کو مزید بھڑکانے میں انہیں لطف ملتا تھا۔

''اللہ حافظ!'' وہ ناگواری سے کہتا ڈائننگ ہال سے نکل گیا۔

☆☆☆

دادی بتاتی تھیں۔ کچھ مہینوں کے فرق سے میں اور شجاع آگے پیچھے پیدا ہوئے۔ تب شجاع سے زیادہ میری یعنی شہباز کی پیدائش پر خوشیاں منائی گئیں کیونکہ تب بہت مشہور تھا کہ اجلال جو بچپن میں للو مشہور تھا کی اولاد بھی اجلال جیسی ہی ہوگی اور

دادی، دادا سخت خوف زدہ تھے۔ باقاعدہ میری اماں کو ابارشن کے مشورے دیے جاتے رہے۔
''ارے ایک پاگل کافی نہیں ہے جو دوسرا بھی پیدا کرنے چلیں۔'' زرنگار چچی قیمتی مشوروں کے ساتھ نمایاں ہوتی تھیں اور پھر مجھ اچھے بھلے کی پیدائش پر دادی کے بقول زرنگار چچی کو سانپ سونگھ گیا۔ میں نے .... سارے نقوش اپنے دادا سے چرائے تھے۔ شکل، صورت اور صحت میں بھی شجاع سے بہتر۔ ایسے میں چچی کی خاموشی جائز تھی۔ دو سال بعد شجاع کی بہن زرجبیں پیدا ہوئی جو بچپن ہی سے زرنگار چچی کی ڈپلی کیٹ ثابت ہوئی۔ انہی کے جیسی ضدی، اکھڑ اور بدتمیز۔

☆☆☆

سب انتظامات ہوگئے تھے اور اب یہاں سے روانگی باقی تھی۔ وہ اندر کہیں کسی کمرے میں گم تھی۔ بلانے کے لیے انہیں خود کمرا کمرا جھانکنا پڑا۔ وہ انہیں ڈیڈی کے کمرے میں ہی مل گئی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، لٹی پٹی اور اجڑی، اجڑی۔ خود ترسی کی انتہا کو چھوتی زار و زار روتی۔ ان کے دل کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے یہاں تھے اور انہیں وہ مسلسل روتی ہی نظر آئی۔ ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھیں خشک نہیں ہوئی تھیں۔ وہ آنے کے ساتھ ہی الگ مصروفیت میں گھر گئے تھے۔ اس کی طرف وہ توجہ نہیں دی جو دوست کو دے رہے تھے اور اب جب دھیان اس کی طرف کیا تو جیسے دل سکڑ کر رہ گیا۔ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ اپنی قیمتی متاع کھو چکی تھی۔

ڈیڈی کبھی نہ آنے کے لیے چلے گئے تھے۔
''خوشی بیٹا۔'' اس کے سر پر ہاتھ رکھے وہ جیسے الفاظ تولنے لگے۔ آج نہ دلاسے کام آنے تھے، نہ ہمدردی۔ آج وہ گریہ کرنے میں حق بجانب تھی اور نڈھال تو وہ خود بھی بہت ہو رہے تھے۔ بے حسی .... بے نیازی کا جو خول وہ اپنے گرد تانے رکھتے تھے اس میں آج دراڑیں پڑ ہی گئیں۔ ایک عرصے سے انہوں نے ان چاہی زندگی جی تھی اس زندگی کا حساب کتاب کرنے کا وقت آیا تو جیسے مہلت گزر گئی۔

''وقت بہت ہوگیا۔'' وہ دھند آلود نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔ وہ جو اجنبی سے شناسا ہو چکے تھے۔
''نہیں...... وقت تو ٹھہر گیا ہے۔'' اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ دل چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔
''آپ اپنی چھوٹی موٹی چیزیں سمیٹ لیں۔ باقی سامان بعد میں اٹھوالیں گے، دیر ہو رہی ہے۔'' وہ اس سے نظریں چرا کر یہ سب کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

اس کی زندگی میں خزاں آگئی تھی۔ سبک خرام شب و روز قیامت کی نذر ہوگئے تھے۔ یقیناً زندگی اسے ہی کہتے ہیں۔ دکھ اور سکھ کا سنگم مگر اس کی تو جیسے دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ وہ بے سائباں ہو چکی تھی۔
''خوش بخت خان...... آپ کو......'' اپنی ذاتی اور ضروری چیزیں سمیٹتے مخصوص جملے کی بازگشت خالی دماغ پر ہتھوڑا بن کر برسی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی گھٹی، گھٹی سسکیاں بھرتی فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو اور ابھی ڈیڈی کی پُرشفقت آواز اس کے سوئے ہوئے دماغ کو جھنجوڑنے کا باعث بنے گی۔
''خوش بخت بیٹے، نماز ٹائم...... گیٹ اپ ہنی شاباش۔'' یا پھر نماز کے بعد وہ جب دوبارہ سو جاتی تب۔
''لگتا ہے آج فاقہ کرنا پڑے گا۔ نو ناشتا...... نو چائے۔'' وہ سیکنڈوں میں بستر چھوڑ دیتی اور اب وہ آواز ہی نہیں...... وہ خود بھی خواب ہوگئے تھے۔
''چلیں بیٹا۔'' وہ شاید باہر جانا بھول بیٹھی تھی۔ انہیں پھر سے آنا پڑا۔ وہ آنکھیں رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کی ہمراہی میں صحن عبور کرتے ہوئے گویا قدم چلنے سے انکاری ہوگئے۔ ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا تھا یہاں آئے۔ کل کی بات لگتی تھی جب وہ ڈیڈی کے سامنے منہ بسور، بسور کر اس گھر میں نقص نکال رہی تھی اور اب اسی گھر کو چھوڑتے ہوئے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایسا تو اپنا پہلا گھر چھوڑتے ہوئے بھی نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ تب ڈیڈی ساتھ تھے اور اب وہ نہیں تھے۔

اس گھر کو ڈیڈی نے اپنے ہاتھوں سے محبت سے سجایا تھا۔ اس کے کونے، کونے پر اُن کی توجہ و محبت کے نقش ثبت تھے۔ وہ اسے چھوڑتے ہوئے جتنی بھی آزردہ ہوتی کم تھا۔

گیٹ پر زبیر بھی موجود تھا۔ وہ شام سے ہی یہیں تھا۔ زبیر نے گیٹ کو تالا لگا کر جب چابی اس کے حوالے کی تو وہ جگہ اور وقت کا لحاظ کیے بغیر زور، زور سے رونے لگی تھی۔ ایسے میں زبیر کے ہی نہیں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑے بابا کے بھی آنسو نکل آئے۔
''ہم آتے جاتے رہیں گے یہاں انشاءُاللہ ......اور یہ لڑکا ہے ناں گھر کا خیال رکھے گا۔'' وہ اس کا ہاتھ سہلاتے رہے۔
''جی...... جی خان جی۔'' زبیر بے حد عقیدت سے بولا تھا۔ خوشی کی عزت وہ پہلے بھی کرتا تھا۔ آج یہ جان لینے کے بعد کہ اس کا حوالہ سامنے کھڑی ہستی سے جا ملتا ہے وہ باقاعدہ رعب میں آیا کھڑا تھا۔

ہر مشکل ہر ضرورت کے وقت دستیاب ہو جانے والا زبیر آج بھی کام آگیا۔ سرِشام جب ڈیڈی کی طبیعت خراب ہوئی۔ وہ گھن گرج مچاتے بادلوں اور برستی بارش کی پروا کیے بغیر زبیر کے گھر بھاگی تھی۔ زبیر فوراً ساتھ ہولیا مگر اس کی یہ نیکی کام نہ آئی۔ ڈاکٹر مسرور اتوار کے اتوار اس گاؤں آیا کرتے تھے اور آج اتوار نہیں تھا اور شہر جانے کے لیے گاڑی چاہیے تھی۔ جس کا انتظام کرنے سے

زیادہ ضروری تھا خوشی کا مستقبل محفوظ کرنا۔ ڈیڈی کی ضد پتھر پر لکیر ثابت ہوئی۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں موجود جس نمبر کو مارک کر کے وہ روزانہ اس پر انگلی پھیر، پھیر کر نہ جانے کیا محسوس کرتے تھے، آج اسے ڈائل بھی کرلیا تھا۔

دفعتاً ہارن کی تیز آواز نے اس کے حواس جگائے۔ کیچڑ ہونے کی وجہ سے شاہجہاں کی پولیس موبائل عین ان کے سر پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس درجہ نزدیک ہونے کے باوجود بھی یوں ہارن بجا کر انہیں متوجہ کرنا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ تنگ آ چکا ہے۔ خوشی نے عقبی سیٹ کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ جہاں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے شاہجہاں کی نظریں ونڈ اسکرین تو فرنٹ سیٹ پر ہونٹ بھینچے بیٹھے بابر کی نظریں مرر میں نظر آتے خوش بخت کے عکس پر تھیں۔

☆☆☆

اس کے روئے، مرجھائے، ہوش ربا چہرے پر جب، جب نگاہ پڑتی بابر کی آنکھوں میں مرچیں بھر جاتیں۔ دل کرتا اسی کی طرح وہ بھی دہاڑیں مار مار کر روئے حالانکہ اس وقت اسے خود پر ہنسنا چاہیے تھا۔

''تو شاہجہاں صاحب...... انجانے میں ہی سہی آپ نے ایک بار پھر میدان مار لیا۔'' اور یہ نئی بات نہیں تھی۔ شاہجہاں ہمیشہ اسے مات دیتا آیا تھا۔ ایسا اس زمانے سے ہوتا آیا تھا وہ جب سارا سال کتابوں میں منہ دیے رہتا اور جب رزلٹ نکلتا۔ شاہجہاں ٹاپ پر ہوتا۔

''کیوں...... کیسے؟'' کی رٹ میں پکڑتا وہ کئی کئی دن تک کُلستا رہتا پر جب عملی زندگی میں قدم رکھنے کے دن آئے تب بھی شاہجہاں سرخرو رہا۔ انٹرویو میں بابر ناکام رہا حالانکہ پھپھو جیسے لٹھ لے کر بابا کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔

''دنیا میں لوگ کیا کچھ نہیں کر رہے۔ تم ایک سفارش نہیں کروا سکتے۔'' مگر بابا نے ایک چپ سو سکھ والی بات پر عمل کر رکھا تھا۔ نہ بیٹے کی اور نہ بھانجے کی۔ انہوں نے سفارش کا مزہ دونوں سے دور رکھا۔

''آج ایک جگہ سفارش کروں گا کل کو دس جگہ اور کرنی پڑے گی۔ غلط سوچ پروان مت چڑھاؤ ان میں۔ اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنے دو۔'' ان کے دوٹوک انکار نے پھپھو کو کئی دن تک بے سکون رکھا تھا۔

''اور آج ایک بار پھر......'' شاہجہاں کی طرف دیکھا تو بابر کا تازہ، تازہ زخم رِسنے لگا۔

شام میں جب وہ دوستوں کے ساتھ ہلا گلا کرنے کے خیال سے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بابا نے پیغام بھجوایا۔

''فوراً میرے پاس آؤ۔'' اس پر کوفت حملہ آور ہوئی تھی۔

''اولڈ مین کو بھی سکون نہیں۔'' وہ بے دلی سے باہر نکلا تو بابا ہال کمرے میں ہی مل گئے۔

''گاڑی نکالو ہمیں جانا ہے کہیں۔'' وہ پوچھنا چاہتا تھا۔

''اس بارش میں؟'' مگر بابا کے چہرے پر کچھ ایسے برفیلے تاثرات تھے کہ وہ جی ماموں کہتا حکم کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑا۔ سارا راستہ پوچھنے کے لیے ہمت جمع کی۔ ''جا کہاں رہے ہیں؟'' مگر ماموں کی کرخت سنجیدگی آڑے آتی رہی۔

''تیز چلاؤ...... اور تیز۔'' اس شدید بارش میں ایسا حکم... بابر کا تجسس آسمان تک جا پہنچا۔ عام روٹین میں جن کے ساتھ ڈرائیونگ امتحان بن جایا کرتی کہ وہ کچھوے کی رفتار سے گاڑی چلواتے تھے۔ آج پتا نہیں کیا کھائے بیٹھے تھے۔ راستہ انجان اور منزل حیران کن۔

جس کچی اینٹوں کے مکان میں وہ دونوں بے تکلف داخل ہوئے۔ وہاں بستر پر موجود کمزور دو بیمار وجود کو اور ان کی پائنتی سے لگی اس ماہ جبیں کو دیکھ کر وہ ساکت ہو گیا۔ تمنا پوری ہوئی تھی پھر بڑا جذباتی ملن کا سین ہوا۔

''دونوں اولڈ بابے آپس میں کیا ہیں؟ کب کے بچھڑے ہیں اور کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' اس سب سے بے نیاز بابر بلیوں اچھلتے دل کو سنبھالتا اسے دیکھتا رہا بس۔

''بابر، اس لڑکے کو لے جاؤ اور قاری مبشر کو بلاؤ۔''

''جی ہے،'' قطعی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا قصہ ہے۔

''فوراً جاؤ اور فوراً آؤ...... میرا کہنا کہ بلا رہے ہیں۔'' بابا اپنا حکم سنا کر خوشی کے ڈیڈی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''اوہ۔'' تھی تو یہ بڑی غلط حرکت مگر بابر کا دل یہیں بھنگڑا ڈالنے کو کرنے لگا اور کچھ نہیں تو خوشی کے قریب المرگ ڈیڈی کا منہ چومنے کی منہ زور خواہش نے سر اٹھایا کہ جن کی مہربانی سے فلمی سین ہونے جا رہا تھا۔

دل کو بہ مشکل قابو کرتا بابر، زبیر کے ہمراہ طوفانی بنیادوں پر قاری مبشر کو لے آیا۔ بابا موبائل کان سے لگائے باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ قاری سے سلام دعا کے بعد اس سے بولے۔

''میرا نیٹ ورک خراب جا رہا ہے، اپنا فون دو۔'' وہ اب بھی نہیں سمجھا کہ کیا قصہ ہے اور جب انہوں نے شاہجہاں کو سخت ترین لہجے میں جیسے اور ابھی آ جانے کا کہا تو وہ تب بھی لاعلم رہا۔ وہ تو جب شاہجہاں کے آتے ہی قاری مبشر ہوشیار ہو گئے۔ تب سین سمجھ میں آیا مگر تب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے دنیا جہان کی کرختگی، نفرت، بیزاری منہ پر سجائے شاہجہاں کا نکاح روتی دھوتی، نڈھال خوش بخت سے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ کون ہے؟'' نہایت تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں جاتے بابر پر اچٹتی نظر ڈالنے کی بعد دادی نے حیرانی دکھائی...... جبکہ سوال پھپھو کی زبان سے برآمد ہوا۔ ان کی چھٹی حس لال سگنل دینے لگی تھی۔ پہلے شاہجہاں کی پولیس موبائل کے ہارن نے چونکایا تھا۔

''اللہ خیر...... ابھی تو یہ گیا تھا۔'' دونوں ماں، بیٹی ہولتی ہوئی لاؤنج تک آئیں۔ جہاں کا منظر الگ ہی نوعیت کا تھا۔

''یہ......'' بابا نے سمٹی سمٹائی خوش بخت کو نظر بھر کر دیکھا۔ ''خوش بخت ہے۔'' اس ایک جواب سے کہاں تسلی ہونی تھی۔

''اچھا...... پر ہے کون؟'' پھپھو کی آنکھیں اُسی پر ٹکی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس پر کسی بھولے بسرے چہرے کا گمان ہو رہا تھا۔

''میری بہو۔'' شاید یہی بہت جامع تعارف تھا۔ پھپھو اور دادی کو لگا انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''شاہجہاں کی بیوی!'' بابر کی بیوی بھی ان کی بہو کہلانی تھی۔ سو کسی کو مغالطہ نہ رہے انہوں نے خوشی اور اپنے رشتے کو مزید تقویت دی۔ پھپھو کا دل ڈوبنے لگا۔

''یہ کیسے...... م...... مطلب تم سچ کہہ رہے ہو؟ یہ اتنی بڑی بات...... شاہجہاں تو آج ملتان گیا تھا۔''

''میں نے اسے واپس بلوالیا، نکاح کے لیے۔'' اب کے دادی صوفے پر گر سی گئیں۔ پھپھو کا الگ برا حال تھا۔

''کیوں...... کون ہے یہ؟ ایسی کون سی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ ہائے میری جان نکل رہی ہے۔'' اور وہ جو قدرے خوش گمان ہو رہے تھے کہ خوشی کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ یہ ردِعمل دیکھ کر سپاٹ سے ہو گئے۔

''آپ دونوں نے جو سنا صحیح سنا، خوشی میری بہو ہے۔ اس کا ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اپنی موجودگی میں شاہجہاں سے نکاح کروایا ہے۔ کسی کو معترض ہونے کی ضرورت نہیں۔ خوشی اس وقت توجہ

اور محبت کی......'' اور یہ پہلی بار ہوا تھا ان کی بات نہیں سنی گئی۔ پھپھو اور دادی شدید ناراضی کا ثبوت دیتی ان کی بات مکمل سنے بغیر وہاں سے ہٹ گئیں۔ بابا مارے استعجاب کے کتنی دیر ساکت کھڑے رہے۔

''آ جاؤ بیٹا، آپ کو کمرے تک چھوڑ آؤں۔'' پھر گہری سانس لیتے خوشی سے بولے۔ جو اپنے غم میں اس قدر نڈھال ہوئی کھڑی تھی کہ دادی اور پھپھو کے اس شاندار استقبال کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ اپنے بھاری ہوتے سر کے ساتھ وہ کھڑی بھی بہ مشکل تھی، سنتی کیا خاک۔

☆☆☆

"how dare you to come in my room?" کوئی اس کے عین سر پر آ کر نہ صرف غرایا بلکہ بڑی بے دردی سے جھنجوڑ کر اٹھا بھی دیا۔ وہ جو کمرے میں آنے کے بعد متواتر روتے، روتے انہی چند لمحوں کے لیے غنودگی میں چلی گئی تھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا آنکھوں میں قہر بھرے اسے نگل جانے کو آیا کھڑا تھا۔ سُن ہوتے دماغ کے ساتھ اسے یہ سوچتے ہوئے بھی کچھ وقت لگا کہ وہ ہے کہاں؟

''اٹھو یہاں سے اور دفع ہو جاؤ۔'' بدتمیزی کی انتہا تھی..... خوشی ہونقوں کی طرح اسے دیکھے گئی۔ ''میں کیا بکواس کر رہا ہوں، سنائی نہیں دے رہا؟ ابھی اور اسی وقت میرے کمرے سے نکل جاؤ۔'' اس نے کہا ہی نہیں خوشی کو بازو سے پکڑ کر بیڈ سے گھسیٹ بھی لیا۔ خوشی کے لیے نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔

''بہت بڑی حویلی ہے میرے باپ کی، تمہیں کہیں بھی جگہ مل جائے گی مگر میرے کمرے میں نہیں۔'' وہ شاید فطرتاً سنگ دل تھا۔ اپنے رحم و کرم پر کھڑی مظلوم لڑکی پر قہر برساتا ذرا بھی نہ ڈگمگایا۔

''مم...... میں...... کیسے؟'' خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔ یوں منہ اٹھا کر وہ کیسے کسی دوسرے کمرے میں جا سکتی تھی جبکہ ابھی آئے کچھ ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ ابھی تو حویلی کے راستے ہی نہیں مکین بھی اس کے لیے اجنبی تھے۔

''باپ کو مرے رات نہیں گزری اور لمبی تان کر سو گئیں۔'' وہ بڑبڑایا تھا۔

''جج...... جی۔'' خوشی سمجھ نہ سکی کیا کہا گیا ہے۔

''یتیموں کا والی میرے باپ کو بننے کا شوق ہے، مجھے نہیں۔ بے شک میں نے تم سے نکاح کر لیا لیکن مجھ سے کسی قسم کی بھی امید مت رکھنا کیونکہ میں ہر اُس انسان سے نفرت کرتا ہوں جو میرے بابا کی گڈ بک میں ہوتے ہیں۔'' بڑی بدلحاظی و بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتا وہ اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلنے لگا۔

''بات سنیں...... پلیز ویٹ...... میں......'' وہ بوکھلاتی، گھبراتی کہتی رہ گئی مگر شاہجہاں نے اسے کمرے سے نکال کر دروازہ بند کر لیا۔

''سنیں...... پلیز میں کدھر جاؤں؟'' وہ روہانسی ہوئی۔ دروازہ بجاتی رہی۔ ''پلیز اوپن دا ڈور...... میری بات تو سن لیں...... پلیز......'' مگر بے حسی...... میں وہ شاید بابا سے دس قدم آگے تھا۔ کان لپیٹے پڑا رہا اور کوئی جاگ نہ جائے وہ اس ڈر سے دروازہ بھی ہلکی آواز میں بجا رہی تھی۔

"ok just do me a favour to guide me to another room please." کوئی اور ہوتی تو شاہجہاں پر لعنت بھیجتی اب تک جا چکی ہوتی مگر ایک تو وہ فطرتاً بہت زیادہ معصوم اور ڈرپوک تھی۔ برے رویّوں سے اس کا کبھی پالا نہیں پڑا تھا کہ ردِعمل دکھاتی اور دوسرے اس وقت اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں کم ابدر کی گئی ہے۔

کافی دیر بعد جب شاہجہاں کو محسوس ہوا آوازیں...... آنا بند ہو گئی ہیں۔ کسی بھی ہمدردی یا خدا ترسی کو

دل میں جگہ دیے بغیر وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ ایک بار پھر ڈیپ ہوا تھا۔

''اگین...... اگین بابا نے اپنی مرضی کی...... میری خواہش، میری مرضی میرا کچھ بھی ان کے نزدیک کچھ نہیں۔ مجھے بے وقوف بنا لیا۔ میری زندگی مذاق بنا ڈالی۔'' پھٹتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ وہی کچھ سوچے گیا۔ جو ابھی سڑکیں ناپتے سوچتا آیا تھا۔ عجیب بات تھی۔ بابا کے مزاج سے اس درجہ واقفیت کے باوجود بھی وہ بڑی آسانی سے ان کے دام میں تب تب آ پھنستا جب، جب وہ جذباتی طور پر گھات لگاتے۔ آج بھی یہی ہوا۔

وہ جب ملتان پہنچا تھا وہاں بارش برس رہی تھی۔ اپنی سرکاری رہائش گاہ اسے دو دنوں کے بعد آنے پر کسی جنت سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ وہ شاید دنیا کا واحد انسان تھا جسے چھٹیاں بری لگتی تھیں۔ چھٹیوں میں اپنے گھر جانا برا لگتا تھا۔ وہاں دادی کی توجہ، پھپھو اور نوریا کا دورُخا پیار اور بابا کا سرد رویہ...... وہ ایک دن میں اوب جاتا۔ باقی کے دن انتہائی غیر دلچسپی سے گزار کر فوراً واپسی کی راہ لیتا۔ ان دنوں وہ ملتان میں ہوتا تھا جو اس کے گاؤں سے چار سے پانچ گھنٹے کے فاصلے پر واقع تھا۔

شدید بارش، سردی اور سفر کی تکان کچھ بھی سوچے بنا آج آتے ہی موبائل ساکنٹ پر لگائے سونے ہی لگا تھا کہ جب مجید کارڈلیس اٹھا لیا۔

''آپ کے گھر سے فون ہے؟'' شاہجہاں پر شدید ناگواری چھائی تھی، دوسری طرف بابا تھے۔

''تم فوراً واپس آؤ۔'' اس کے السلام علیکم پر انہوں نے واپس آ سکتے ہو کہہ کر پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا صرف حکم صادر کیا۔ شاہجہاں کے خون میں ابال آیا تھا سن کر۔

''ابھی......؟'' غصہ دبا کر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں ابھی۔''

''مگر میں ابھی تو یہاں پہنچا ہوں۔''

''جانتا ہوں۔'' ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سنجیدگی تھی۔ ''جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔ باقی بات بعد میں بتاؤں گا۔'' وہ پھر سے پھنس گیا۔ نہایت بے دلی سے چار گھنٹوں کا سفر طوفانی رفتار سے طے کرتا جب بابا کے بتائے پتے پر پہنچا تو بارش یہاں بھی جوبن پر تھی اور اسی حساب سے اس کی تھکن بھی۔ وہیں اسے کسی کی زندگی کے لیے قربان ہونا پڑا تھا۔

''اب خوش؟'' نکاح کے بعد بابا نے بسترِ مرگ پر لیٹے اس انسان سے کہا تھا جس کی جھلملاتی آنکھوں میں اطمینان ہی نہیں شاہجہاں کے لیے بیش بہا پیار بھی اُمڈ رہا تھا۔ جو اس کا ہاتھ کئی بار اپنے ہونٹوں سے لگا چکے تھے مگر وہ کیا کرتا۔ یہ زندگی تھی فلم کا سین نہیں مگر اس کی زندگی کا اہم فیصلہ فلم کے سین جیسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

''ارے۔'' اپنے کمرے سے باہر نکلتے بابر کو جھٹکا لگا تھا۔ خوشی، شاہجہاں کے کمرے کے باہر ادھ موئی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کا حال کمرے کے اندر کا حال بیان کر رہا تھا۔

''آ...... آپ یہاں باہر؟'' جس کام کے لیے وہ جا رہا تھا اسے فراموش کیے وہ ایک جست میں اس تک پہنچا۔ جس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آنسوؤں کا نام و نشان مٹانا چاہا تھا۔ ''آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ آئیں اندر چلیں۔''

''نن...... نہیں...... نہیں۔'' وہ بری طرح سے بدکی تھی۔ بابر الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

''آپ کو شاہجہاں نے باہر نکالا ہے؟'' وہ بے یقینی سے پوچھنے لگا۔ خوشی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''مائی گاڈ۔'' بابر نے پیشانی مسلی۔ ''جانور ہے یہ تو۔'' بڑبڑاہٹ ایسی تھی کہ خوشی نے بہ آسانی

سن لی۔ ''انسانیت نام کو نہیں ہے اس میں...... ہے ناں وہی خر دماغ پولیس والا۔ آئیں، آپ میرے ساتھ آئیں...... آئیں پلیز۔''

''کک...... کہاں؟'' وہ گھبرا گئی۔ کہیں اور چلے جانے سے بہتر اسے یہاں کھڑے رہنا بہتر لگ رہا تھا۔ بابا اسے اس کمرے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے آتے تو کم از کم وہ انہیں اس کمرے کی حدود میں ہی مل سکتی تھی۔

''گھبرائیں مت، اغوا نہیں ہو رہیں آپ۔ آپ تھکی ہوئی ہیں ریسٹ کرلیں۔ یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں۔ ویسے تو کیا ہی اچھا ہوا گر ماموں آپ کو یہاں دیکھ لیں پھر اس لاٹ صاحب کی شامت آپ دیکھیے گا۔''

''نہ...... نہیں۔'' وہ کہاں عادی تھی ایسے مناظر دیکھنے کی۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ مجھے دوسرے بیڈروم میں لے جائیں۔'' گھومتا ہوا سر اب یہاں بغیر قصور کے سزا بھگتنے کے حق میں نہیں تھا۔

''آئیں۔'' بابر کی سرکردگی میں وہ نئی پناہ گاہ میں آگئی۔

''کوئی ضرورت، کوئی کام...... کچھ بھی ہو تو آپ......''

''نہیں پلیز، مجھے بس سونا ہے ابھی۔'' صرف تنہائی کی خواہش ہو رہی تھی۔ اس نے بابر کی بات پر کان بھی نہیں دھرا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ واپسی کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ بابا کمرے میں آگئے۔

''تم نے خوش بخت کو کمرے سے نکال دیا؟'' حیرت تھی انہوں نے گوشالی کے لیے صبح تک کا انتظار کیا۔ وہ توقع کر رہا تھا اِدھر خوش بخت کمرے سے باہر جائے گی اُدھر لعن طعن کرتے بابا اس کے کمرے میں آموجود ہوں گے۔

''آپ جانتے ہیں مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی گوارا نہیں۔'' بابا نے بہ مشکل غصہ دبایا۔

''تم اور تمہارے اعتراضات...... وہ تمہاری بیوی ہے۔''

''میں اس شادی کو نہیں مانتا۔''

''کیوں؟'' مگر اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

''میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے؟'' بابا بالآخر بھڑک اٹھے۔

''شادیاں ایسے نہیں ہوا کرتیں۔'' اس کے بابا سے اختلافات اپنی جگہ لیکن وہ یوں آمنے سامنے بابا کے فیصلوں کی تحقیر نہیں کرسکتا تھا۔

''تم جانتے ہو سچوئیشن کیا تھی؟ خوشی کے ڈیڈی کے پاس مہلت کے چند لمحے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کی خواہش تھی۔''

''اس کے لیے آپ نے مجھے پیش کر دیا؟'' اس کے لہجے میں ناراضی ہی نہیں شکایت بھی تھی۔

''میں نے اس کے ڈیڈی سے وعدہ کر لیا تھا۔''

''مگر میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ نہ اپنے باپ سے اور نہ اس کے باپ سے۔'' اس کی ہٹ دھرمی عود آئی۔

''تو اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''تنہائی۔'' اس بدتمیزی پر بابا کا بس نہیں چلا تھپڑ کھینچ ماریں۔

''ایک نیک، شریف لڑکی اتنی آسانی سے تمہیں مل گئی۔ تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔'' بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر جمی تھی۔

''آپ اپنے ہر الٹے کام کو ہمیشہ سیدھا کہنے پر کیوں بضد رہتے ہیں؟''

''شاہجہاں...... تم حد سے بڑھ رہے ہو۔''

''وہ بھی صرف آپ کی وجہ سے۔'' وہ دوبدو بولا۔ بابا کی برداشت ختم ہوگئی۔

''میرا قصور یہ ہے کہ تم اس گھر میں پیدا ہوئے جہاں تمہیں دنیا کے تمام عیش و آرام ملے......''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ جانتے ہی نہیں آپ نے کیا، کیا ہے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''نہیں تم بتادو میں نے کیا، کیا؟ وہ قصور، وہ گناہ جس کی وجہ سے تم باپ کو باپ نہیں سمجھتے۔ ہمیشہ لاتعلقی دکھائی۔''

''لاتعلقی...... اور میں نے؟'' اس کی آنکھوں میں بیتے ہر دن کا درد آن بسا۔ ''لاتعلقی کیا ہوتی ہے بابا...... آپ میری ماں سے پوچھیں۔ آپ کی .... بے توجہی، آپ کی اجنبیت وقت سے پہلے اسے مار گئی۔ لاتعلقی کیا ہوتی...... آپ مجھ سے پوچھیں۔ جسے چھوٹی سی عمر میں ماں اور گھر سے دور کرکے آپ نے بورڈنگ میں ڈال دیا اور آپ بات کر رہے ہیں لاتعلقی کی؟'' بابا کے چہرے پر شکستگی کے آثار تھے مگر وہ تلخی سے کہتا چلا گیا۔

''تم خوشی کو ساتھ لے جاؤ۔'' اس کا برسنا جیسے ضائع ہوگیا.... بابا نے یہ کہہ کر جیسے اسے حیران کردیا۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں؟'' وہ گویا بڑا لطف اندوز ہوا۔

''اسے تمہارے ساتھ رہنا چاہیے۔'' ان کا لہجہ ٹھوس تھا۔ شاہجہاں نے سر جھٹک کر گویا اس حکم نامے کا اثر زائل کیا اور ایک طرف سے ہوکر آگے بڑھنے لگا جب ان کی آواز آئی۔

''تم خوشی کے ساتھ وہی کرنے جارہے ہو......'' وہ پل بھر کے لیے رکے۔ ''جو میں نے تمہاری ماں کے ساتھ کیا تھا۔'' اس نے بے ساختہ مٹھیاں بھینچی تھیں۔ خوش بخت کے ہی طفیل وہ اپنا قصور قبول کرچکے تھے مگر اب دیر ہوچکی تھی۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ بابا محض اس کی پشت تکتے رہ گئے۔

☆☆☆

تمام راستہ ذہن پر اذیت و اضطراب کا قبضہ رہا۔ بابا نے کہا تھا۔

''عیش و آرام......'' اس کے دماغ میں بھرا دھواں آنکھوں تک کا سفر کر گیا۔ اسے ونڈ اسکرین تک دھندلی نظر آنے لگی۔

''عیش و آرام، سکھ اور سکون کا نعم البدل کب ہوئے ہیں؟'' بابا اور خوشی پورے راستے دماغ پر حاوی رہے۔ بابا نے کہا وہ خوشی کے ساتھ وہی سلوک کرنے جارہا ہے جو انہوں نے اس کی ماں کے ساتھ کیا اور وہ سوچ رہا تھا شاید وہ اس سے زیادہ کر جائے۔

☆☆☆

ابھی شاہجہاں کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دادی اور پھپو آگئیں۔ بابا نے ایک گہری سانس لے کر خود کو ان کی طرف سے ہونے والی بمباری کے لیے تیار کیا۔

''مبارک ہو۔'' دادی نے ابتدا کی۔ ''ایک پرائی لڑکی کی خاطر بیٹے کو بھی ناراض کرلیا۔''

''اماں!''

''ہاں بولو...... ہم ہیں قصوروار، ہم ہیں گناہ گار کہہ دو انسانیت کے سبق صرف تمہیں یاد ہیں۔ اس دنیا میں اکلوتے تم ہی خدا ترس ہو مگر انسانیت صرف یہیں ختم نہیں ہوتی۔ خود سے جڑے رشتوں کی پروا بھی انسانیت کہلاتی ہے بلکہ وہ پہلے ہیں......''

''ہمارے نصیب...... بھی یتیم ہم سے ٹکراتے ہیں۔ جیسے ہم نے ٹھیکا لے رکھا ہو یتیموں کا۔''

''وہ بھی صرف بہویں بنانے کے لیے۔'' پھپو کے اس طنز نے بابا کے ملال میں اشتعال بھی جمع کردیا۔ وہ ہونٹ بھینچے شدید ناراضی کے ساتھ پھپو کو دیکھنے لگے۔

''تم جانتے ہو...... نوبرا ٹھیک نہیں ہے۔'' ان پر نظریں جمائے پھپو اصل مدعے پر آئیں۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' ان کی تشویش بے ساختہ تھی۔

"اعتبار ٹوٹا ہے اس کا۔" پھپو کا لہجہ زہر خند تھا۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگے۔

"ایک انجان لڑکی کو بہو بنالائے۔ ہم سے تو پوچھا ہوتا۔ ہماری مرضی، ہماری خوشی کچھ تو معلوم کیا ہوتا......ہم نے پالا ہے شاہجہاں کو۔ حق بنتا ہے ہمارا اس پر۔" دادی رونے لگی تھیں۔ خالص جذباتی ہتھیار جسے استعمال کرتے ہوئے وہ یہ بھی بھول گئیں کہ اس کی پرورش کا حق تو اس کی ماں کو بھی نہیں ملا تھا۔

"میں آپ کے سارے حقوق سے آگاہ ہوں لیکن حالات ایسے ہوگئے کہ مجھے یہ کرنا پڑا ورنہ میرے نزدیک یہ خالصتاً شاہجہاں کی اپنی مرضی کا کام تھا وہ خود کرتا۔" پھپو نے بڑا تمسخرانہ سا ہنکارا ابھرا تھا۔

"جب بات اپنوں کے فائدے کی آئی تم نے ہاتھ جھاڑ لیے۔ شاہجہاں کے کندھوں پر بات ڈال دی۔"

"اماں آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" خوشی کے ڈیڈی کی موت، اس کے بعد شاہجہاں کے رویے کی تکلیف...وہ پہلے ہی نڈھال ہورہے تھے اوپر سے ان دونوں خواتین کے جذباتی شکوے۔

"ہم نے تم سے امیدیں لگائیں اور تم شاہجہاں کی مرضی کا بہانہ کرکے خاموش رہے۔" دادی کا رونا جاری تھا اور پھپو بھی کھل کر میدان میں اتر آئیں۔

"میں نے اپنی نوریا کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ رشتے ٹھکرائے، صرف اس آس پر کہ ماموں اس کے سر پر ہاتھ رکھے گا۔ اپنے بیٹے کے لیے اس کی سگی بھانجی کے علاوہ اور کسی کا کیوں سوچے گا۔" یہ واقعی انکشاف تھا۔ جس فیصلے کا حق وہ اپنے طور پر بیٹے کو سونپ چکے تھے۔ وہاں وہ اس کی نظروں میں معتبر بھی رہتے تو بہن اور ماں کے آگے معتوب ٹھہرتے مگر شومئی قسمت وہ اب بھی سب کے قصوروار بن گئے۔

"اماں بھی یہی چاہتی تھیں۔" اونچی اونچی سسکیوں کے بیچ پھپو نے گویا دادی کو بھی ہمنوا بنانے کا عندیہ دیا۔

"اگر چاہتی تھی تو کون سا گناہ کرتی تھی۔ گھر کے رشتے ہوں تو ہر کوئی ایسا ہی چاہتا ہے پھر نوریا میں کمی کیا تھی جو ہم نہ سوچتے۔" اب دونوں خواتین منہ بھر کر یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ نوریا نے بھی جینا محال کررکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے وہ ماں ہی نہیں نانی سے بھی بڑی بے باکی سے یہی فرمائش داغتی۔

"آدھا تو بڈھا ہوچکا شاہجہاں، کب کریں گے شادی اور کچھ نہیں تو ماموں کے کان میں بات ہی ڈال دیں یا پھر منگنی تو ہوجانی چاہیے۔"

"ارے گھر کی بات ہے کیوں اتاؤلی ہوتی ہو، نہ شاہجہاں کہیں جارہا ہے نہ تم......اطمینان رکھو۔" اور کل اسی اطمینان کا جنازہ نکل گیا۔ نوریا نے ماں اور نانی دونوں پر چڑھائی کردی۔

"آپ دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ کہتی تھیں سب ہوجائے گا، تسلی رکھو، گھر کی بات ہے، سب راضی ہیں۔ اب کیا ہوا؟" وہ بہت ہذیانی ہورہی تھی پوری رات یہ غم منایا تھا۔

"یہ سب نصیب کی بات ہوتی ہے۔" بابا کا شکست خوردہ جملہ سب کی جان جلا گیا۔

☆☆☆

خوشی کو وہ فجر کی نماز کے وقت جیسا چھوڑ گئے تھے وہ اب بھی ویسی ہی ملی۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے۔ آلتی پالتی مارے بے آواز اور بے حد روئی ہوئی۔ نسیم سے ناشتے کی ٹرے لیے وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"خوشی بیٹا، ایسے رونے سے جانے والے واپس آجاتے تو میں روز روتا۔" خوشی اس مہربان چہرے کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھنے لگی جس میں ڈیڈی کا چہرہ مدغم ہونے لگتا۔

"اچھی بات یہ ہوتی ہے جانے والے کو کوئی تحائف دے کر رخصت کیا جائے تاکہ وہ آئندہ کے لیے ان کے کام بھی آئیں یعنی آپ کی دعائیں۔"

"انکل......ڈیڈی مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔" کوئی غم سا غم تھا۔ قیامت تھی جو آکر گزرنے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔

"یہ تو پھر زیادتی ہوگئی۔ تمہارے ڈیڈی تمہیں میرے پاس چھوڑ گئے۔ مجھے اپنا سمجھ کر اور تم میرے ہوتے ہوئے خود کو اکیلا سمجھ رہی ہو......وہاں ڈیڈی دیکھ کر خوش ہورہے ہوں گے کہ یہاں خوشی کے پاس میں ہوں اور......" وہ اتنا کہہ کر ذرا دیر کو چپ ہوئے تھے۔ "اور شاہجہاں ہے۔" خوشی کے آنسو بہنا بند ہوگئے۔ توجہ بٹ گئی تھی۔

"اور سنو آج سے تم مجھے بابا کہو گی انکل نہیں، چلو اب ناشتا کرتے ہیں۔"

"میں......میرا دل نہیں۔" اسے ذرا بھی بھوک محسوس نہیں ہورہی تھی۔

"ارے دل کو مارو گولی۔" انہوں نے بات کاٹ کر قدرے مصنوعی ناراضی دکھائی۔ "کھانا معدے میں جانا ہوتا ہے دل میں نہیں اور معدہ کہہ رہا ہے ناشتا......" وہ یوں بول رہے تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ "چلو مل کر ناشتا کرتے ہیں۔ میں بھی بھوکا ہوں یار۔" ان کے سامنے بنا کوئی تکرار کیے وہ چپ چاپ ناشتا کرنے لگی۔

"آپ سے ایک بات پوچھوں؟" ناشتے کے دوران اسے جیسے خیال آیا۔ بابا خوشگوار حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"مگر کچھ بھی پوچھنے سے پہلے اجازت لینی ضروری نہیں۔ بے جھجک پوچھو۔"

"آپ......" وہ قدرے جھجکی۔ "میرے ڈیڈی کے کیا لگتے ہیں؟"

☆☆☆

شناخت سے عاری، رونگٹے کھڑے کرتی، زخم خوردہ لاش میرے ابا کی تھی۔ صحن کے عین وسط میں رکھی۔ عورتوں کا جمگھٹا گھیرا ڈالے موجود تھا۔ کبھی اس کی طرف نگاہ کرتیں اور فوراً جھرجھری لے کر پھیر لیتیں۔ اکثر سپارے پڑھ رہی تھیں۔ ایک ایسی موت جس پر نہ کوئی بین، نہ کوئی رونا بلکہ زرنگار چچی کے چہرے پر نظر آنے والا اطمینان میں نے اپنی اماں کے چہرے پر بھی دیکھا۔ وہ ابا کی پائنتی کی طرف چارپائی سے ذرا ہٹ کر بالکل چپ چاپ، گم صم بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھ سے دنیا دکھاوے کو بھی آنسو نہیں ٹپکا اور نہ ہی وہ ایسی کوشش کررہی تھیں دادی تھیں جن کی دھیمی، دھیمی سسکیاں کبھی کبھی گونجنے لگتیں جنہیں بیٹے کی دائمی جدائی سے زیادہ اس کی تکلیف دہ موت رُلا رہی تھی۔

☆☆☆

سرِشام ہی آسمان لال غبار آلود بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ دادی ہولنے لگیں۔

"لال سرخ آندھی......ضرور کچھ غلط ہوا ہے؟" اور چند لمحوں میں گلی میں کہرام برپا ہوگیا۔

"اوئے للو کی لاش......سراج دین کے کھیت میں درخت سے لٹکی ملی۔" اور لاش گھر بھی پہنچادی گئی۔

"توبہ......اللہ معافی......کوئی بڑی ہی اذیت والی موت ملی ہے۔" کسی نے کہا تھا۔ سب قیافے ملا رہے تھے۔ ابا پر پہلے تشدد کیا گیا پھر اس کی لاش درخت سے لٹکا دی گئی۔

"اللہ بچائے ایسی موت سے۔"

"اور ایسی اولاد سے بھی۔"

"واقعی، ایسی اولاد سے اللہ بچائے۔"

"سب کہتے تھے، کملا ہے، بھولا ہے، فرشتہ ہے اور اس بھولے نے باپ بھائی کی عزت خاک میں ملادی۔"

"ایسی معصوم، خدمت گزار بیوی......اور کملا ساس کے عشق میں جا پھنسا۔"

''ارے اللہ معاف کرے ایسا کبھی دیکھا نہ سنا۔ یہ اگر پاگل تھا تو وہ منحوس تو سیانی تھی۔''

''بدبخت سوتیلی تھی ناں سمیعہ کی۔ عیاشی کے لیے بیٹی کا گھر بھی نہ چھوڑا۔ جان بوجھ کر للّو پر ڈورے ڈالے۔ جائداد دیکھ کر رال ٹپکنے لگی تھی کم بخت کی۔ بیاہی بیٹی سے وہ سب کچھ کیسے مل سکتا تھا جو للّو سے اینٹھ سکتی تھی۔''

''قیامت کی نشانیاں ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو، اللہ اولاد دے تو سیانی دے نہیں تو نہ دے۔ مرن جوگے نے باپ کا اونچا شملہ دیکھا نہ بھائی کی شان، سب مٹی میں رول دیا۔''

''سنا ہے مروایا بھی سمیعہ کی سوتیلی نے خود ہی۔''

''ہاں ظاہر ہے جب پتا چلا ہوگا کہ باپ بھائی نے للّو کو عاق کر دیا پھر اس کملے کا اس نے اچار ڈالنا تھا؟''

''ارے کئی تو بھائی بند ہیں اس کے، کسی سے کہہ کر مروا دیا ہوگا۔'' ایسے موقع پر ایسی موت پر ایسی ہی باتیں، ایسے ہی تجزیے ہوتے ہیں۔

دادا کی زندگی میں ہی میرے ابا میری سوتیلی نانی کے چکروں میں پڑ گئے تھے۔ راتوں کو کبھی کبھار غائب رہنا ابا کا وتیرہ تھا مگر اب وہ ہفتوں گھر سے غیر حاضر رہنے لگے۔ پیسہ جیب سے جلدی، جلدی ختم ہونے لگا۔ قیمتی، قیمتی سامان اماں کی سوتیلی کے گھر جانے لگا اور پہلے بھی کبھار جنونی دوروں کا شکار ہونے والے ابا آئے روز اماں اور میری جان عذاب میں رکھنے لگے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اماں کو گالیوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیتے۔ ایسی ایسی غلیظ باتیں اور طعنے کہ سننے والے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

ابا کو کبھی ترچھی نظروں سے نہ دیکھنے والے میرے دادا نے بھی ان کو دھنک کر رکھ دیا تھا مگر ابا کا جنون نہ اترا۔ وہ مستقل سوتیلی ساس کے گھر رہنے لگے تھے۔ میرے دادا کو یہ غم لے ڈوبا۔ ابا کو عاق کر دینے کی دھمکی وہ پہلے دے چکے تھے اور بلال چچا نے ایسا کر دکھایا۔ میری سوتیلی نانی کے لیے بغیر روپیہ جائداد والا داماد اب ناکارہ تھا۔ اس نے بری طرح سے ابا کو دھتکارنا شروع کر دیا مگر ابا کی الٹی کھوپڑی تھی۔ جب وہ اسے دھتکارنے لگی تو ابا نے اسے پیٹنا شروع کر دیا مگر وہ میری ماں نہیں تھی چپ چاپ سہہ جانے والی۔ اس نے بالآخر ابا کا کام تمام کر دیا۔ اس کی فوتگی کے دن اماں کے چہرے کا سکون تو ایک، ایک کو نظر آ رہا تھا مگر میرے دل کا اطمینان صرف میرے دل تک رہا۔ ہاں میں شاید دنیا کی وہ واحد اولاد تھا جسے باپ کی موت نے مطمئن کر دیا تھا۔

☆☆☆

حویلی آنے کے ڈیڑھ دو مہینے بعد اس کی نوریا سے ملاقات ہو ہی گئی۔

کمرے میں ہمہ وقت بند رہنے سے اس روز سے طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ اس شام وہ حویلی کے پرانے حصے کی طرف آ گئی۔ جو پچھلی طرف تھا جس حصے میں ان سب کی رہائش تھی۔ وہ کافی جدید طرز کا بنا ہوا تھا جبکہ پرانا حصہ وہی پرانی طرزِ تعمیر کا تھا مگر کافی کشادگی لیے ہوا تھا۔ لمبے دالان، کھلے، کھلے کمرے، بڑا سا صحن اور پودوں، پھولوں سے مالا مال ایک حسین باغ۔ وہ سحر زدہ سی اس باغ میں ٹہلنے لگی تھی۔

اپنے بیڈروم سے نکل کر وہ یا تو بابا کی اسٹڈی جاتی یا پھر ان کے بیڈروم میں یا پھر کبھی ان کے ہمراہ لاؤنج میں جا بیٹھتی۔ وہ بھی تب جب بابا کا اصرار بڑھتا۔ وہ ان کی خوشی کے لیے ایک بار کچن میں بھی چلی گئی تھی۔ بابا کے لیے چائے بنانے مگر وہاں بوتل کے جن کے مانند آ ٹپکنے والی پھپھو نے کچھ ایسی تند نظروں سے اسے گھورا تھا کہ وہ چائے بھول بھال، ہلدی رنگت لیے واپس اپنے حجرے کو پلٹ آئی۔ بابا اس کا اترا چہرہ دیکھ کر ہی ساری کہانی سمجھ گئے تھے مگر آج دل کافی اوب گیا تھا پھر کھڑکی سے خوشگوار موسم نے بھی جھب دِکھا دی تھی۔ وہ کپڑوں کی شکنیں درست کرتی بلاارادہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

صبیح چہرہ کملایا ہوا تھا، رخساروں کے گلاب مرجھا گئے تھے اور کرنجی آنکھیں شوخی و شادمانی سے محروم سوجی، سوجی تھیں۔ لمبی راہداریوں میں چکرانے کے بعد وہ اب باغ میں تھی۔ لمبی، لمبی سانس لیتی وہ ایک دم ٹھٹکی تھی۔ نوریا وہاں انار کے پودے کے پاس کرسی دھرے بیٹھی تھی۔ نوریا کو شاید کسی کے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا احساس ہو گیا تھا۔ بنا اپنی پوزیشن بدلے وہ گردن موڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تو خوشی گڑبڑا گئی۔ نوریا کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں۔

''ہیلو!'' جھجکتی، گھبراتی خوشی آگے بڑھی۔

''میں خوشی۔'' نوریا کو دیکھ کر اسے خوشگوار احساس ہوا تھا۔ ''تم نوریا ہو ناں؟'' اس نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے بڑھایا مگر نوریا نے ہاتھ ملانا تو درکنار جواب دینا بھی غیر ضروری سمجھا۔ خوشی اس کی آنکھوں کے ارتکاز سے قدرے خفیف ہوئی، ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''بابا بتا رہے تھے تم اسی کیمپس جاتی ہو جہاں میں جاتی ہوں۔ حیرت ہے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا کیوں نہیں۔'' نوریا یک ٹک اسے دیکھے گئی پھر اٹھ کر خوشی کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''جب ماموں تمہارے قابو میں آ چکے تھے پھر شاہجہاں پر قبضہ جمانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''جی......؟'' کاٹ دار جملے نے اسے بھونچکا کر دیا۔

''میں نے کہا ایک گھر کے دو، دو مردوں کو پھنسانے کا ہنر تم نے کہاں سے سیکھا؟'' تھوڑی تگ و دو کے بعد وہ جب نوریا کی بات کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہوئی تو جیسے زلزلے کی زد میں آ گئی ہو۔

نیلی

ایک بوڑھے آدمی نے اپنے پرس میں اداکارہ نیلی کی تصویر رکھی ہوئی تھی ایک دفعہ اتفاق سے اُن کے بیٹے نے وہ تصویر دیکھ لی تو بولا۔

''واہ ابا جی خوب! آپ نے اپنے پرس میں نیلی کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''رکھی تو تمہاری ماں کی تصویر تھی مگر پڑے، پڑے نیلی ہو گئی۔''

از! ارم کمال، فیصل آباد

اگر......!

میرا چشمہ نخلستان سائیں میرا بادل سبز شجر
تو بخت میرا تو تخت میرا تو محل میرا تو گھر
میں پنچھی اِک دعا مانگوں تو کر منظور اگر
یا پنجرہ، پنجرہ شام نہ دے یا کاٹ دے میرے پر

مرسلہ: طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی

میں اور وہ......

کس لیے دیکھ کے نظروں کو جھکا لیتا ہے
وہ جو بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے
مضطرب ہوتی مگر تجھ کو سکوں ہی دیتی
گرم پانی بھی تو آتش کو بجھا دیتا ہے
زندگی چیز ہے کیا جب بھی کیا اس سے سوال
شاخ سے توڑ کر وہ پھول گرا دیتا ہے
میں پہنچتی ہوں تیرے خواب کی دہلیز پر جب
ایک سایہ سا مجھے بڑھ کے جگا دیتا ہے
یہ بھلا کیسی محبت ہے کہ عطیہ اکثر
میں جلوں جب بھی وہ دامن سے ہوا دیتا ہے

شاعرہ: عطیہ زاہرہ، لاہور

''تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اسے لگا نویرا پاگل ہوگئی ہے۔

''وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔'' نویرا کو اس کی پھیکی پڑتی شکل نے بڑا سکون دیا۔

''تم غلط کہہ رہی ہو۔'' ہمیشہ کی طرح وہ بہت جلدی کمزور پڑ گئی۔ آنسوؤں کا گولا حلق میں اٹک گیا تھا۔ ''تم ہوش میں نہیں ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو جس کا منگیتر اس سے چھن جائے وہ حواسوں میں کیسے ہو سکتی ہے۔''

''منگیتر......'' خوشی کو دھچکا لگا۔ ''لیکن بابا نے ایسا کچھ نہیں بتایا۔''

''میں تو بتا رہی ہوں ناں!'' جھوٹ بولنے میں وہ بھائی کی طرح ماہر تھی۔

''تم سن لو، میں اپنی چیز کسی کو نہیں دیا کرتی، شاہجہاں صرف میرا ہے۔ اسے میں تمہارا کبھی نہیں ہونے دوں گی، یاد رکھنا۔'' اس پر بم گرا کر نویرا پُرسکون سی چلی گئی۔ خوشی کیا کرے کیا نہ کرے کی تفسیر بنی کھڑی تھی۔

خود کو نارمل زندگی کی طرف لانے کی اس کی کوشش نویرا نے ملیامیٹ کر دی تھی۔ وہ رات گئے تک نویرا کے زہریلے لہجے کی بازگشت کے زیر اثر رہی۔ بابا کے کمرے میں رات کو دودھ کا... گلاس پہنچانے کا کام اس نے اپنے سر لے رکھا تھا۔ اداس طبیعت کی وجہ سے اس رات دودھ دینے کا خیال بھی گیارہ بجے آیا۔

''اوہ...... بابا ویٹ کر رہے ہوں گے۔'' جھٹ پٹ گرم دودھ گلاس میں ڈالتی وہ پہلے تو ان کے بیڈروم میں پھر اسٹڈی پہنچی مگر بابا وہاں نہیں تھے۔

''لگتا ہے زمینوں پر دیر ہو گئی ہے شاید آج نہ آئیں۔'' گلاس ٹیبل پر رکھتی بے دم سی کرسی پر گری۔ زندگی عجیب سی ہو کر رہ گئی تھی۔ بابا بھلے اسے اولاد جیسی توجہ دے رہے تھے لیکن پھر بھی کچھ اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ زندگی بوجھ بننے لگی تھی۔

''ہیلو...... دنیا کی سب سے غمگین خاتون۔''

بابر کی آواز نے خیالات میں ارتعاش پیدا کیا تھا۔

''آپ!'' جلدی سے چہرہ رگڑ ڈالا مبادا وہ آنسو دیکھ لے۔

''یہی میں کہنے لگا تھا...... آپ؟'' وہ بڑی فرصت سے بیٹھ بھی گیا۔

''میں بابا کو دودھ دینے آئی تھی۔'' تنہائی اور سکون بابر کی موجودگی میں رخصت ہو گئے۔

''اور میں نے لائٹ جلی دیکھی تو آ گیا۔''

وہ چپ رہی۔ بابر ٹانگ پر رکھی ٹانگ جھلاتا کبھی پیپر ویٹ گھماتا گاہے بہ گاہے اس پر نظر ڈالتا، بیٹھا ہی رہا۔

''ویسے......'' ویسے کو لمبا کھینچنے کے بعد بابر نے ڈرامائی وقفہ لیا پھر بولا۔ ''یہ پروگرام کب تک جاری رہے گا؟''

''کون سا؟'' اسے بابر کی سنجیدگی نے بوکھلاہٹ میں مبتلا کیا۔

''رونے دھونے کا۔'' جہاں اٹکی سانس بحال ہوئی وہیں آنکھیں پھر جھلملانے لگیں۔

''ویسے......'' خوشی کی اتری صورت کو بغور جانچنے کے بعد بابر کا ''ویسے'' ایک بار پھر گونجا۔ ''تمہیں رونا بھی چاہیے۔'' گلا کھنکھارتے ہوئے بیٹھنے کی پوزیشن بدلی گویا فارم میں آیا۔ ''ایک تو تمہارے ڈیڈی کی ڈیتھ، اس پر بنا تمہاری مرضی جانے تمہارا نکاح۔'' گفتگو کا رخ کچھ اس طرف گھوما کہ خوشی آنسو بہانا بھول کر تحیّر زدہ ہو گئی۔ ''نکاح بھی اس سڑیل سے، جو تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا حالانکہ......''

''بابر بھائی...... میں وہ......'' اس نے بابر کی بات کاٹی۔

''اور جب کا گیا واپس بھی نہیں آیا آج تک...... حد ہوتی ہے کٹھور پن کی بھی۔''

''بابر بھائی میں......'' وہ پھر منمنائی۔

''اب لڑکی روئے نہ تو کیا کرے حالانکہ تمہیں ناراض ہو جانا چاہیے۔''

''بابر بھائی۔'' خوشی پر بے چارگی طاری ہونے لگی۔

''مگر تم پریشان نہ ہو، اس شخص سے تمہیں۔''

''بھائی مجھے نویرا نے کچھ کہا ہے۔'' بے حد سرعت سے اس نے کہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے بابر پر سکتہ طاری ہو گیا۔

''کیا کہا؟''

''میں نے کہا میں نویرا کی وجہ سے رو رہی تھی۔ اس نے بہت خراب بولا ہے مجھے۔'' اب بابر اتنا ہمدرد بن رہا تھا کیا حرج تھا اسے یہ بتانے میں اور وہ جو شاہجہاں کے خلاف اسے ڈوز دینے آیا تھا چُپکا ہو بیٹھا۔

''میں سمجھا تم شاہجہاں کی وجہ سے۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے بابر بھائی۔'' جمائی روکتی وہ کھڑی ہو گئی۔ ''میں چلتی ہوں۔''

''اوہ......'' بابر مایوس ہوا۔ ''میں سوچ رہا تھا کافی پیتے ہوئے مل کر ٹی وی دیکھتے ہیں۔''

''خیر پھر سہی۔'' بابر نے دانت کچکچا ڈالے تھے۔

☆☆☆

''یہ آپ کا بیٹا ہے؟'' پولیس یونیفارم میں ملبوس وہ شاہجہاں کی تصویر تھی۔ خوشی نے بغور دیکھنے کے بعد کچھ اس انداز سے پوچھا کہ بابا ہنس دیے دل چاہا کہہ دیں کہ تمہارا شوہر بھی لیکن وہ اتنی مگن اور معصوم لگ رہی تھی کہ انہیں خود کو باز رکھنا پڑا۔

''مجھے لگتا ہے غصے کے کافی تیز ہوں گے۔''

''تمہیں کمرے سے نکالا تھا اس لیے؟''

''نہیں، نہیں۔'' اس نے پُرزور مخالفت کی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اس رات کے تمام نقش اس کے ذہن سے اتر چکے تھے۔

''جن کی بھویں ایسی ہوتی ہے...... ایسی۔'' اس نے پہلے شاہجہاں کی بھوؤں پر انگلی رکھی پھر باقاعدہ اپنی سکوڑ کر دکھائیں۔ ''وہ لوگ غصے کے بہت تیز ہوتے ہیں۔'' بابا کھل کر ہنسے تھے۔ یہ نئی بات معلوم ہوئی تھی انہیں۔ اس فوٹو البم کو انہوں نے شاید ہی کبھی کھولا ہو جو اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

''پھر تو تمہیں میں بھی غصے والا لگتا ہوں گا؟''

اس نے بڑی توجہ کے ساتھ انہیں دیکھا۔

''سمجھ گئی، یہ آپ پر ہی گئے ہیں لیکن آپ سیریس نہ لیں، یہ میں ایسے ہی کہہ رہی ہوں۔ ضروری نہیں کہ سچ بھی ہو۔''

''ہاں مگر ماننے کی بات ہے۔ تم کمال کی فیس ریڈر ہو۔'' وہ مسکرا کر شاہجہاں کی ایک اور تصویر دیکھنے لگی۔

''خوشی۔''

''جی!'' بابا اسے متوجہ کرنا چاہتے تھے لیکن وہ تصویروں میں گم تھی۔ جہاں ایک خوب صورت سی لڑکی شادی کے جوڑے میں کھڑی تھی۔ دلہن بنی ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر خوشی و تازگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ یہی کہنے کے لیے اس نے سر اٹھایا اور بابا کے ہاتھ میں نیا نویلا موبائل فون دیکھ کر فوراً پوچھا۔

''یہ کس کا ہے؟''

''تمہارا۔'' بابا اس میں کچھ فیڈ کر رہے تھے۔

''میرا...... مگر کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کیوں، کیا مطلب ہے۔ ضرورت کی چیز ہے۔ ساری دنیا رکھتی ہے۔ آج سے پہلے تم بھی استعمال کرتی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے میں نے لینے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔'' بے خیالی میں اس نے کئی تصویریں پلٹ ڈالی تھیں۔

"لیکن بابا مجھے ضرورت نہیں ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ڈیڈی کے بعد ہر خواہش دم توڑ چکی تھی اور یہ رکھ کر اسے کس سے رابطے میں رہنا تھا بھلا۔

"کیوں بھئی، تمہیں کیوں ضرورت نہیں؟"

"میں نے کہاں کالز کرنی ہیں بابا؟" اس کی آزردگی بابا سے چھپی نہ رہی۔

"مجھے......اور شاہجہاں کو۔" وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔

"یا پھر ہمیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے تم سے بات کرنے کی۔ مجھے زمینوں پر اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ تمہیں بتا بھی نہیں پاتا۔ اب سہولت ہو جائے گی۔" اس نے بنا بحث کیے موبائل لے لیا۔

"میں نے اس میں شاہجہاں کا نمبر بھی ڈال دیا ہے۔" تھوڑا بے نیاز نظر آتے ہوئے انہوں نے بتایا وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تم اسے کال ضرور کرنا۔" بڑی زور آور تاکید تھی۔

"مگر کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"پھر وہی کیوں۔" بابا جھنجلا سے گئے۔ "بیوی ہو تم اس کی، تمہیں بات کرنی چاہیے اس سے۔ شوہر ہے وہ تمہارا اور کچھ نہیں تو کان کھینچنے کے لیے ہی کر لینا کہ ملتان جا کر بیٹھ کیوں گئے ہو۔" اُف بابا کے سبق......وہ بھی خالصتاً زنانہ پہلی بار خوشی کو شرم محسوس ہوئی۔ شوہر صاحب کو کال کرنے پر نہیں سسر صاحب کے سمجھانے پر۔

"بیٹا، جہاں بات اپنے حق کی ہو وہاں ڈٹ جانا چاہیے۔ تمہیں قطعی شرمانے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ فون کرو اور حق سے کہو تمہیں لے جائے، اپنے پاس رکھے یہاں تمہارا کیا کام۔" وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ موضوع طول پکڑ رہا تھا۔ اسی حساب سے اس کے گالوں کی سرخی بھی۔

"ایک تو بھئی تمہاری ساس نہیں ہے ورنہ یہ پٹیاں مجھے نہ پڑھانی پڑتیں۔" بابا کے ماتھا مسلنے پر وہ مسکرائی یعنی مزید پٹیاں باقی تھیں۔

"اب زیادہ کیا کہوں، سب تمہارے فائدے کی باتیں ہیں۔ یہاں تمہیں لمبا سفر کر کے شہر جانا پڑتا ہے کالج کے لیے، وہاں تم یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لوگی۔" یہ بات سیدھی دل کو جا لگی واقعی پھر کال بنتی ہے۔

"جیسے میں کروں گی اور آپ کا بیٹا دوڑا چلا آئے گا؟" یہ خدشہ بے ساختہ زبان پر آ گیا۔ بابا نے پھر سے ماتھا مسلا۔

"بھئی......ایک بار، دو بار، تین بار نہیں مانے گا پر کبھی تو مانے گا۔"

"تب میری اسٹڈیز بھی کمپلیٹ ہو چکی ہوں گی۔" اس نے منہ بسور کر حقیقت بیان کی۔

"آئے گا بیٹے ضرور آئے گا۔ غصے کا تیز ہے پر دل کا بہت اچھا ہے۔ کبھی کسی کے ساتھ غلط نہیں کرتا۔ تم تو بیوی ہو اس کی۔" وہ البم میں موجود ایک تصویر دیکھتی پھر سے بلش ہوئی۔

"یہ بہت ڈینجرس لگتے ہیں۔" بابا کے شاہجہاں کے بارے میں تعریفی کلمات ضائع گئے۔ وہ جو سوچ رہی تھی وہی کہہ بھی دیا۔ بابا نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"تم نے تو پرسنالٹی ہی زیرو کر دی میرے بچے کی۔" وہ ہنسی کے بیچ میں بولے خوشی شرمندہ ہو گئی۔ "خیر تم کال ضرور کرو گی اس خطرناک بندے کو۔"

"ارے......" مگر اب دھیان تصویروں کی طرف لگ چکا تھا۔ وہ اچانک پُرجوش ہوئی۔ "یہ دیکھیں......" بابا گم صم ہو گئے۔ وہ ایک تصویر انہیں دکھا رہی تھی۔

"میرے ڈیڈی......بابا آپ کے البم میں میرے ڈیڈی کی تصویر۔" وہ آواز دبا کر چلا رہی تھی۔

(دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ)

ناولٹ

کیچڑ میں کنول

نگہت سیما

رات بہت اندھیری تھی، گھپ سیاہ گھور اندھیری رات......اماوس کی راتوں کا زرد کمزور چاند بھی ڈوب گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ دھرے ادھ کھلی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی......سامنے گلی میں کھمبے پر جلنے والا پیلا زرد، بیمار روشنی والا بلب بھی آج نہیں جل رہا تھا۔ شاید فیوز ڈ تھا۔ ہاں چوباروں



کی کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے روشنیاں چھن، چھن کر باہر آ رہی تھیں...... کبھی کبھی طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی آوازیں ہوا کے دوش پر لہراتی لمحے بھر کے لیے آتیں اور پھر گم ہو جاتیں...... نیچے گلی میں کبھی کبھی قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تھی اور کبھی کسی کی لڑکھڑاتی آواز میں گانے کے بول کانوں میں پڑتے تھے۔

یہ کھڑکی پچھلی گلی میں کھلتی تھی...... سامنے والی گلی میں شاید اب بھی رونق ہوگی، پھولوں اور مٹھائیوں کی دکانیں کھلی ہوں گی لیکن اس گلی میں اندھیرا تھا سامنے والے چوباروں کی پچھلی کھڑکیاں اور پچھلے دروازے تھے اُدھر گلی میں سے کوئی منچلا گاتے ہوئے گزرا۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِنو بہار چلے...... اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کمرے میں مدھم روشنی کا پیلا بلب جل رہا تھا۔ کمرا نہ بڑا تھا نہ چھوٹا...... دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ دو بیڈ بچھے ہوئے تھے ساتھ میں سائڈ ٹیبلز تھیں۔ درمیان والی خالی جگہ پر چنیوٹی طرز کا بھاری سنگار میز تھا۔ جس پر درمیانے درجے کا میک اپ کا سامان پڑا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ قالین بچھا تھا...... اور اس کے چاروں طرف جگہ خالی تھی۔ سرخ، مسٹرڈ، سفید، میرون اور سبز رنگ کا یہ قالین ہاتھ کا بنا ہوا تھا...... اور مشتری بیگم کی والدہ کو کسی نے تحفے میں دیا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ملنے والا یہ تحفہ اب خاصا بوسیدہ ہو چکا تھا لیکن مشتری بیگم کا اسے پھینکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بقول ان کے "آج کل تو ہاتھ کے بنے قالین لاکھوں میں ملتے ہیں۔" پتا نہیں یہ قالین قیمتی تھا یا اس کے دینے والے سے مشتری بیگم کی بھی کوئی خاص یادیں وابستہ تھیں کہ مشتری بیگم نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کمرا کچھ عرصے پہلے تک مشتری بیگم کے استعمال میں ہی تھا...... لیکن اب جوڑوں کے درد کی وجہ سے ان کا سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ نیچے کے حصے میں رہتی تھیں اور یہ کمرا انہوں نے شہزادی اور رانی کو دے دیا تھا۔ یہ چوبارہ کوئی اتنا بڑا نہیں تھا نیچے ایک بڑا ہال اور تین چھوٹے کمرے تھے، ہال میں محفل سجائی جاتی تھی اور ہال کی چھت پر رنگین شیشے لگے ہوئے تھے...... اور وال ٹو وال کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ ہال کی سجاوٹ اچھی طرح سے کی گئی تھی اور یہیں کے تین چھوٹے کمروں میں سے ایک میں مشتری رہتی تھی جبکہ باقی دو کمروں میں سے ایک میں لڑکیاں رہتی تھیں یعنی صبو، پنو اور راگنی...... جبکہ ڈیوڑھی میں بنے کمروں میں استاد اور سازندے رہتے تھے۔ یہ کمرے اندھیرے اور سیلن زدہ تھے...... ڈیوڑھی کا دروازہ ایک چھوٹے سے چوکور صحن میں کھلتا تھا۔ صحن کا فرش شطرنج کی بساط کی طرح تھا۔ سفید اور سیاہ ڈبیوں والا...... ڈیوڑھی میں سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی تھیں...... یہ سیڑھیاں سیدھی اور تنگ تھیں...... اوپر تین کمرے اور ایک باورچی خانہ تھا...... دو کمرے مہمانوں کے لیے مخصوص تھے جن میں جدید انداز کا فرنیچر تھا جبکہ تیسرا مشتری بیگم کا سابقہ کمرا...... جو اَب رانی اور شہزادی کے زیرِ استعمال تھا۔ سامنے والے کمروں کے آگے گلی کی طرف بالکونیاں تھیں...... بالکونیوں کے جنگلے کبھی سبز رہے ہوں گے لیکن اب روغن جگہ، جگہ سے اکھڑ چکا تھا...... باورچی خانہ بھی اوپر والے حصے میں تھا...... جو کافی کشادہ تھا اور باورچی خانے کا کام چاندنی اور اس کے بیٹے خانو کے سپرد تھا...... سردیوں میں دونوں باورچی خانے میں ہی چارپائیاں بچھا لیتے اور گرمیوں میں چھت پر......

گانے والا منچلا ابھی گلی میں ہی چکر لگا رہا تھا۔ کبھی اس کی آواز بلند ہو جاتی کبھی آہستہ...... سامنے والے چوبارے کی کھڑکیوں سے آنے والی روشنی اب نہیں آ رہی تھی۔ تب ہی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا...... رانی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تو سوئی نہیں شہزادی......؟" وہ کھڑکی کے پاس کھڑی شہزادی کو دیکھ کر بولی۔

شہزادی نے مڑ کر دیکھا...... رانی مسہری پر بیٹھ گئی تھی اور اب جھک کر گھنگرو کھول رہی تھی۔ اس نے لمبی سی میرون فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ فراک کی چولی پر دبکے اور موتیوں کا کام تھا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ کھڑکی بند کر کے اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"تو پھر نیچے ہی آ جاتیں...... بڑے دنوں بعد آج خوب رونق تھی۔"

شہزادی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"تجھے تو بخار تھا شہزادی، گولی کھا کر لیٹ جاتی۔" رانی نے سیدھے ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور زیور اتارنے لگی۔

"اماں ناراض ہو رہی تھیں مجھ سے؟" شہزادی نے پوچھا۔

"نہیں فکر کر رہی تھیں تیری کہ اتنے دن سے بخار اتر کیوں نہیں رہا...... کہہ رہی تھیں صبح خانو اور چاندنی کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلی جانا......" رانی نے زیور سمیٹ کر دراز میں ڈالا...... اور کھڑے ہو کر سنگار میز کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور پھر ایک انگڑائی لے کر شہزادی کی طرف دیکھا۔ "وہ...... وہ نہیں ہے، وہی لمبا سا لڑکا...... اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ آتا ہے کبھی کبھی۔ بڑے کھلے دل کا ہے...... اس نے آج اماں سے کہا کہ وہ مری جا رہا ہے تو میں بھی اس کے ساتھ چلوں لیکن اماں نے کہہ دیا کہ ہم گانے والیاں ہیں ساتھ لے کر جانا ہے کسی کو تو پار والی گلی میں چلے جاؤ...... حالانکہ میرا دل تو......"

وہ دل پر ہاتھ رکھ کر جھکی اور مسکرائی۔

شہزادی نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ رانی کو پیلی روشنی میں اس کا رنگ بے حد پھیکا اور پیلا سا لگا۔

"تیری طبیعت زیادہ خراب ہے شہزادی......؟"

رانی نے دیوار میں نصب لکڑی کی الماری کھول کر کپڑے نکالے۔

"ہاں...... نہیں تو بس ٹھیک ہی ہے۔"

"پھر بھی صبح ڈاکٹر کے پاس ضرور چلی جانا۔"

اس نے سر ہلایا۔

رانی نے لائٹ آف کر دی اب کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ بس کپڑوں کی سرسراہٹ تھی۔ شہزادی یوں ہی پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی، کچھ دیر بعد رانی نے کپڑے بدل کر بتی جلائی...... اب وہ شلوار قمیص میں تھی کالے پھولوں والی پیلی قمیص اور کالی شلوار...... اتارے ہوئے کپڑے تہ کر کے اس نے الماری میں رکھے اور پھر لیٹنے سے پہلے شہزادی کی طرف دیکھا۔

"بتی بجھا دوں......؟ تو بھی سو جا......"

"نہیں، مجھے نیند نہیں آ رہی رانی تو سو جا۔"

"ارے نیند کیوں نہیں آ رہی، دل تو نہیں دے بیٹھی کسی کو؟" رانی نے تکیہ سر کے نیچے ٹھیک کر کے رکھا اور شہزادی کی طرف رخ کر کے لیٹ گئی۔

"پتا ہے اس روز اماں صبو سے کہہ رہی تھیں۔

"سب کچھ دے دینا اس امیر زادے کو پر دل نہ دینا بڑی خوار ہو گی۔"

"نہیں، میرا دل تو میرے پاس ہی ہے رانی...... ہم جیسوں کے دل بھی تو ہمارے جیسے ہوتے ہیں، بے وقعت، بے معنی...... گلیوں میں پڑے روڑے، کوڑے کی طرح ہمارے دل کی کیا قیمت...... بے مول بھی کوئی نہ لے۔"

"واہ، کیوں نہیں ہے قیمت بھلا......؟" رانی جیسے چیخی تھی۔ "ارے بھلا بے مول کیوں دیں ہم...... لگانے والے ان کی بھی بڑی قیمت لگاتے ہیں۔"

"پر میں نے تو نہیں دیکھا اٹھارہ برسوں میں کسی ایسے کو اس چوبارے پر آتے جو صرف دل کا خریدار ہو۔" اس کے لہجے میں پتا نہیں ایسا کیا تھا کہ

رانی نے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
”کیوں...... کیا تو دل کا سودا کرنا چاہتی ہے؟“
”پتا نہیں......“ وہ اپنی انگلیوں کو چٹخا رہی تھی۔
”ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، صرف اٹھارہ سال......“ رانی ہنسی تھی۔ ”ابھی سیکڑوں آئیں گے اپنا دل تیرے قدموں میں رکھنے......“
”لیکن مجھے سیکڑوں کی تو نہیں بس ایک کی چاہ ہے۔“ شہزادی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
”ہائے کیا تیرا من ابھی سے کسی کا طلبگار ہو گیا ہے۔ ابھی تو...... تو محفل میں بھی نہیں آئی...... سچ بتا کون ہے؟“
”نہیں ایسی کوئی بات نہیں رانی...... میں نے یونہی ایک بات کہی تھی...... میں تو کچھ اور سوچتی ہوں۔“
”کیا بھلا......؟“ رانی نے ادھ میچی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
”مجھے کسی دل والے کی تلاش نہیں ہے رانی، نہ مجھے اپنے دل کا سودا کرنا ہے۔“
”پھر کیا سوچتی رہتی ہے ہر وقت...... جب سے کالج جانا چھوڑا ہے، ہر وقت گم صم رہتی ہو۔“
”میں تو یہ سوچتی ہوں کہ کیا اماں سچ مچ ہماری اماں ہیں اور ہم دونوں سگی بہنیں ہیں اور ہمارا باپ......؟“
”باپ تو جو بھی تھا مر کھپ گیا ہوگا...... چاندنی نے ہی بتایا تھا مجھے اماں نے رامو استاد سے نکاح پڑھوایا تھا...... بہت شوق تھا اسے گھر بنا کر رہنے کا...... اب پتا نہیں اس نے نکاح پڑھوایا بھی تھا یا نہیں...... لیکن چاندنی کہتی ہے تیری ماں کو شوق تھا اور رامو، میں جب دو سال کی تھی چلا گیا مڑ کر آیا ہی نہیں...... اور رہی اماں کی بات تو وہ تو سو فی صد ہماری ماں ہیں...... سگی ماں......“ شہزادی کی آنکھیں بجھ گئیں اور چہرہ پھیکا، پھیکا لگنے لگا۔
”کاش اماں ہماری سگی اماں نہ ہوتیں، میں یہ سوچ، سوچ کر خوش ہوتی رہتی کہ میں نے یہاں شاہی محلے کے اس چوبارے میں جنم نہیں لیا...... کسی اعلیٰ خاندان کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور کوئی اغوا کر کے مجھے اماں کے پاس چھوڑ گیا تھا اور میری رگوں میں دوڑنے والا خون...... ہا...... یہ سوچنا بھی کتنا خوش کن اور دلفریب ہے ناں......“
”اسی لیے اماں کہتی ہیں رسالے نہ پڑھا کر دماغ خراب کرتے ہیں...... اب یہ تو کہانیوں اور فلموں میں ہوتا ہے ناں کہ کوٹھے پر پلنے والی کسی نواب یا امیر زادے کی بیٹی ہو اور وہ اسے ڈھونڈتا ہوا آئے اور اپنی دنیا میں واپس لے جائے...... لیکن ہم تم اگر کسی نواب کی اولاد بھی ہوں تو کوئی ہمیں ڈھونڈتا ہوا نہیں آئے گا، شہزادی کہانیوں اور حقیقتوں میں بہت فرق ہوتا ہے چندا......“
”لیکن کبھی کبھی حقیقت میں بھی تو ایسا ہوتا ہے کہ شریف ماں، باپ کی بیٹی چوبارے پر پہنچ جاتی ہے جیسے صبو، راگنی اور پنو...... یہ تینوں تو اماں کی بیٹیاں نہیں ہیں ناں......“
”صبو تو گھر سے بھاگی تھی اور اس کا عاشق اماں کے پاس اسے بیچ گیا...... راگنی تو اسی گلی کی ہے اور پنو کا مجھے پتا نہیں۔“ رانی نے جمائی لی۔
”کاش میں بھی اماں کی بیٹی نہیں ہوتی، بھلے میرا عاشق ہی مجھے بیچ گیا ہوتا......“ اس کی آنکھوں سے کوئی حسرت جھانکنے لگی تھی۔
”تو اماں کی بیٹی ہی ہے شہزادی، تجھے یقین کیوں نہیں آتا...... ہزار دفعہ تو چاندنی سارا قصہ سنا چکی ہے، پیدا ہونے سے لے کر اب تک کہ اس نے ہمارے لنگوٹ دھوئے، ہمیں پالا...... اور تو جب پیدا ہوئی تھی تو کالی سیاہ چوہیا جیسی تھی...... اور پھر جب تو نے دانت نکالے تو کتنا تنگ کیا تھا تو نے...... اور پھر جب سیڑھیوں سے گر کر دانت تڑوا بیٹھی تھی تو...... پھر بھی یقین نہیں آتا تو دوبارہ پوچھ لو...... چاندنی کو تو بس چابی

دینے کی ضرورت ہے...... شروع ہو جائے گی......“
”اُف...... او...... رانی پتا ہے مجھے سب جانتی ہوں کہ میں اماں کی ہی بیٹی ہوں...... لیکن میں خواب دیکھنا چاہتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے تو پھر تم کیوں مجھے نہیں دیکھنے دیتیں۔“
”ٹھیک ہے بابا دیکھو خواب اور اب مجھے سونے دو، تین بجنے والے ہیں۔“
رانی نے چادر سر تک اوڑھ لی اور کروٹ بدل لی، شہزادی کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر بتی بجھا دی لیکن بستر پر جانے کے بجائے وہ پھر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی اور پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی تھی۔ باہر اندھیرا تھا...... کھڑکیوں سے آنے والی مدھم روشنی بھی نہیں تھی...... کھڑکی کے عین نیچے سے کسی بلی کے رونے کی آواز آئی تھی۔ پتا نہیں یہ بلیاں کیوں روتی ہیں۔ مشتری بہت چڑتی تھی، نری نحوست...... کسی چوبارے کی کھڑکی کھلی تھی اور کسی نے کوشش کرتے ہوئے کوئی پتھر پھینکا تھا...... اور بلی کے رونے کی آواز اب بند ہو گئی تھی لیکن وہ یونہی کھڑکی میں کھڑی رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی۔ کمرے میں رانی کے ہلکے، ہلکے خراٹے گونجنے لگے تھے۔
”اور رانی کتنی مطمئن ہے اور اپنی اس زندگی سے...... پتا نہیں میں کیوں مطمئن نہیں ہوتی...... شاید اس لیے کہ رانی نے زندگی کو صرف اس چوبارے کے اندر ہی دیکھا ہے اور میں نے اس کے علاوہ بھی ایک اور زندگی دیکھی ہے۔ ایک بالکل مختلف زندگی...... مولوی صاحب کے گھر کی زندگی...... وہاں مولوی صاحب کے گھر کی زندگی میں بلا کی کشش محسوس ہوتی تھی۔“ وہ کھڑکی سے لگی باہر اندھیری گلی میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی...... وہ سب کچھ جو اس نے سنا تھا اور اسے بتایا گیا تھا اور وہ سب کچھ جو اس کے خود اپنے ساتھ بیتا تھا۔
تقسیم سے پہلے مشتری بیگم کی ماں جہاں آرا راول پنڈی میں ”بلیوں کی سراں......“ میں رہتی تھیں اور میجر پارسن اکثر اس کے پاس آتا تھا یا چھاؤنی بلا لیتا تھا۔ کہتے تھے کہ میجر پارسن کا دل آ گیا تھا اس پر اور جب وہ راول پنڈی سے لاہور آیا تو اسے بھی ساتھ ہی لے آیا تھا...... یہ وہ دن تھے جب ملک کی تقسیم کا شور تھا...... جہاں آرا کچھ عرصہ میجر پارسن کے ساتھ اس کے ماڈل ٹاؤن والے بنگلے میں رہی تھی اور پھر جب ملک کی تقسیم کے بعد میجر پارسن کو ملک چھوڑنا پڑا تو وہ ایک چھوٹی گود کی بچی کے ساتھ اس چوبارے میں آ گئی تھی۔ وہ بچی یعنی مشتری بیگم اسی میجر پارسن کی اولاد تھی۔ نیلی کچور آنکھیں، چٹا گورا رنگ بالکل انگریزوں جیسا......
اکثر چاندنی جب فارغ ہوتی تو بتایا کرتی تھی اس چوبارے میں پہلے گومتی رہتی تھی اور میجر پارسن کی جہاں آرا سے بھی پہلے اس سے بہت راہ رسم تھی...... راول پنڈی جانے سے پہلے وہ اکثر گومتی کو اپنے بنگلے میں لے جاتا تھا اور گومتی مہینوں وہاں رہتی تھی...... اور تقسیم کے بعد میجر پارسن نے ہی اسے بحفاظت سرحد پار بھجوانے کا انتظام کروایا تھا اور جانے سے پہلے میجر پارسن کے کہنے پر بھی وہ اپنا چوبارہ جہاں آرا کو دے گئی تھی...... سجا سجایا سامان سے بھرا...... چاندنی تو یہ بھی کہتی تھی کہ یہ قالین دراصل میجر پارسن نے ہی جہاں آرا کو گفٹ کیا تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا تھا تو چاندنی ہی کوئی چار پانچ سال کی تھی۔ جب جہاں آرا چوبارے میں آئی تو سازندوں اور استاد رنگو کے علاوہ یہ بچی بھی وہاں موجود تھی۔ یوں چاندنی بھی جہاں آرا کو تحفے میں ملی تھی...... نام تو اس کا چاندنی تھا لیکن وہ خود سیاہ اندھیری رات تھی۔ سیاہ رنگ، چھوٹا سا قد، چپٹی ناک لیکن اب 65 سال کی عمر میں بھی بڑی پھرتیلی تھی...... باورچی خانے کا کام اس نے کب سنبھالا تھا یہ تو مشتری بیگم کو بھی یاد نہیں تھا لیکن جب سے مشتری

نے ہوش سنبھالا تھا اسے باورچی خانے میں ہی دیکھا تھا۔ عمر میں مشتری سے چار پانچ سال ہی بڑی تھی۔ ڈیوڑھی پر بیٹھنے والا تاجا سازندے، استاد رنگو سب گومتی کے بعد جہاں آرا کی ذمّے داری بن گئے تھے، افراتفری کا زمانہ تھا۔ بہت عرصے تک چوبارہ بے آباد ہی رہا...... اِدھر اُدھر بھی چوبارے خالی ہی دِکھتے تھے پہلے تاجا گیا پھر کچھ سازندے دوسرے چوبارے پر چلے گئے لیکن چاندنی یہاں ہی رہی...... پھر ہولے، ہولے لوگ تقسیم کے دکھ بھولنے لگے...... زخموں پر کھرنڈ جم گئی تو چوبارے پھر سے آباد ہوگئے...... لٹی پٹی بے سہارا لڑکیاں بھی مطلبی، خودغرض اور لالچی لوگوں کے طفیل پہنچائی جانے لگیں تو جہاں آرا کا چوبارہ بھی آباد ہوگیا...... مشتری، جہاں آرا کی واحد اولاد تھی، جہاں آرا نے اس کی تربیت شروع کردی تھی...... لیکن چوبارے میں دو تین لڑکیاں...... مظلوم سہارے کی آس میں دھوکا کھا کر یہاں پہنچ گئی تھیں...... چاندنی کہتی تھی کہ اس نے تاجے سے شادی کرلی تھی...... بقول مشتری، تاجا بھی چاندنی کے جوڑ کا ہی تھا۔ کالا بھجنگ ایک آنکھ سے کانا اور خانو اسی پر گیا تھا...... پر چاندنی کی جان اٹکی رہتی تھی اس میں، چالیس سال کا ہوگیا تھا لیکن چاندنی کا بس نہیں چلتا تھا کہ نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں دے لیکن اگر وہ تاجے کا بیٹا تھا جب تاجا یہاں سے گیا تھا تو چاندنی ہی کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی اور خانو کی عمر ہونی چاہیے ستاون، اٹھاون سال کہ پاکستان بنے ساٹھ سال ہوچکے تھے لیکن خانو تھا ہی انتالیس، چالیس کا اور بقول چاندنی کے پاکستان بنے تین سال ہوئے تھے جب تاجا اور دوسرے لوگوں نے چوبارہ چھوڑا تھا تو چاندنی سات آٹھ سال کی تھی تو...... یہاں آکر شہزادی کا سارا حساب گڑبڑ ہوجاتا تھا لیکن پھر بھی اس نے چاندنی کی بات کو مان لیا تھا کہ خانو اس کا بیٹا ہے اور تاجا، خانو کا باپ...... خانو باہر کے سارے کام کرتا تھا...... جہاں آرا کے بعد بھی چوبارہ آباد رہا کہ مشتری خوب صورت بھی تھی اور گلے میں سُر بھی تھا...... لیکن پتا نہیں کہاں سے اس کے دل میں گھر، گرہستی کا شوق چرایا تھا۔

''چاندنی میں شادی کرنا چاہتی ہوں......'' لیکن حسن کے قصیدے پڑھنے والے تو بہت تھے لیکن شادی کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ تب پینتیس سال کی عمر میں مشتری نے موسیقی سکھانے والے استاد راموے ہی شادی کرلی...... رامو پچاس، پچپن کا تھا لیکن پھر جب رانی دو سال کی ہوئی تو رامو ایک روز میو اسپتال میں پٹی کروانے گیا اور پھر مڑ کر نہیں آیا...... حالانکہ مشتری نے تو چاندنی کے ساتھ جاکر مردہ خانے میں بھی دیکھ لیا تھا تو اب رانی تھی پچیس سال کی اور شہزادی تھی پورے اٹھارہ سال کی اور یہاں آکر شہزادی کا حساب پھر گڑبڑ ہوجاتا اور وہ خواب دیکھنے لگتی تھی کہ وہ کسی بڑے آدمی کی اکلوتی بیٹی تھی جسے اغوا کرکے کوئی غنڈہ مشتری کے چوبارے میں چھوڑ گیا تھا لیکن اس کے خوابوں کو رانی یوں تار تار کردیتی جیسے روشنی رات بھر دیکھے گئے خوابوں کو آنکھوں سے نوچ لیتی ہے...... چاندنی بھی روشنی کی طرح ظالم تھی اس کے خوابوں کو بے دردی سے نوچتے ہوئے ذرا نہ ہچکچاتی، شہزادی کو وہ اپنے سامنے کے ایک ٹوٹے ہوئے دانت کے ساتھ ہنستی ہوئی بالکل چڑیل لگتی تھی حالانکہ اسے چاندنی سے بھی بہت محبت تھی۔

☆☆☆

''وہ بڑی کالی سیاہ رات تھی باہر بادل زور سے گرجتا تھا اور چوبارے کی کھڑکیوں سے جیسے بجلی لپک، لپک کر اندر آتی تھی اور مشتری درد اور تکلیف سے تڑپتی تھی...... میں بھاگ بھاگ کر ڈیوڑھی تک جاتی تھی...... اور باہر چھاجوں چھاج برستا مینہ اور اس پر ٹھک، ٹھک گرتے اولے...... کب کا گیا خانو سواری لے کر نہیں مڑا تھا اور سواری ملتی بھی

کیسے...... اسپتال میں نام درج کرا رکھا تھا...... گلی ویران نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات...... خانو بھی بوری لپیٹے ہانپتا کانپتا واپس آگیا...... نہ تانگا نہ ٹیکسی کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ بس پھر اللہ کا نام لے کر میں مشتری کے پاس بیٹھ گئی...... اور تو، تو میرے ہاتھوں میں پیدا ہوئی تھی اسی چوبارے کے اس کمرے میں جس میں اب نیا بیڈ بچھا ہے، صبح جب مشتری نے دیکھا تو حق دق...... رہ گئی سوکھی سڑی کالی سرخ سی چوہیا جیسی لگ رہی تھیں تم۔''

اور شہزادی کے خوابوں کا شیش محل دھڑام سے گر کر چکنا چور ہوجاتا...... اس کے نصیب میں تو اسپتال میں پیدا ہونا بھی نہیں لکھا تھا۔ یہیں پیدا ہوئی یہیں مرجائے گی...... اور وہ کتنی ہی دیر تک ان خیالی کرچیوں کو انگلیوں کی پوروں سے چن، چن کر ہاتھ زخمی کرتی رہتی تھی اور یہ تب کی بات تھی جب اس نے مولوی صاحب کے گھر جانا شروع کیا تھا اور اب تو وہ چاندنی سے پوچھتی ہی نہیں تھی کچھ اور بارہ سال پہلے کی سنی بات کو وہ خود ہی خود جھٹلاتی رہتی تھی۔'' چاندنی کو تو شوق ہے خواہ مخواہ اپنے کارنامے بتانے کا......''

بارہ سال پہلے جب وہ چھ سال کی تھی تو مشتری کو اچانک عاقبت سنوارنے کا خیال آیا تھا اس روز وہ باہر سے آئی تھی جب چاندنی نے اسے بتایا تھا۔

''ساتھ والی گلی کی گلشن بائی مرگئی اور مرتے دم سرہانے یٰسین شریف پڑھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہائے مشتری پورے چوبارے کی لڑکیوں میں ایک کو بھی یٰسین شریف نہ آتی تھی۔ ڈیوڑھی کا لڑکا مولوی صاحب کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اِدھر گلشن کی سانس اٹکی ہوئی تھی...... ہائے مشتری میں تو دہل گئی تھی۔ وہاں کھڑی کونے میں گلشن کو دیکھتی تھی...... ہائے مشتری تو نے کیوں نہ قرآن پاک پڑھا......''

اور تبھی مشتری کی نظر شہزادی پر ٹھہر گئی تھی۔ جھٹ کالا فیشنی برقع پہن کر شہزادی کا ہاتھ پکڑ، مولوی صاحب کے ہاں پہنچ گئی...... یہ مولوی صاحب کبھی کبھار شاہی محلے میں آتے تھے جب کبھی چوبارے والیاں نیاز دلواتیں یا کسی کا چوتھا، دسواں، چالیسواں ہوتا تو انہی مولوی صاحب کو بلوایا جاتا تھا کہ دعا کروادیں۔ بھلے مانس آدمی تھے۔ چپ چاپ بغیر کسی حیل وحجت کے چلے آتے تھے۔ کوئی گلی میں داخل ہوتے دیکھ کر مذاق بھی اُڑا دیتا تو پروا نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا گھر شاہی مسجد کے عقب میں تھا۔ خود مولوی صاحب شاہدرہ کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد میں پیش امام تھے، گھر میں ان کی بیوی، بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں...... غریب اور متوسط گھرانے کی بچیاں پڑھنے آتی تھیں۔ چھوٹا سا گھر تھا دو کمرے اور ان کے آگے برآمدہ، برآمدے کے ساتھ باورچی خانہ پھر صحن، صحن میں غسل خانہ، لڑکیاں برآمدے میں ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے بیٹھی تھیں اور سامنے رحل پر رکھے سیپاروں کو ہل، ہل کر پڑھتی تھیں۔ شہزادی کو یہ سب بڑا اچھا لگتا تھا اور انوکھا بھی۔ استانی جی پیڑھی پر بیٹھ جاتی تھیں اور ایک، ایک لڑکی کو پاس بلا کر سبق دیتی اور سنتی تھیں۔ وہ صبح فجر کے بعد اور دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد پڑھاتی تھیں...... لیکن کچھ اسکول پڑھنے والی لڑکیاں صبح نہیں آتی تھیں صرف ظہر کے بعد آتی تھیں۔ ہاں چھٹی والے دن دونوں ٹائم آتی تھیں۔ پر مشتری نے استانی جی کو بتادیا تھا کہ شہزادی صرف دوپہر میں آئے گی...... کبھی خانو اور کبھی چاندنی اسے چھوڑ جاتے تھے...... اور لے بھی جاتے تھے...... کبھی کبھار اگر پڑھنے کے بعد دیر ہوجاتی تو وہ زیب النسا کے ساتھ کھیلنے لگتی تھی۔ زیب النسا مولوی صاحب کی بیٹی تھی اور تقریباً اس کی ہم عمر ہی تھی...... وہ دونوں باورچی خانے کے اوپر بنی دو چھتی میں جاکر کھیلتیں...... اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹین کا بکسا تھا جس میں اس نے اپنے کھلونے اور گڑیاں وغیرہ

www.paksociety.com

رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس دو تین گڑیاں تھیں...... کپڑے کی بنی ہوئی اور ایک پلاسٹک کی گڑیا بھی تھی لیکن اس کے پاس پلاسٹک، مٹی اور ٹین کے بے شمار کھلونے تھے...... گرہستی کا سارا سامان ...... چولھے، ہانڈی سے لے کر جگ، گلاس وغیرہ وہ جھوٹ موٹ کا کھانا پکاتیں، پیالیوں میں پانی کی چائے اور پلیٹوں اور ڈونگوں میں کچے چاول اور بھنے دانے رکھ کر کھانا کھاتیں۔ کبھی کبھی زیب النسا گڑیا کی شادی بھی رچاتی...... کبھی گڈی اسے دے دیتی اور گڈا خود رکھ کر بیاہ رچاتی کبھی گڈا اسے دیتی اور گڑیا خود رکھ لیتی...... ہمیشہ نکاح کے لیے عبدالرحمٰن کو بلایا جاتا جو زیب النسا کا بھائی تھا اور اس سے چار سال بڑا تھا۔ مولوی صاحب کے بس یہی دو بچے تھے۔ کبھی کبھار زیب النسا کی دو تین اور سہیلیاں بھی ہوتیں...... اور کئی بار جب خانو اسے لینے آجاتا تو اس کی گڑیا کی رخصتی اور نکاح ادھورا ہی رہ جاتا جس پر اسے بہت افسوس ہوتا اور یہ وہ زندگی تھی جو اس کے گھر کی زندگی سے بالکل مختلف تھی انوکھی اور پُرکشش ...... اور استانی جی بھی اسے مشتری اور چاندنی سے مختلف لگتی تھیں۔ جب وہ دوپٹے کی بُکل مار کر نماز پڑھتیں تو وہ انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ اور ایک بار اس نے مشتری سے کہا تھا کہ وہ بھی استانی جی کی طرح نماز پڑھا کرے تو مشتری نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے نماز پڑھنی نہیں آتی لیکن وہ ہے پکی مسلمان۔ تب اس نے مشتری سے کہا تھا کہ وہ استانی جی سے نماز پڑھنا سیکھ کر اسے بھی سکھا دے گی۔ وہ استانی جی کی ہر حرکت کو غور سے دیکھتی اور مشتری کے ساتھ موازنہ کرتی رہتی تھی۔ استانی جی پڑھاتے، پڑھاتے اٹھ کر کام بھی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی باورچی خانے جا کر ہانڈی چڑھا آتیں کبھی دھلے کپڑے تہ کرنے لگتیں کبھی لڑکیوں کو سبق دے کر فارغ ہوتیں تو کروشیہ اٹھا کر کسی دوپٹے کی لیس (بیل) بنا رہی ہوتیں، کبھی کڑھائی کر رہی ہوتیں...... مولوی صاحب گھر آتے تو سر جھکائے کمرے میں چلے جاتے وہ فوراً اٹھ کر جاتیں کبھی چائے بنا کر لے جاتیں اور کبھی پانی گلاس میں ڈال کر ان کی خدمت میں لے جاتیں۔ زیب النسا .... جب انہیں ابا کہہ کر بلاتی تو اسے اچھا لگتا تھا وہ دل ہی دل میں خود بھی ابا کہہ کر اس کی حلاوت کو محسوس کرتی۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اس نے اماں سے پوچھا تھا کہ اس کے ابا کہاں ہیں تو مشتری نے بتایا تھا کہ مر گیا تیرا ابا...... اور اس روز وہ چپکے، چپکے بہت روئی تھی۔ اسے زیب النسا جیسے کھلونے لینے کا بھی شوق تھا۔ ''ایسے ہی کھلونوں اور گڑیوں سے کھیل کر لڑکیاں گرہستی سیکھتی ہیں۔ پر تجھے کون سا گرہستی چلانی ہے۔'' چاندنی نے اسے پلاسٹک کا کھلونا ڈنر سیٹ لے کر دیتے ہوئے کہا تھا...... تب تو وہ چاندنی کی بات نہ سمجھ سکی تھی لیکن اب اچھی طرح سمجھتی تھی۔

وہ مولوی صاحب کے گھر قرآن پاک پڑھنے جاتی تھی۔ مشتری نے چاندنی کے کہنے پر بھی اسے گانا سیکھنے کے لیے نہیں بٹھایا...... پتا نہیں کیوں...... ٹال دیا چاندنی کو۔

''پہلے کلام پاک تو پڑھ لے، نہ اُدھر کی رہے گی نہ اِدھر کی...... اور تیرے مرتے سمے مولوی صاحب نہ ملے تو پھر سرہانے یٰسین شریف کون پڑھے گا۔''

مشتری ہنسی تھی اور چاندی نے سر ہلا دیا تھا لیکن سُر تو اس کے گلے میں بولتے تھے۔ مولوی صاحب کے گھر میلاد ہوا تو اس نے بھی زیب النسا کے ساتھ مل کر نعت پڑھی اور جب گھر میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے نعت کے بول دُہرانے لگی تو استاد جی چونکے...... کئی بار بلا کر نعت سنی اور مشتری سے کہا۔

''تیری بیٹی کے گلے میں سُر بولتے ہیں۔'' اور جس روز اس نے زیب النسا سے سیکھی ہوئی دعا طرز لگا کر مشتری کو سنائی تو مشتری تو جھوم، جھوم اٹھی۔ کیا سوز تھا...... کیا آواز تھی...... معصوم آواز میں اتنا سحر، نہ سکھایا نہ بتایا اور نہ کہیں سانس ٹوٹی اور نہ کہیں سُر اونچے نیچے ہوئے۔ وہ لہک لہک کر گاتی رہی۔

''آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے جاؤ راہ جانے کے لیے
اے دعا ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کر
اے خدا اب پھیر دے رخ گردشِ ایام کے
خلق کے روندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں''

''کہاں سے سیکھا یہ؟'' مشتری نے اسے چوم کر کہا تھا۔

''زیب النسا نے سکھائی ہے اور اس نے استانی جی سے سیکھی ہے۔ استانی جی کہتی ہیں ان کے زمانے میں صبح صبح لڑکیاں اسمبلی میں پڑھتی تھیں کبھی لب پہ آتی ہے دعا اور کبھی یہ...... ایک لڑکی پہلے پڑھتی آگے کھڑے ہو کر اور باقی اس کے پیچھے بعد میں مل کر دُہراتی تھیں۔'' اور ساتھ ہی اس نے فرمائش بھی کر ڈالی۔

''اماں مجھے بھی زیب النسا کے اسکول میں داخل کروا دو ناں......''

''لو اور سنو......'' مشتری نے چاندنی کی طرف دیکھا تھا۔

''گلشن کے چوبارے کی تو بہت ساری لڑکیاں اسکول جاتی ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے مشتری...... اب یہ 1950ء تو ہے نہیں، ارے پڑھائی بھی تو سمجھو میک اپ کی طرح ہے، سرخی پاؤڈر منہ کو چمکاتا ہے تو پڑھائی پوری ذات کو چمکا دیتی ہے۔'' اور چاندنی جھٹ سے بولی تھی۔

یوں شہزادی اسکول بھی جانے لگی تھی لیکن ساتھ ہی مشتری کے کہنے پر موسیقی کے اسباق بھی استاد جی نے دینے شروع کر دیے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ تھوڑی دیر بعد ہی پہلو بدلنے لگتی تھی۔

حالانکہ استاد جی اس پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ آواز خداداد تھی۔ موسیقی کے رموز واوقاف سکھاتے ہوئے انہوں نے سارے ہی راگوں میں اسے طاق کر دیا تھا...... پہلا مکمل کلام جو اس نے سنایا تھا وہ اقبال کا کلام تھا۔ استاد جی بھی رمز شناس تھے۔ جانتے تھے کہ ایسی ہی چیزیں ڈوب کر پڑھتی ہے مشتری کے سامنے آج امتحان مقصود تھا۔

''نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر''

جوں ہی اس نے بول اٹھائے محفل میں سکوت چھا گیا۔ یہ کوئی معمول کی محفل نہیں تھی اس میں صرف مشتری، چاندنی، خانو اور سازندے تھے...... مشتری تو جیسے اس کی آواز کے سحر میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے سر پر دوپٹا اچھی طرح کیے دو زانو...... بیٹھی پڑھ رہی تھی۔

''شہیدِ عشق نبی ﷺ کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے
اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر''

اور جب پوری نعت پڑھنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں تو مشتری کی آنکھوں میں نمی تھی اور چاندنی تو باقاعدہ انگلیاں چومتے ہوئے آنکھوں سے مس کرتی تھی اور روئے جاتی تھی اور جب مشتری بولی تو اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''استاد جی ہماری شہزادی تو اپنی آواز سے ہی دلوں کو قدموں میں گرا لے گی۔'' لیکن اسے دلوں کو قدموں میں گرانے کا شوق نہیں تھا اسے تو بس ایک دل کی تمنا تھی جو اس کے قدموں میں نہ گرے اس کے پہلو میں اس کے دل کے ساتھ دھڑکے...... اور جس روز اس نے یہ نعت پڑھی تھی وہ ساتویں جماعت کی طالبہ تھی...... قرآن پاک اس نے ختم کر لیا تھا اور یٰسین شریف کے علاوہ کئی اور سورتیں بھی زبانی یاد کروائی تھیں استانی جی نے اور جب اس نے چاندنی کو سورۂ یٰسین زبانی خوب صورت قرأت

کے ساتھ سنائی تھی تو چاندنی کے دل میں ایسا اطمینان اترا تھا۔ موت کا خوف اور جان اٹکی رہ جانے کا ڈر یک دم ختم ہوگیا تھا اور اس روز اس نے مشتری کے گھٹنے تھام کر کہا تھا۔

”مشتری میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”کیسا احسان؟“ مشتری ہاتھوں اور بالوں کو موتیے کے گجروں سے سجا رہی تھی۔

”تو نے شہزادی بٹیا کو قرآن پاک پڑھوا دیا۔“

”تجھے یقین ہے چاندنی جب تیری آخری سانس تیرے حلق میں اٹکے گی تو شہزادی تیرے پاس ہوگی؟ کیا پتا پہلے ہی کہیں اُڑ اڑا جائے۔ یہ پرانا دور نہیں ہے کہ ساری عمر ایک ہی چوبارے میں گزار دیں...... لڑکی کو تیرے کہنے پر میں نے اسکول بھی داخل کروا دیا ہو سکتا ہے فلموں میں چلی جائے...... بھاگ جائے کسی کے ساتھ گھر بسا لے۔“ مشتری کبھی کبھی یوں ہی جی جلاتی تھی۔ ایک لمحے کو چاندنی کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔

”جو اللہ کی رضا مشتری......“ اس نے صحن میں بال سکھاتی شہزادی کو دیکھا تھا۔ دبلی پتلی سانولی سوکھی...... اسے بھلا کس نے فلم میں کام دینا ہے اور کس نے دل کی ملکہ بنانا ہے۔ لیکن یہی سوکھی سڑی شہزادی جب سولھویں برس میں پہنچی تو مشتری نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ کیا رنگ و روپ نکالا تھا اس نے سیاہ غزال آنکھیں، لمبے گھنے بال، خوب صورت قد بت، سانولا رنگ لیکن اتنی ملاحت اتنی دلکشی کہ وہ گوری چٹی رانی سے بھی زیادہ پیاری لگنے لگی تھی اور جس روز استاد جی نے اسے اوکے کیا تھا کہ اب محفل میں بٹھا دو۔ اسی روز اس نے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔

”نہ استاد جی، ابھی پڑھ رہی ہے وہ، دو سال اور پڑھے گی آپ ریاض کرواتے رہیں۔“ اس کے جسم میں بہت لچک تھی۔ کھڑے کھڑے بھی جیسے بل کھاتا نظر آتا تھا لیکن رقص کے لیے اس کے پاؤں اٹھتے ہی نہیں تھے۔ ٹکر ٹکر استاد کا منہ دیکھا کرتی۔

”رقص کو تو رہنے ہی دو مشتری بیگم...... اس کا مزاج نہیں ہے، اس کا گلا ہی تجھے بھوکا مرنے نہیں دے گا۔ سونے میں تُلے گی اپنے سُر اور گلے کی وجہ سے۔“

اور مشتری بھی چپ ہو رہی تھی۔

اور ان دو سالوں میں اس نے گانے میں کمال حاصل کر لیا تھا...... اور بارہ جماعتیں بھی پڑھ لی تھیں...... دس دن پہلے آخری پرچہ دیا تھا اور ان دس دنوں میں ایک بار مشتری نے اسے محفل میں گوایا۔ کالج، یونیورسٹی کے لڑکے تھے اور باقاعدہ کسی بڑی محفل میں گانے سے پہلے مشتری چاہتی تھی کہ وہ پختہ ہو جائے لیکن وہ جو نگاہیں جھکا کر بیٹھی تھی تو آخری بول پر ہی نگاہ اٹھائی تھی۔ ناز نہ ادائیں...... مشتری نے رانی سے کہا کہ ذرا آدابِ محفل بھی سکھاؤ اور رانی ادب آداب کیا سکھاتی تب سے وہ بخار چڑھائے بیٹھی تھی اور سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ پتا نہیں وہ بیمار تھی یا اسے لگتا تھا وہ بیمار ہے۔ اس نے مشتری سے کہا تھا۔ وہ بی اے کرنا چاہتی ہے لیکن مشتری نے صاف منع کر دیا۔

”نہ بھئی میرے جگرے میں اتنا دم نہیں ہے۔ چوبارہ اجڑا ویران کبھی بھولے بسرے کوئی آ جائے تو اور وہ بھی صرف گانا سننے کو نہیں مانگتے اور تقاضے کرتے ہیں اب ساری عمر گانے کے علاوہ اور کام نہیں کیا تو اب کیا ریت روایت بدل دیں۔ درجن بھر بندوں کا پیٹ بھریں یا تیرا پڑھائی کا خرچہ پورا کریں؟“ اور شہزادی جانتی تھی کہ مشتری غلط نہیں کہتی تھی۔

”ارے شہزادی یہاں آنے والے سب بھوکے ننگے ٹٹ پونجیے جیب سے پیسہ نکالتے جان نکلتی ہے۔ دو ٹکے جیب میں ڈال کر آ جاتے ہیں گانا سننے...... ہونہہ۔“

شہزادی نے سوچا تھا وہ روزن بند ہوا جس سے ٹھنڈی میٹھی ہوا کے جھونکے آتے تھے۔ وہ پڑھائی

میں کوئی ممتاز طالبہ نہیں تھی لیکن وہ پڑھنا چاہتی تھی جب وہ اپنی گلی سے نکل کر شاہی مسجد کے میناروں پر نظر ڈالتے ہوئے اسٹاپ پر کھڑی ہوتی تو اسے لگتا تھا یہ کوئی اور شہزادی ہے اور چوبارے میں رہنے والی مشتری بیگم کی بیٹی وہاں ہی پیچھے رہ گئی ہے۔

مولوی صاحب کے گھر جانا تو پہلے ہی چھوٹ چکا تھا اور کالج وہ جگہ تھی جہاں وہ ---- بالکل ایک الگ ماحول میں سانس لیتی تھی۔ اس ماحول میں تازگی تھی اور پاکیزگی بھی اور زیب النسا بھی۔

اگرچہ زیب النسا اس سے ایک درجہ آگے تھی لیکن دونوں میں دوستی بہت تھی اور یہ دوستی اسکول کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

زیب النسا وہ واحد لڑکی تھی جو اس کے پس منظر سے واقف تھی لیکن پھر بھی اسے اپنا بہترین دوست سمجھتی تھی۔ بہت پہلے جب وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اسے شہزادی کے متعلق پتا چل گیا تھا۔

زیب النسا کو شہزادی کی سالگرہ کا گفٹ دینے اس کے گھر جانا تھا ان جیسی متوسط گھرانے کی لڑکیوں میں سالگرہ منانے کا رواج نہیں تھا لیکن لڑکیاں اپنی دوستوں کو اسکول میں چھوٹے موٹے گفٹ دیا کرتی تھیں۔ شہزادی نے بھی اسے گفٹ دیا تھا اور اب وہ جانا چاہتی تھی اس نے شہزادی کے لیے چوڑیاں اور ٹاپس خریدے تھے لیکن ابا نے اسے منع کر دیا تھا اور بہت رسان سے سمجھا دیا تھا کہ وہ وہاں نہیں جا سکتی لیکن انہوں نے اسے شہزادی سے بات کرنے یا دوستی رکھنے سے منع نہیں کیا تھا۔ سو زیب النسا نے اگلے دن اُسے اسکول میں ہی گفٹ دے کر وعدے کے مطابق اس کے گھر نہ آسکنے کی وجہ بتا دی تھی جبکہ رانی نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ زیب النسا...... کا انتظار نہ کرے وہ نہیں آئے گی لیکن زیب النسا...... اس کی سہیلی تھی وہ اس کے گھر نہیں آسکتی تھی لیکن شہزادی تو جا سکتی تھی ناں سو وہ زیادہ تو نہیں بس دو تین بار اس کے گھر گئی تھی سات آٹھ سالوں میں کتنا جی چاہتا تھا اس کا کہ پہلے کی طرح وہ ہر روز ان کے گھر جائے اور ہر روز وہاں کی کوئی ایسی بات جو اس کے گھر میں نہیں تھی دل میں سجا کر لے آئے لیکن اب وہ قرآن پاک ختم کر چکی تھی شاید استانی جی اور مولوی صاحب بھی اس کا آنا پسند نہ کرتے پھر اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا اسے ریاض کرنا ہوتا تھا، پڑھنا ہوتا تھا اور پھر اسے رانی اور مشتری سے بھی سیکھنا ہوتا تھا تو وہ صرف تین چار بار ہی ان سارے سالوں میں اس کے گھر گئی تھی۔ ایک بار جب زیب النسا نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ وہ مٹھائی کا ڈبا لے کر آئی تھی۔ اس گھر میں آنے کا اس کا ہمیشہ ہی بہت دل چاہتا تھا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا اور وہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا کیونکہ بچیاں آگے پیچھے قرآن پاک پڑھنے کے لیے آتی رہتی تھیں لیکن اس روز ابھی بچیوں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن دروازے پر پھر بھی کنڈی نہیں لگی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ سامنے ہی برآمدے میں تخت پر عبدالرحمٰن استانی جی کی گود میں سر رکھے نیم دراز تھا اور استانی جی اس کے بالوں میں بہت پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ آہٹ پر عبدالرحمٰن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں اور چھوٹی سی داڑھی...... یہ عبدالرحمٰن کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ پھر عبدالرحمٰن اٹھ کر اندر کمرے میں غائب ہو گیا اور وہ جیسے چونک پڑی۔ استانی جی اسے آگے آنے کو کہہ رہی تھیں۔

”ارے بیٹی کھڑی کیوں ہو گئی ہو آ جاؤ۔“

اور پھر وہ زیب النسا کو آواز دینے لگی تھیں۔

”ارے زیب دیکھو کون آیا ہے؟“ کتنا مکمل اور کتنا بھرپور منظر تھا جو اس کی آنکھوں میں کھب گیا تھا۔ ماں اور بیٹا...... یہ منظر اسے اپنے گھر میں کہیں

نظر نہیں آیا تھا اور پھر پہلی بار اس نے خواب دیکھا تھا ایک چھوٹا سا گھر صاف ستھرا سا اور تخت پوش پر وہ بیٹھی ہے گود میں ایک پیارے سے بچے کو لیے اور پاس ہی کرسی پر بیٹھا عبدالرحمٰن محبت سے انہیں تکتا ......اور تب وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں پہلی بار عبدالرحمٰن اس کے خوابوں میں آیا تھا اور اب اٹھارہ سال کی عمر تک متعدد بار منظر بدل، بدل کر یہ خواب آتا رہا۔ کبھی وہ عبدالرحمٰن کے سامنے کھانا رکھ رہی ہے، کبھی اس کے کپڑے استری کر رہی ہے، کبھی چھوٹے سے گھر میں جھاڑو دے رہی ہے اور عبدالرحمٰن بچہ اٹھائے کھڑا ہے۔

''کیا اسے عبدالرحمٰن سے محبت ہوگئی ہے؟'' اس نے کئی بار اپنے دل کو ٹٹول، ٹٹول کر خود سے پوچھا تھا۔ اس نے ابھی نئے، نئے ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے تھے اور لفظ محبت سے نئی، نئی آشنا ہوئی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے بھلا عبدالرحمٰن کو دھیان سے دیکھا ہی کب تھا وہ جھپاک سے اندر چلا گیا تھا۔ دراصل اس کا دل عبدالرحمٰن کی محبت میں نہیں اس گھر کی محبت میں ہمکتا تھا جس میں عبدالرحمٰن رہتا تھا اور دوسری بار وہ زیب النسا کے اصرار پر میلاد شریف میں شرکت کے لیے ان کے گھر گئی تھی۔ اس نے زیب النسا سے پوچھا تھا۔

''استانی جی اور مولوی صاحب کو میرے نعت پڑھنے پر اعتراض تو نہیں ہوگا ناں؟'' اب وہ بچی تو نہیں تھی جانتی تھی کہ وہ چھوت کا ایسا مرض ہے جس سے شریف لوگ دور بھاگتے ہیں لیکن یہ گھرانا عجیب گھرانا تھا۔ نہ استانی جی نے اسے قرآن پڑھانے سے انکار کیا نہ اس سے بات کرنے کو زیب النسا کو منع کیا اور اب زیب النسا چاہتی تھی۔ وہ علامہ اقبال کی وہی نعت پڑھے جسے ٹیچرز فرمائش کر کر کے اس سے سنتی تھیں اور استانی جی یا مولوی صاحب نے بالکل منع نہیں کیا تھا۔ سو وہ آئی تھی اور اس نے نعت پڑھی تھی جب وہ نعت پڑھ رہی تھی تو باہر سے گزرتا ہوا عبدالرحمٰن ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر''

آواز تھی یا کوئی جادو تھا جس نے عبدالرحمٰن کے قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

وہ اس وقت تک سحر زدہ سا کھڑا رہا جب تک نعت ختم نہ ہوئی تھی اور جب رات کو کھانا کھاتے ہوئے اس نے زیب النسا سے پوچھا تھا۔

''یہ نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے والی نعت کون پڑھ رہا تھا؟''

''شہزادی تھی۔'' زیب النسا نے بتایا تھا اور لقمہ اس کے ہاتھ سے نیچے پلیٹ میں گر پڑا تھا اور جب صبح کالج میں زیب النسا نے شہزادی کو بتایا کہ عبدالرحمٰن پوچھ رہا تھا کہ یہ نعت کون پڑھ رہا تھا تو شہزادی تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی اور اس رات پھر اس نے خواب دیکھا تھا وہ عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ عبدالرحمٰن وہ اور ان کے بچے۔ یہ وہ خواب تھا جسے وہ بار بار دیکھنا چاہتی تھی پھر بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہے۔

نیچے گلی میں کوئی کتا زور سے بھونکا تھا اور رانی نے کروٹ بدل کر اس کے بیڈ کی طرف دیکھا تھا اور پھر سائڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ کا بٹن دبا دیا تھا اور شہزادی کا خالی بیڈ دیکھ کر یک دم اچھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''شہزادی۔'' اس کے منہ سے گھٹی، گھٹی سی آواز نکلی تھی۔ شہزادی نے مڑ کر دیکھا۔

''کیا ہے رانی؟''

''اوہ۔'' رانی نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ ''تم وہاں اندھیرے میں کھڑی کیا کر رہی ہو اور تم سوئی نہیں ابھی تک۔ چار بج رہے ہیں۔''

شہزادی کھڑکی بند کر کے اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ''میں تو تمہارا خالی بیڈ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔''

''کیوں، تم نے سمجھا میں بھاگ گئی ہوں؟''

''نہیں خیر اس طرح تو نہیں سوچا۔'' وہ کچھ جھینپی، جھینپی سی آواز میں بولی اور پھر لیٹ گئی۔

''بھگانے والا کوئی ہو تو بھاگ بھی جاؤں رانی، ایک لمحہ نہ رکوں۔ کوئی امیر زادہ تو کیا یہاں تو کوئی بھکاری بھی بھگا لے جانے کو تیار نہ ہو۔'' اس نے سوچتے ہوئے رانی کی طرف دیکھا جس نے پھر آنکھیں بند کرلی تھیں اور کروٹ بدل لی تھی۔

''تم بھی سو جاؤ۔'' رانی نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کیا۔ شہزادی کی آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگ رہی تھیں لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ چار بجے سوئی تھی پھر بھی اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے دھوپ چھن، چھن کر اندر آرہی تھی۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے بازو آنکھوں پر رکھ لیا لیکن دھوپ تو جیسے آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رانی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ایک دو بجے سے پہلے نہیں اٹھتی تھی لیکن کالج جانے کی وجہ سے اسے جلدی اٹھنے کی عادت تھی پھر صبح، صبح وہ اٹھ کر کچھ ریاض بھی کر لیتی تھی۔ بیڈ پر بیٹھے، بیٹھے اس کی نظر رانی کے بیڈ کے پاس نیچے پڑے گھنگروؤں پر پڑی۔ رانی جب رقص کرتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے آس پاس کی ہر شے تھم گئی ہو۔ اس کے اندر جیسے بجلی بھری تھی لیکن وہ......اس کا تو ایک قدم بھی سیدھا نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے استاد جی نے ہار مان لی تھی۔

اس نے کبھی گھنگرو نہیں باندھے تھے۔ اسے

غزل

وہ یار جو ہے مجھے حسبِ حال دیتا ہے
عروج دن کو تو شب کو ملال دیتا ہے

مجھے ذرا سا بھروسا نہیں ہے اب اس پر
وہ میری بات ہوا میں اچھال دیتا ہے

اسے پسند نہیں ہے میری ہنسی شاید
ہر اک خوشی وہ مری غم میں ڈھال دیتا ہے

میری سمجھ میں جواب اس کا کچھ نہیں آتا
وہ لمحہ، لمحہ نیا اِک سوال دیتا ہے

اداس رہنے کی عادت جو ڈال دی اس نے
اب اس کا وصل بھی حُزن و ملال دیتا ہے

کبھی جو وعدے پہ اپنے کھرا نہیں اترا
وہ بے وفائی میں میری مثال دیتا ہے

مرے وجود کو کانٹوں کی نوک پہ رکھ کر
وہ آج غیروں کو الفت کی شال دیتا ہے

میری غزل میں بہت رنگ ہیں مگر دل سے
اسے وہ سنتا ہے سن کر نکال دیتا ہے

شاعر: آصف شہزاد
مرسلہ: ظلِ شاہین، ڈی جی خان

ساری زندگی گھنگرو باندھ کر بھوکی نظروں کے سامنے ناچنا نہیں تھا۔ وہ بیڈ سے اتری اور ہولے، ہولے قدموں سے چلتی ہوئی گھنگروؤں کے پاس رکی اور جھک کر گھنگرو اٹھا لیے۔ سرخ ساٹن کا پٹا۔

''اور ......کیا مجھے بھی ایک دن یہ گھنگرو باندھنے پڑیں گے؟'' اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ جل رہے ہوں۔ اس نے یک دم گھنگرو نیچے پھینک دیے جو ہلکی سی آواز کے ساتھ قالین پر گرے تھے۔ وہ کچھ دیر خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر مڑ کر بیڈ سے دوپٹا اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر کھڑکی کی طرف بڑھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر تیز تیز سانس لی جیسے دم گھٹ رہا ہو۔ گلی اب بھی خاموش اور ویران تھی۔ اس نے تھوڑا سا جھک کر دیکھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کوئی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یکا یک وہ اٹھا اور اس نے سر اٹھا کر اوپر شہزادی کی طرف دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا۔ کیا یہ وہی رات والا تھا جو رات گلی میں کبھی بلند اور کبھی آہستہ آواز میں گاتا تھا۔ اس نے مڑ کر گہری نیند سوئی ہوئی رانی کو دیکھا۔

''یہاں زندگی سوئی ہوئی تھی اور وہاں زیب النسا .... اور عبدالرحمٰن کے گھر زندگی جاگ رہی ہوگی۔ متحرک ......زندہ...استانی جی گرم، گرم پراٹھے پکا رہی ہوں گی، عبدالرحمٰن ، زیب النسا اور مولوی صاحب چولھے کے قریب ہی پیڑھیوں پر بیٹھے ناشتا کر رہے ہوں گے۔ زیب کپوں میں چائے ڈالتی ہوگی۔ آہ...... وہاں زندگی جیتی ہے اور یہاں مرتی ہے پھر ناشتے کے بعد زیب اور عبدالرحمٰن اپنے کالج چلے جائیں گے اور استانی جی کھرے کے پاس بیٹھ کر برتن دھوئیں گی اور صبح کے وقت آنے والی بچیاں برآمدے میں بیٹھی ہل، ہل کر بلند آواز میں سپارے کا سبق یاد کرتی ہوں گی۔'' وہ پھر عبدالرحمٰن کے گھر جا پہنچی تھی۔

اس روز وہ تیسری بار زیب النسا کے گھر گئی تھی۔ اس نے زیب النسا سے گرائمر اور کمپوزیشن کی کتاب لی تھی اور ہر روز کالج لے جانا بھول جاتی تھی۔ اس نے سوچا تھا آج وہ گھر ہی دے آئے۔ گھر کون سا دور تھا۔ گلی سے باہر نکلو تو شاہی مسجد اور شاہی مسجد کے عقب میں شاہی قلعے سے پہلے ایک گلی میں زیب النسا کا گھر تھا تو وہ اسے کمپوزیشن کی کتاب واپس کرنے آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح صحن کا دروازہ دھکیل کر صحن میں آئی تھی۔ سامنے برآمدے میں عبدالرحمٰن کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

اس روز اس نے وہی میلاد کے دن والا لباس پہنا ہوا تھا۔ سفید گھیر دار فراک پر ململ کا سفید کلف لگا دوپٹا جس پر کرن لگی تھی اور کلف کے ساتھ ابرق بھی تھی۔ جو رہ رہ کر چمکتی تھی۔

عبدالرحمٰن کھڑا ہو گیا تھا اور مبہوت سا اسے برآمدے کی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی برآمدے تک آئی تھی اور عبدالرحمٰن نے چونک کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''اماں اور زیب تو خالہ کے گھر گئی ہیں اور ابا مسجد میں ہیں۔'' وہ گھر میں اکیلا تھا۔

''یہ کتاب......'' اس نے کتاب آگے بڑھائی۔ ''زیب کو دینی تھی۔'' اس نے نظریں اٹھائیں۔ عبدالرحمٰن نے کتاب تھام لی وہ واپس مڑی۔ عبدالرحمٰن وہاں ہی کھڑا رہا۔ صحن کے دروازے تک جاتے، جاتے وہ دو دفعہ رکی۔ دو بار مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شاید عبدالرحمٰن اسے روک لے اور عبدالرحمٰن کتاب ہاتھ میں لیے اسے دیکھتا تھا کہ شاید وہ رک جائے، کچھ کہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہا تھا لیکن دونوں کے دل ایک تال پر دھڑک رہے تھے۔ عبدالرحمٰن کہنا چاہتا تھا۔

''شہزادی تمہاری آواز بہت خوب صورت ہے، دل میں اتر جانے والی تم خود بھی خوب صورت ہو۔''

اور شہزادی کہنا چاہتی تھی۔ ''عبدالرحمٰن مجھے تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہنے کی تمنا ہے۔'' لیکن نہ شہزادی کچھ کہہ سکی نہ عبدالرحمٰن اور شہزادی گھر آ گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کاش میں عبدالرحمٰن کو اس روز بتا سکتی کہ مجھے اس کے گھر کی تمنا ہے۔''

باہر کھٹ پٹ ہوئی۔ خانو کی چپلیں گھسیٹنے کی آواز اور برتنوں کی کھڑ کھڑ۔ اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تو صرف دس بجے تھے اور یہ کسی کے جاگنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے بیڈ کے پاس پڑی چپل پہنی اور سوتی ہوئی رانی کو دیکھتی کمرے سے باہر آئی۔ چاندنی ٹرے میں ناشتا لگائے سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی اور خانو اس کے پیچھے پیر گھسیٹتا چلتا تھا۔

''یا اللہ خیر ہو، یہ وقت مشتری کے جاگنے کا تو نہیں تھا۔'' اس نے جنگلے سے جھانک کر صحن میں دیکھا۔ نیچے بھی چہل پہل تھی۔ صبو کمرے سے باہر آ رہی تھی اور مشتری غسل خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ خانو اور چاندنی سیڑھیوں سے اتر چکے تھے وہ بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ڈیوڑھی کا صحن میں کھلنے والا دروازہ چوپٹ کھلا تھا وہ جلدی سے صحن سے ہوتی مشتری کے کمرے میں آئی وہ ناشتا کر رہی تھی۔

''آپ کو کہیں جانا ہے کیا؟''

''ہاں، داتا دربار جا رہی ہوں۔'' مشتری نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''تیری طبیعت اب کیسی ہے؟ میں نے رانی سے کہا تھا تجھے اسپتال لے جائے۔''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ ایک صوفے پر ٹک گئی۔

''لیکن مجھے اتنی ٹھیک نہیں لگتی......خیر ابھی جا رہی ہوں ناں داتا صاحب، دعا کروں گی، منت بھی مانوں گی تیری پہلی ہی محفل کی دھوم مچ جائے۔ استاد جی کو تو بڑا یقین ہے۔'' مشتری نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''اگلے ہفتے تیرے لیے محفل رکھوں گی۔ استاد جی سے میں نے کہہ دیا ہے تجھے کلام منتخب کر کے دیں اور سن لیں تجھ سے۔''

''چلیں آپا...... میں تیار ہوں۔'' صبو برقع کے بٹن بند کرتے ہوئے اندر آئی۔

''ہاں چلتے ہیں۔'' مشتری صافی سے ہاتھ پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

''خانو میرے ساتھ جائے گا چاندنی...... دو گھنٹے تک آ جائیں گے ہم۔'' اور پھر وہ شہزادی کی طرف مڑی۔

''تو چلے گی ساتھ...... داتا صاحب......؟ بڑا سکون ملے گا......دل ٹھہر جائے گا تیرا بھی۔''

''لیکن اماں وہ مجھے آج زیب النسا کی طرف جانا تھا...... رزلٹ کا پتا کرنا ہے مجھے...... کب تک آئے گا۔''

''لے تو نے اب کون سا پڑھنا ہے آگے جو رزلٹ کا پتا کرنا ہے تجھے۔'' مشتری ہنسی تھی۔

''خیر چلی جانا اور استانی جی کو میرا سلام دینا......'' اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔ مشتری نے چاندنی کے ہاتھ سے برقع لیتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

''کیا یہ صرف زیب النسا سے ملنے کی خوشی ہے یا کچھ اور بھی ہے...... خیر......'' اس نے سر جھٹکا اور شہزادی کمرے سے باہر نکل آئی...... وہ بڑی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی اور اسی پھرتی سے تیار ہوئی تھی۔ چاندنی نے اسے ناشتے کے لیے روکا تھا۔

''ارے بیٹا خالی پیٹ مت نکلو گھر سے۔'' اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن چاندنی کی محبت کے آگے وہ ہمیشہ مجبور ہو جاتی تھی سو گھر سے نکلتے، نکلتے

گیارہ بج گئے تھے اس گھر میں ابھی ناشتا بھی نہیں ہوا تھا اور وہاں زیب النسا کے گھر میں دن کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی...... زیب النسا تخت پر کتابیں بکھرائے بیٹھی تھی۔ دو چار روز میں اس کے بی اے سال اول کے پرچے ہونے والے تھے اور استانی جی باورچی خانے میں تھیں...... زیب النسا اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔

''تم بیٹھو ذرا اِدھر شہزادی' میں یہ سوال یاد کروں پھر بات کرتی ہوں۔''

''نہیں...... تم اپنا پڑھو...... جب فارغ ہو جاؤ تو باتیں کرلیں گے، میں تو استانی جی کے پاس جا رہی ہوں۔'' استانی جی سبزی کاٹ رہی تھیں اس نے مٹر کی ٹوکری اپنی طرف کرلی اور مٹر چھیلنے لگی...... استانی جی آلو کاٹ رہی تھیں۔

''عبدالرحمٰن کو مٹر آلو کی بھاجی بہت پسند ہے۔''

''اور مجھے تو مٹر آلو کی بھجیا کیا کچھ بھی پکانا نہیں آتا لیکن خیر سیکھ لوں گی۔'' اس کے لبوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی...... استانی جی نے ایک نظر اسے دیکھا اور سوچا کتنی پیاری ہیرا سی لڑکی ہے اور کہاں جنم لیا... بدنصیب نے...... ان کے چہرے پر تاسف تھا دکھ تھا اور وہ جانے کن خوابوں میں کھوئی مٹر چھیل رہی تھی...... مٹر ختم ہوگئے تھے اس نے پیاز اٹھائی تب ہی کمرے کی چق اٹھا کر عبدالرحمٰن سر جھکائے آستینوں کے بٹن بند کرتا باورچی خانے تک آیا تھا۔

''جی اماں اب بتائیں کیا، کیا منگوانا ہے۔'' عبدالرحمٰن گھر پر تھا اور وہ سمجھ رہی تھی یونیورسٹی میں ہوگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا...... نظریں ملیں اس نے نظریں جھکالیں۔ عبدالرحمٰن ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''فہرست بنادی ہے زبین نے' لے لو اس سے اور ہاں ٹھہرو...... کچھ دوپٹے بھی رنگوانے تھے۔'' وہ اٹھیں۔ ''میں لے کر آتی ہوں۔''

شہزادی نے ہاتھ میں پکڑی پیاز کا چھلکا اتارا اور کاٹنے لگی۔

''شہزادی......'' عبدالرحمٰن نے چیخ چیخ اسے پکارا تھا یا کان بجے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا...... وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا...... اور پتا نہیں کیسے تیز چھری نے شہادت کی انگلی پر گہرا کٹ لگا دیا۔ بھل بھل خون بہنے لگا...... عبدالرحمٰن نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور انگلی کو اپنے ہاتھ سے دبا کر خون روکنے کی کوشش کی اور وہ اپنے سامنے دوزانو بیٹھے عبدالرحمٰن کو ایک ٹک دیکھتی رہی اور اس کی نظریں عبدالرحمٰن کے چہرے سے ہٹ کر اس کے ہاتھوں پر جمی تھیں خوب صورت مردانہ ہاتھ...... دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

''زیب...... زیب جلدی سے پٹی اور اسپرٹ' آیوڈین جو بھی ہے لے کر آؤ شہزادی کی انگلی کٹ گئی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے یونہی ہاتھ پکڑے، پکڑے مڑ کر برآمدے میں بیٹھی زیب کی طرف دیکھا تھا۔

کاش وقت یہیں کہیں ٹھہر جائے.........

عبدالرحمٰن ایسے ہی اس کا ہاتھ تھامے رہے وہ یونہی اس باورچی خانے میں بیٹھے، بیٹھے اپنی آخری سانس لے لے...... عبدالرحمٰن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور کھڑا ہوگیا۔

''زیب آرہی ہے...... پٹی باندھ دیتی ہے۔'' وہ تیزی سے صحن عبور کرتا ہوا برآمدے میں کمرے کے دروازے تک آیا تھا اور استانی جی سے دوپٹوں والا شاپر پکڑ کر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

زیب النسا اس کی انگلی پر پٹی باندھ رہی تھی اور وہ سوچتی تھی جیسے یکایک وہ تہی داماں ہوگئی ہے...... خالی ہوگئی ہے۔ کسی نے اس کا بھرا خزانہ چھین لیا ہے...... ابھی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھا تو وہ یک دم مالدار ہوگئی تھی...... امیر...... خزانے کی مالک......

''اف...... شہزادی کیسے کاٹ لیا...... تمہیں کیا ضرورت تھی پیاز کاٹنے کی...... بھلا پہلے کبھی پیاز کاٹی ہوگی تم نے؟''

''تم یونہی پریشان ہو رہی ہو زیب...... اتنا بڑا زخم نہیں ہے۔''

''نہیں خیر کافی گہرا کٹ لگا ہے، خون دیکھو ناں بند ہی نہیں ہو رہا۔'' زیب النسا نے کس کے پٹی باندھ دی تھی۔

''یہ عبدالرحمٰن کو کیا ہوا شاپر پکڑا اور یہ جا وہ جا...... سودے کا پرچہ ویسا کا ویسا ہی پڑا ہے۔'' استانی جی بڑبڑاتی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کی انگلی کٹ جانے پر افسوس کیا تھا اور اسے زیب النسا کی شادی کا بتایا۔

''امتحانوں کے بعد اس کی شادی ہے شہزادی...... رات میں میری بہن اور بہنوئی نے تاریخ لینے آنا ہے شادی کی...... تو کچھ چیزیں منگوانی تھیں...... اب رات میں دوڑاؤں گی کیا......''

''آجائے گا اماں خود ہی دوسری بار جانا پڑے گا۔'' زیب النسا ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی تھی۔

''چلو وہاں برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

''تم خوش ہو زیب؟'' اور زیب النسا کی آنکھوں میں جگنو اتر آئے تھے۔ شرمیلی مسکراہٹ نے اس کے پورے چہرے کو روشن کردیا تھا...... وہ کتنی خوش تھی اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

''اور تمہارا بی اے......؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک سال ہی تو رہ جائے گا تو وہ شادی کے بعد کرلوں گی...... خالہ کو اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی تنویر کو...... لیکن تم...... کیا تمہاری اماں نے اجازت دے دی تمہیں آگے پڑھنے کی؟''

''نہیں زیب...... اماں میری پڑھائی کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتیں...... بہ مشکل گزارہ ہوتا ہے۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''لیکن......؟'' زیب کو حیرت ہوئی۔ ''میں تو سمجھتی تھی تم لوگوں کے پاس بہت پیسہ ہوتا ہوگا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے، زیب، ہم گانے والیاں ہیں، صرف گانے والیاں...... اور آج کل گانے وغیرہ سننے کم ہی لوگ آتے ہیں بلکہ نہ آنے کے برابر...... چاندنی کہتی ہے یہ نوابوں، مہاراجوں کا دور نہیں ہے...... ورنہ پہلے تو گانے والیوں کے چوبارے کبھی ویران نہیں ہوتے تھے۔ اب تو کسی نے شادی بیاہ کی محفل میں بلوالیا یا کسی فنکشن پر ورنہ گھر تو......''

زیب النسا حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی اس سے پہلے اس نے کبھی یوں کھل کر بات نہیں کی تھی۔

''ہمارا علاقہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصے میں ہم جیسی ہی ہیں...... اور ان کا حال کم و بیش ہم جیسا ہی ہے...... اور دوسرے حصے میں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ چاندنی نے اسے بتایا تھا اس کی نانی راول پنڈی میں پہلے قسائی گلی میں رہتی تھیں۔ گلاب پری کے چوبارے میں دور، دور سے لوگ اس کا گانا سننے آتے تھے۔ ایک سے ایک گانے والی تھی اس چوبارے میں پھر پتا نہیں وہاں سے بلیوں کی سراں میں کیسے پہنچی اور وہاں سے میجر پارسن کے پاس...... سنا تھا میجر پارسن نے اس سے شادی کی تھی اور مسلمان ہوگیا تھا۔ اللہ جانے سچ تھا یا جھوٹ......''

زیب النسا کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی...... پھر ہولے سے بولی۔

''خیر تم میری کتابیں لے جانا...... پڑھ کر پرائیویٹ امتحان دے دینا، میں بھی تمہاری مدد کردوں گی...... بلکہ تم بی اے کرکے بی ایڈ کرکے کسی اسکول میں ٹیچر لگ جانا...... اور کسی اچھی جگہ...... میرا مطلب ہے یہ محلہ چھوڑ دینا۔''

شہزادی کے دل کو یہ بات لگی تھی اور جب اس نے یہ بات مشتری سے کہی تھی مشتری بہت دیر تک

چپ بیٹھی اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔

''اماں ہم گانا گا کر پیسہ کماتے ہیں ناں تو اگر میں ٹیچر بن جاؤں تو بھی پیسے کما لوں گی...... پہلی صورت میں تمہاری عزت نہیں ہے...... لوگ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے...... دوسری صورت میں لوگ ہمیں اچھا سمجھیں گے ہماری عزت کریں گے۔''

''تم ابھی بہت چھوٹی ہو شہزادی صرف اٹھارہ سال کی...... اور تم خوابوں کی باتیں کرتی ہو...... لوگ تمہیں وہ عزت نہیں دیں گے جس کے خواب تم دیکھ رہی ہو...... اسے تلاشتے، تلاشتے تم تھک جاؤ گی...... تمہارے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے تمہارا وجود زخم، زخم ہو جائے گا لیکن یہ عزت نہیں ملے گی تمہیں۔''

''اماں اگر کوئی شریف آدمی مجھ سے اور رانی سے شادی کرلے کیا تب بھی عزت نہیں ملے گی ہمیں؟''

''کیا کوئی ہے......؟'' مشتری کی آنکھیں اسے اندر تک کھوج رہی تھیں۔

''نہیں......'' وہ سٹپٹائی...... ''لیکن کوئی ہو بھی تو سکتا ہے ناں......''

''جب کوئی ہو تو پھر بتانا...... اور اب جا استاد جی انتظار کررہے ہیں...... ریاض کر لے جا کر...... اور یہ پڑھائی وڑھائی کی باتیں بھول جا اب۔'' مشتری کا لہجہ سخت ہوا تھا لیکن آنکھوں میں اندر کہیں نمی سی تیرتی رہی تھی...... شہزادی گیلی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

''کہیں مولوی کے بیٹے سے تو آنکھ مٹکا نہیں کرلیا......'' چاندنی کا اپنا مخصوص لہجہ تھا اور انداز اور ڈیوڑھی کی طرف جاتی شہزادی نے برا سامنہ بنایا...... چاندنی کا اس طرح کا لہجہ اور اندازِ گفتگو اسے ہمیشہ ہی ناگوار گزرتا تھا۔

''نہیں...... مجھے نہیں لگتا......'' مشتری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ بھی تو اس دور سے گزری تھی...... ماضی سینما کی اسکرین کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا...... اس نے بھی ایک روز جہاں آرا کی گود میں سر رکھ کر کہا تھا۔

''اماں مجھے گانا نہیں گانا...... مجھے دلہن بننا ہے۔'' اس نے ٹی وی پر ڈراموں میں لڑکیوں کو دلہن بنے دیکھا تھا۔ جہاں آرا نے آہستہ سے اس کا سر گود سے ہٹادیا تھا...... اور نگو کو آواز دی تھی...... اور ڈپٹا تھا۔

''ابھی تک کیا سکھایا ہے تم نے لفظوں کی ادائیگی پر غور کرو...... سُر دیکھو اوپر نیچے...... اور سانس ایسے چڑھ جاتی ہے جیسے پہاڑی پر چڑھ رہی ہو اب تب ہی میرے سامنے لانا جب کسی قابل ہو......''

جہاں آرا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی لیکن مشتری کے دل میں تو گھر بسا کر رہنے کی خواہش ہمیشہ ہمکتی رہی...... اور اس نے دو بار کوشش بھی کی تھی گھر بسانے کی...... پہلے رامو اور اس کے جانے کے سات سال بعد جب یقین ہوگیا کہ مرکھپ گیا ہوگا تو شیرو کے کہنے پر مولوی صاحب سے پوچھ کر دوسری بار شیرو کوچوان کے ساتھ چپکے سے نکاح پڑھا کر اس کے ساتھ چلی گئی تھی پھر دسویں دن ہی اس کے بیوی بچوں کو پتا چلا اور انہوں نے مار پیٹ کر شیرو کو طلاق دینے پر مجبور کردیا اور جس خاموشی سے گئی تھی اسی خاموشی سے گیارھویں دن واپس آگئی...... کسی کو خبر تک نہیں ہوئی ایک چاندنی تھی جو سب جانتی تھی...... تو یہ ظالم خواہش اب شہزادی کے دل میں پیدا ہوئی تھی...... باعزت ... زندگی کی خواہش دونوں ہی صورتیں مشکل تھیں۔

شیرو کے ساتھ دس دن اس نے ایک بالکل گرہستن عورت کی طرح گزارے تھے۔ چھوٹا سا ایک کمرے کا گھر شیرو نے اچھرے میں کرائے پر لیا تھا...... صبح اٹھ کر اس گھر میں جھاڑو دینا...... تیل کے چولھے پر شیرو اور اپنے لیے چائے بنانا...... اور دن کو کوئی سبزی، دال پکانا جو ایک بار بھی اچھی نہیں بنی تھی

لیکن شیرو نے خوش ہو کر کھائی تھی، تعریف کی تھی...... اسے شیرو سے محبت ہوگئی تھی اور اگر شیرو کی بیٹی عزت کی زندگی کی خواہش مند تھی تو......

☆☆☆

اگلی جمعرات کو اس نے پھر داتا صاحب جاکر نیاز کی دیگ دی تھی کہ شہزادی کو کوئی شریف آدمی مل جائے جو اسے گھر میں بسالے۔

پچھلی جمعرات کو اس نے منت مانی تھی کہ شہزادی کا نام ہو اس کے طفیل چوبارہ چمک اٹھے...... اس کی آواز جادو کردے اور اس جمعرات کو...... لیکن کوئی شریف آدمی شہزادی کو کہاں ملنا تھا...... بس...... عبدالرحمٰن تھا جو بات نہیں کرتا تھا لیکن جب بھی جاتی دور دور سے دیکھتا تھا...... اور اس دیکھنے کو زیب النسا نے بھی دیکھا تھا۔ اسے شہزادی اچھی لگتی تھی وہ اس کی سہیلی بھی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں رہتی ہے اور اس روز پتا نہیں کیوں اس نے عبدالرحمٰن سے پوچھ لیا تھا۔

''یہ شہزادی جہاں رہتی ہے اسے شاہی محلہ ہی کیوں کہتے ہیں...... کیا یہاں پہلے شاہی خاندانوں کی اجڑی بچھڑی عورتیں بھی لائی جاتی تھیں......؟ زوال کے بعد...... بے چاری عورتیں......'' پتا نہیں کیوں اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ کیا خبر شہزادی بھی کسی شاہی نسل کی ہو۔

اور ذرا فاصلے پر بیٹھے مولوی صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ وہ تمام مولویوں سے مختلف تھے۔ ان سے کراہیت نہیں کرتے تھے...... لیکن انہوں نے پاس بیٹھی استانی جی سے کہا۔

''زیب النسا کو سمجھا دو اب وہ جوان ہے کل کو اس کی شادی ہونی ہے، یہ شہزادی سے دوستی اب ختم کرلے...... میں نہیں چاہتا کہ وہ اب یہاں آیا کرے۔'' ان کی آواز آہستہ ہوئی تھی۔

''عبدالرحمٰن بھی جوان ہے...... کل کلاں کو...... ہم شریف لوگ ہیں۔'' اور استانی جی نے سر ہلادیا تھا...... ذرا فاصلے پر بیٹھے عبدالرحمٰن اور زیب النسا نے سب سنا تھا اور جہاں زیب النسا کا رنگ ماند ہوا تھا۔ وہاں عبدالرحمٰن کا بھی دل ڈوب گیا تھا...... اور اس نے سوچا تھا۔'' اس کے یہاں آنے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے...... میں کوئی نادان' بے وقوف

زندگی اے زندگی

☆زندگی صرف ایک ہم ہی تک محدود نہیں بلکہ ہم سے وابستہ تمام رشتے، تمام تعلق، تمام ناتے اسی بھرپور انداز سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں جیسا کہ ہم خود چاہتے ہیں۔ سو ہر لمحہ جب ہم اپنی بہتری کے حصول کے لیے صَرف کردیتے ہیں تو کیوں نہ ہم دوسروں کی بہتری بھی برابر سے چاہیں' یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم مثبت اندازِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کریں، اسی طرح ہم اپنی دنیا کے ساتھ' ساتھ اپنی عاقبت بھی سنوار سکتے ہیں......

☆دنیا میں ہم ایک اچھے دوست، ایک اچھے ساتھی اور ایک پُرخلوص رہنما کے متلاشی رہتے ہیں کیوں نہ ہم یہی تمام صفات اپنے میں پیدا کریں تا کہ دوسرے بھی اس تلاش سے استفادہ حاصل کریں۔

☆زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا...... یہ تو مشہورِ زمانہ مصرع ہے مگر کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کی کوشش اور بے غرض ہو کر دوسروں کے لیے کامیابی کی راہیں ہموار کرنا...... ہرگز مر مر کے جیے جانے کے مترادف نہیں بلکہ ایسے جینے میں ہم سُرور بھی حاصل کرسکتے ہیں جو بعدِ حیات بھی ملتا رہے گا۔

مرسلہ نگار: نگہت زیدی، بہارہ کہو

"ہوں...؟" مولوی صاحب اٹھ کر چلے گئے تھے اور اپنے خیالات کو جھٹکنے کے لیے اور شہزادی کے تصور سے بچنے کے لیے عبدالرحمٰن نے آہستگی سے زیب النسا ....کو بتایا تھا۔

"یہ جو انگریز تھے ان کا وتیرہ تھا کہ جہاں، جہاں انہوں نے قبضہ کیا اور فتوحات کیں......وہاں ایسے علاقوں میں جہاں شاہی خاندان کے وزرا اور امرا وغیرہ رہتے تھے وہاں ایسی عورتوں کو بسا دیا...... شاید اس طرح شکست خوردہ حکمرانوں کی تذلیل مقصود ہو......اس کے سرے پہ اب یہ شاہی مسجد ہے عقب میں شاہی قلعہ تو یقیناً پہلے یہاں امرا اور دربار سے منسلک لوگ رہتے ہوں گے......شاہی محلہ پرانا نام ہے اب کچھ اور ہے......" زیب النسا کے سامنے اس کا موجودہ نام لیتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی تھی۔ "اور یہ صرف برصغیر میں نہیں یورپ میں بھی جہاں کہیں انہوں نے فتوحات کیں...... جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں سینٹ پولی ایک جگہ ہے جہاں چرچ ہی چرچ تھے......ہٹلر کی شکست کے بعد انہوں نے اس علاقے کو ایروسنٹر بنا دیا...... یورپ کا سب سے بڑا ایروسینٹر ہے وہ آج کل۔" زیب النسا حیرانی سے اس کی بات سن رہی تھی......عبدالرحمٰن نے اس سے پہلے کبھی اتنی اور ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔

"شہزادی اچھی ہے لیکن......" اس کی آواز آہستہ ہو گئی تھی اور وہ انگلیاں چٹخانے لگا تھا۔

"وہ بہت اچھی ہے اس نے امی جی سے قرآن پاک پڑھا ہے اور نعت......نعت کس طرح ڈوب کر پڑھتی ہے۔"

"تو......؟" عبدالرحمٰن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مولوی صاحب جا چکے تھے اور استانی جی خاموش بیٹھی کروشیے سے دوپٹے پر بیل بنا رہی تھیں۔

"تو......؟" زیب النسا کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"اگر وہ وہاں سے نہیں آتی تو میں اسے اپنی بھابی بنا لیتی۔ سچ بتانا عبدالرحمٰن بھائی آپ کو کیسی لگتی ہے وہ؟"

"وہ......وہ اچھی ہے۔" اس نے تھوک نگلا۔ "تو ظاہر ہے اچھی لگتی ہے۔"

"تو آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ اس سے شادی کرلیں؟" اس کا دل چاہتا تھا مگر وہ ابھی تک خود سے بھی نہیں کہہ سکا تھا، زیب النسا کو کیا بتاتا۔

"اس سے شادی کر کے اسے باعزت زندگی دینا تو نیکی ہوگی ناں...... ابا بھی تو کہتے ہیں کہ اگر کوئی گناہ گار نیکی کے راستے پر چلنا چاہے تو اس کا ہاتھ تھام لینا چاہیے۔"

"ہاں لیکن کیا پتا اسے ہی ایسی باعزت زندگی کی خواہش نہ ہو۔" اس نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے آواز اور آہستہ کرلی تھی۔

"اسے ایسی زندگی کی بہت چاہ ہے۔" زیب النسا ....پُرجوش ہوئی تھی۔ "بارہا اس نے مجھ سے کہا ہے کہ کاش وہ ہمارے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی۔" عبدالرحمٰن کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔

"اچھا ایسا کہا تھا اس نے؟"

"ہاں، مجھے لگتا ہے وہ آپ کو پسند کرتی ہے اگر وہ آپ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہے تو کیا آپ اس سے شادی کرلیں گے؟"

"میں......ہاں......" اس وقت اس کا یہی خیال تھا کہ اگر اس نے ایسا چاہا، عزت کی زندگی گزارنی چاہی تو وہ ضرور اس کا ہاتھ تھام لے گا لیکن جب اس نے اس سے التجا کی۔

"مجھ سے شادی کرلیں آپ...... میں گھر بسا کر رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک گھر کی بڑی چاہ ہے۔" تو وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔

"میں......میں بھلا تم سے کیسے شادی کرسکتا ہوں۔ میں مولوی عبدالمنان کا بیٹا......لوگ کیا کہیں گے۔" وہ ایک دم تیزی سے مڑا تھا اور چق اٹھا کر

کمرے میں چلا گیا تھا اور وہ برآمدے میں تنہا کھڑی رہ گئی تھی پھر اس نے حسرت سے اس گھر کو آخری بار دیکھا اور زیب النسا سے ملے بغیر جو باورچی خانے میں چائے بنانے گئی تھی اس گھر سے باہر آگئی۔

مشتری نے کئی دن اسے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔ وہ چپ چاپ ریاض کر کے اندر کمرے میں گھس کر کھڑکی سے باہر جھانکتی رہتی۔

"سنو شہزادی! بہت دنوں سے زیب النسا سے تم ملنے نہیں گئیں؟"

"اس کی شادی ہونے والی ہے اماں، شادی کی تیاری میں مصروف رہتی ہے۔"

"اچھا کب ہے، تم جاؤ گی اس کی شادی میں، بلایا ہے تمہیں؟"

"نہیں......میں جا کر کیا کروں گی اماں۔" اس نے آنکھیں بند کر کے آنسو چھپائے تھے۔ مشتری کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

"چاندنی، ملک صاحب اور خان صاحب کو اطلاع بھجوا دو۔ اگلے اتوار کو شہزادی گانا گائے گی۔ بہت شوق تھا انہیں شہزادی کا گانا سننے کا۔ استاد جی نے تعریف ہی اتنی کی تھی۔" اوپر شہزادی کھڑکی کا پٹ کھولے گلی میں جھانکتی رہی تھی۔ آج اسٹریٹ لیمپ کی روشنی سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی جس سے ٹیک لگائے شاید اُسی روز والا منچلا بیٹھا وقفے، وقفے سے سر اٹھا کر سامنے دیکھتا جا رہا تھا اور گاتا جا رہا تھا۔

"تھا یقیں کہ آئیں گی یہ راتاں کبھی"

کبھی اس کی آواز بلند ہوتی کبھی آہستہ۔ پتا نہیں وہ کون تھا لیکن اب وہ اسے اکثر کھڑکی میں سے دیکھتی تھی۔ کبھی اس گلی میں کبھی اس گلی میں، کبھی کسی چوبارے کے سامنے دیوار سے یا دروازے سے کان لگائے سنتا ہوا۔ شاید وہ اندر سے آنے والی آوازیں سنتا ہوا یا پھر......؟ شہزادی کا بڑا دل چاہتا تھا کہ کبھی وہ اس سے جا کر پوچھے کہ وہ یہاں ساری، ساری رات صبح ہونے تک کیوں چکراتا ہے لیکن صبح، صبح وہ غائب ہو جاتا تھا۔

شہزادی کی آواز اور گانے کی دھوم مچ گئی تھی۔ ملک صاحب قدردان تھے۔ اچھی آواز کے عاشق۔

"میں کہتا ہوں مشتری اسے ٹی وی، ریڈیو پر متعارف کرواؤ پھر دیکھنا تمہارے دن پھر جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کسی ڈرامے، فلم کی......ہیروئن بن جائے گی۔"

"گانے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن اداکاری اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بڑی سیدھی بچی لڑکی ہے میری، نہ ادائیں نہ نخرہ۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے...... بڑی سادی سی ہے۔ خیر میں بات کرتا ہوں کسی سے۔" ملک صاحب نے وعدہ کرلیا تھا۔ مشتری خوش تھی لیکن شہزادی مانو روبوٹ ہو...چابی کی مشین۔ مشتری کہتی تیار ہو جاؤ، تیار ہو جاتی۔ گانا، گانا ہے، گانا گا لیتی۔ مشتری کا دل اس کی حالت پر دُکھتا۔ محبت کی نشانی تھی۔ وہ اسے رانی سے زیادہ چاہتی تھی۔

"ارے کہیں روگ تو نہیں لگا بیٹھی۔ یہ بڑی بالی عمریا ہے۔" چاندنی اندازے لگاتی اور مشتری کچھ نہ سمجھ پاتی۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ ایک مولوی کا گھر، اس کا بیٹا تھا تو لیکن وہاں بھی کبھی دوڑ، دوڑ کر نہ گئی پھر بھی ایک روز پوچھ ہی بیٹھی۔

"شہزادی تو کیا سوچتی رہتی ہے ہر وقت؟ کیا یاد آتا ہے کوئی؟"

"نہیں اماں، کس نے یاد آنا ہے بھلا۔" عبدالرحمٰن کا سراپا آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ پتا نہیں اس نے عبدالرحمٰن سے محبت کی تھی یا نہیں۔ پتا نہیں وہ اسے یاد آتا تھا یا نہیں لیکن اس کا گھر ضرور یاد آتا تھا۔ چھوٹا سا گھر جہاں زندگی تھی، جیتی جاگتی، ہنستی ہوئی اور عبدالرحمٰن جو اسے میٹھی، میٹھی نظروں سے دیکھتا

جس نے چھری سے کٹ جانے پر ایک بار اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور کئی دن تک وہ اس ہاتھ کو چومتی رہی تھی پتا نہیں کیوں۔ کئی دن تک اس کے ہاتھ پر عبدالرحمن کے ہاتھوں کا لمس جیسے سانس لیتا رہا تھا۔ وہی عبدالرحمن اس روز چق اٹھا کر اندر کمرے میں چلا گیا تھا اور اس نے مڑ کر باورچی خانے کی طرف دیکھا تھا جہاں زیب النسا چائے بنا رہی تھی اور استانی جی بازار گئی ہوئی تھیں۔

اس نے دو قدم بڑی مشکل سے اٹھا کر چق اٹھائی تھی۔ وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھا جھک کر بوٹوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ آہٹ پر اس نے نظر اٹھائی تھی۔ وہ چق اٹھائے دروازے میں کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

''میں...... ہم...... میری اماں صرف گانا گاتی ہے۔ وہ طوائف نہیں ہے، جسم فروش نہیں ہے۔'' اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''تم مجھ سے شادی کرلو عبدالرحمن میں......''

''رہتی تو وہاں ہی ہوناں اسی گلی میں۔'' عبدالرحمن کی آنکھیں سپاٹ تھیں...... بالکل خالی... کسی بھی جذبے سے خالی وہ نظریں جو اُسے اپنائیت سے تکتی تھیں آج اجنبی تھیں۔

''سوری شہزادی میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔'' تو عبدالرحمن اسے یاد نہیں آتا تھا۔ بالکل بھی یاد نہیں آتا تھا بس دل میں ایک گھاؤ تھا۔ اپنی بے وقعتی کا، کم مائیگی کا اور اپنے ٹھکرائے جانے کا۔ بہت گہرا گھاؤ جو بھرتا نہیں تھا، رِستا رہتا تھا۔

''نہیں اماں، مجھے کوئی بھی یاد نہیں آتا۔'' اس نے پھر دُہرایا تھا۔ ''بس ایک خواہش ہے جو تنگ کرتی ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر کی خواہش...... جہاں صبح، صبح میں اٹھ کر جھاڑو دوں، ناشتا بناؤں اور......''

مشتری کے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا تھا۔ اس نے شہزادی کو گلے سے لگالیا تھا اور ہولے، ہولے تھپکنے لگی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں اماں سب ٹھیک ہے۔'' اس نے الگ ہوتے ہوئے مشتری کو تسلی دی تھی۔ ''رات کو کیا ملک صاحب آئیں گے؟ استانی جی نے مومن کی بڑی اچھی غزلیں یاد کروائی ہیں۔''

''ملک صاحب تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔'' مشتری نے بتایا تھا اور وہ اٹھ کر اوپر کمرے میں آگئی تھی لیکن مشتری تو وہاں کی وہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا وہ پریشان نہ ہو لیکن اس کے دل کو تو جیسے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ شہزادی کے دل کی خواہش...... کچھ دیر بعد وہ اٹھی تھی اور برقع اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی۔ اس نے چاندنی یا خانو کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا اور انیس سال بعد وہ شیرو کو چوان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اپنے تانگے میں نیم دراز اونگھ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑی دیکھتی رہی پھر آہستہ سے آواز دی۔

''شیرو۔'' وہ یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو اس نے نقاب چہرے سے ہٹایا۔

''مشتری!'' اس روز کے بعد اس نے تانگا گلی کے باہر کھڑا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس طرف سے گزرتا بھی نہیں تھا۔

''پہچان لیا تم نے؟'' مشتری کی آواز آہستہ تھی۔ شیرو نے سر ہلایا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنا تھی شیرو۔''

''خیر تو ہے ناں مشتری؟'' مشتری نے سر ہلا دیا تھا۔

''خیر ہی ہے۔'' اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ ایک دو تانگے آس پاس کھڑے تھے۔

''جناح باغ چل وہاں ہی چل کر بات کرتے ہیں۔'' مشتری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ شیرو نے گھوڑے کو چابک مارا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں آواز لگائی تھی۔

''چل میرے شیر...... شاباش۔'' اور مشتری جیسے بیس سال پیچھے پہنچ گئی تھی جب ایسے ہی کبھی کبھی وہ شیرو کے تانگے میں بیٹھ کر جناح باغ جایا کرتی تھی اور پھر...... وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور جب شیرو نے تانگا ایک طرف کھڑا کیا تو وہ چونکی۔ سامنے ہی جناح باغ تھا۔

''زیادہ لمبی بات نہیں تو یہاں ہی بات کرلیں ہ'' وہ پتا نہیں کیوں جھجک گیا تھا۔ مشتری نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں، لمبی بات تو نہیں ہے۔'' شیرو نے گردن پیچھے کرلی تھی۔ تیز کڑکتی دوپہر میں آس پاس کوئی نہیں تھا۔

''شیرو تمہیں یاد ہے ہم نے شادی کی تھی اور دس دن ایک گھر میں رہے تھے۔''

''ہاں۔'' شیرو کی آنکھیں لمحے بھر کو چمکی تھیں۔ ''بوڑھا ہو رہا ہوں لیکن وہ دس دن دل کی تختی پر ایسے لکھے ہیں جو کسی پانی سے نہیں دُھلتے۔''

''ان دس دنوں کی یادگار ایک لڑکی ہے شیرو...... تمہاری اور میری لڑکی...... اٹھارہ سال کی ہے۔ میں نے اسے قرآن پاک پڑھایا اور بارہ جماعتیں بھی پڑھ رکھی ہیں اس نے۔''

''ارے واہ۔'' شیرو خوش ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''کیا بتاتی...... اب بھی نہ بتاتی شیرو اگر جو تیری لڑکی گھر بسا کر عزت سے رہنے کی خواہش نہ کرتی۔ شریف خون اس کے اندر لہریں مارتا ہے اور گھر بسا کر رہنا چاہتی ہے۔ شریف عورتوں کی طرح۔'' شیرو خاموشی سے سن رہا تھا۔

''تو میں تیرے پاس اس لیے آئی ہوں کہ تو کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کروادے۔''

''لیکن میں کہاں...... کیسے مشتری؟'' اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو باپ ہے اس کا، وہ عزت کی زندگی مانگتی ہے تو دے اسے عزت کی زندگی۔ گھر لے جا، کہہ دے تیری بیٹی ہے۔''

''گھر...... تو جانتی ہے نہیں لے جاسکتا۔ میری بیوی بیٹے سب نکال دیں گے اس گھر سے۔''

''میں تیری بیوی تھی، میرا تیرا صرف کاغذوں کا رشتہ تھا، تو نے کھڑے کھڑے طلاق دے دی پر وہ تو تیرا خون ہے شیرے......''

''مجھے تیری بات کا یقین ہے مشتری پر میرے گھر والے یقین نہیں کریں گے اور......''

''اچھا چل مجھے واپس لے چل۔'' مشتری نے نقاب چہرے پر کرلیا۔

''اس کی قسمت میں بھی چوبارے میں ہی جینا مرنا لکھا ہے۔'' نقاب کے اندر اس کی آنکھیں بہتی تھیں اور وہ ہاتھ اندر کر کے آنکھیں پونچھتی تھی۔ آگے پیچھے سڑک خالی تھی بس گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی اور مشتری اب کچھ نہ سوچتی تھی۔

''مشتری مجھے معاف کردینا۔'' وہ تانگے سے اتری تو شیرو نے کہا۔ مشتری نے بنا کچھ کہے چھوٹا سا بٹوا کھول کر کچھ نوٹ نکالے۔

''یہ تیرا کرایہ ہے کم ہے تو بتادے۔'' شیرو نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو اس نے سیٹ پر پیسے رکھ دیے۔

''میں کوشش کروں گا کہ......'' لیکن مشتری آگے بڑھ گئی تھی۔ اگر وہ اسے اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتا تھا تو پھر کوشش بھی بیکار تھی۔ بے نام و نشان کا ہاتھ کس نے تھامنا تھا۔ اس نے کوشش کرلی تھی اب شہزادی کا نصیب تھا اور اس کے نصیب پر مشتری کا دل روتا تھا لیکن بظاہر کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ دو چار دن سے چوبارہ ویران پڑا تھا۔ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کالج یونیورسٹی کے لڑکے بھی نہیں جو اکا دکا آجاتے تھے۔ سورانی کل کے کپڑوں میں سستی سے پڑی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے آنکھیں بند مسلسل پیر ہلا رہی تھی۔

’’رانی کیا تیرا دل نہیں چاہتا تیرا ایک گھر ہو۔ جہاں تو راج کرے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ۔‘‘ شہزادی کے خواب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔

’’نہیں، میرا ایسا کوئی دل نہیں چاہتا۔‘‘ رانی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ’’میرا دل تو چاہتا ہے کہ چاروں طرف میرے رقص کی دھوم ہو۔ میں کتھک میں اتنی مہارت حاصل کرلوں کہ ہندوستان، پاکستان دونوں جگہ بس میرا ہی نام ہو۔ رانی کا رقص اور شہزادی کا گانا دونوں کی دھوم مچ جائے پوری دنیا میں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے کچے گھروں میں بیٹھ کر اُپلے تھوپنے کا۔‘‘ اس نے پھر آنکھیں بند کرلی تھیں اور گنگنانے لگی تھی۔

’’مدھوبن میں رادھیکا ناچے رے
ناچے رے، ناچے رے‘‘

’’اور میں......‘‘ شہزادی نے سوچا۔ ’’مجھے جو اگر ایک کچے کوٹھے کا ہی سائبان مل جائے تو میں خوش ہوکر اُپلے تھاپوں اور گیلی لکڑیاں جلاتے ہوئے بھلے میری آنکھوں کا سارا پانی ختم ہوجائے اور تندور میں روٹیاں لگاتے روز میرے ہاتھ بازو جلیں تب بھی میں شکر کے سجدے کرتے کرتے نہ تھکوں۔‘‘ اس نے رانی کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے یوں ہی پاؤں ہلائے جاتی تھی اور گنگناتی رہی تھی۔

’’مدھوبن میں......‘‘

وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ وہ گلی میں داخل ہورہا تھا۔ آج اس نے نسبتاً صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بال بھی بنائے ہوئے تھے۔ آج چلتے ہوئے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ بھی نہیں تھی۔ ابھی رات پوری طرح نہیں جاگی تھی۔ پتا نہیں شہزادی کے دل میں کیا آیا کہ وہ تیز، تیز چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور سیڑھیوں کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترتی ڈیوڑھی میں آگئی۔ ڈیوڑھی میں بے حد مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ نیم وا تھا۔ وہ گلی والا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ گلی میں تھوڑی رونق تھی۔ موتیے اور گلاب کی ملی جلی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چکر کاٹ کر پچھلی گلی میں آگئی وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

’’اے......تم یہاں کیا کرتے ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ’’بس ایسے ہی آتا ہوں، اچھا لگتا ہے۔‘‘

’’کیا اچھا لگتا ہے؟‘‘ شہزادی نے دلچسپی سے اسے دیکھا تو اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

’’چلو گے میرے ساتھ؟‘‘ اس نے جیب تھپتھپائی چند سکوں کی کھنکھناہٹ آئی۔

’’نہیں۔‘‘

’’کیا کرتے ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘

’’ماں باپ کا کھاتے ہو؟‘‘

’’ماں باپ نہیں ہیں۔‘‘ اب کے اس نے شہزادی کو غور سے دیکھا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔

’’اکیلے رہتے ہو؟‘‘

اس نے سر ہلایا۔

’’گھر ہے؟‘‘ شہزادی اسے کھوج رہی تھی۔

’’ہاں ہے پر بڑی تنہائی ہے، اکیلا پن ہے وہاں اس لیے ادھر آجاتا ہوں۔ یہاں اندر سے آنے والی آوازیں سنتا ہوں تو تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔‘‘

’’کام کاج کچھ نہیں کرتے تو پھر کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟‘‘

’’کبھی کبھی مزدوری کرلیتا ہوں گزارہ ہوجاتا ہے۔‘‘

’’شادی کیوں نہیں کرلیتے؟‘‘

’’مجھ سے کون شادی کرے گا؟‘‘

’’میں......مجھ سے شادی کروگے؟‘‘

وہ ہکا بکا سا ہوکر اسے دیکھنے لگا تو وہ واپس مڑی۔

’’کل پھر آؤں گی پوچھنے تم سوچ لینا۔‘‘ وہ اسے حیران چھوڑ کر واپس آگئی تھی۔ اب رانی بستر پر بیٹھی تھی۔ وہ اندر آکر بیٹھ گئی۔

’’کہاں گئی تھیں؟‘‘

’’نیچے گلی میں۔‘‘

’’خانو آگیا چرغہ لینے بھیجا تھا؟‘‘ رانی پوچھ رہی تھی۔

’’دھیلے کی کمائی نہیں اور انہیں چرگا (چرغہ) کھانا ہے۔‘‘ چاندنی بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی تھی۔

’’آجاؤ نیچے لے آیا خانو چرغہ، نان۔‘‘

’’آؤ۔‘‘ رانی کھڑی ہوئی۔

’’مجھے بھوک نہیں ہے۔‘‘ شہزادی اٹھ کر پھر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔ گلی خالی تھی۔ رانی نے جاتے، جاتے جھک کر کھڑکی میں سے دیکھا اور سوچا۔

’’جانے شہزادی خالی دیواروں اور بند کھڑکیوں میں کیا دیکھتی ہے۔‘‘

’’وہ کون تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کا نام کیا تھا اسے علم نہیں تھا پھر بھی وہ اسے اپنا خواب تھما آئی تھی اور اسے انتظار تھا کہ اس کے پاس اس خواب کی تعبیر تھی یا نہیں۔‘‘ ابھی اس سے ملاقات ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور انتظار شروع ہوا ہی نہیں تھا کہ وہ مایوس ہوگئی تھی۔ ایک بار چاندنی نے کہا تھا۔

’’شریف آدمی رات کے اندھیرے میں ان گلیوں کے پھیرے تو لگا سکتا ہے لیکن کسی کو عزت سے تھام کر گھر لے جاتے کم ہی دیکھا ہے میں نے۔‘‘ تو شاید آج کے بعد وہ نظر نہیں آئے گا۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔ اسے انتظار نہیں تھا پھر بھی اگلی صبح سورج نکلنے کے بعد سے غروب ہونے تک کا وقت مشکل سے کٹا تھا۔ جب باہر اندھیرا چھا گیا تھا اور چوباروں میں روشنیاں جل اٹھی تھیں تو اس نے بہت بے دلی سے کھڑکی کھول کر دیکھا تھا وہ سامنے ہی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی اور پھر جیسے اڑتی ہوئی گلی میں پہنچی تھی۔ تیل لگائے ٹیڑھی مانگ نکالے سلیقے سے کنگھی کیے وہ کل سے قدرے بہتر کپڑوں میں تھا۔ وہ عبدالرحمن جیسا نہیں تھا۔ اس میں کچھ بھی عبدالرحمن جیسا نہیں تھا۔ نہ شکل

میرا ڈرائیور!

میرا ڈرائیور ڈرائیونگ کے علاوہ سب کچھ جانتا ہے، اس کا خیال ہے کہ سیاست، سفارت، مذہب، معیشت اور صحافت وغیرہ کے بارے میں اس کا علم ان شعبوں کے ماہرین سے زیادہ ہے، وہ ان موضوعات پر اظہارِ خیال اکثر ڈرائیونگ کے دوران کرتا ہے، میں اسے ٹوکتا ہوں کہ وہ اپنا دھیان صرف ڈرائیونگ کی طرف رکھے لیکن اسے میرا ٹوکنا ہر بار سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ایک دفعہ وہ مجھے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ملک سیاست دانوں نے تباہ کیا ہے، دورانِ گفتگو وہ گردن پچھلی سیٹ کی طرف موڑ کر میرے تاثرات کا جائزہ بھی لیتا جاتا تھا جس کے نتیجے میں گاڑی سڑک کے ساتھ واقع ایک کھڈ میں جا گری اور یوں گاڑی کا انجر پنجر ہل گیا چنانچہ میں اس بات کا تو قائل نہ ہوسکا کہ سیاست دانوں نے ملک تباہ کیا لیکن یہ بات بالکل یقینی تھی کہ اس ڈرائیور نے گاڑی کو ضرور تباہ کردیا ہے۔

اقتباس: ہنسنا رونا منع ہے
از: عطاالحق قاسمی
پسند: ماہ نور قیصر، راول پنڈی

صورت نہ قد بت۔ نہ بات کرنے کا وہ قرینہ پھر بھی وہ اسے عبدالرحمٰن سے اچھا لگا تھا کیونکہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ اس کے ساتھ مل کر باعزت زندگی گزار سکتی تھی۔ بھلے محنت مزدوری کر کے ہی کیوں نہیں۔ وہ اسے بہت بلند لگا بہت اونچائی پر بیٹھا اور عبدالرحمٰن ...... وہ تو بہت نیچے کہیں اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے مشتری کے پاس لے آئی۔

''اماں یہ...... یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' مشتری نے ایک نظر میں ہی اس کے حال حلیے سے اس کا سارا احوال جان لیا تھا پھر بھی آنکھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''کیا نام ہے، کیا کرتے ہو؟'' وہ گھبرایا، گھبرایا سا انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

''نام......''

''ہاں، کیا نام ہے تمہارا بتاؤ ناں؟'' شہزادی نے اسے حوصلہ دیا۔

''میرا نام حفیظ ہے۔'' شہزادی سے حوصلہ پا کر اس نے بتایا۔ ''مزدوری کرتا ہوں ادھر بسوں کے اڈے پر۔''

''گھر بار؟''

''گھر اپنا ہے پر چھوٹا سا ہے تین مرلے کا شاہدرہ میں۔ ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں اکیلا ہوں۔''

''شہزادی سے کہاں ملے ہو، کب سے مل رہے ہو؟''

''کل رات یہاں اس گلی میں پچھلی طرف ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی بار اور انہوں نے کہا تھا کہ کیا مجھ سے شادی کرو گے اور میں آ گیا بتانے کے دل و جان سے۔'' مشتری نے ٹھنڈی سانس لے کر تاسف سے اسے دیکھا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تو شہزادی نے حسرت سے اسے دیکھا۔ وہ چلا گیا تو شاید پھر نہ آئے۔

''یہ لڑکا تمہارے قابل نہیں ہے شہزادی۔'' مشتری نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کم عمر تھی ناتجربے کار بھی اور مشتری تجربے کی بھٹی میں جل کر کندن بن چکی تھی۔

''اور جو لڑکے میرے قابل ہیں میں ان کے قابل نہیں ہوں اماں۔'' دکھ، اذیت، خود ترسی کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں۔ مشتری تڑپ گئی لیکن وہ اسے کنویں میں دھکا نہیں دے سکتی تھی۔

''ایسے راہ چلتے لوگ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے شہزادی۔''

''تو آپ کا کیا خیال ہے ہمیں کوئی محل دو محلوں والا بیاہنے آئے گا؟''

''آ بھی سکتا ہے شہزادی، ملک صاحب کہہ رہے تھے ایک بار تو ٹی وی پر پرفارمنس دے، دے تیری آواز تہلکہ مچا دے گی پھر خود ہی آئیں گے بادشاہ اور شہزادے تیری دہلیز پر۔''

''اماں یہ شہزادوں، بادشاہوں کا دور نہیں ہے۔ جو مل رہا ہے اسے ہی غنیمت جانو۔'' وہ عجیب طرح سے ہنسی۔ ایسی ہنسی کہ مشتری کو اپنے دل میں ہزاروں کانچ چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''شہزادی تو بوڑھی نہیں ہو گئی ہے۔ تجھے گھر بسانا ہے ناں...... ٹھیک ہے تو گھر بسا لینا لیکن ابھی دو تین سال انتظار کر سکتی ہے۔ کیا پتا اس سے اچھا کوئی......'' مشتری کے اندر کہیں شیرو کا انتظار بھی چھپا ہوا تھا کیا پتا بیٹی کی محبت میں کوئی اچھا رشتہ دیکھ لے وہ۔

''میں انتظار کرتی رہوں اماں کسی اچھے کا اور یہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔'' ایک گھر بسانے کی عزت سے رہنے کی خواہش اس کے اندر کرلاتی تھی اور مشتری کو تکلیف دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی ایسی خواہش اگر ایک بار دل میں بیدار ہو جائے تو اسے دل سے نوچ کر پھینکنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے

بالا بالا ہی وہ حفیظ کے ساتھ جا کر اس کا گھر بھی دیکھ آئی۔ ایک کمرا، دیوار کی اینٹوں میں سے سیمنٹ اکھڑا ہوا۔ صحن اور صحن کے ایک کونے میں غسل خانہ۔ باورچی خانے کا نام نشان نہ تھا۔ برآمدے میں دیوار کے ساتھ ایک مٹی کے تیل کا چولھا پڑا تھا۔

''اس گھر میں شہزادی رہے گی؟'' اس نے چاندنی سے کہا تھا۔

''رہ لوں گی اماں۔'' شہزادی کو اعتراض نہیں تھا۔ اس گلی کی سب سے بڑی حویلی اور اس گھر میں سے مجھے ایک کو چننا ہو تو میں اسی گھر کو چنوں گی اماں۔'' وہ کم عمر تھی لیکن اس نے دوٹوک بات کی تھی پھر بھی مشتری سوچ میں پڑی تھی۔

''ملک صاحب آ جائیں تو ان سے کہوں گی ان کا کوئی جاننے والا لاوارث اکیلا لڑکا جسے کوئی اعتراض نہ ہو...... پر کماتا تو ہو اچھا حفیظ کی طرح نہ ہو۔'' لیکن ملک صاحب پتا نہیں کب آتے اور رانی نے مشتری سے کہا۔

''اماں شہزادی فیصلہ کر چکی ہے تو نے اس کی بات نہ مانی تو وہ بھاگ جائے گی۔ ایسا ہی چاؤ چڑھا ہے اسے گرہستن عورت کہلانے کا اور مشتری نے ہتھیار ڈال دیے۔

''چلو بسا لو گھر جیسا بھی بستا ہے۔'' لیکن مشتری نے آخری بار اسے ضرور سمجھایا تھا پر شہزادی سمجھتی نہ تھی اور یوں مشتری نے اسے نکاح پڑھوا کر حفیظ کے ساتھ رخصت کر دیا۔ حفیظ اکیلا آیا تھا۔ ایک سرخ ستاروں والا سلک کا سستا سا جوڑا اور نقلی زیور کا موٹے نگینوں والا ایک سیٹ۔ شہزادی نے خوش ہو کر اس کا لایا ہوا جوڑا پہنا تھا اور مشتری نے تصور ہی تصور میں شیرو کی طرف منہ کر کے تھوکتے ہوئے نکاح نامے میں شیرو کی جگہ رامو کا نام باپ کے خانے میں لکھوا دیا تھا۔

خانو اور چاندنی رکشے میں اسے چھوڑنے آئے تھے اور ان کے جانے کے بعد حفیظ بھی کھانے پینے کا سامان لینے چلا گیا تھا۔ وہ سر جھکائے چارپائی پر بیٹھی تھی۔ حفیظ کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ خوف زدہ تو ہوئی تھی لیکن پلستر اکھڑی دیواروں والا یہ گھر اس کا تھا۔ چھوٹا تھا لیکن اس کا تھا۔ وہ یہاں عزت سے سر اٹھا کر جیے گی اور پھر...... پھر عبدالرحمٰن کو بتائے گی کہ...... اور یہ عبدالرحمٰن کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ حفیظ کو سوچنا چاہتی تھی جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا لیکن بار بار حفیظ کے تصور کو دھکیل کر عبدالرحمٰن آ کھڑا ہوتا تھا۔ میٹھی، میٹھی نظروں سے اسے تکتا ہوا پھر باہر کھٹکا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ حفیظ جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا گیا تھا پھر صحن میں سے حفیظ کے گنگنانے کی آواز کچھ لڑکھڑاتی ہوئی سی......

''تھا یقیں کہ آئے گی یہ راتاں کبھی''

پھر دروازہ کھلا اور حفیظ اندر آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شہزادی کا دل دھڑ دھڑ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا دوپٹا چھوڑ دیا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔'' اس نے شہزادی کے ہاتھ کو پکڑا اور شہزادی کو اس کے منہ سے بدبو کا بھبکا آیا تو بے اختیار اس نے اپنا چہرہ پیچھے کیا۔

''تم نے نشہ کیا ہے حفیظ؟''

''کیا آج بھی نشہ نہ کرتا...... آج تو میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہے۔'' وہ اٹھا اور اس نے لکڑی کی چوکور میز پر جو لفافے لا کر رکھے تھے، وہ اٹھاتے شہزادی نے دیکھا۔ لفافے تیل میں چپڑے ہوئے تھے پھر ایک تام چینی کی روغن اکھڑی پلیٹ میں لفافے الٹ دیے۔ سیخ کباب اور شامی کبابوں کی خوشبو کمرے میں بکھر گئی۔ تیسرے لفافے سے اس نے تین نان نکالے۔

''لو پہلے کھا لو۔'' شہزادی نے نفی میں سر ہلا دیا اس نے دوبارہ پوچھا اور خود بڑے، بڑے لقمے لینے لگا۔

''بڑی حسرت تھی مجھے تم جیسی کسی کو قریب سے

دیکھنے کی لیکن میری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار میں گلشن بائی کے کوٹھے پر ستارہ بیگم کا ناچ دیکھنے گیا تھا۔ دھکے مار کر نکال دیا انہوں نے اور تب سے میں ان گلیوں میں چکراتا پھرتا تھا۔ گھنگروؤں اور طبلے کی آواز سنتا تھا اور تصور کی آنکھ سے دیکھتا تھا لیکن آج سچ مچ حقیقت میں دیکھوں گا۔'' وہ زور سے ہنسا تھا۔

''چلو اٹھو ڈانس کرو، دکھاؤ آج ساری حسرتیں نکال دو میری۔'' اس نے شہزادی کا بازو پکڑا جو ٹکر ٹکر آنکھوں میں وحشت بھرے اسے دیکھتی تھی۔

''ایسے کیا دیکھتی ہو بھئی، سہاگ رات کے ضائع جانے کا غم نہ کھاؤ ابھی ساری رات پڑی ہے۔ پہلے میری جان تھوڑا دل خوش کردو۔ ویسے تمہاری ماں ہے بہت ہوشیار، جانتی تھی پیسے کے نام پر پھوٹی کوڑی نہیں سو حق مہر میں یہ گھر ہی لکھوالیا۔ چلو میری بلا سے۔ تمہارا ہو یا میرا ایک ہی بات ہے۔ ہاں اٹھو ناں اب۔''

''مجھے...... مجھے نہیں آتا رقص۔''

''جھوٹ بولتی ہے۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

''نہیں...... میں نے صرف گانا سیکھا ہے۔''

''گانا بھی سنیں گے میری جان لیکن پہلے ذرا تیری رونمائی تو دوں۔ دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔'' وہ اٹھا اور سامنے دیوار میں بنی بغیر طاقوں کی الماری میں سے ایک شاپر اٹھایا اور اس میں سے سرخ ساٹن کے پٹے پر لگے گھنگرو نکالے اور تھوڑا سا اونچا کرکے آنکھوں کے سامنے لہرا کر ہنسا۔

''یہ ہے تیری رونمائی...... ہے ناں انوکھی۔ پتیل کی پانی گرم کرنے والی گاگر بیچ کر خریدے ہیں۔

چھن کے چھن تیرے گھنگرو بولیں

چھن کے چھن'' اس نے ہاتھ ہلائے۔

''چھن کے چھن تیرے گھنگرو

چھن چھن چھن۔'' اس کی آواز ٹوٹ، ٹوٹ جاتی تھی اور شہزادی پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی تھی اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر گھنگرو بجاتا تھا۔

''چھن ...... چھن چھن۔'' اور دائیں پاؤں کی ایڑی زمین پر مارتا تھا۔ شہزادی ساکت بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

''چل ٹانگیں نیچے لٹکا تیری رونمائی دوں تجھے۔''

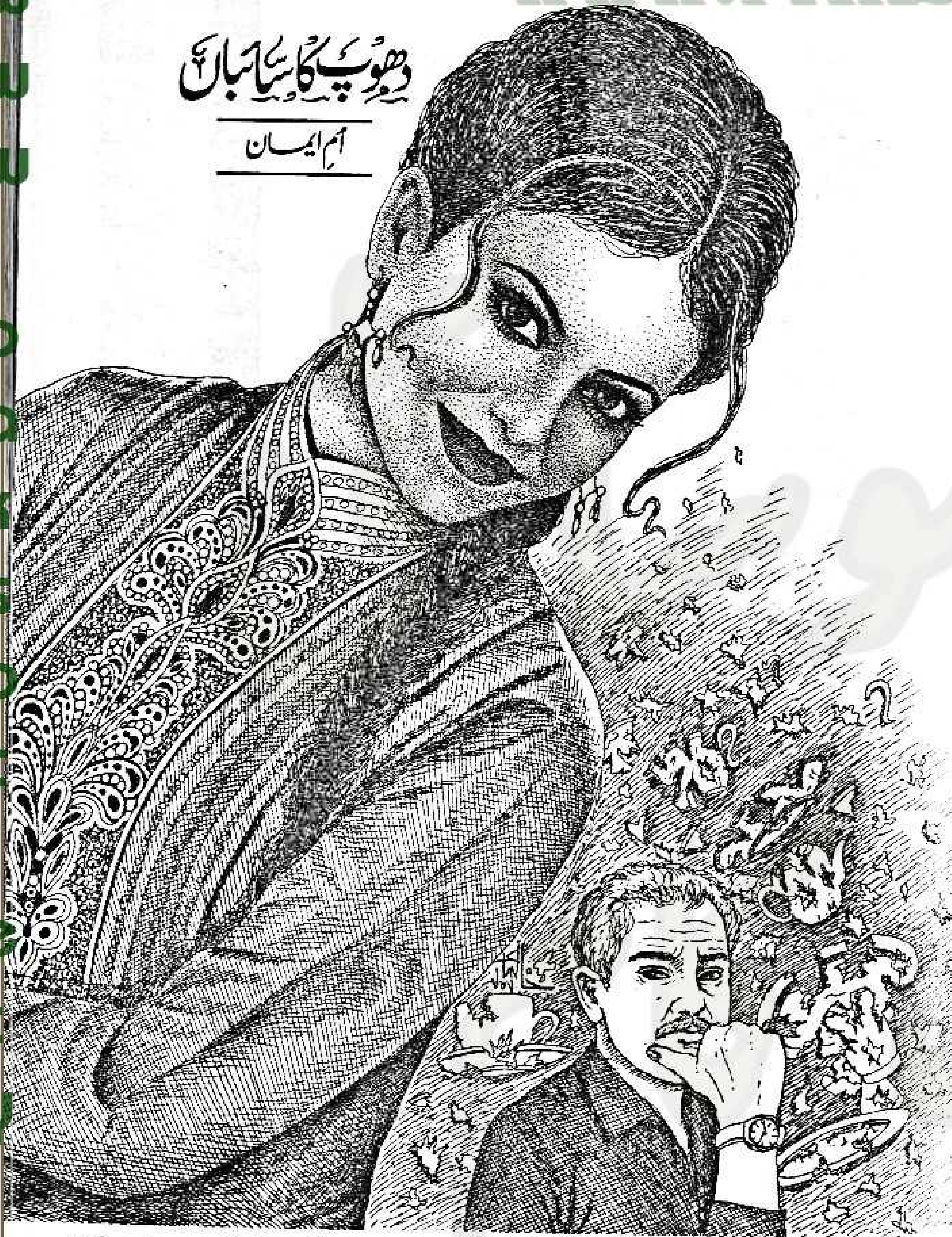
''نہیں۔'' وہ پیچھے ہٹی تھی۔ ''نہیں آتا مجھے رقص کرنا۔'' اس نے ہاتھوں سے گھنگرو پیچھے کیے یوں جیسے گھنگرو نہ ہوں سانپ ہوں۔

حفیظ کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ خود زمین پر بیٹھ کر اسے گھنگرو باندھنے کی کوشش کرتا رہا۔

''میں نے تجھ سے شادی کیوں کی ہے۔ جانتی ہے اس لیے کہ تیرا رقص دیکھوں۔ میں کبھی کسی چوبارے میں نہیں جاسکا لیکن اب تیرا رقص دیکھوں گا...... ہاہا...... جانتا ہوں کتنی پارسا ہوتی ہو تم۔'' پہلے اس نے منتیں کیں پھر گالیاں دیں اور پھر ہاتھ اٹھالیا۔ تھپڑ، مکے، لاتیں وہ خاموش پٹتی رہی۔ مارتے، مارتے وہ تھک گیا تو خود ہی بکتا جھکتا نشے میں نڈھال ہوکر وہاں ہی زمین پر گر گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اِدھر اُدھر گھنگرو اور سرخ دھجیاں بکھری تھیں۔ وہ غصے سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ وہی سرخ دوپٹا سر سے گردن تک اوڑھے سوئی ہوئی تھی یوں کہ سرخ ساٹن کی ایک دھجی اس نے اپنے ہاتھ میں بھینچ رکھی تھی اور اس کا چہرہ اتنا پیلا ہورہا تھا جیسے کسی نے اس پر پیلا رنگ مل دیا ہو۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے حصے سے دھوپ چھن، چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور چہرہ چمک رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ جیسے زیادہ روشن ہوتا جارہا تھا۔ حفیظ نے ڈرتے، ڈرتے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ موت کی خنکی اس کے ہاتھوں میں اتر گئی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ ہٹالیا اور پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اس کے روشن چہرے کو دیکھنے لگا۔

دھوپ کا سائبان

اُمِ ایمان



سرد ہواؤں کے جھونکے نہیں بلکہ جھکڑ چل رہے تھے۔ گیلے ہاتھوں سے سر اور کانوں کو دوپٹے سے ڈھانکتے ہوئے کانوں کی لوئیں سُن سی ہونے لگی تھیں۔ برتن چکنے بہت تھے۔ لہٰذا دھونے میں بھی دیر لگ رہی تھی۔ سردیوں میں چکنے برتنوں کو دھونا ویسے ہی کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آج اماں کی بہن اپنے بچوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اماں نے قورمہ اور بریانی بنوائی تھی۔ سردی کے مارے قورمے کا تیل جم جم سا گیا

تھا۔ صبو نے اب کی دفعہ ہوا کے زور سے سر سے اترنے والے دوپٹے کی پروا نہ کی۔ ''بس اب جلدی سے برتن ختم کر کے ہی سر ڈھکوں گی۔'' تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے سوچا، ایک کانچ کی پلیٹ ہاتھ سے پھسلی۔

''ارے کم بخت نئی پلیٹ توڑ ڈالی۔'' اماں نے باورچی خانے کے دروازے سے جھانکا۔ جہاں باہر کھرے میں بیٹھی وہ برتن دھو رہی تھی۔ وہ کھانا سمیٹنے کے لیے آئی تھیں۔ پلیٹ کے ٹوٹنے کی آواز پر غصے سے کھول گئیں۔ سخت سردی میں باہر برتن دھوتی صبو پر ترس کیا آنا تھا۔

''شاید اب رات کا کھانا بھی نہ ملے۔'' صبو نے سوچا۔ برتن دُھل چکے تھے لیکن برتنوں کا ٹوکرا اندر لاتے ہوئے صبو ڈر رہی تھی۔ کیا پتا کھانے کے بجائے مار کھانی پڑے...... لیکن اندر تو آنا تھا اس نے کھڑے ہو کر دوپٹا دوبارہ سر اور کانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹا...... ٹوکرا اٹھایا ایک لمحے کو اندر کی آوازوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ خاموشی تھی۔ ''اللہ کرے اماں اندر چلی گئی ہوں سونے کے لیے......'' آہستہ قدموں سے باورچی خانے کے دروازے کی طرف چلی...... اندر نظر ڈالی باورچی خانہ خالی تھا...... ''شاید اماں چلی گئی ہیں سونے...... اللہ تیرا شکر......'' اِدھر صبو نے اندر قدم رکھا...... اُدھر اماں باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔

''توڑ ڈالی ناں پلیٹ نامراد...... کام کم کرتی ہے نقصان زیادہ ...... دل کرتا ہے تیرا ہی نقصان کر ڈالوں۔'' اماں کی چنگھاڑ نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ برتنوں کا ٹوکرا سنبھلتے سنبھلتے بھی ہاتھوں سے نکل گیا۔ دھڑ...... دھڑ...... دھڑام...... دھڑام......

کانچ کے برتن ٹوٹ، ٹوٹ کر باورچی خانے کے فرش پر بکھر گئے۔ ''یا اللہ!''............ اماں کا ہاتھ ایک تواتر سے چلنے لگا۔

چٹاخ...... چٹاخ...... پڑنے والے تھپڑوں نے صبو کے گالوں کو ایک دم لال کر ڈالا جیسے خون چھلکنے کو ہو...... وہ تو ابا شاید پانی پینے آئے تھے۔ انہوں نے اماں کو روکا اور کمرے میں لے گئے۔ دہشت زدہ صبو کانپتی ہوئی وہیں ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ اسے ٹوٹے ہوئے کانچ چبھنے کا بھی احساس نہیں ہوا...... اماں کی مار کے بعد ابا جس طرح باورچی خانے میں ہیرو کی طرح داخل ہوئے تھے۔ صبو کو توقع تھی کہ وہ ہیرو کا رول پلے بھی کریں گے لیکن وہ تو اسے صرف دیکھ کر رہ گئے...... ہمدردی نہ دلاسا...... پیار تو دور کی بات ہے۔ انہوں نے اماں کو ایک لفظ بھی نہ کہا صرف دونوں بازوؤں سے پکڑ کر انتہائی نرمی سے کمرے کی طرف لے گئے۔

صبو کو اتنی تکلیف اماں کے تھپڑوں سے نہیں ہوئی تھی جتنی ابا کی خاموشی سے......

''اماں تو سوتیلی تھیں...... لیکن ابا تو سگے تھے...... میں اماں کی بیٹی نہیں ہوں اسی لیے انہیں مجھ سے محبت ہے نہ میرا احساس ہے...... لیکن ابا کی تو بیٹی ہوں...... انہیں کیوں مجھ سے محبت نہیں...... وہ میری تکلیف کا احساس کیوں نہیں کرتے......'' صبو ٹھنڈے فرش پر بیٹھی ہاتھوں سے کانچ سمیٹتی رہی...... ان کانچوں کو اگر ہوشیاری سے پکڑو تو یہ نہیں چبھتے لیکن باتوں کے کانچ کتنی ہی ہوشیاری و عقل مندی دکھاؤ ان کی چبھن دل تک جاتی ہے۔

اماں کمرے سے باہر نہیں نکلیں...... اس نے باورچی خانہ صاف کر کے بچا ہوا سالن اور روٹی ایک پلیٹ میں نکالا اور باورچی خانے میں ہی بیٹھ کر کھانے لگی۔ باورچی خانے کا دروازہ جو باہر صحن میں کھلتا تھا بند کر دیا...... سر سر ہواؤں کی آواز بھی بند ہو گئی۔ ایک خاموشی سی چھا گئی۔ صبا ہاتھ میں روٹی لیے کھانے کے ساتھ ساتھ اپنے آنسو بھی پی رہی تھی۔ اگر ماں دنیا سے چلی جائے تو صبر آ جاتا ہے لیکن اگر ماں موجود ہو

لیکن اس تک رسائی نہ ہو تو کیا ہوتا ہے......؟ روح میں جدائی کے زخم پڑ جاتے ہیں ایسے زخم جو ناسور کہلاتے ہیں۔ رِستے ہی رہتے ہیں۔

صبو ہاتھ میں روٹی لیے جلدی، جلدی نوالے لینے لگی۔ ''اماں اگر آ گئیں تو نہ معلوم کیا حشر کریں......'' اس نے اپنی ماں کی اُمنڈ اُمنڈ کر آنے والی یاد پر صبر کا بند باندھا...... لیکن بہتے آنسوؤں کے ساتھ جلدی، جلدی نگلتے نوالوں نے گڑ بڑ کر دی۔ ایک ہچکی کے ساتھ اُچھو آ گیا۔ صبو کا کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اٹھ کر دو گھونٹ پانی پیا۔ روٹی کا ٹکڑا یوں ہی چھوڑ کر اپنے اسٹور نما کمرے میں چلی گئی۔ چھوٹے سے کمرے میں ایک طرف بستر اور صندوق رکھے تھے۔ مچان پر دیگچیاں اور فالتو برتن رکھے تھے باقی بچی ہوئی جگہ میں اس کا جھلنگا سا پلنگ بچھا تھا۔ صبو نے چادر کو جھاڑ کر تکیہ ٹھیک کیا اور لیٹ کر کمبل تان لیا۔

تھکن کے مارے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ اب رونے کے باعث آنکھوں اور سر میں بھی درد ہونے لگا...... لیکن آنسو اب بھی بہہ رہے تھے ماں کو یاد کرتے آنسو بہاتے نہ جانے کب نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

صبو کی ماں ساجدہ بیگم شادی ہو کر جب اس گھر میں آئیں تو خوش دلی سے استقبال کرنے والی ان کی ساس زندہ تھیں جو بڑے ارمانوں اور تمناؤں سے انہیں اپنے بیٹے کی دلہن بنا کر لائی تھیں...... لیکن ان کے بیٹے کو تو کسی اور کی تمنا تھی...... جس کے لیے ماں راضی نہیں ہوئی تھیں پھر شادی تو ہوئی لیکن ساجدہ بیگم کے لیے وہ شادی کم اور بربادی زیادہ تھی۔

کسی ایسی عورت کے دکھ کا اندازہ بھلا کیسے لگایا جا سکتا ہے جس سے اس کا شوہر پہلی رات میں ہی کہہ دے۔ ''یہ شادی اس نے محض ماں کے دباؤ میں کی ہے ورنہ وہ تو کسی اور کی چاہ رکھتا ہے۔ اور جب بھی موقع ملا وہ اس سے ضرور شادی کرے گا۔''

''بجو جان! کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔'' شادی کے دوسرے دن جب بجو میکے آئی تو اماں نے لپک کر ساجدہ بیگم کو کلیجے سے لگا لیا اور ساجدہ بیگم بھی ماں کے کمزور وجود سے لپٹ گئیں۔

''ماں کا یہ کمزور وجود جو بیماریوں کی دیمک سے کھوکھلا ہو چکا ہے تجھے کب تک سہارا دے گا...... باپ تیرا ہے نہیں، بہن بھائی کوئی نہیں، رشتے دار...... جنہوں نے تیری شادی کے لیے طعنے دے دے کر تیری ماں کو پریشان کر ڈالا۔'' ساجدہ بیگم کو ماں کے جملے یاد آ رہے تھے۔

''کوئی ایسی بدصورت تو نہیں تھی میں...... ہاں معمولی صورت ضرور تھی آج کل تو شادی کے لیے ہیروئن تلاش کی جاتی ہے...... مقبول علی کی ماں کو میں شاید اسی لیے پسند آ گئی کہ پیچھے پوچھنے والا کوئی نہیں صرف ایک کمزور ماں ہے۔ جس کی حیثیت بھی ہواؤں کے دوش پر رکھے چراغ کی سی ہے......'' ساجدہ نے ماں کے گلے لگ کر کتنی ہی باتیں سوچ ڈالیں اور مستقبل کے کتنے ہی فیصلے کر ڈالے۔

''کیسی ہے بجو......؟ مقبول احمد کیسا ہے......؟ کس کے ساتھ آئی ہے؟'' تخت پر بیٹھتے ہوئے ماں نے تھکن کے احساس سے لرزتے ہوئے لہجے میں بہت سے سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔

''اماں میں بالکل ٹھیک ہوں، مقبول احمد ہی چھوڑ کر گئے ہیں کہہ گئے تھے کہ شام میں لینے آئیں گے۔'' ساجدہ نے انگلی میں پڑی انگوٹھی گھماتے ہوئے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔

اماں کی جائزہ لیتی نظریں چہرے کا طواف کرتے، کرتے نیچے ہاتھوں تک پہنچیں...... سرخ نگ والی انگوٹھی گھماتی انگلیوں کو دیکھ کر مسکرائیں اور آہستہ سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر

دیکھا پھر خوش ہو کر بولیں۔
''مقبول احمد نے یہ منہ دکھائی میں دی ہے......''
ساجدہ نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ اسے منہ دکھائی دینے کا انداز یاد آ گیا۔ ڈبے سمیت انگوٹھی کو اس کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کتنی بے پروائی تھی انداز میں......
''سجو سمجھ لے اللہ نے تیرے نصیب میں جو لکھا تھا تجھے مل گیا...... اب مقبول احمد جیسا بھی ہے تیرا مجازی خدا ہے۔ ہوسکتا ہے آگے کسی وقت جا کر حالات تبدیل ہو جائیں۔ اسے تیری کوئی نہ کوئی بات اچھی لگ جائے۔'' اس نے خود ہی اپنے دل کو سمجھایا تھا۔
''لیکن کاش یہ بات کسی نے مقبول احمد کو بھی بتائی ہوتی...... شادی سے پہلے لڑکیوں کو تو خوب درس و نصیحتیں کی جاتی ہیں لیکن لڑکوں کو کوئی کیوں نہیں بٹھا کر سمجھاتا...... شادی کے بندھن کی باریکیوں اور سمجھوتوں کے اسرار و رموز جیسے لڑکیوں کے لیے اہم ہیں ویسے ہی لڑکوں کے لیے بھی اہم بلکہ اہم ترین۔''
...... وہ بیٹھی خود ہی یہ باتیں سوچتی رہی، سوچ میں ڈوبی سجو کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اماں اس کے لیے چائے ناشتے کا انتظام کرنے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں...... وہ تو میز گھسیٹنے کی آواز پر چونکی۔
اماں میز اس کے قریب رکھ کر ناشتے کی ٹرے رکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

وقت کا دریا بے آواز بہتا ہے...... دن، مہینوں اور مہینے، سالوں پر محیط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سجو نے وقت دیکھنا چھوڑ دیا تھا...... تین سالوں کے دوران دو بچے اس کی گود میں آئے تھے تو دو محبت کرنے والی ہستیاں اس سے دور بھی جا بسی تھیں ایک اس کی اپنی ماں اور دوسری مقبول احمد کی ماں جو اس کی خدمت گزاری سے خوش اور مطمئن تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ بیٹا پہلے کی ساری باتیں بھلا بیٹھا ہے...... سجو کی وفا اور اطاعت گزاری نے اس بندھن کو مضبوط کر دیا ہے، بچوں کی صورت میں دو زنجیریں بھی پاؤں میں ڈال دی ہیں...... لیکن سجو جانتی تھی کہ یہ بات کتنی حقیقت پر مبنی ہے۔ کام کے بہانے ورکشاپ سے رات دیر سے گھر آنا، موبائل پر لمبی، لمبی باتیں اور میسجز کی منٹ منٹ کی ٹون پہلی محبت کو کمزور نہیں توانا کرنے کی علامتیں تھیں لیکن اس بات کی وجہ سے سجو نے مقبول احمد سے کبھی کوئی سوال جواب نہیں کیا...... کہ جواب تو پہلی رات ہی پورے زور سے دیا گیا تھا۔
''موقع ملتے ہی میں ضرور شادی کروں گا۔''
اماں کے جاتے ہی مقبول احمد کے لیے راستہ سہل ہوگیا۔ دوسری شادی مردوں کے لیے کتنی آسان ہے اس کا اندازہ کوئی عورت ہی لگا سکتی ہے۔
عقیلہ بیگم، مقبول احمد کی محبت بن کر آ گئیں۔ لہٰذا ان کا پلڑا بھاری ہی ہونا تھا۔ مقبول احمد نے دوسری شادی کر کے عقیلہ بیگم کو الگ گھر میں رکھا...... لیکن جلد ہی دو گھروں کو چلانے میں انہیں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا خاص طور سے دوسرے گھر کا کرایہ...... بس پھر کیا تھا گھر مقبول احمد کا تھا ساجدہ کو حکم ہوا کہ اپنے لیے سونے کا انتظام دوسرے کمرے میں کر کے یہ کمرا خالی کر دیا جائے۔
''سجو تم کل سے بچوں کو لے کر برابر کے چھوٹے کمرے میں سونا۔'' سجو نے حیرانی سے سوالیہ انداز میں مقبول احمد کو دیکھا۔
''عقیلہ بیگم کو میں کل گھر لا رہا ہوں، میرے لیے دو، دو گھروں کو الگ، الگ چلانا مشکل ہے۔'' مقبول احمد نے بے پروائی سے ان کی حیران آنکھوں میں لکھی تحریر کا جواب دیا۔
''مقبول احمد ایسا ظلم نہ کیجیے...... آپ نے شادی کر لی چلیے ٹھیک ہے لیکن خدا کے لیے انہیں یہاں لا کر میری اور اپنے بچوں کی زندگی عذاب نہ بنائیں۔'' سجو نے آہستہ، آہستہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں شوہر کو مخاطب کیا۔
''پھر دوسرا حل تو یہی ہے کہ تم اس گھر سے رخصت ہو جاؤ۔'' مقبول احمد نے سفاکی سے کہا۔
سجو کا دل ڈوب گیا...... وہی امتحان جس سے پہلے قدم پر وہ لرزاں تھی...... اتنے عرصے بعد بھی وہی امتحان...... ''میرے رب میری مدد کر......''
سجو کا دل لرز لرز کر رب کو پکارتا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا دیا۔ ''یہاں سے نکل کر کہاں جانا ہے......'' اس نے اپنے دائیں بائیں چمٹے ہوئے بچوں کو دیکھا۔ کلیم احمد اور صبا...... جو باپ کے غصے سے لرز رہے تھے ماں کے دامن کو مضبوطی سے تھامے کھڑے تھے۔
پہلے ماں کے لیے اور اب بچوں کے لیے ساجدہ بیگم نے پھر سمجھوتے کی چھتری تان لی۔ سر کا سائبان سرک رہا ہو تو سمجھوتے کی چھتری میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔
عقیلہ بیگم اس سائبان کو صرف اور صرف اپنا حق سمجھتی تھیں۔ سو اب ساجدہ کی حیثیت ایک کام والی کُل وقتی ملازمہ سے زیادہ نہیں تھی...... اور اس کے بچے اس کی طرح ملازم کے بچے سمجھے جاتے...... کلیم کی پڑھائی چھڑوا کر ورکشاپ پر لگا دیا گیا تھا۔
''چلو کوئی بات نہیں، بچے ہنر سیکھ جائیں تو اچھا رہتا ہے لیکن تعلیم......'' سجو نے مقبول احمد سے بات کی لیکن وہ آنکھوں پر پٹی باندھے عقیلہ بیگم کی بتائی راہ پر چل رہے تھے۔
''پڑھائی وڑھائی بیکار ہے، میں نے کون سا پڑھا تھا۔''
عقیلہ بیگم کا پاؤں بھاری ہوا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا نہ نخروں کا...... ہاں بھئی نخرے اٹھانے والا ہو تو کوئی کیوں نہ نخرے دکھائے...... وہ بھی ماں بنی تھی لیکن...... کبھی دو بول ہمدردی کی بھی مستحق نہ ٹھہری تھی اور اب...... روز ہی مقبول احمد ہاتھوں

میں پھلوں کے تھیلے تھامے گھر میں قدم رکھتے لیکن ان پھلوں پر نہ تو سجو کا حق ہوتا نہ ہی اس کے بچوں کا......
''اماں......! مجھے بھی سیب کھانا ہے۔'' صبا نے ماں کی طرف دیکھا۔
ابھی ابھی اس نے ابا کو پھلوں کا تھیلا کمرے میں لے جاتے دیکھا تھا۔
''اچھا بیٹا، تیرے باپ سے کہوں گی۔''
''نہ اماں، مجھے ابھی چاہیے میرا بہت دل چاہ رہا ہے تم تو روزانہ یہی کہتی ہو......'' صبا نے احتجاج کیا۔
''میری جان......'' سجو نے بیٹی کو گلے لگا لیا، بے آواز آنسو گر گر کر بیٹی کے گالوں پر پھسلتے رہے۔
''کیا تیرے بچے اسی طرح باپ کے رہتے یتیموں کی سی زندگی گزاریں گے؟'' سجو سوچتی رہی...... ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ بس اب مجھے بچوں کو لے کر یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ ماں کا پرانے محلے والا گھر بند پڑا ہے، کچی آبادی ہے لیکن دل تو کچے نہیں ہیں ناں...... کچھ نہ کچھ آسرا ہو ہی جائے گا زندگی کا...... آخر خدا ہمارا بھی تو ہے ناں......'' سجو نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔
اگلے دن ورک شاپ جانے کے لیے مقبول احمد تیار ہوا تو سجو نے اس کے سامنے بات رکھی۔
''مقبول احمد مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے۔ اب میں یہاں سے چلی جاتی ہوں تاکہ تم عقیلہ بیگم کے ساتھ اپنی مرضی سے رہو...... یہاں رہ کر میں اپنے بچوں کو یتیموں اور مسکینوں کی طرح ترستے نہیں دیکھ سکتی۔'' مقبول احمد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا سوچا ہے تم نے......؟''
''مقبول احمد......! کیا یہ بچے تمہارے بچے نہیں...... یہ تمہاری ایک نگاہ کو ترستے ہیں...... روز پھلوں کے تھیلے کمرے میں لے جاتے دیکھتے ہیں...... آخر ان کا بھی تم پر کوئی حق ہے یا نہیں؟''
''اتنے عرصے سے جو تم اس گھر میں رہ رہی

ہو، کھا پی رہی ہو یہ حق کی ادائیگی ہے کہ نہیں......؟ میں نے تم کو طلاق نہیں دی کہ گھر کی چھت میسر رہے لیکن ناشکری ذلیل عورت جا چلی جا...... جہاں تجھے جانا ہے جا......'' مغلظات کی بوچھاڑ مقبول احمد کے ہونٹوں سے برس رہی تھی۔ ''عزت راس نہیں ہے تجھے۔ جا تیرا جہاں دل چاہے۔'' مقبول احمد نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی... بس میں بچوں کے کپڑے اور سامان وغیرہ لے لوں۔'' سجو نے مقبول احمد کی طرف دیکھا اور کمرے کی بڑھی۔

''نہ ایک دھجی بھی نہیں اور نہ ہی بچے...... یہ میرے بچے ہیں میرے ساتھ رہیں گے۔''

سجو نے اس ظالمانہ حکم پر مقبول احمد کو دیکھا۔

''نہ مقبول احمد نہ...... مجھ پر رحم کرو، میرے بچے مجھ سے نہ چھینو، ماں کے دل کو نہ اجاڑو...... اس کی بددعا تمہیں بسنے نہیں دے گی۔'' سجو نے صبا اور کلیم کو اپنے سے چمٹا لیا۔

''ہرگز، ہرگز نہیں...... یہ تیرے ساتھ نہیں جائیں گے۔'' مقبول احمد نے ہاتھ بڑھا کر سختی سے دونوں بچوں کو کھینچا۔ جیسے کچے پھل ڈالی سے توڑ لیے جاتے ہیں۔

سجو کا بازو پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیا۔

اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے سے پہلے سجو نے دیکھا کہ عقیلہ بیگم کمرے کے دروازے پر کھڑی فاتحانہ مسکرا رہی تھیں۔

صبا اور کلیم باپ کے چیخنے کے باعث سہمے ہوئے تھے گویا سکتے میں ہوں۔

''کیا کروں؟'' سجو خالی ہاتھ دروازے کے باہر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کچھ سمجھ کام نہیں کر رہی تھی برابر والی جمیلہ خالہ کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ اندر چلی گئی۔

جمیلہ خالہ نے اس کی حالت دیکھ کر جلدی سے پکڑ کر کمرے میں لے جا کر بٹھایا دو گھونٹ پانی کے پلائے۔

''دیکھ رہی ہیں جمیلہ خالہ، کیسا ظالم ہے مقبول احمد... میرے بچوں کو چھین لیا ہے، میں کیسے زندہ رہوں گی۔ میں کیا کروں میرے خدایا......'' سجو تڑپ کر روئی جمیلہ خالہ نے سینے سے لگا کر اس کا سر سہلایا۔

''رو لے تو اچھا ہے آنسو بہا لے ورنہ دل میں غم بیٹھ گیا تو ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے گی۔''

''خالہ میں کیا کروں، تم بتاؤ میں نے تو سوچا تھا کہ بچوں کو لے کر کہیں چلی جاؤں گی محنت مزدوری کر کے ان کو پال لوں گی...... لیکن مقبول احمد نے تو مجھے سزا اتنی کڑی دے دی اور وہ بھی ناحق......''

''ٹھہرو بیٹا، دل کو سنبھالو میں سوچتی ہوں کچھ...... تم بھی سوچو غور کرو بلکہ یہ چائے کے ساتھ دو بسکٹ کھا کر تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔'' جمیلہ خالہ نے اس کے سامنے چائے کا کپ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھ دی۔

سجو ذرا دیر لیٹی تھی لیکن ذہنی طور پر اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ لیٹتے ہی جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہو...... گہری نیند بلکہ مدہوشی سی طاری تھی۔

جمیلہ خالہ دو دفعہ دیکھ کر گئیں۔ تیسری دفعہ آئیں تو سجو اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی دونوں ہاتھ گود میں رکھے، خالی ذہن آنکھیں کھولے دیوار کو تک رہی تھی۔

''کیسی ہے سجو...... تیری طبیعت......؟'' خالہ نے محبت سے پوچھا۔

سجو نے دیوار سے نظریں ہٹا کر خالہ کو دیکھا لیکن چپ رہی۔

''خالہ مجھے بچے یاد آ رہے ہیں...... میرے لیے تو ایک دن ان سے دور رہنا مشکل ہے۔ میں کیسے ان کے بغیر رہوں گی......''

''نہ بیٹا اللہ نہ کرے تجھے ان کے بغیر رہنا پڑے۔ اللہ تیرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالے تو فکر نہ کر کوئی حل سوچتی ہوں تو بھی اللہ سے خیر کی دعا کر۔''

سجو چونک اٹھی نماز عصر کا وقت تھا...... وہ ہڑبڑا کر اٹھی...... نماز کے بعد اللہ کے حضور کتنی ہی دیر ہاتھ

اٹھائے دعا مانگتی رہی۔ کبھی سجدے میں جاتی کبھی تڑپ کر اٹھتی اور ہاتھ پھیلا دیتی۔ آنسوؤں کی لڑیاں گرتی چلی جارہی تھیں...... سجدے کی جگہ گیلی ہوگئی تھی۔

''دیکھو بجو، میں نے بہت غور کیا ہے تو دو راستے سمجھ آتے ہیں ایک تو مقبول احمد سے معافی مانگ کر دوبارہ گھر بسالے اور اسی طرح روز و شب گزارے یا پھر دوسرا راستہ یہ کہ بچوں کو چھوڑ کر کچھ عرصے دور چلی جا، وہ تیری اماں کی ماموں زاد بہن ہے ناں گوجرانوالہ میں بس تو وہاں چلی جا...... مقبول احمد اور عقیلہ بھی دیکھیں کیسے گھر اور بچے سنبھالے جاتے ہیں پھر اب ان کا بچہ بھی آنے والا ہے...... سب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا...... پھر یہ بات بھی ہے کہ بچے باپ کے گھر محفوظ رہتے ہیں۔ باہر کا حال خراب ہے ابھی تو تیرا آسرا نہیں بچے کہاں لے جائے گی، کیسے پالے گی، ٹھیک ہے کلیم ورکشاپ میں کام سیکھ رہا ہے، سیکھنے دے...... بیٹی باپ کے گھر سے بیاہی جائے تو سسرال میں پایہ مضبوط رہتا ہے۔ سو تو انہیں یہیں رہنے دے۔''

''خالہ جمیلہ وہ اماں کا پرانا گھر تھا ناں اس میں چلی جاتی ہوں۔''

''چل پگلی، وہ گھر بھی کرائے کا تھا...... تجھے تو کچھ خبر ہی نہیں...... اب وہاں کہاں جائے گی...... میری مان لے مقبول احمد کے گھر واپس چلی جا......''

''نہ خالہ اتنا عرصہ منہ بند کر کے رہی خدمت کی اور وفا کا یہ صلہ دیا، اسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکال دیا۔ اب نہیں جاؤں گی وہاں۔'' بجو کے لہجے میں عزم تھا پھر وہ خالہ جمیلہ کی مدد سے اماں کی ماموں زاد بہن کے ہاں گوجرانوالہ چلی گئی۔ وہیں اسے پتا چلا تھا کہ عقیلہ بیگم نے معذور بچی کو جنم دیا تھا جو دو ماہ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہ کر اس جہان سے چلی گئی۔ عقیلہ خالی گود رہ گئی۔ بچی کا غم بلڈ پریشر کی زیادتی کا باعث بنا...... بس خدا کے کام خدا ہی جانے...... عقیلہ بیگم نے صبر کر لیا...... ناتواں جسم جو کام کر کے ادھ موا ہوا جاتا تھا...... اس پر ستم یہ ہوا کہ عقیلہ بیگم پر ایک رات فالج گر گیا۔ جسم کا آدھا حصہ مفلوج ہوگیا...... چہرہ ٹیڑھا ہوگیا...... مقبول احمد نے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ علاج معالجے پر روپیہ خرچ کیا لیکن معاملہ وہیں کا وہیں رہا...... مقبول احمد بڑے پریشان تھے...... کون گھر سنبھالے کون عقیلہ بیگم کی دیکھ بھال کرے...... صبو تو بچی تھی پھر بھی اپنی بساط بھر کام سنبھالا ہوا تھا۔

''اماں منہ کھولو، یہ دلیا کھالو۔'' صبا چمچہ پیالہ لیے عقیلہ بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔ گلے کے نیچے تولیا لگا کر... دلیا احتیاط سے کھلانے لگی۔ عقیلہ بیگم آنکھوں میں نمی لیے صبو کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے میکے والے دیکھنے آئے تھے لیکن انہوں نے جھوٹے منہ بھی اپنے گھر لے جانے کی بات نہ کی...... ایسی خدمت کی مصیبت اپنے سر لینے کا کسے شوق تھا۔

''پا...... پا...... پانی......'' عقیلہ بیگم کے کانپتے لبوں سے ٹوٹے، ٹوٹے الفاظ نکلے صبو نے پیالہ میز پر رکھ کر گلاس اٹھالیا اور چمچہ، چمچہ منہ میں ڈالنے لگی۔

صبا کے علاوہ عقیلہ بیگم کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کس وقت کیا چاہیے، بے چینی کیسی ہے؟ تکلیف کیا ہے؟ صبو اماں کے سارے کام کرتے ہوئے سوچتی تھی کہ وہ ڈانٹنے ڈپٹنے اور تھپڑوں سے تواضع کرنے والی مضبوط اور توانا اماں اب کہاں ہے؟ صبا سوچتی اور حیران ہوتی دعا کرتی۔

''یا اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے، یارب اماں کو ٹھیک کردے۔'' اماں کی تکلیف پر صبو کا دل دکھ کے مارے دعائیں کرتا...... اس نے وہ ساری باتیں سارے ظلم بھلا دیے تھے پتا نہیں کیسے اُسے تو عقیلہ بیگم پر صرف ترس آتا تھا۔ ہمدردی ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ بچے ہر چیز جلدی بھول جاتے ہیں......

اُدھر جمیلہ خالہ نے ساری صورتِ حال دیکھتے ہوئے مقبول احمد سے بات کی۔

''مقبول! تو نے بجو کو گھر سے نکال کر اچھا نہیں کیا...... معصوم کی آہ لی...... دیکھ اب تیرا گھر وہی سنبھال سکتی ہے اب بھی اسی کی بچی خدمت کررہی ہے مگر عقیلہ کی خدمت بچی کے بس کی نہیں۔ سوچ لے اپنے ظلم و زیادتی کا رویہ چھوڑ دے، بجو کو گھر میں بسالے۔ اس معصوم پر تُو نے بڑا ظلم کیا...... اللہ ظلم کرنے والے اور زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا......''

''خالہ بجو مان جائے گی؟'' اب مقبول احمد سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا جبھی بڑے بے بس انداز میں پوچھا۔

''میں بات کرتی ہوں فون پر...... سمجھاتی ہوں اللہ بہتری کرے گا۔'' دوسرے دن جمیلہ خالہ کے پاس مقبول احمد کے لیے خوش خبری تھی کہ بجو مان گئی ہے۔

''ہم کل ہی چلیں گے بجو کو لینے کے لیے۔''

لیکن مقبول احمد سے زیادہ بڑی خوش خبری یہ کلیم اور صبا کے لیے تھی۔ کلیم ورکشاپ سے واپس آیا تو بہن نے بتایا۔

''سچ صبو......''

''ہاں، ہاں بالکل سچ...... اماں کو کل ابا لے کر آئیں گے بھائی۔'' کلیم نے بڑھ کر بہن کو گلے لگالیا۔

''یہ سب تیرے صبر، شکر اور خدمت گزاری کا صلہ ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔''

''ہاں بھائی اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اماں نے بھی تو کتنا صبر کیا ہے۔'' بستر پر لیٹی عقیلہ دونوں بہن بھائیوں کی خوشی دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں آنکھوں سے بہنے والے آنسو پچھتاوے کے تھے یا دکھ کے......؟ بجو نے مقبول احمد کے ہمراہ گھر کے صحن میں قدم رکھا تو حیران ہوگئی...... گھر کی دیواریں جھنڈیوں اور چمکیلی جھالروں سے سجی تھیں۔ صبو اور کلیم نے سرخ گلاب کے موٹے موٹے ہار بجو کے گلے میں ڈالے تو بجو نے دونوں کو کلیجے سے چمٹا لیا۔ دائیں بائیں کلیم اور صبو کو لے کر اپنے پرانے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ گلاب کے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ کلیم نے پنکھا چلایا تو ان کے پروں پر رکھی گلاب کی پتیاں بجو کے اوپر صدقے واری ہونے لگیں۔ بجو نے پلٹ کر دیکھا مقبول احمد کمرے کے دروازے پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''واہ......! ایسا استقبال تو نئی دلہن کا بھی نہ ہوا تھا۔'' بجو من ہی من میں مسکرائی۔

''عقیلہ کہاں ہے؟'' سرخوشی اور بے خودی کے ان لمحوں میں اچانک اسے دھیان آیا۔

''اُدھر دوسرے کمرے میں......'' صبا نے اشارہ کیا۔

بجو آہستہ، آہستہ چلتی ہوئی عقیلہ کے بستر کے پاس آئی اور اپنے گلے سے گلابوں کا ہار اتار کر عقیلہ کے گلے میں ڈال دیا۔ عقیلہ کی آنکھوں سے خوشی کے ساتھ ساتھ آنسوؤں کی لڑی جاری تھی مگر یہ آنسو شرمندگی کے بھی تھے۔

چٹ پٹے ٹوٹکے

☆ اگر آپ کے پاؤں کی ایڑیاں پھٹ جائیں اور کوئی کولڈ کریم اثر نہ کرے تو آپ سوئی دھاگا لے کر سی لیں۔

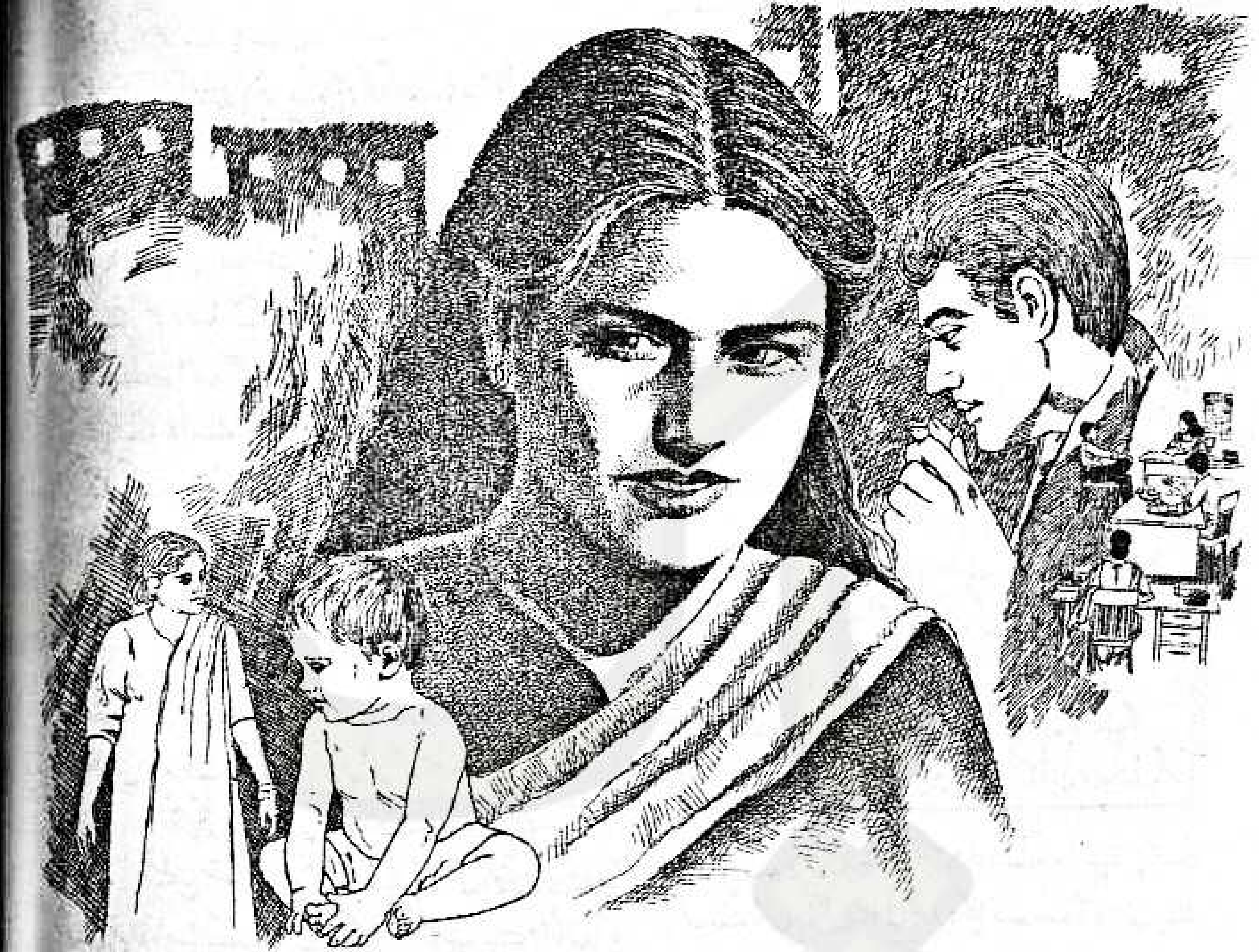
☆ اگر آپ کے ہاتھ میں بہت درد ہے تو ایک مضبوط ہتھوڑی سے اپنے پاؤں پر ضرب لگائیں آپ اپنے ہاتھ کے درد کو بھول جائیں گے۔

☆ اگر آپ کے دانت میں کیڑا لگ جائے تو ایک دو ہفتوں تک کچھ مت کھائیں کیڑا اندر ہی بھوکا مر جائے گا۔

☆ اگر آپ کو رات میں نیند نہیں آتی تو آنکھوں میں سونے سے پہلے ایک، ایک ڈراپ ایلفی ڈال لیں آپ کو نیند بھی اچھی آئے گی اور صبح آنکھیں بھی نہیں کھلیں گی۔

نوٹ: کہیں اصلیت میں یہ ٹوٹکے آزمانہ لیجیے گا۔

پروین افضل شاہین، بہاول نگر



مکمل ناول

میرا نصیب ہے

نگہت عبداللہ

''سنو......! کل میری اماں تمہارے ہاں گئی تھیں......؟'' وہ غالباً سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آرہا تھا جبھی اس کی سانس پھول رہی تھی اور بغیر سلام دعا کے اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تو اس کی بے قراری پر میں نے مسکراہٹ دبا کر مختصر جواب دیا۔

''ہاں......''

''پھر......؟ میرا مطلب ہے کیا سوچا تمہارے امی ابا نے......؟'' وہ دونوں ہاتھ ٹیبل پر جما کر مجھے

دیکھنے لگا۔

''پتا نہیں۔'' میں نے سیدھے سادے انداز میں لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ اپنے پیچھے کسی چیز پر ڈھے کر تقریباً چیخا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''جو سچ ہے، میں نے وہی کہا ہے... مجھے نہیں معلوم میرے ماں باپ نے تمہاری اماں کو کیا جواب دیا ہے اور پلیز دھیرج سے بات کرو...... یہ آفس ہے۔'' میں نے آخر میں ٹوکا تو وہ بالکل خاموش ہو گیا۔

''دیکھو احسن!'' کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کر کے آخر مجھے خود ہی کہنا پڑا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے گریجویشن کیا ہے، اس کے بعد ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کر کے یہاں جاب بھی کرنے لگی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر معاملے میں آزاد اور خود مختار ہو چکی ہوں ایسا نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسا سوچ سکتی ہوں کیونکہ میرے والدین نے مجھے کسی قابل اس لیے نہیں بنایا کہ میں ان کی سوچ، ان کے فیصلوں کو چیلنج کرنے لگوں...... ہرگز نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ طے ہے کہ وہ جو سوچیں گے جو فیصلہ کریں گے مجھے اس پر سر جھکانا ہے تو پھر میں یہ جاننے کی کوشش کیوں کروں کہ انہوں نے تمہارے بارے میں کیا سوچا۔'' میری اتنی طویل بات کے جواب میں پہلے اس نے اتنی ہی گہری سانس کھینچی پھر پوچھنے لگا۔

''اگر انہوں نے میرے خلاف فیصلہ دے دیا تو......؟''

''میں کوئی احتجاج نہیں کروں گی۔'' میں نے سکون سے جواب دیا تو وہ پھر چیخ پڑا۔

''کیوں...... کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟''

''ہے...... لیکن اپنی محبت کے حصول کی خاطر میں اپنے والدین کو ناراض نہیں کر سکتی۔''

میرے حتمی انداز پر وہ کتنی دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر کرسی کی پشت پر سر رکھ کر چھت کو گھورنے لگا تو مجھے اس پر بہت ترس آیا لیکن میں اسے کوئی آس نہیں دلا سکتی تھی، جب ہی قصداً انجان سی بن کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

''سنو......'' کتنی دیر بعد اس کے پکارنے پر میں نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا تو کہنے لگا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے والدین میرے ہی حق میں فیصلہ سنائیں۔''

''ہاں......'' میں نے بغیر کسی تاثر کے ہاں کہا تھا اور وہ اسی پر خوش ہو گیا۔

''ہاں...... انشاء اللہ تمہارے والدین بھی ہاں کہیں گے، مجھے اچھی امید رکھنی چاہیے...... ہے ناں......''

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''بڑی ظالم ہو، میرا دل رکھنے کی خاطر ہی ہاں کہہ دو۔'' اس نے شاکی ہو کر کہا۔

''فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ اپنا کام کرو۔''

''کیا کام کروں، تم نے کام کرنے کے قابل چھوڑا ہے؟ ہر پل ذہن پر سوار رہتی ہو، اچھا بھلا اپنی زندگی جی رہا تھا، مزے میں تھا، پتا نہیں کہاں سے آ گئیں پاگل بنانے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بول رہا تھا۔

''اور تو کوئی پاگل نہیں بنا؟'' میں نے فوراً کہا۔

''اندھے ہیں سب...... ویسے شکر ہے ورنہ......''

میرے گھورنے پر وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا پھر جاتے، جاتے بولا تھا۔

''سنو، فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔''

اور چاہتی تو میں بھی یہی تھی لیکن کیا کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ خاموشی سے ابا کے فیصلے کا انتظار کروں...... جنہوں نے گزشتہ چار سالوں سے امی کا جینا حرام کر رکھا تھا حالانکہ قصوروار وہ نہیں تھیں لیکن بیلا کی غلطی کی سزا وہی بھگت رہی تھیں اور صرف ابا ہی نہیں سارے خاندان والے امی کو ہی الزام دیتے

تھے۔ خاص طور پر تائی جی تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں اور انہیں مواقع کچھ زیادہ ہی ملتے تھے کیونکہ ہم ایک ہی گھر میں رہتے تھے گو کہ پورشن بنے ہوئے تھے لیکن درمیان میں دیواریں نہیں تھیں اور آنگن تو ایک ہی تھا۔ جب ہی اندر، باہر آتے، جاتے سامنا ضرور ہوتا تو ہر بار وہ امی کا کلیجا چھلنی کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کہہ جاتی تھیں۔ جب سے میں جاب کرنے لگی تھی تب سے انہوں نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا تھا۔

''دیکھو بیٹی! تم بہت اچھی، سمجھدار لڑکی ہو...... کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے خاندان کی بدنامی ہو...... پہلے بیلا...... دیکھو کیسے اپنی مرضی کر کے ماں، باپ کے منہ پر کالک مل گئی ہے تم اس کے نقشِ قدم پر نہ چلنا۔'' وغیرہ وغیرہ......

اور میں نادان نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ تائی جی کا مقصد مجھے سمجھانا نہیں بلکہ بیلا کی غلطی کو دہرا کر میرا سر جھکانا ہے اور میں واقعی چپ چاپ سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہتی...... البتہ دل ہی دل میں بیلا کو ضرور گالیاں دیتی۔ جس کی وجہ سے امی اور میں بھی منہ میں زبان رکھتے ہوئے گونگی بننے پر مجبور تھے۔ صرف بیلا کی وجہ سے ہی نہیں ابا کی وجہ سے بھی جو تائی جی کو غیر معمولی اہمیت اور احترام دیتے تھے اور ہمیں بھی یہی حکم تھا۔ جس سے بیلا بہت چڑتی تھی۔

مجھے یاد ہے وہ شروع سے ہر وہ کام کرتی جس سے تائی جی منع کرتی تھیں اور جو وہ کرنے کو کہتیں وہ کبھی نہیں کرتی تھی۔ جس پر شام میں اکثر اسے ابا کی ڈانٹ اور کبھی مار بھی سہنی پڑتی لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آتی تھی اور مجھے لگتا تھا جیسے تائی جی کی ضد ہی میں اس نے وہ غلط قدم اٹھایا تھا...... اگر ایسا تھا تب بھی اس نے غلط کیا، کم از کم امی اور پھر میرا ہی خیال کر لیتی کہ اس کے اس اقدام سے ہم پر کیا بیتے گی...... لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا۔

اور میں بہت سوچتی تھی۔ ان چار سالوں میں امی نے جتنے آنسو بہائے تھے اتنی بار میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ میں بیلا نہیں بنوں گی۔ یہی نہیں اپنے ہر عمل سے ہی میں خود کو اس سے مختلف ثابت کرنے کی کوشش کرتی آ رہی تھی لیکن ایک احسن کے معاملے میں، میں ناکام ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کب، کیسے وہ میرے دل کی زمین پر اپنی محبت کا بیج بو گیا، مجھے سچ مچ پتا نہیں چلا...... میں تو اسے صرف ایک دوست سمجھتی تھی لیکن معاملہ اس سے آگے چلا گیا تھا اور اب اس نے مجھے پروپوز کر کے اپنی اماں کو بھی ہمارے ہاں بھیج دیا تھا۔ اگر درمیان میں بیلا کی غلطی نہ ہوتی تو میں آرام سے امی کو احسن کے بارے میں بتا سکتی تھی لیکن اب تو یہ ممکن ہی نہیں تھا اس لیے میں نے احسن کو اگر اصل بات نہیں بتائی تھی تب بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اس معاملے میں میرا کچھ اختیار نہیں میرے والدین جو فیصلہ کریں گے میں وہی قبول کروں گی اور حقیقتاً مجھے یہی کرنا تھا۔ اس لیے میں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ابا نے احسن کے پروپوزل کو کوئی اہمیت دی بھی ہے یا نہیں جبکہ وہ اگلے دن پھر آن موجود ہوا۔

''سنو! تمہیں کچھ اندازہ تو ہوا ہوگا......؟''

''کس بات کا......؟'' میں نے بے دھیانی سے سن کر پوچھا تو وہ جھنجلا کر بولا۔

''کہاں رہتی ہو تم...... گھر کی خبر رکھتی ہو نہ میری طرف دھیان ہے۔''

''میں صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ مزید چڑ کر بولا۔

''بہت اچھا کرتی ہو۔''

''پھر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟''

''دیکھو...... میں یہاں تمہارے ساتھ مذاق کرنے نہیں آیا...... سیدھی طرح بتاؤ، تمہارے والدین نے کیا سوچا...... میرا مطلب ہے میرے

بارے میں؟'' اس نے وارننگ کے انداز میں پوچھا تو میں زچ ہو کر بولی۔

''میں اب بھی یہی کہوں گی مجھے نہیں پتا۔''

''ٹھیک ہے ...... میں آج خود تمہارے ہاں آؤں گا۔'' وہ کہہ کر جانے لگا لیکن میں نے فوراً پکار لیا۔

''سنو...... احسن......!'' وہ وہیں سے پلٹ کر دیکھنے لگا تو میں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''میرے ہاں آنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔''

''آؤں گا...... ضرور آؤں گا۔'' اس نے کیوں کا سوال ہی نہیں اٹھایا اور مزید آنے پر زور دے کر چلا گیا تو میں واقعی بہت پریشان ہوگئی۔

اس کے پیچھے بھی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اپنے اس کیبن نما کمرے سے میں صرف اس وقت نکلتی تھی جب باس کا بلاوا آتا تھا اور سیدھی وہیں جا کر واپس یہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ اِدھر اُدھر میں نے کبھی نہیں جھانکا تھا اس لیے حقیقتاً مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمارے آفس میں اور کتنے کمرے ہیں جبکہ یہاں کام کرتے ہوئے مجھے چھ مہینے ہوگئے تھے اور اسٹاف میں بھی سب لوگوں سے واقف نہیں تھی۔ بس دو تین افراد جن میں احسن بھی شامل تھا اور جو میرے روم میں آکر مجھ سے ڈیزائن ڈسکس کرتے تھے بہرحال وہ سارا دن میرا اسی پریشانی میں گزرا کہ میں احسن کو کیسے باز رکھوں ...... گو کہ یہ زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن وہ پھر میرے کمرے میں آیا ہی نہیں اور پانچ بجے جب میں آفس سے نکلی تب زینے پر رک کر بھی اس کا انتظار کیا اور آخر مایوس ہو کر گھر آگئی پر مسلسل یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں وہ آنہ جائے۔ جتنی بار بیل بجی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ اس کے ساتھ میں اسے برا بھلا بھی کہتی رہی ...... یہاں تک سوچ لیا کہ ابا تو جو فیصلہ کریں گے، میں کل پہلی فرصت میں اسے اپنی طرف سے انکار کردوں گی اور یہ بھی کہہ دوں گی کہ وہ آئندہ اپنی اماں کو یہاں نہ بھیجے۔

''جیہ...... تمہیں امی بلا رہی ہیں......'' رات میں جب آخری چائے کے برتن دھو رہی تھی جب شہنی نے کچن میں جھانک کر مجھے تائی جی کا بلاوا دیا تو میں نے اس کی طرف پلٹ کر پوچھا۔

''فوراً بلایا ہے یا میں یہ برتن دھولوں؟''

''کوئی جلدی نہیں...... آرام سے آنا......'' وہ کہہ کر چلی گئی تو بھی میں نے جلدی، جلدی برتن دھو ڈالے پھر کچن بند کر کے امی سے کہتی ہوئی تائی جی کی طرف چلی گئی۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ شہنی کے ساتھ سر جوڑے پتا نہیں کیا باتیں کررہی تھیں مجھے دیکھتے ہی ایک دم سیدھی ہو بیٹھیں۔

''آؤ، آؤ جیہ...... فارغ ہوگئیں......؟''

''جی......!'' میں ان ہی کے بیڈ پر قدرے فاصلے سے بیٹھ گئی تو کہنے لگیں۔

''جب سے نوکری سے لگی ہو آ کر میرے پاس بیٹھتی بھی نہیں ہو کوئی ناراضی ہے کیا......؟''

''ارے نہیں تائی جی! میں آپ سے کیوں ناراض ہوں گی بھلا...... بس آفس سے آکر کھانا پکانے میں لگ جاتی ہوں۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح لگاوٹ کا مظاہرہ کر کے کہا۔

''ہاں...... ایک تو پہلے ہی تھکی ہوئی آتی ہو، اوپر سے اور کام......'' پھر شہنی سے کہنے لگیں۔

''دیکھ لو، تم جو نوکری کرنے کا کہتی ہو تو پہلے اس کا حال دیکھ لو۔''

''کیا ہوا...... اچھی بھلی تو ہے...... مجھے تو پہلے سے زیادہ فریش لگتی ہے۔'' شہنی نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو تائی جی برا سا منہ بنا کر بولیں۔

''کوئی نہیں...... اتنی سی شکل نکل آئی ہے، خیر تم جاؤ یہاں سے، مجھے جیہ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''تو میرے سامنے کریں ناں......''

''نہیں، تم جاؤ......'' تائی جی نے اسے گھورا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی جبکہ میں اندر ہی اندر پریشان ہو رہی تھی کہ پتا نہیں کیا بات کریں گی لیکن یہ خوبی مجھ میں تھی کہ میں خواہ کتنی پریشان یا خوف زدہ ہوتی مقابل پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی اب بھی بظاہر میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی تائی جی......! کیا بات ہے؟''

''ہاں وہ......'' تائی جی میری طرف متوجہ ہوئیں پھر آواز دھیمی کر کے راز داری سے بولیں۔ ''میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم احسن کو جانتی ہو......؟''

''کون احسن......؟'' میں یکسر انجان بن گئی جبکہ حقیقتاً اندر دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''وہی جو تمہارے آفس میں ہوتا ہے۔'' تائی جی کا انداز بڑا دوستانہ تھا لیکن ان کی آنکھیں ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

''پتا نہیں تائی جی ...... میں تو اپنے آفس کے کسی بندے کو نہیں جانتی، میرا کسی سے واسطہ ہی نہیں پڑتا، الگ روم میں بیٹھتی ہوں اور اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔'' میں نے سہولت سے جواب دے کر کہا تو وہ کچھ دیر کھوجتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

''ہاں ...... میں تو پہلے ہی کہتی ہوں کہ تم بیلا جیسی نہیں ہو، وہ بہت تیز تھی جب ہی تو دیکھو گل کھلا گئی۔ اللہ سمجھے اسے۔''

''چھوڑیں تائی جی...... یہ بتائیں، آپ احسن کا کیوں پوچھ رہی تھیں؟'' میں نے بیلا کی طرف سے ان کا دھیان ہٹانے کی خاطر احسن کا نام لے دیا۔

''وہ اس کی ماں آئی تھی تمہارے لیے...... میں نے سوچا تم سے معلوم کرلوں...... کیسا لڑکا ہے لیکن تم تو جانتی ہی نہیں۔''

''جی......''

''ٹھیک ہے پھر میں تمہارے باپ سے کہوں گی، وہ خود ہی چھان بین کرے...... ویسے ایک اور لڑکا بھی ہے میری نظر میں۔'' انہوں نے کہا تو میرا دل چاہا کہ کہہ دوں شہنی بھی تو ہے اس کے لیے دیکھیں اور سوچیں ...... میری فکر کیوں کرتی ہیں لیکن پھر وہی بیلا...... الو کی ...... میری زبان پر تالے لگ گئی تھی۔

''میں جاؤں تائی جی......! نیند آرہی ہے۔''

''ہاں، ہاں پھر صبح تمہیں آفس بھی جانا ہوتا ہے۔''

''جی شب بخیر......'' میں فوراً اٹھ کر ان کے کمرے سے نکل آئی تو آگے برآمدے میں ثریا بھابی مل گئیں۔ فیڈر اور تھرماس ہاتھ میں لیے کچن کی طرف جارہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو رک کر پوچھنے لگیں۔

''تم میری ساس کے پاس کیا کررہی تھیں؟''

''باتیں سن رہی تھی ان کی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو ثریا بھابی شاکی ہو کر بولیں۔

''میرے خلاف......''

''نہیں...... آج وہ میری شادی کی فکر میں تھیں۔''

''کیوں......؟ اللہ سلامت رکھے تمہارے ماں، باپ موجود ہیں، یہ کیوں فکر کررہی ہیں۔ اپنی بیٹی کی کریں جسے کھانے اور سونے کے علاوہ اور کچھ آتا ہی نہیں...... موٹی بھینس کہیں کی۔''

''کوئی نہیں، اتنی اسمارٹ ہے شہنی اور کام بھی کرتی ہے۔'' میں نے ان سے اختلاف کیا تو انہوں نے پہلے سر جھٹکا پھر پوچھنے لگیں۔

''ویسے ان کا شہنی کو رخصت کرنے کا کیا پروگرام ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم اور آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں، خود آپ کو ساری معلومات ہونی چاہئیں...... فی الحال اکلوتی بہو ہیں آپ اس گھر

کی۔'' میں نے لاعلمی کا اظہار کرنے کے ساتھ کہا تو وہ فوراً بولیں۔

''دعا کرو...... جلدی دوسری آئے تا کہ میری ساس کا آدھا دھیان اس کی طرف منتقل ہو۔''

''عدنان بھائی آئیں گے تب ہی تو...... ویسے کب تک آنے کا پروگرام ہے ان کا؟'' میں نے پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولیں۔

''پتا نہیں...... شاید عید پر آجائے۔''

''تو آپ تائی جی کو ان کے لیے لڑکی ڈھونڈنے پر لگادیں، اس طرح بھی ان کا دھیان بٹ جائے گا۔'' میرے مشورے پر وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں پھر پوچھنے لگیں۔

''سنو...... تمہارا عدنان کے ساتھ کوئی چکر تو نہیں ہے؟''

''توبہ کریں......'' میں اچھل پڑی۔

''کیوں...... اچھا تو ہے......''

''میں اچھی نہیں ہوں......'' میں کہہ کر قصداً ہنسی اورانہیں کچن کی طرف دھکیل کر اپنے کمرے میں آگئی۔

''فضول باتیں کرنے کھڑی ہوگئی...... اتنی دیر میں استری ہوجاتی۔'' اپنے آپ سے کہتے ہوئے میں نے جلدی سے صبح کے لیے کپڑے نکالے اور استری کا پلگ لگادیا پھراس کام سے فارغ ہوتے ہی لائٹ آف کر کے لیٹ گئی کیونکہ بارہ بج چکے تھے جبکہ روزانہ میں گیارہ بجے تک سوجاتی تھی تاکہ صبح اٹھنے میں دقت نہ ہواورابھی میں فوراً سوجانا چاہتی تھی لیکن ذراسی بے قاعدگی نے نیند اڑادی تھی۔ کچھ دیر زبردستی آنکھیں بند کیے پڑی رہی پھر چھت کو گھورنے لگی اورایسے میں ہمیشہ مجھے بیلا یاد آتی تھی کبھی جب اسے نیند نہیں آتی تھی تو وہ مجھے بھی جھنجوڑ کر اٹھادیتی تھی۔

''کیا ہے......؟'' میں آنکھیں ملتے ہوئے پوچھتی تو وہ بڑے آرام سے کہتی۔

''مجھے نیند نہیں آرہی۔''

''پھر......؟''

''پھر کیا تم بھی اٹھ جاؤ......''

''میں نہیں اٹھ رہی......'' میں دوبارہ تکیے پر گرنے لگتی لیکن وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیتی۔

''خبردار جو سوئیں تو......''

''اچھی زبردستی ہے، تم ایسے کیوں کرتی ہو......؟''

''مزہ آتا ہے، میرا دل چاہتا ہے چیخ، چیخ کر سارے گھر کو اٹھادوں اور پھر میں آرام سے سوجاؤں۔'' اس نے بہت محظوظ ہو کر کہا تھا اورایک بار سچ مچ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ بجائے مجھے اٹھانے کے چیخ چیخ کر سارے گھر کو اٹھادیا تھا امی، ابا، تائی جی، عمران بھائی، عدنان بھائی، شہنی، سب بھاگے چلے آئے تھے۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......؟''

اور وہ یوں ظاہر کرنے لگی تھی جیسے ڈراؤنے خواب سے اٹھی ہو، کسی کو پہچان بھی نہیں رہی تھی اور مزید تائی جی کی طرف اشارہ کر کے چڑیل، چڑیل چلانے لگی تھی۔ ابا نے اسے بازوؤں میں لے کر تھپکنا شروع کردیا اورامی اس کے سر پر آیت الکرسی پڑھنے کھڑی ہوگئی تھیں۔ تائی جی اپنا بولے جارہی تھیں، ساتھ ساتھ شہنی کو وہاں سے بھاگنے کا اشارہ بھی کرتی جارہی تھیں۔ غالباً انہیں خدشہ تھا کہ کہیں بیلا کا جنّ ان کی بیٹی پر نہ قبضہ کرلے اور جب ابا کے بازوؤں میں پُرسکون ہو کر بیلا سوگئی تب تائی جی، شہنی کو کھینچتی ہوئی لے گئیں۔ ان کے پیچھے عمران بھائی اور عدنان بھائی بھی چلے گئے تو ابا نے امی کو وہیں بیلا کے پاس سونے کو کہا پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے کمرے سے چلے گئے تھے پھر صبح جب میں نے بیلا سے پوچھا کہ رات اسے کیا ہوا تھا تو اس نے بڑے آرام سے جواب دیا تھا۔

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔''

''اُف ......! کتنی بدتمیز ہو تم...... سب کو پریشان کر کے رکھ دیا......'' میں نے ٹوکا تو ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''بہت مزہ آیا اور داد دو مجھے کہ تائی جی کو ان کے منہ پر چڑیل بھی کہہ دیا۔''

''بڑا کمال کیا......'' میں نے جس قدر ناگواری کا اظہار کیا وہ اسی قدر اترا کر بولی تھی۔

''اور کیا، تم کہہ سکتی ہو......؟''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، تم پتا نہیں کیوں ان سے اتنی خار کھاتی ہو، آخر کیا لے لیا ہے انہوں نے تمہارا......؟'' میں نے بات کے اختتام پر اسے دیکھا تو وہ فوراً بولی تھی۔

''باپ......''

''ہیں......'' میں مذاق سمجھ کر ہنسنے لگی تو وہ میرا ہاتھ کھینچ کر بولی تھی۔

''میں مذاق نہیں کررہی سچ کہہ رہی ہوں، تائی جی نے ہم سے ہمارا باپ چھین لیا ہے دیکھتی نہیں ہو، کیسے ابا ان کی ہر بات پر آمین کہتے ہیں۔''

''تو کیا ہوا...... وہ بڑی ہیں پھر بے چاری بیوہ بھی ہوگئیں، اس لیے ابا زیادہ خیال کرنے لگے ہیں کہ کہیں انہیں یہ احساس نہ ہو کہ تایا جی کے بعد ان کا کوئی نہیں ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ تائید کے ساتھ کہنے لگی۔

''ہاں...... ابا اسی لیے کرتے ہیں لیکن وہ کچھ زیادہ پھیل رہی ہیں۔ ابا کی سعادت مندی سے ناجائز فائدہ اٹھارہی ہیں۔''

''کوئی نہیں......''

''کوئی نہیں......'' وہ میری نقل اتارتے ہوئے چڑ کر بولی تھی۔ ''تمہیں تب پتا چلے گا جب ہر کام کے لیے تائی جی کی طرف دیکھنا پڑے گا کہ وہ اجازت دیں گی تب ہی ہم کچھ کرسکیں گے۔ اب بھی ابا جان ان کی بات مانتے ہیں، امی کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں اور

قرآن حکیم لکھنے کے لیے ابتدائی معلومات

1۔ آپ رجسٹر یا کاپی پر نہ لکھیں کیونکہ یہ کاغذ کمزور ہوتا ہے، بیس، پچیس سال بعد پرانا اور خراب ہوجائے گا۔

2۔ اردو بازار سے اچھے قسم کا سفید کاغذ خریدیں۔

3۔ اپنے قرآن پاک کا سائز آپ خود تیار کریں گی۔

4۔ ایک سفید ڈرائنگ شیٹ خریدیں اوراس پر پنسل فٹ کی مدد سے شیٹ کا سائز تیار کریں۔

5۔ قرآن حکیم سے نہ لکھیں، علیحدہ سپارے خریدیں اس طرح آپ کو ہینڈل کرنے میں آسانی ہوگی۔

6۔ 12 لائنوں والے سپارے لیں تاکہ سائز بڑا نہ ہونے پائے۔

7۔ حاشیہ ضرور بنوائیں ...... جس طرح سپارے میں لکھا ہے ویسا ہی آپ بھی لکھیے ...... مثلاً صفحہ نمبر اور لائن ٹو لائن ورڈ ٹو ورڈ لکھیں۔

8۔ وائٹو اپنے پاس رکھیے، معمولی غلطی وائٹو سے درست کریں۔ بڑی غلطی ہو تو صفحہ ریجیکٹ کردیں۔

9۔ جتنے صفحات آپ کے کلام پاک میں ہیں اسی حساب سے کاغذ کی شیٹ بنیں گی۔ دکاندار مدد کردے گا۔

10۔ اگر حاشیے پر کوئی ڈیزائن ڈلوانا ہے تو یہ کمپیوٹر سے بنے گا۔

11۔ جلد بہت اعلیٰ بنوائیں، اس میں کنجوسی نہ کریں...... (جلد بندی میں بہت خرچہ آتا ہے)

12۔ لکھنے کے لیے signo بلیک پوائنٹر خریدیں۔ ایک پوائنٹر سے ایک سپارہ لکھ سکیں گی۔

13۔ جب لائن لکھ لیں تو اسی وقت چیک کریں۔

14۔ الحمد شریف آپ کے سیدھے ہاتھ کی جانب ہوتی ہے اس پر ہمیشہ صفحہ نمبر 2 ہوتا ہے۔ بائیں جانب صفحہ نمبر 3 ہوگا۔ اگر آپ الحمد شریف پر صفحہ 1 ڈالیں گی تو یہ بلنڈر ہوگا۔

از: ذکیہ بلگرامی، کراچی

دیکھنا اس بات پر میں کسی دن بہت فساد ڈالوں گی۔''
''نہیں بیلا......'' میں نے فوراً اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ ''تم خدا کے لیے ایسا کچھ نہیں کرنا۔''
''کیسے نہیں، میرے کسی معاملے میں اگر ابا نے انہیں زیادہ اہمیت دی تو پھر میں رہوں گی یا وہ......'' اس نے قطعیت سے کہا تھا۔
اور بیلا کے احساس دلانے پر میں نے غور کیا تو واقعی تائی جی نے غالباً پورے گھر پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے ابا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور بہت پیار سے......
جب عمران بھائی کی شادی کرنے لگیں تو ابا سے یوں مشورے کرتیں جیسے ان کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتیں جبکہ کرتی اپنے من کی تھیں جس کا ابا کو احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ خوش تھے کہ بھاوج انہیں اہمیت دیتی ہیں اور امی سے بھی کہتے کہ ان کا میرے سوا اور کون ہے بے چاری اکیلی عورت......
''اکیلی کیوں......؟'' ایک دن امی نے ٹوکا تھا۔ ''ماشاءاللہ جوان بیٹے ہیں۔''
''ہاں......لیکن انہیں اتنی عقل کہاں......؟''
''سب عقل ہے بس ایک آپ کو نہیں ہے۔'' امی کا اتنا کہنا تھا کہ ابا ایک دم طیش میں آگئے تھے۔
''کیا کہنا چاہتی ہو تم، چھوڑ دوں بیوہ بھاوج اور بھائی کے یتیم بچوں کو......ارے ابھی تو وہ ہم پر بوجھ نہیں ہیں۔ ماشاءاللہ اپنا کماتے کھاتے ہیں، میں کیا کرتا ہوں...جا کر حال احوال ہی پوچھ لیتا ہوں اور تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا......ارے اگر نہیں دیکھ سکتیں انہیں تو جا بیٹھو اپنے بھائی کے گھر......''
''میں نے ایسا کب کہا......؟'' امی غصے سے خائف ہو کر منمنائی تھیں۔
''خبردار جو کچھ کہا تو......'' ابا مزید تیز ہو کر دہاڑے تھے جس پر بیلا بھاگ کر ان کے مقابل کھڑی ہونا چاہتی تھی لیکن میں اسے کھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئی اور دروازہ لاک کر دیا تھا۔
''مجھے جانے دو، میں نا انصافی اور زیادتی برداشت نہیں کر سکتی۔'' بیلا بری طرح تلملا کر مجھے نوچتی کھسوٹتی رہی لیکن میں نے اس وقت دروازہ نہیں کھولا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ بات بڑھ کر تائی جی تک پہنچے اور وہ امی سے باقاعدہ دشمنی باندھ لیں گو کہ دشمنی تو وہ اب بھی کر رہی تھیں لیکن براہِ راست امی سے نہیں الجھتی تھیں۔
بہرحال اس روز میں نے بڑی مشکل سے بیلا کو ٹھنڈا کیا تھا۔ اس کے بعد امی نے بھی اسے سمجھا دیا کہ اسے بڑوں کے معاملات میں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
''نہیں بولوں گی، کبھی نہیں بولوں گی، کُڑھتی رہیں خود، بہت شوق ہے انہیں کڑھنے کا مظلوم بننے کا......'' اس رات بیلا بڑبڑاتی رہی تھی۔ میں نے قصداً انہیں ٹوکا تھا۔
اور پھر واقعی اس نے خاموشی اختیار کر لی لیکن جتنی دیر ابا، تائی کے کمرے میں بیٹھتے، وہ اِدھر جلے پیر کی بلی کی طرح چکراتی تھی اور دانت پیس، پیس کر اپنی ہتھیلی پر مکے مارے جاتی۔ اس وقت وہ ایسے ہی تلملا رہی تھی جب عدنان بھائی نے ہمارے کمرے میں جھانک کر پوچھا تھا۔
''سنو! چچا جان کہاں ہیں؟''
''ابا کہو......'' بیلا نے جس انداز سے کہا۔ اس سے میں گھبرا کر وضاحت کرنے لگی تھی۔
''اس کا مطلب ہے ہمارے ابا......''
''ہاں وہی تمہارے ابا کہاں ہیں؟'' عدنان بھائی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے لیکن مجھ سے پہلے بیلا نے جواب دیا تھا۔
''تمہاری اماں کے پاس......''
''جی عدنان بھائی......ابا شاید اُدھر ہی ہوں گے

یا دیکھیں امی سے پوچھ لیں۔'' میں بات بنانے کی کوشش کر رہی تھی کہ عدنان بھائی اندر آ کر پوچھنے لگے۔
''تم اتنا بوکھلا کیوں رہی ہو......؟''
''ہاں دیکھو کتنی پاگل ہے...... حالانکہ بوکھلانا تمہیں چاہیے۔'' بیلا پتا نہیں کیا سوچے بیٹھی تھی۔ میری بوکھلاہٹ اور پریشانی کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔
''کیوں......؟'' عدنان بھائی نے پوچھا تو وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔
''ظاہر ہے، تم لڑکی والے ہو......''
''ہائے بیلا......'' اس سے پہلے کہ عدنان بھائی کچھ سمجھتے میں پیٹ پکڑ کر یوں چلّانے لگی جیسے بہت درد ہو رہا ہو۔
''اسے کیا ہوا......؟'' عدنان بھائی پریشان ہو گئے تھے۔
''اکثر ہوتا ہے......میرا مطلب ہے پیٹ میں درد......تم جاؤ، میں دیکھتی ہوں اسے۔'' بیلا انہیں بھیج کر ہنسنے لگی تھی۔
''قسم سے بیلا......اگر تم مجھ سے بڑی نہ ہوتیں تو میں......''
''بس، بس، زیادہ غصہ مت دکھاؤ......'' وہ مجھے ٹوک کر پھر ٹہلنے لگی تھی۔



یونہی کتنے دن گزر گئے، میرا بس یہی کام رہ گیا تھا کہ جیسے ہی ابا، تائی جی کے پورشن کی طرف جاتے، میں بیلا کا دھیان بٹانے میں لگ جاتی اور پھر ایک دن خود ہی اس کا دھیان بٹ گیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، ابا کب آفس سے آئے کب دوسرے پورشن میں گئے، وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ جب میں نے ٹوکا تو مسکرا کر بولی تھی۔
''مجھے وہ اچھا لگنے لگا ہے۔''
''کون......؟'' میں نے پوری آنکھیں پھیلائی تھیں۔
''حماد......''
''دیکھو......اس طرح مت کرو، مجھے فوراً پوری تفصیل بتا ڈالو۔ نہیں تو میرا ڈپریشن بڑھ کر مجھے اوپر پہنچا دے گا۔'' میں نے کہا تو وہ رعب سے بولی تھی۔
''خبردار میری سگائی سے پہلے اوپر جانے کی کوشش مت کرنا۔''
''تو جلدی بتاؤ۔''
''کیا......؟''
''تمہارے ساتھ پڑھتا ہے؟''
''نہیں......لیکن روزانہ میرے راستے میں آتا ہے خوب صورت سی گاڑی میں سلام کرتا ہوا نکل جاتا اور آج اس نے رک کر مجھ سے بات کی تو مجھے اچھا لگا۔''
وہ اس کے تصور میں کھو کر بول رہی تھی اور میں اس کی آنکھوں میں رنگوں کی برسات دیکھ کر کچھ خائف سی ہو گئی تھی۔
''ک......کیا بات کی اس نے؟''
''اپنا تعارف کرایا میرا نام پوچھا اور کہا، تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ میں ہنس دی تو وہ بولا۔ تمہاری ہنسی بہت پیاری ہے۔''
''پھر......؟''
''پھر میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔'' وہ کہہ کر چونکی تھی اور یوں بیلا اپنی زندگی کے خوب صورت موڑ میں داخل ہو کر باقی سب بھول گئی۔ امی کا کڑھنا اور چھپ، چھپ کر رونا نظر آتا تھا اسے نہ ابا کا دوسرے پورشن میں جانا۔ وہ اپنی دنیا میں گم ہو گئی تھی۔ اگر میں احساس دلانے کی کوشش کرتی تو بے نیازی سے کہتی۔
''کیا ہے امی کو اب عادی ہو جانا چاہیے۔''
''یہ تم کہہ رہی ہو......؟'' پہلی بار اس جواب پر میں بہت حیران ہوئی تھی۔
''ہاں اور ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ابا اگر تائی جی

کے پاس جا بیٹھتے ہیں تو اس میں برائی کیا ہے، وہ کوئی لڑکی نہیں ہیں جوان بچوں کی ماں ہے اور اب تو بہو بھی آچکی ہے۔''

''بس کرو بیلا......! تمہارا تو کوئی دینِ ایمان ہی نہیں ہے۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر اسے خاموش کرایا تھا اور بعد میں جب میں نے سوچا تو مجھے بیلا کی تبدیلی پر حیرت نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہوئی کہ وہ مثبت انداز سے سوچنے لگی ہے پھر اس کا ایک فائدہ مجھے بھی ہوا تھا کہ روزانہ اسے ٹھنڈا کرنے کی ڈیوٹی سے مجھے نجات مل گئی تھی، اس کے برعکس وہ میری خوشامد کرنے لگی تھی۔

''جیہ پلیز......! ابھی سونا نہیں مجھے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

''صبح کر لینا......'' مجھے بدلہ لینے کا موقع ملا تھا یوں ظاہر کرتی جیسے بہت نیند آرہی ہو۔

''صبح ہماری ملاقات کہاں ہوتی ہے، تم کالج، میں یونیورسٹی اور وہاں سے آکر تمہیں امی کے پاس بیٹھنا ضروری ہوتا ہے۔''

''کل نہیں بیٹھوں گی امی کے پاس تمہاری باتیں سن لوں گی۔''

''نہیں ابھی سنو......'' اس کی لگاوٹ میں کچھ ضد بھی شامل تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں بھی سننا چاہتی تھی۔ اس لیے ہتھیار ڈال کر متوجہ ہو جاتی۔ وہ حماد، حماد کرتے اتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا تصور ہی نہیں تھا جس سے میں ڈرنے لگی تھی اور اسے ٹوکا بھی تو وہ بڑے یقین سے بولی۔

''سنو...... ساری دنیا فریب ہو سکتی ہے۔ حماد کی محبت نہیں۔''

''تو پھر وہ آگے کیوں نہیں بڑھتا، میرا مطلب ہے شادی کے لیے۔''

''لو وہ تو روز اپنے ماں، باپ کو بھیجنے کی بات کرتا ہے لیکن میں منع کر دیتی ہوں۔''

''کیوں منع کرتی ہو......؟''

''بس میں چاہتی ہوں پہلے ایگزام دے لوں، اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو۔''

''نہیں بیلا...... سلسلہ شروع ہونے دو تاکہ ایگزام کے فوراً بعد تمہاری شادی ہو جائے۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً ہی بولی تھی۔

''اور تمہارا نمبر آئے۔''

''ظاہر ہے تم جاؤ گی تو میرا نمبر آئے گا ناں......''

''یہ بات ہے تو میں صبح ہی حماد سے کہوں گی اور دیکھنا، شام میں اس کے اماں ابا آجائیں گے۔'' اس نے یوں کہا تھا جیسے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

☆☆☆

''اور واقعی اگلی شام حماد کے ماں، باپ آگئے تھے جنہیں دیکھتے ہی مجھے ان کی امارت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے بڑی چاہت سے بیلا کو مانگا تھا یعنی ان کے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے سے کم حیثیت لوگوں میں آن بیٹھے ہیں۔ اس کے برعکس جیسے وہ سوالی تھے تو سوال کرنے والوں جیسی ہی عاجزی دِکھا رہے تھے۔ جس کی بعد میں، میں نے ابا کے منہ سے تعریف بھی سنی تھی اور دو دن تک یوں لگتا رہا جیسے ابا ابھی ہامی بھر لیں گے لیکن تیسرے دن پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ ابا ایک دم بدل گئے۔

''اب وہ لوگ آئیں تو صاف منع کر دینا، مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے......'' ابا، امی سے کہہ رہے تھے اور بیلا سن کر اسی وقت ان کے مقابل جا کھڑی ہوئی تھی۔

''کیوں منظور نہیں ہے، مجھے منظور ہے۔''

''تم......!'' ابا طیش میں آکر بیلا پر ہاتھ اٹھانا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے امی نے اسے پرے دھکیل دیا۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

''پہلے مجھے بات کرنے دیں۔ میری شادی

حماد سے ہوگی، اگر آپ نے منع کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' وہ امی کے دھکوں کے باوجود چیخ، چیخ کر بول رہی تھی کہ تائی جی بھاگی آئیں۔

''کیا ہو گیا......؟''

''آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے معاملات میں بولنے کی۔ آپ جائیں اپنی اولاد کی فکر کریں۔'' بیلا نے ان کا لحاظ نہیں کیا پھر بھی وہ پچکار رہی تھیں۔

''بیٹی، تم بھی میری اولاد ہو، میں نے تو کبھی فرق نہیں کیا، جیسے شہنی ویسے تم۔''

''بس رہنے دیں، بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں آپ کو...... ابا کو بے وقوف بنا سکتی ہیں مجھے نہیں۔''

''بیلا......!'' ابا دہاڑے تھے اور اس سے پہلے کہ اس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹتے، تائی جی درمیان میں آکر ابا پر بگڑنے لگی تھیں۔

''بیٹی پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی۔ وہ تو ابھی نادان ہے لیکن تم تو سمجھ والے ہو۔''

اس کے ساتھ انہوں نے مجھے بیلا کو وہاں سے لے جانے کا اشارہ کیا تو میں اسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لے گئی، جہاں اس نے بقیہ غصہ مجھ پر اتارا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی بات پر اَڑی رہی کہ اس کی شادی حماد ہی سے ہوگی اور اگر یہاں سے منع کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ یہ گھر چھوڑ دے گی اور پھر واقعی وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی کیونکہ ابا نے اس کی شادی عدنان بھائی کے ساتھ طے کر کے فوری نکاح کا نہ صرف فیصلہ سنا دیا بلکہ انتظامات میں بھی لگ گئے تھے اور بیلا نے جیسے ہی سنا، اسی وقت باقاعدہ اعلان کرتی ہوئی گئی تھی۔

''میں جا رہی ہوں، میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔'' میں اور امی اس کے پیچھے بھاگیں اسے پکارتی رہ گئیں لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا اگر دیکھ لیتی تو اپنے جانے کا ارادہ ترک نہ بھی کرتی تب بھی گرتی ہوئی امی کو سہارا دینے ضرور آتی لیکن اس نے یہ منظر دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد تو ہمارے لیے زندگی عذاب ہو گئی۔ ابا نے سارا الزام امی کے سر پر رکھ دیا اور اب بھی یہی کہتے ہیں اور عدنان بھائی کا انداز کیسا اکسانے والا ہوتا ہے۔

''اگر میری بہن ایسا قدم اٹھاتی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ کر ایک کونے میں ڈال دیتا۔''

بہرحال بیلا کے جانے سے امی تو بالکل ہی ٹوٹ گئی تھیں اور میرے لیے بھی اس وقت تو ابا نے سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ کالج جانے سے بھی منع کر دیا تھا لیکن پھر کچھ دنوں بعد تائی جی کے کہنے پر انہوں نے مجھے کالج جانے کی اجازت دے دی تو اسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر اپنی زندگی میں کچھ بننا ہے تو سب سے زیادہ مجھے تائی جی کو خوش رکھنا اور ان کی جی حضوری کرنی ہوگی۔ شروع میں بیلا نے مجھے یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہیں تب پتا چلے گا جب ہر کام کے لیے تائی جی کی طرف دیکھنا پڑے گا اور یہی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

بی اے کر کے میں دو سال گھر بیٹھی رہی تھی اس دوران میرے لیے کافی پروپوزل آئے تھے لیکن کہیں بات نہیں بنی۔ بس ایک آدھ کو ہی اِدھر سے انکار ہوا تھا۔ باقی سب بیلا کی داستان دُہرا کر منع کر گئے تھے مجھے نہیں معلوم، بیلا کی کہانی وہاں تک کیسے پہنچتی تھی۔ بہرحال امی بہت فکر مند تھیں اور مجھے گھر کے گھٹے ہوئے اور سازشی ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔ جب ہی میں نے تائی جی کے ذریعے ابا سے کوئی کورس کرنے کی اجازت لی پھر اسی طرح جاب بھی کرنے لگی جبکہ میری ڈور اب بھی تائی جی کے ہاتھوں میں ہی تھی یہ نہیں تھا کہ میں کوئی کمزور یا بزدل لڑکی تھی، حقیقتاً مجھ میں بیلا جیسا یا شاید اس سے زیادہ حوصلہ تھا۔ چاہتی تو ایک جھٹکے سے تائی جی کے ہاتھوں

www.paksociety.com

سے اپنی ڈور کھینچ کر اپنے معاملات میں خود مختاری کا اعلان کر دیتی لیکن مجھے امی کا خیال تھا جو بیلا کی غلطی کی سزا اب تک بھگت رہی تھیں۔ گو کہ اسے گئے چار سال ہوگئے تھے اور پتا نہیں کیسے اس نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا کہ آنا تو دور کی بات، کبھی فون بھی نہیں کیا تھا جبکہ میں شروع میں تو بہت شدت سے منتظر رہی تھی کہ وہ کم از کم مجھے ضرور بتائے گی کہ یہاں سے نکل کر وہ کہاں گئی اور پھر حماد کے ساتھ شادی کیسے ہوئی اور پتا نہیں ہوئی یا نہیں۔

پہلے مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کیونکہ میں نے بہت سے واقعات سنے اور پڑھے بھی تھے کہ گھر سے اس طرح نکلی ہوئی لڑکیوں کا آگے کیا انجام ہوتا ہے اس لیے میں اور شاید امی بھی لاشعوری طور پر منتظر رہتی تھیں کہ وہ دھکے کھاتی ہوئی آخر پلٹ کر یہیں آئے گی...... لیکن وہ جیسے کہہ کر گئی تھی کہ اب اس گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو یہاں بھی اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا لیکن اس سے ہمارا رشتہ اٹوٹ تھا...... میں اگر اسے گالیاں دیتی تھی تو اس کے لیے دعا بھی ضرور کرتی تھی کہ وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو اور خوش ہو۔

☆☆☆

رات میں بیلا کو سوچتے ہوئے بہت دیر سے سوئی تھی، جب ہی صبح معمول کے مطابق آنکھ نہیں کھلی اور امی نے بھی نو بجے اٹھایا تھا۔ میں گھڑی دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''امی...... مجھے آفس جانا تھا۔''

''میں سمجھی، آج نہیں جاؤ گی، اتنی بے خبر سو رہی تھیں تم...... میں نے سات بجے ایک دو بار پکارا تھا۔ کیا رات دیر تک اُدھر بیٹھی رہی تھیں؟'' امی نے پوچھا تو میں دوبارہ لیٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں، زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی۔''

''اچھا، تو اب اٹھ جاؤ......'' امی نے دوبارہ لیٹنے پر ٹوکا۔

''کیا کروں گی اٹھ کر، آفس کی تو چھٹی ہوگئی...... ابا چلے گئے کیا......؟''

''ہاں۔'' امی ہاں کہہ کر جانے لگیں تو پھر میں نے اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بیٹھیں ناں...... کہاں جا رہی ہیں؟''

''تمہارے لیے ناشتا بنا دوں؟''

''مجھے جب کرنا ہوگا، خود بنا لوں گی، آپ بیٹھیں ناں......'' میرے اصرار پر وہ شاید تھکی تھیں جب ہی بیٹھ کر بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''کیا بات ہے؟''

''پریشان کیوں ہوگئیں، میں تو یونہی آپ کے ساتھ باتیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن آپ کو شاید خاموش رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔''

''ہاں...... سارا دن کون ہوتا ہے جس کے ساتھ بولوں، جب سے تم بھی نوکری سے لگی ہو، میں بالکل اکیلی ہوگئی ہوں۔'' انہوں نے کہا تو میں نے فوراً پوچھا۔

''چھوڑ دوں نوکری......؟''

''نہیں، گھر میں بیٹھ کر طعنے سننے سے اچھا ہے کام سے لگی رہو۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ سارا دن طعنے سنتی ہیں۔'' میں نے ان کی بات پکڑی تو دکھ سے بولیں۔

''جب نصیب میں یہی ہے تو کیا کروں۔''

''کوئی نصیب میں نہیں لکھا...... سب بیلا کا کیا دھرا ہے خود تو آرام سے ہوگی اور ہم......''

''اللہ کرے آرام سے ہو۔'' امی نے کہا تو میں ایک دم خاموش ہو کر انہیں دیکھے گئی۔ تب ہی برآمدے سے شہنی نے پکارا تھا۔

''جیہ! تمہارے آفس سے فون ہے۔''

''آفس سے۔'' میں چونکنے کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بہت عجلت میں چپلوں میں پیر پھنساتے ہوئے کمرے سے نکل کر ٹیلی فون کے پاس آئی تو شہنی ریسیور مجھے دے کر وہیں کھڑی ہوگئی۔ جس پر میں بہت جز بز ہوئی اور بہت احتیاط سے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے احسن پوچھنے لگا۔

''آج چھٹی کس خوشی میں......؟''

''سوری سر......! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نہیں آسکی۔'' میں نے شہنی پر یہی ظاہر کیا جیسے باس کا فون ہو اور اُدھر وہ چیخ پڑا۔

''دماغ پر اثر ہوگیا ہے کیا......؟''

''جی سر......''

''مذاق چھوڑو جیہ، یہ بتاؤ کیوں نہیں آئیں؟''

''میں کل ضرور آؤں گی سر......'' میری ساری توجہ اُدھر تھی لیکن نظریں شہنی پر۔

''سنو...... کیا ہوگیا ہے تمہیں...... کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' اب وہ سنجیدہ ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ''میں آجاؤں؟''

''نو سر...... میں نے کہا ناں میں کل ضرور آؤں گی اور وہ پرابلم وہیں ڈسکس کر لیں گے...... اوکے......'' میں نے بظاہر بہت اعتماد سے کہہ کر فون بند کر دیا پھر انجان بن کر شہنی سے پوچھا۔

''تمہیں فون کرنا ہے؟''

''نہیں...... ہاں......'' وہ واقعی گڑبڑا گئی تھی۔

''کر لو......'' میں اندر ہی اندر محظوظ ہوتی صحن میں لگے واش بیسن پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی پھر وہاں سے کچن کا رخ کیا اور چائے کا پانی رکھ کر سلائس گرم کر رہی تھی کہ شہنی آکر پوچھنے لگی۔

''تمہاری طبیعت کو کیا ہوا......؟''

''کچھ نہیں، اصل میں رات تائی جی کے ساتھ باتوں میں دیر ہوگئی تھی اس لیے صبح آنکھ نہیں کھلی لیکن باس سے تو یہ نہیں کہہ سکتی تھی ناں......'' میں نے اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

''تمہارے باس بہت سخت ہیں کیا......؟''

''ہاں اور صرف ہمارے نہیں سب ایسے ہوتے ہیں، خوفناک شکلیں، اوپر سے کرخت لہجے، پیشانی پر اتنے بل ہوتے ہیں کہ شمار نہیں کیے جاسکتے۔'' باس کا نقشہ کھینچتے ہوئے میری نظروں میں اچانک ہی اپنے باس کا وجیہہ سراپا آن سمایا تو میں ایک دم خاموش ہوگئی۔

''توبہ میں تو جاب نہیں کروں گی۔'' شہنی نے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیوں......؟''

''مجھے کوئی شوق نہیں خوفناک شکلیں دیکھنے کا۔'' وہ کہہ کر چلی گئی تو میں نے ہنستے ہوئے سر جھٹکا پھر وہیں کھڑے، کھڑے ناشتا کر کے برتن بھی دھو ڈالے اس کے بعد فوراً کرنے کو کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں امی سے کہہ کر تائی جی کے پاس چلی آئی کیونکہ میری ڈور ان کے ہاتھوں میں تھی اور مجھے انہیں خوش رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ اطمینان بھی دلانا پڑتا تھا کہ میں ان کے مشورے کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی یعنی ان کی خوشامد ضروری تھی۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

بہر حال خود پر جبر کر کے میں بہت دیر اُن کے پاس بیٹھی اور ان کے منہ سے ثریا بھابی کی برائیاں سنتی رہی۔ درمیان میں کتنی بار میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی لیکن وہ پھر اسی پر آجاتیں، خدا خدا کر کے کھانا پکانے کا وقت ہوا تو میری جان چھوٹی لیکن آگے امی ناراض بیٹھی تھیں۔

''باپ کی طرح تمہارا بھی وہیں دل لگتا ہے۔''

''توبہ کریں...... میرا تو انہیں دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔'' میں نے فوراً کہا تو امی نے پھر ٹوکا۔

''پھر کیوں جاتی ہو؟''

''مجبوری ہے، نہیں جاؤں گی تو وہ ابا کو بہکا کر ہر روز یہاں فساد ڈلوائیں گی۔'' میں نے کہہ کر بات بدل دی۔

''کھانے میں کیا پکنا ہے، جلدی بتائیں۔''

''سبزی گوشت رکھا ہے، جو دل چاہے بنالو۔''

''میں سب بنالیتی ہوں، دو دن آپ کو کھانا پکانے سے فرصت مل جائے گی۔'' میں کہتی ہوئی کچن میں آگئی تو کام کے ساتھ ساتھ میری سوچیں بھی بدلتی رہیں اور آخر میں احسن پر آکر تھم گئی تھیں۔

وہ فون پر میری باتوں سے پتا نہیں کیا سمجھا تھا جو اگلے دن سیدھا میرے پاس چلا آیا اور چھوٹتے ہی پوچھنے لگا۔

''کل کیا مسئلہ تھا؟''

''میرے ساتھ میری کزن کھڑی تھی۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح سکون سے جواب دیا۔

''تو......؟''

''تو ظاہر ہے، میں اس کے سامنے تم سے بات نہیں کرسکتی تھی۔''

''کیوں......ڈرتی ہو......؟'' وہ میرے سکون سے جانے کیوں چڑتا تھا اور اکسانے کی کوششیں بھی کرتا۔

''ہاں۔'' میرے اعتراف پر وہ جھنجلا گیا۔

''کیوں......؟''

''تم اور کوئی بات نہیں کرسکتے۔'' میں نے ٹوکا تو وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''نہیں...... میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اتنی بزدل کیوں ہو......؟''

''تو جان لو کہ میں بزدل نہیں، بہت بہادر ہوں۔'' میں نے زور دے کر کہا تو وہ ہنسنے لگا پھر ایک دم میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھنے لگا۔

''میرے لیے اسٹینڈ لے سکتی ہو؟''

''ہاں......اگر میں چاہوں۔''

''کیوں نہیں چاہتیں......؟'' اس نے فوراً ٹوکا۔

''وجہ...... میں تمہیں بتا چکی ہوں مجھے اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنا اچھا نہیں لگتا اور نہ میں والدین کے فیصلوں کو چیلنج کرنا پسند کرتی ہوں...... تم پلیز مجھ سے ایسی کوئی توقع مت رکھو اور نہ مجھے اکسانے کی کوشش کرو۔'' میں بہت سکون سے ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی کہ وہ ٹیبل پر ہاتھ مار کر بولا۔

''بس کرو...... میں تمہاری تقریر سننے نہیں آیا۔''

''تمہیں آنا ہی نہیں چاہیے جب تک تمہارے پروپوزل کا فیصلہ نہیں ہوجاتا۔'' میں نے کہہ کر سر جھکالیا۔

''ٹھیک کہتی ہو، مجھے واقعی پہلے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے جو اگر میرے حق میں ہوگیا تو......'' وہ رک کر مجھے دیکھنے لگا تھا لیکن میں نے سر اونچا نہیں کیا تو وہ بھی بات ادھوری چھوڑ کر میرے کمرے سے نکل گیا تھا۔

اور اس کے بعد جب بھی وہ میرے کمرے میں آیا صرف آفیشل کام سے، اس کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کی۔ جس پر مجھے اطمینان ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس عجیب سا لگنے لگا۔ اس کے اجنبی انداز پر اپنے آپ جھنجلانے لگتی اور شاید اسے متوجہ کرنے کی خاطر ہی میں جان بوجھ کر غلطیاں کرنے لگی تھی اور اس وقت مجھے کچھ اور نہیں سوجھا تو کھانے چلی گئی۔

''پانی۔'' اس نے گلاس میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

''تھینک یو......'' میں نے دو گھونٹ لے کر اسے دیکھا لیکن وہ ٹیبل پر پھیلی شیٹ پر جھک گیا تھا۔

میرا دل چاہا بقیہ پانی اس کے سر پر انڈیل دوں اور جب اس پر عمل نہیں کرسکی تو جھنجلانے لگی۔ وہ اگر مجھے دیکھ نہیں رہا تھا تو بھی محسوس ضرور کررہا تھا...... اس کے بعد متوجہ نہیں ہوا اور قدرے توقف سے ایک ڈیزائن پر پنسل سے مارک کرکے کہنے لگا۔

''اسے کمپیوٹر پر لگادیں۔''

''اور......''

''بس یہ ہی......'' وہ کہہ کر چلا گیا تو میں کتنی دیر اس کے پیچھے دیکھتی رہی پھر کمپیوٹر آن کردیا لیکن کام

میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ جو کام دے گیا تھا اسے مکمل کرپائی۔ اس کے بعد گھڑی دیکھنے لگی۔ حالانکہ ابھی صرف گیارہ بجے تھے اور میں یوں اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جیسے یہاں سے نکلنے میں چند سیکنڈز باقی ہوں۔ تب ہی میرے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہونے لگی۔ پہلے تو میں سمجھی نہیں کہ یہ کیسی آواز ہے جب غور کیا تب بھی الجھ کر بولی۔

''یس......کم آن......''

دوسری طرف جیسے سنا ہی نہیں گیا اور دستک ہنوز جاری رہی۔ تب مجھے اٹھنا پڑا اور جیسے ہی دروازہ کھولا ایک چھوٹا سا بچہ میرے پیروں میں آن گرا جو غالباً دروازے کے ساتھ پیٹھ لگا کر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ میں پہلے اچھل کر پیچھے ہٹی پھر بچہ دیکھ کر حیران تو ہوئی ہی لیکن فوراً اسے بازوؤں میں بھی اٹھالیا تو بچہ جو گرنے سے نہیں رویا تھا میری شکل دیکھ کر رونے لگا۔

''ارے، رے۔'' میں اسے کندھے سے لگا کر چپ کروانے لگی لیکن وہ اور مچل گیا تب ہی باس غالباً اس کی آواز سن کر بھاگے آئے تھے اور مجھے ان کو دیکھ کر احساس ہوا کہ یہ گھر نہیں آفس ہے۔

''یہ......؟'' باس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ میں گھبرا کر بول پڑی۔

''پتا نہیں کس کا ہے۔''

''میرا ہے۔'' انہوں نے بچے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو بوکھلاہٹ میں، میں بجائے بچہ انہیں دینے کے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''سعد، سعد بیٹا۔'' انہوں نے چٹکی بجا کر بچے کو پکارا تو ان کی آواز سنتے ہی بچے نے فوراً متوجہ ہوکر ان کی طرف بازو پھیلا دیے۔

''تائی بوائے۔'' انہوں نے اسے لے کر سینے سے لگالیا پھر جاتے، جاتے بولے تھے۔

''اگر ڈیزائن تیار ہوگیا ہے تو لے آئیں۔''

''جی سر۔'' میں جلدی میں سارے ڈیزائن سمیٹ کر ان کے پاس لے گئی تو مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرکے وہ انہیں دیکھنے میں لگ گئے اور میں ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی جو ہر ڈیزائن کے ساتھ بدل رہے تھے یعنی کہیں پسندیدگی اور کہیں ناپسندیدگی اور اسی حساب سے میں بھی کہیں خوش ہورہی تھی کہیں مایوس۔ تب ہی ان کا بچہ قریب آکر میری کلائی پر بندھی گھڑی سے کھیلنے لگا...... تو میں نہ صرف اس کی طرف متوجہ ہوئی بلکہ اسے پیار کرنے اور گدگدانے میں باس کی طرف سے میرا دھیان بالکل ہی ہٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے پکارا تب میں چونک کر سیدھی ہوبیٹھی۔

''یس سر!''

''یہ آپ مسٹر احسن کو دکھادیں۔'' انہوں نے چند ڈیزائن میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو میں انہیں دیکھنے کے بعد بولی۔

''سر...... یہ میں انہیں دکھا چکی ہوں لیکن شاید انہیں پسند نہیں آئے۔''

''ٹھیک ہے، میں خود ڈسکس کرلوں گا۔''

''میں جاؤں سر؟'' میں نے پوچھا اور ان کے اثبات میں سر ہلانے پر کھڑی ہوئی تو بچہ میری طرف بازو پھیلا کر مچل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے ٹوکتے یا اپنے پاس بلاتے میں اسے اٹھا کر بولی۔

''سر! یہ میرے پاس ہے۔''

''تنگ کرے تو لے آیئے گا۔'' انہوں نے گویا اجازت دے دی اور میری ٹیبل پر یوں بھی اس وقت کوئی کام نہیں تھا۔ جب ہی میں بہت اطمینان سے سعد کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ اس کا ایک ایک چیز پر انگلی رکھ کر پوچھنا کہ یہ کیا ہے اور معصوم سی ہنسی مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی میں اس کی حرکتوں پر حیران بھی ہورہی تھی کیونکہ قریب سے اتنا چھوٹا بچہ میں پہلی بار دیکھ رہی تھی گو کہ گھر میں ثریا بھابی کا بیٹا تھا لیکن وہ اس کے معاملے میں اتنی وہمی تھیں کہ زیادہ تر اسے

www.paksociety.com

اپنے کمرے میں ہی بند رکھتیں۔ میری یا کسی کی بھی گود میں دینے سے کتراتی تھیں۔ اس لیے میں اور امی خود ہی محتاط رہتے۔

میرا پورا دن سعد کے ساتھ بہت اچھا گزرا تھا۔ پانچ بجے جب میں آفس سے نکلنے لگی تو میرا دل چاہا اسے بھی ساتھ لیتی جاؤں اور وہ بھی مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تب باس میرے ساتھ باہر نکلے اور پہلے وہ اسے لے کر رخصت ہوئے پھر میں اپنے روٹ کی وین دیکھ کر سوار ہوئی تب راستے میں مجھے خیال... آیا کہ باس بچے کو آفس کیوں لے آئے تھے یعنی اس کی ممی کہاں ہیں۔

''شاید اس کی ممی نہیں ہیں۔'' اس خیال کے ساتھ ہی میری ساری ہمدردیاں سعد کے ساتھ ہوگئیں۔ ''بے چارہ معصوم بچہ، ماں کی آغوش سے محروم ہوگیا۔ اُف اللہ میاں کو ترس بھی نہیں آیا، اتنے سے بچے کی ماں لے لی۔'' میں انہی سوچوں میں کڑھتی ہوئی افسردہ سی گھر آئی تو گھر میں احسن کی اماں موجود تھیں۔

''السلام علیکم!'' میں سلام کرکے اُلٹے پیروں واپس مڑنے لگی تھی کہ انہوں نے پکار لیا۔

''ادھر آؤ بیٹی، میں تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔''

''جی۔'' میں نے امی کو دیکھا اور ان کے اشارے پر احسن کی اماں کے پاس آبیٹھی تو وہ غالباً بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگیں۔

''دفتر سے آرہی ہو؟''

''جی۔''

''احسن بھی تو وہیں ہوتا ہے تمہارے ساتھ؟'' انہوں نے سادگی سے کہا تھا اور میں امی کی موجودگی کے باعث پریشان ہوگئی لیکن بولی سہولت سے تھی۔

''پتا نہیں، میں نہیں جانتی۔''

''لیکن وہ تو تمہیں جانتا ہے اور اسی کے کہنے پر تو میں یہاں آئی ہوں۔'' انہوں نے کہا تو میں انجان بن گئی۔

''اچھا۔''

''ہاں، آج چوتھی بار آئی ہوں۔'' وہ کہہ کر امی کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''بہن، آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''اس کے ابا آجائیں، ان سے پوچھیے گا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' امی نے اپنی طرف سے معذوری ظاہر کردی تو وہ پوچھنے لگیں۔

''کب تک آئیں گے اس کے ابا؟''

''آتے ہوں گے۔'' امی نے کہا تو میں ابا کے آنے کے خیال سے فوراً اٹھ کر اپنے کمرے میں آتو گئی لیکن کسی طرح اپنا دھیان اِدھر اُدھر نہیں کرسکی اور بس یہی سوچتی رہی کہ پتا نہیں ابا نے کیا سوچا ہے اور انہیں کیا جواب دیں گے گو کہ ہر دو صورتوں میں مجھے خاموشی سے سر جھکانا تھا پھر بھی میں جاننا چاہتی تھی کیونکہ احسن کی ناراضی نے مجھے بہت دل برداشتہ کردیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں زیادہ دن اس کے سامنے خود کو انجان اور پُرسکون ظاہر نہیں کرسکوں گی اور میں اس کے سامنے بکھرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میری عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کررہی تھی کہ میں اس کے سامنے بیلا کا مسئلہ رکھ کر صفائیاں پیش کروں۔ اس کے بعد یا تو وہ مجھ سے ہمدردی جتائے، احسان کرے مجھ پر یا دھتکار کر چلتا بنے۔ نہیں......!

اس کے برعکس جیسا کہ میں نے پہلے مقام پر ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے والدین کے ہر فیصلے کو قبول کروں گی تو میں چاہتی تھی کہ اس سے پہلے کہ بیلا کی کہانی اس تک پہنچے ابا فیصلہ سنا دیں۔ آر یا پار میرا بھرم نہ ٹوٹے اور اس وقت سے رات سونے تک میں نے امی کی باتوں سے چہرے سے، یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ ابا نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے لیکن مجھے... کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

آج تیسرے دن بھی باس کا بچہ سعد میرے پاس تھا۔ جس کی وجہ سے میں کوئی کام نہیں کر پا رہی تھی۔ جہاں اس کی طرف سے توجہ ہٹتی وہ مچلنے لگتا۔ آخر میں نے سارا کام ایک طرف رکھ کر سعد کو اپنے سامنے ٹیبل پر بٹھا لیا اور پیپر ویٹ گھما کر اسے بہلانے لگی تو کچھ دیر وہ اس میں خوش ہوتا رہا پھر وہ ہی نہیں، میں بھی اکتا گئی تھی اور کسی دوسری چیز کی تلاش میں دراز کھولی تھی کہ احسن آگیا اور بہت خاموشی سے بیٹھ کر کچھ دیر سعد کو دیکھتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہوکر بولا۔

''تو اب تمہاری یہ ڈیوٹی ہے۔''

''اچھی ہے۔'' میں قصداً مسکرائی تو اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''کہیں مستقل گلے نہ پڑ جائے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا تو وہ بات بدل گیا۔

''باس اسے کیوں لے کر آتے ہیں؟''

''پتا نہیں، میں خود ہی سوچتی رہتی ہوں کہ شاید اس کی ممی......'' میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''سب کے لیے سوچ سکتی ہو تم، ایک میرے لیے نہیں۔''

''تمہارے لیے۔'' میں نے کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ ''کیا سوچوں؟''

''یہی کہ میرے بارے میں تمہارے گھر والوں نے کیا سوچا ہے۔ آخر تمہارے ابا اتنی پس و پیش کیوں کررہے ہیں، کیا چاہتے ہیں وہ؟'' وہ زِچ ہوکر بول رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو پوچھنے لگا۔

''تمہارے گھر میں کون، کون ہے؟''

''کیوں؟''

''میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ اپنے طور پر سمجھ سکوں کہ تمہارے ابا کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔'' اس نے کہا تو میں ذرا سا ہنس کر بولی۔

''میرے ابا کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے انہیں صرف میری شادی کرنی ہے۔''

''اور بہن، بھائی؟'' اس نے حیران ہوکر دیکھا۔

''نہیں اور کوئی ذمے داری نہیں ہے ان پر۔ تم بتاؤ، اس روز تمہاری امی آئی تھیں انہیں کیا جواب دیا ابا نے؟'' میں نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

''پہلے کہا تھا سوچیں گے اور اس روز کہا اپنے بڑوں سے مشورہ کریں گے۔ کون ہے تمہارے ہاں بڑا...... دادا یا تایا وغیرہ؟'' اس نے بھی جواب کے ساتھ پوچھا۔

''دادا، تایا تو نہیں ہیں، تائی جی ہیں۔'' میں نے بتایا تو وہ حیرت سے بولا۔

''تمہارے ابا ان سے مشورہ کریں گے؟''

''کیوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' میرے ٹوکنے پر وہ جھنجلا گیا۔

''حیرت مجھے تم پر ہے جو بڑی سعادت مند بن رہی ہو، صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔ بے وقوف بنا رہی ہو مجھے...''

''کیا واقعی تمہیں ایسا لگتا ہے؟'' میرے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ ایک دم خاموش ہوگیا پھر براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا تھا۔

''سچ بتاؤں مجھے کیا لگتا ہے؟''

میرا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا تھا پھر بھی میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے پہلے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی پھر دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے آرام سے میری شخصیت پر چڑھے خول پر ضرب لگائی تھی۔

''تمہارے اندر خوف ہے...... کسی رسوائی کا۔''

''نہیں۔'' مجھے اپنا لہجہ کمزور لگا تو میں نے گھبرا کر سعد کو چھیڑ دیا یعنی اس کے ہاتھ سے سنہری پین

لے لیا جس پر وہ مچلنے لگا۔
”اسے کیوں رُلا دیا؟“ اس نے ٹوکا تو میں آن سی کر کے کھڑی ہوگئی اور سعد کو اٹھا کر بولی۔
”چلو، تمہیں تمہارے باپ کے پاس چھوڑ آؤں۔“
”جلدی آنا، میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ یقیناً میری کیفیت بھانپ گیا تھا اور میں اسی بات سے ڈرتی تھی۔ جب ہی فوراً وہاں سے نکل کر باس کے کمرے میں آئی تو وہ فون پر جانے کس سے بات کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔
میں نے بیٹھتے ہی ٹیبل سے بسکٹ کا پیکٹ اٹھالیا اور کھول...کر سعد کو کھلانے کے ساتھ بلا ارادہ ان کی باتیں سننے لگی تھی۔
”جیسا تم چاہتی ہو، سب کچھ ویسا ہی ہوگا۔“
”ہاں بس تم سارا سامان منگوالو، اس کے بعد تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“
”ڈونٹ وری یار، میں ہوں ناں۔“
”سعد بہت آرام سے ہے۔“
”اوکے، میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ فون رکھ کر سعد...کو دیکھنے لگے پھر مجھ سے بولے۔
”یہ بہت جلدی آپ سے مانوس ہوگیا ہے۔“
”جی۔“ میں یہی کہہ سکی تو وہ خاموش ہو کر کچھ دیر جانے کیا سوچتے رہے پھر اپنے آپ سے بولنے لگے۔
”کل سعد کی برتھ ڈے ہے اور اس کی ممی بہت پریشان ہو رہی ہیں۔ اصل میں ان کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے ورنہ وہ سارے انتظام خود کر لیتیں۔ اب چل نہیں سکتیں تو جھنجلا رہی ہیں۔ اگر آج کی تاریخ میں سارے کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوئے تو......“ وہ پریشان ہو رہے تھے اور میں جو توجہ سے ان کی باتیں سننے لگی تھی بلا ارادہ کہہ گئی۔
”سر میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“
”آپ......؟“ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا پھر یکلخت ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
”ہاں آپ نے سعد کو بہلا لیا ہے یقیناً اس کی ممی کو بھی......آئی مین وہ آپ کے کام سے ضرور مطمئن ہوں گی۔“ میں خاموشی سے دیکھنے لگی کہ وہ کیا کام بتاتے ہیں اور انہوں نے پہلے اپنے ڈرائیور کو بلوایا پھر مجھ سے کہنے لگے۔
”آپ سعد کو لے کر گھر چلی جائیں وہاں اس کی ممی آپ کو بتائیں گی کہ وہ برتھ ڈے پارٹی کے لیے کیسی ڈیکوریشن چاہتی ہیں اور پلیز آپ ان کی کسی بات کا برا نہیں مانیے گا۔“
”جی۔“ میں کچھ شش و پنج میں پڑ گئی کیونکہ یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر بھی بھیج سکتے ہیں اور وہ مجھے اسی حساب سے کہنے لگے۔
”آپ کو دوبارہ آفس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہیں سے اپنے گھر چلی جایئے گا بلکہ ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔“
”جی۔“ میں نے سعد کو لیے ہوئے اپنے کمرے سے بیگ اٹھایا پھر ڈرائیور کے پیچھے باہر نکل آئی اور شکر کیا کہ احسن...موجود نہیں تھا۔ ورنہ وہ ضرور ٹوکتا کیونکہ میرے چہرے سے گھبراہٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ تمام راستہ بھی میں یہی سوچتی رہی کہ اگر ابا یا تائی جی کو معلوم ہوگیا کہ میں آفس سے کہیں اور گئی تھی تو یقیناً مجھے پھر گھر بٹھا دیا جائے گا۔
جب ڈرائیور نے گاڑی روکی اور اتر کر میری طرف کا دروازہ کھولا تو میں چونکی اور پھر سعد کی ممی کا سوچ کر پریشان ہوگئی کہ جانے وہ کس مزاج کی خاتون ہیں اور میرے ساتھ ان کا رویہ پتا نہیں کیا ہوگا۔
”زیادہ بک، بک کریں گی تو اسی وقت گھر چلی جاؤں گی۔ میں ان کی نوکر تھوڑی ہوں۔“ میں نے خود کو تسلی دی اور لاؤنج میں رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تو اپنے گھر میں آکر سعد مچلنے لگا۔
”مما، مما!“ میں نے اسے گود سے اتار دیا اور

اس کے پیچھے چلتے ہوئے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی میرے منہ سے زوردار چیخ نکلی تھی۔
”بیلا!“
”جیہ......!“ بیلا نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ میں بھاگ کر اس کے اوپر جا گری اور رونے کے ساتھ اسے گالیاں بھی دینے لگی تھی۔
”منحوس، الو کی......اچھا ہوا تیری ٹانگ ٹوٹ گئی۔“ بیلا آنسوؤں کے ساتھ ہنسے جا رہی تھی جبکہ سعد اس صورت حال سے گھبرا کر رونے لگا تھا لیکن مجھے اپنے رونے میں اس کی آواز سنائی ہی نہیں دی۔ تب بیلا نے زور سے میرے بازو میں چٹکی کاٹی۔
”میرے بچے کو دیکھو۔“
”تمہارا بچہ......“ میں نے بازو سہلاتے ہوئے بیلا کو دیکھا پھر ایک دم اچھل کر کھڑی ہوئی اور سعد کو بازوؤں میں بھر کر کھلکھلانے لگی تھی۔
”میں بھی کہوں، یہ مجھے اتنا اپنا، اپنا کیوں لگتا ہے۔ سچ بیلا یہ تمہارا بیٹا ہے۔ ایک ہی ہے؟“ میں نے سعد کے پھولے گالوں پر چٹاچٹ پیار کرتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔
”فی الحال ایک ہی ہے۔“
”کتنے سال کا ہے؟“
”دو۔“ اس نے بتایا تو میں حیران ہوئی۔
”دو......پھر یہ بولتا کیوں نہیں؟“
”اب بولنا شروع کیا ہے۔“
”لیکن ثریا بھابی کا بیٹا تو اس سے چھوٹا ہے اور وہ بہت بولتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔
”یہ اپنے باپ پر گیا ہے، کم گو......“
”کہاں ہے اس کا باپ؟“ میں بھول ہی گئی تھی کہ میں یہاں کیسے اور کس لیے آئی تھی۔
”آفس۔“ بیلا بتا کر چونکی۔ ”ہائیں سعد بھی تو وہیں تھا۔“

"میرے ساتھ آیا ہے۔" میں بھی اس کی طرح بتا کر چونکی تھی پھر سمجھ کر بولی۔ "میں اس کے باپ کے آفس میں جاب کرتی ہوں۔ ابھی انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے کہ میں اس کی برتھ ڈے پارٹی کا انتظام کردوں۔"

"اچھا ہاں ابھی حماد کا فون آیا تھا، بتا رہے تھے انہوں نے تمہیں بھیجا ہے۔" اس نے کہا پھر بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"تائی جی مرگئیں کیا؟"

"اللہ نہ کرے۔" میں نے بے اختیار کہا تو اس کی سنجیدگی میں حیرت بھی شامل ہوگئی۔

"پھر تم جاب کیسے کررہی ہو؟"

"کیوں؟" میں اس کا مطلب سمجھ کر بھی انجان بن گئی تو اس بار اس نے تائی جی والا سوال کچھ اس طرح گھمادیا۔

"ابا تو زندہ ہیں ناں؟"

"اللہ کا شکر ہے، تم کیسی باتیں کررہی ہو۔" میں نے برا مان کر ٹوکا۔

"میں ایسی ہی باتیں سوچ سکتی ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے ان چار سالوں میں وہاں کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔ ابا اسی طرح تائی جی کے غلام ہوں گے اور جب وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے تو تم......"

"میں بھی نہیں کرسکتی۔" میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"پھر......؟"

"پھر یہ کہ میں تائی جی کی مرضی حاصل کرلیتی ہوں۔ ان کے سامنے معصوم، مسکین بنی رہتی ہوں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوں اور یوں ظاہر کرتی ہوں جیسے میں اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور خیر خواہ انہیں ہی سمجھتی ہوں وغیرہ، وغیرہ۔" میں نے یوں بتایا جیسے بیلا میری چالاکی کو سراہے گی لیکن وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"بکی بے غیرت ہو۔"

"کیوں، بے غیرتی کی کیا بات ہے؟"

"شرم نہیں آتی تمہیں، جس عورت نے ہماری ماں کو گھر تو گھر اس کی اولاد کے معاملے میں بھی بے دخل کردیا، تم اس کی خوشامد کرتی ہو۔" بیلا باقاعدہ مجھے ڈانٹنے...لگی تھی۔

"مجبوری ہے، خیر چھوڑو ان باتوں کو تم اپنی سناؤ۔" میں نے بات کا رخ اس کی طرف موڑا تو اس نے پہلے گہری سانس کھینچ کر گویا خود کو تائی جی کے شکنجے سے آزاد کیا پھر مسکرا کر بولی۔

"کیا سناؤں، مزے میں گزر رہی ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے اس وقت سے بتاؤ جب تم گھر سے نکلی تھیں تو آگے تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں اپنی گود میں سوئے سعد کو اس کے برابر لٹا کر یوں بیٹھ گئی جیسے اب وہ مجھے طویل داستان سنائے گی لیکن وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

"کچھ نہیں، ہونا کیا تھا۔ میں سیدھی حماد کے گھر آگئی تھی اس کے ممی، ڈیڈی کو سارے حالات بتائے تو انہوں نے اسی وقت چار آدمی بلا کر میرا حماد کے ساتھ نکاح پڑھوادیا۔ زندگی میں بظاہر کوئی کمی نہیں ہے لیکن یہ میں جانتی ہوں، میری خوشی مکمل نہیں ہے۔ زندگی میں والدین کی کمی تو محسوس ہوتی ہے۔"

"ماشاء اللہ، کیا بات ہے تمہاری......خود تو ہنسی خوشی رہنے لگیں اور پیچھے ہمارے لیے عذاب چھوڑ آئیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو تائی جی، امی کو تمہارا طعنہ نہ دیتی ہوں۔ میں الگ تمہاری وجہ سے ریجیکٹ ہورہی ہوں لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے البتہ امی......انہیں یہ غم دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے کہ میں بھی اپنے گھر کی نہیں ہوسکوں گی۔" میں اسے ملامت نہیں کرنا چاہتی تھی جب ہی سیدھے سادے انداز میں بتایا تو وہ تاسف سے بولی۔

"ہاں، تائی جی کے ہوتے تو یہ واقعی ناممکن

ہے۔" تب ہی حماد آگئے اور مجھے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر حیرت سے بولے۔

"آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کیا؟"

"حماد! یہ جیہ ہے۔" مجھ سے پہلے بیلا بول پڑی۔ "جیہ......میری بہن۔"

"تمہارا مطلب ہے......" حماد مجھے دیکھنے لگے۔ "ہاں مجھے تو جیسے معلوم تھا۔"

"کیوں، میں اتنا ذکر کرتی ہوں اس کا پھر بھی آپ نے نہیں پہچانا۔"

"اب پہچان لیتا ہوں۔" حماد میرے سامنے آبیٹھے اور بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ "تو تم جیہ ہو، میری پیاری بیوی کی پیاری بہن...... مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور پر اپنے گھر میں دیکھ کر زیادہ خوش ہوں۔"

"تھینک یو، مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ دونوں خوش ہیں۔" میں نے شکریے کے ساتھ کہا پھر اچانک خیال آنے پر پوچھا تھا۔ "آپ کے ممی، ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ امریکا گئے ہوئے ہیں۔ وہاں میری بڑی سسٹر ہیں ان کے پاس...... ویسے تمہیں یاد ہیں میری ممی، ڈیڈی؟"

"جی وہ آئے تھے ہمارے ہاں۔"

"ہاں، وہ بیلا کو ان کا مایوس لوٹنا اچھا نہیں لگا تھا جب ہی خود چل کر آگئی۔" انہوں نے شرارت سے بیلا کو دیکھا پھر پوچھنے لگے۔ "کچھ کھانا دانا بھی کھلایا جیہ کو یا یونہی باتوں سے پیٹ بھر رہی ہو؟"

"آپ آگئے ہیں ناں، آپ کھلائیں گے میں تو چل نہیں سکتی۔" بیلا نے کہا تو مجھے اب خیال آیا۔

"بیلا، تمہاری ٹانگ کے ساتھ کیا حادثہ ہوا؟"

"واش روم میں پھسل گئی تھی۔ معمولی فریکچر ہے پھر بھی دو ہفتے لگیں گے۔"

"مجھے بتائیں حماد بھائی کچن کہاں ہے، میں بنادیتی ہوں۔" انہوں نے دروازہ کھول کر وہیں سے کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں کمرے سے نکل آئی۔

شام تک میں وہیں رہی اور میں نے بیلا کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ سعد کی برتھ ڈے اس کی ٹانگ کا پلاسٹر اترنے کے بعد ہی ہوگی۔ حماد بھائی بھی یہی چاہتے تھے لیکن بیلا جانے کیوں بضد تھی بہرحال اس نے میری بات مان لی تھی پھر اگلے روز آنے کا کہہ کر میں نے اس سے اجازت لی تو حماد بھائی خود مجھے گھر تک ڈراپ کرگئے تھے حالانکہ میں نے بہت منع کیا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ابا نہ دیکھ لیں لیکن شکر ہے اس وقت تک ابا آفس سے نہیں لوٹے تھے پھر بھی میں پہلے سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد امی کے پاس آئی تو وہ روزانہ کی طرح میری خیریت سے واپسی پر شکر کررہی تھیں۔ پتا نہیں ان کا سارا دن کیسے گزرتا تھا بہرحال میں اس وقت بیلا سے مل کر خوش تھی جب ہی امی کو سلام کرنے کے ساتھ ان سے لپٹ گئی اور ان کے کان میں بولی۔

"بڑی اچھی خبر ہے امی۔"

"کیا؟" وہ مجھے خود سے الگ کرکے میرا چہرہ دیکھنے لگیں تو میں خوش ہوکر بولی۔

"بیلا اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔"

"بیلا......!" امی کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

"ہاں امی، آج میری اچانک اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ حماد بھائی کے ساتھ بہت خوش ہے۔ اس کا ایک بیٹا بھی ہے سعد ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔" خوشی سے جہاں میری آواز کھنک رہی تھی وہاں آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے اور امی گھبرا گھبرا کر کبھی مجھے دیکھتیں کبھی دروازے سے باہر نظر ڈالتیں۔ آخر انہوں نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مت نام لو اس کا، تمہارے ابا نے سن لیا تو زبان کھینچ لیں گے تمہاری۔"

"امی!" میں نے اپنے ہونٹوں سے ان کا ہاتھ ہٹا کر پوچھا۔ "آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

"آنسو پونچھ کر کچن میں جاؤ۔" امی میری بات کا جواب دینے کے بجائے ٹوک کر الماری کھول کر کھڑی ہو گئیں تو میں دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئی تھی پھر رات میں سب کاموں سے فارغ ہو کر جب میں معمول کے مطابق تائی جی کے کمرے میں حاضری دینے گئی تو پہلی بار میں نے خود سے بیلا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"تائی جی! کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے پتا نہیں بیلا کہاں ہو گی؟" میں نے کہا تو تائی زہرخند شروع ہو گئیں۔

"رُل رہی ہو گی کہیں۔ ارے ایسی لڑکیوں کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ جس کے لیے گھر چھوڑ کر گئی تھی، اس نے بھی دھتکار دیا ہو گا۔ غیرت والی تو تھی نہیں جو کہیں ڈوب مرتی۔ پتا نہیں کہاں کہاں منہ کالا کر رہی ہو گی۔"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں۔" میں نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا دفعان ہوئی، یہاں رہتی تو تمہیں اور شہنی کو بھی خراب کرتی۔"

"ارے ہاں تائی جی، وہ شہنی جاب کے لیے کہہ رہی تھی۔" میں نے موضوع بدل دیا اور پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ان کے پاس سے اٹھ آئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن میں وقت سے بہت پہلے آفس پہنچ گئی کیونکہ مجھے بیلا کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ کل اس کے ساتھ یہی طے ہوا تھا کہ حماد بھائی مجھے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا دیں گے لیکن یہ میں بھول ہی گئی تھی کہ حماد بھائی دس بجے آفس آتے تھے اور ان کے آنے تک میں نے سوچا کچھ کام ہی کر لوں لیکن اسی وقت احسن آ گیا اور میرے سامنے بیٹھ کر بہت چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کچھ دیر نظر انداز کرنے کے بعد آخر ٹوک دیا تو وہ مزید پیشانی پر شکنیں ڈال کر بولا۔

"تم بتاؤ؟"

"کیا بتاؤں؟" میں نے سکون سے اسے دیکھا تھا۔

"کل کہاں گئی تھیں؟" اس کا لہجہ بھی چبھتا ہوا تھا۔

"باس کے گھر۔" میں ہنوز پُرسکون تھی۔

"کیوں؟"

"کچھ کام تھا۔"

"تمہیں؟"

"نہیں انہیں۔"

"کیا کام؟" وہ اب مشکوک ہو گیا تھا جس پر میں سلگ گئی۔

"تم ایسے سوال کیوں کر رہے ہو؟"

"میری بات کا جواب دو۔"

"نہیں دے رہی۔" میں نے چڑ کر کہا تو وہ طنز سے بولا۔

"تمہارے پاس جواب ہی نہیں ہے۔"

"میرے پاس جواب ہے یا نہیں، تمہیں میں مزید اطلاع دے رہی ہوں کہ ابھی میں پھر باس کے گھر جاؤں گی۔" میں نے چبا، چبا کر کہا تو اس نے فوراً ہونٹ بھینچ کر غالباً خود کو کیوں کہنے سے روکا تھا پھر اسی طرح اٹھ کر جانے لگا کہ اسی وقت حماد بھائی دروازہ کھول کر بولے۔

"ہیلو حیہ! تم تیار ہو؟"

"جی۔" میں کھڑی ہو گئی۔

"جاؤ، میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے۔" وہ کہہ کر چلے گئے تو میں نے یونہی دراز کھول لی اور اس میں ہاتھ مارتے ہوئے انتظار کرنے لگی کہ احسن کچھ کہے گا لیکن وہ کچھ بولا نہ ہی وہاں سے گیا جس سے مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ ناچار بیگ اٹھا کر اس کے سامنے ہی باہر نکل آئی تو مزید مجھ پر جھنجلاہٹ بھی سوار ہو گئی تھی۔

بیلا شدت سے میری منتظر تھی، چھوٹتے ہی پوچھنے لگی۔

"امی نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟"

"ہاں۔" میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے جھوٹ بول کر فوراً سعد کو اٹھا لیا تو وہ میرا دوپٹا کھینچ کر بولی۔

"اِدھر میرے پاس بیٹھو ناں اور مجھے بتاؤ، میرا سن کر امی کی کیا کیفیت ہوئی؟"

"رونے لگیں خوشی سے۔" میں آرام سے بیٹھ کر بتانے لگی۔ "پھر تم سے ملنے کو بے چین ہو گئیں لیکن بے چاری مجبور ہیں۔ تم جانتی ہو ابا کو اور ان ہی کے ڈر سے وہ تمہارا نام بھی نہیں لیتیں لیکن پھر بھی کہہ رہی تھیں کہ کبھی موقع ملا تو تمہارے پاس ضرور آئیں گی۔"

"ایمان سے میرا بھی بہت دل چاہتا ہے......" بیلا نے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

"کیا دل چاہتا ہے۔ چار سالوں میں کبھی فون تو کیا نہیں اور دل چاہتا ہے۔"

"فون نہیں کروں گی۔" اس نے اب بھی منع کیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نے قسم کھالی تھی کہ میں خود سے کوئی رابطہ نہیں کروں گی جب تک ابا کو خود احساس نہیں ہو گا اور وہ میرے پاس آئیں گے۔ میں اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔"

"یہ تو تم بھول جاؤ کہ ابا کو کبھی احساس ہو گا۔ اگر ہونا ہوتا تو جب تم نے گھر چھوڑا تھا اسی وقت ہو جاتا اور پھر وہ میرے معاملے میں بھی نرم پڑ جاتے لیکن وہ اب بھی ویسے ہی ہیں۔" میں نے کہا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں۔ میں ان کی مرضی پر سر جھکا دیتی اگر یہ واقعی ان کی مرضی ہوتی لیکن وہ تو تائی کی زبان بولتے ہیں۔ اس وقت بھی انہوں نے حماد کو ناپسند نہیں کیا تھا بلکہ تائی جی کے کہنے پر منع کیا تھا البتہ امی کا خیال آتا ہے لیکن پھر میں سوچتی ہوں کہ اگر میں ان کی خاطر اس وقت عدنان سے شادی کر لیتی تب امی اور دکھی ہوتیں۔ اب کم از کم انہیں یہ اطمینان تو مل جائے گا کہ میں خوش ہوں، ہے ناں!" وہ آخر میرا ہاتھ ہلا کر مسکرائی تھی پھر پوچھنے لگی۔

"عدنان کی شادی ہو گئی؟"

"نہیں وہ یہاں نہیں ہوتے۔ دو سال پہلے کویت چلے گئے تھے۔ اب سن رہی ہوں آنے والے ہیں اور شاید اب تائی جی ان کی شادی کر دیں۔" میں نے بتایا تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

"تمہارے ساتھ کرنے کا تو نہیں سوچ رہیں؟"

"اللہ نہ کرے جو انہیں کبھی یہ خیال آئے۔" میں نے دہل کر کہا تو وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"اور اگر آ گیا تو کیا کرو گی؟"

"پتا نہیں۔" میں اچانک آزردگی میں گھر گئی تھی۔

"تمہیں کوئی اور پسند ہے کیا؟" وہ اب نرمی سے پوچھ رہی تھی جب ہی میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو وہ میرا ہاتھ دبا کر مسکرائی۔

"تمہارے آنسو بتا رہے ہیں کہ کوئی ہے، کون ہے؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ جب میں نے آنسو صاف کر لیے تب اصرار سے پوچھنے لگی۔

"بتاؤ ناں، کون ہے؟"

"احسن۔" میں نظریں جھکائے بتانے لگی۔ "حماد بھائی کے آفس ہی میں ہوتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنی اماں کو بھی بھیج چکا ہے لیکن اِدھر ابا نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا بلکہ

تائی جی ہی فیصلہ کریں گی۔''

''جو تمہارے حق میں نہیں ہوسکتا۔'' بیلا نے فوراً کہا پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگی۔

''یہ بتاؤ، تم نے کیا سوچا ہے؟''

''کچھ نہیں، میں کچھ نہیں سوچ سکتی۔'' میں نے بے بسی سے کہا تو وہ ڈانٹنے لگی۔

''پاگل مت بنو، جب پتا ہے کہ تائی جی تمہارا بھلا نہیں چاہتیں تو پھر تمہیں خود سوچنا ہے۔ مظلوم بن کر سر جھکا دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، تمہاری اپنی زندگی خراب ہوگی سمجھیں!''

''بس خاموش رہو، جب میں نے ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کرنے کا سوچ لیا ہے تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے ناراضی سے کہا تو اس نے گہری سانس کی صورت مجھ پر تاسف کا اظہار کیا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ ناشتے کے بعد ابا، تائی جی کے پورشن میں چلے گئے تب امی میرے پاس آکر بیلا کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے انہیں وہی پہلی ملاقات کا احوال تفصیل سے سنا دیا البتہ یہ نہیں بتایا کہ میں اس کے گھر گئی تھی اور نہ یہ کہ میں حماد بھائی کے آفس میں کام کرتی ہوں۔ اس کے برعکس سرِراہ ملاقات ظاہر کی اور زیادہ اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش اور مطمئن ہے جس سے ظاہر ہے امی کو مطمئن ہی ہونا تھا اور کتنی بار ان کے منہ سے شکر کے الفاظ نکلے تھے۔ اس کے بعد میری فکر کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''پتا نہیں تمہارے باپ نے تمہارے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کل بھی احسن کی امی آئی تھیں کچھ دیر میرے پاس بیٹھیں پھر تمہاری تائی جی کے پاس چلی گئیں۔''

''تائی جی کے پاس؟'' میں پریشان ہوگئی اور گو کہ میں طے کرچکی تھی کہ اس معاملے میں کچھ نہیں بولوں گی لیکن امی نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے کہنا پڑا۔

''آپ نے کیوں جانے دیا انہیں؟''

''خود ہی کہہ رہی تھیں کہ آپ کے میاں اگر بھاوج کی بات مانتے ہیں تو میں ان ہی کے سامنے دامن پھیلا دیتی ہوں۔'' امی نے کہا تو میں نے الجھ کر پوچھا۔

''انہیں کس نے بتایا کہ ابا، بھاوج کی بات مانتے ہیں؟''

''خود تمہارے ابا نے اس روز کہا تھا کہ وہ بھاوج سے مشورہ کرکے جواب دیں گے۔ جب ہی کل وہ اُدھر ہی چلی گئیں۔ اب وہاں پتا نہیں کیا باتیں ہوئیں۔'' امی تشویش سے بولیں تو مجھے انہیں تسلی دینی پڑی۔

''آپ کیوں فکر کرتی ہیں، جو قسمت میں لکھا ہوگا وہی ہوگا۔''

''پتا نہیں قسمت میں کیا لکھا ہے۔'' امی نے گہری آہ کھینچی پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

''تم تو آج کپڑے دھوؤ گی میں کھانا بنا لیتی ہوں۔''

''آپ رہنے دیں، میں کرلوں گی سب۔''

میں بھی سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن کسی طرح خود کو یہ کہہ کر نہیں بہلا سکی کہ جو قسمت ہوگا وہی ہوگا۔ اس کے برعکس یہ خیال زور آور تھا کہ تائی جی نے ضرور میرے بارے میں کچھ الٹا سیدھا کہا ہوگا اور یہ تو کل احسن ہی سے معلوم ہوسکتا تھا اور کل کوئی بہت دور نہیں تھی لیکن وقت بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

میں سارے کاموں سے فارغ ہوگئی۔ یہاں تک کہ اگلے دن کے کپڑے بھی استری کرلیے لیکن سوچ کا سفر تمام نہیں ہورہا تھا۔ عجیب سی بے کلی جس میں پریشانی بھی شامل تھی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں جو اتنے آرام سے احسن سے کہہ دیتی ہوں کہ میرے والدین جو فیصلہ کریں گے۔ مجھے اسی پر سر جھکانا ہے تو یہ کتنا مشکل ہے۔

اس وقت میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا کہ میں بیلا کی طرح ابا کے مقابل جا کھڑی ہوں اور گو کہ مجھ میں اتنا حوصلہ تھا لیکن امی کو چھوڑ کر خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید میرے اندر بیلا کی طرح کا یقین نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہزار ہا اندیشے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں امی سے نظریں چرا کر سوچتی رہی۔

''ہوگا کیا، میں سیدھی احسن کے پاس چلی جاؤں گی اور ہم شادی کرکے ہنسی خوشی رہنے لگیں گے۔''

''ہنسی خوشی......'' میرا دل ڈوبنے لگا تھا جس سے میں مزید خائف ہوگئی حالانکہ مجھے جتنا اپنے جذبوں پر یقین تھا اسی قدر احسن کی محبت پر لیکن میں......میں صرف سوچ سکتی تھی عمل کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا کیونکہ میں زیادہ دیر امی کی طرف سے نظریں نہیں چرا سکتی تھی۔ اس لیے اس رات میں بس یہی دعا کرتی رہی کہ اللہ تائی جی کے دل میں ہمارے لیے رحم ڈال دے لیکن تائی جی کے دل پر تو گویا مہر لگ چکی تھی جو انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کی بیٹی بھی موجود ہے اور میرے بارے میں احسن کی اماں سے جانے کیا کچھ کہہ ڈالا کہ اگلے روز وہ مجھ سے بہت متنفر اور اکھڑا، اکھڑا سا تھا۔

ایک دو بار میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن جس طرح اس نے ناگواری سے دیکھا اس سے پہلے مجھے غصہ آیا پھر دکھ......اور دکھ اس بات کا تھا کہ جو کچھ تائی جی نے کہا، اس نے یقین کرلیا تھا......مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ آیا سچ کیا ہے اور اس بات نے مجھے اتنا دل برداشتہ کیا کہ میں اسی وقت جاب چھوڑنے کا سوچ کر حماد بھائی کے پاس چلی آئی۔

''میں گھر جارہی ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ گھڑی دیکھ کر بولے۔

''بس ابھی ڈرائیور آنے والا ہے۔''

''میں اپنے گھر جانے کی بات کررہی ہوں اور آئندہ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔'' میں نے زور دے کر کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگے۔

''خیریت؟''

''بس......میں جاب چھوڑ رہی ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ اور آرام سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' وہ اپنا کام چھوڑ کر یوں بیٹھ گئے جیسے میری پوری داستان سننے کو تیار ہوں اور مجھے کچھ نہیں سنانا تھا جب ہی روٹھے لہجے میں بولی۔

''میرا یہاں سے دل اچاٹ ہوگیا ہے۔''

''اچھا، ابھی تو تم بیلا کے پاس جاؤ اس کے بعد جب تمہارا دل چاہے آجانا۔'' انہوں نے کہہ کر بیل کا بٹن دبایا اور پیون کے آنے پر پوچھنے لگے۔

''گاڑی آگئی؟''

''جی سر۔'' انہوں نے پیون کا جواب سن کر اسے جانے کا اشارہ کیا پھر مجھ سے بولے۔

''جاؤ، بیلا تمہارا انتظار کررہی ہوگی اور ہاں اسے بتا دینا کہ تم جاب چھوڑ رہی ہو ساتھ ہی وجہ بھی بتانا۔''

''کوئی وجہ نہیں ہے۔'' میں کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی اور بیگ لینے کے لیے اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں احسن کو دیکھ کر اب میری پیشانی پر بل پڑ گئے لیکن میں کچھ بولی نہیں خاموشی سے اپنا بیگ لے کر واپس پلٹی تھی کہ وہ میرے سامنے آگیا۔

''کہاں جارہی ہو؟''

''تمہیں کیا، میں کہیں بھی جاؤں۔'' میں نے تڑخ کر کہا تو وہ طنز سے بولا۔

''بہت اونچا اڑنے لگی ہو۔''

''میری پرواز ہمیشہ سے ایسی ہے۔'' میں نے کہہ کر قدم آگے بڑھایا تو وہ فوراً دروازہ بند کرکے اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا اور بہت چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ یہ آفس

ہے۔“ میں نے جھنجلا کر کہا تو وہ جتا کر بولا۔
”تم بھی تو بھول جاتی ہو کہ گھر سے آفس آئی تھیں پھر یہاں سے کہیں اور جانے کا مطلب...... کیا تمہارے گھر والوں کو معلوم ہے۔“
”ہاں۔“ میں نظریں چرا گئی۔
”جھوٹ بولتی ہو تم اور تم نے مجھ سے بھی جھوٹ بولا کہ تم اپنے والد کی واحد ذمے داری ہو جبکہ تمہاری بہن......“ وہ جانے کیا کہتا کہ میں بول پڑی۔
”میری بہن کی شادی ہو چکی ہے۔“
”ایک اور جھوٹ۔“ اس نے کہا تو میں غصے سے بولی۔
”ہاں، میری ہر بات جھوٹ ہے یہ بھی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں سب جھوٹ تھا، سب جھوٹ ہے۔“
”اور سچ کیا ہے؟“
”وہی جو تم جان گئے ہو اور اب پلیز میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ......“ وہ میری دھمکی سے پہلے ہی ایک طرف ہٹ گیا تو میں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی اور اب میرا بیلا کے پاس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کوئی مجبوری بھی نہیں تھی پھر بھی پتا نہیں کیوں میں اس کے پاس آ گئی تھی۔
”کیا ہوا؟“ بیلا نے میری شکل دیکھتے ہی ٹوکا۔ ”کسی سے لڑ کر آ رہی ہو۔“
”ہاں...... اور اب میں تم سے لڑوں گی تم بہت بری ہو بیلا۔“ میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو وہ مجھے گلے لگانے کو آگے بڑھی لیکن میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔
”تم میری بہن نہیں ہو، تم انتہائی خود غرض ہو۔ گھر سے نکلتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری غلطی کی سزا مجھے بھگتنی پڑے گی۔“
”کیا ہوا، تائی جی نے احسن کو ریجیکٹ کر دیا؟“ بیلا نے سمجھ کر کہا۔
”وہ ریجیکٹ نہیں کرتیں، مجھے ریجیکٹ کرواتی ہیں۔ تمہاری داستان سنا کر اور اس سے پہلے مجھے افسوس نہیں ہوتا تھا لیکن احسن......“ میں پھر رو پڑی تو وہ افسوس سے بولی۔
”چہ...... چہ اس شخص کے لیے رو رہی ہو جس کی محبت پانی کے بلبلے جیسی تھی۔“ پھر مجھے کھینچ کر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم خود احسن کو سارے حالات بتا دو لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب دیکھو تائی جی، پتا نہیں کس انداز سے اور کیا، کیا کہا ہے کہ اس نے تمہیں ریجیکٹ کر دیا اور افسوس تو ابا پر ہے جو اَب بھی نہیں سمجھ رہے۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ اگر کہو تو میں احسن سے بات کروں؟“
”نہیں۔“ میں نے فوراً منع کیا۔ ”اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو پھر ساری زندگی میری صورت کو ترستی رہو گی۔“
”کیوں منع کر رہی ہو؟“
”بس کر رہی ہوں۔“ میری ضد پر وہ کندھے اچکا کر بولی۔
”تمہاری مرضی۔“ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلو جا کر منہ ہاتھ دھوؤ میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“
”سعد کہاں ہے؟“ مجھے واش روم کی طرف جاتے ہوئے اچانک سعد کا خیال آیا تھا۔
”اسے حنا اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“
”یہ حنا کون ہے؟“
”پڑوس میں رہتی ہے۔“
”اچھا، تم سعد کو لے آؤ۔“ میں کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی پھر سارا دن وقفے، وقفے سے بیلا مجھے منانے کی کوشش کرتی رہی کہ میں اسے احسن سے بات کرنے دوں لیکن مجھے بھی ضد ہو گئی تھی۔ میں اپنی اسی بات پر اَڑی رہی تو آخر وہ مایوس ہو کر بولی تھی۔
”چلو جانے دو اسے، اب میں تمہارے لیے اچھا سا لڑکا دیکھوں گی۔“

☆☆☆

کل میں حماد بھائی سے کہہ کر آئی تھی کہ میں جاب چھوڑ رہی ہوں اور ابھی میرا آفس جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لیے میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند آ کے نہیں دی۔ تب میں جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی گوکہ آٹھ بج چکے تھے پھر بھی میں تیار ہو گئی۔ اس کے بعد آرام سے ناشتا کیا کیونکہ اب دیر ہونے پر سرزنش کا ڈر نہیں تھا۔ اس لیے میں اطمینان سے نو بجے گھر سے نکلی تھی اور جب آفس پہنچی تو پہلے حماد بھائی کے کمرے میں جھانک کر انہیں سلام کیا تو وہ تحکم سے بولے۔
”اندر آؤ۔“
”جی۔“ میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو ڈانٹ کر بولے۔
”یہ تمہارے آنے کا وقت ہے، دس بج رہے ہیں۔“
”سوری، میں تو آنا ہی نہیں چاہتی تھی پھر خیال آیا گھر بیٹھ کر کیا کروں گی۔“ میں نے کہا تو وہ تاسف سے بولے۔
”تو تم گھر کے کاموں سے بچنے کے لیے جاب کرتی ہو؟“
”جی نہیں، میں کام چور نہیں ہوں۔ یہاں سے جا کر کھانا پکاتی ہوں۔“
”ماشاء اللہ اب ذرا یہاں کے کام بھی دیکھ لو۔ وہ کیا نام ہے ان کا مسٹر احسن کتنی دیر سے پریشان ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے کہا تو میں نے ٹھٹک کر پوچھا۔
”کیوں؟“
”ان کی فائل غالباً تمہارے پاس ہے اور ہاں مجھے کاٹن فیبرکس کے لیے جلدی کچھ اچھے ڈیزائن تیار کر کے دو۔“
میں ان کا حکم سن کر اپنے روم میں آ گئی اور پہلے احسن کی فائل تلاش کر کے سامنے ٹیبل پر رکھی تاکہ آئے تو اسے دیکھتے ہی لے کر چلتا بنے کیونکہ کل کی تلخ کلامی کے بعد اب میں اس سے بالکل بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی فیصلہ ہو چکا تھا اور میں اس سے پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ میں کوئی احتجاج نہیں کروں گی اور اب تو شاید وہ مجھے اکسائے گا بھی نہیں کیونکہ تائی جی نے بیلا کے بارے میں بتا کر اسے بھی متنفر کر دیا تھا اور مجھے دکھ اسی بات کا تھا کہ محبت کے پہلے امتحان میں ہی وہ ناکام ہو گیا تھا۔ بہر حال کچھ دیر بعد وہ آ گیا اور پہلی نظر میں اپنی فائل دیکھ کر اٹھا بھی لی لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ جاتے، جاتے پلٹ آیا تھا۔
”سنو، میں اپنے کل کے رویے پر تم سے معافی مانگتا ہوں۔“ اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تو میں بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
”آئی ایم سوری، مجھے تم سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں تھا اور نہ ہی میں تمہارے کسی عمل پر تمہیں سرزنش کرنے کا حق رکھتا ہوں۔“ میں اب بھی خاموش رہی یوں بھی اس نے کوئی جواب طلب بات نہیں کی تھی۔ وہ شاید مجھے بلوانا چاہتا تھا جب ہی قدرے رک کر پوچھنے لگا۔
”تم ناراض ہو؟“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ قصداً ذرا سا مسکرایا پھر کہنے لگا۔ ”تمہیں کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے والدین نے میرے بارے میں کیا سوچا تم نے لاعلمی کا اظہار کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ تمہیں کیونکہ ہر حال میں اپنے والدین کے فیصلے پر سر جھکانا ہے اس لیے تم جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔“
”یہی سچ ہے۔“ وہ ابھی کچھ اور بھی کہتا لیکن میں بے اختیار بول پڑی تھی۔
”نہیں، یہ سچ نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ تمہارے والدین کے پاس فیصلے کا اختیار ہی نہیں ہے بلکہ فیصلہ ایک بالکل اجنبی شخص کو کرنا ہوتا ہے۔“ اس نے یقین سے کہا تو میں نے ناگواری سے ٹوکا۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

"تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مزید سن لو کہ تمہاری تائی جی نے تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہماری طرف منتقل کر دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا چاہتی ہو تم؟" اس نے بات ختم کر کے بڑے آرام سے دونوں بازو سینے پر لپیٹ لیے تھے۔ یوں جیسے بڑا سخی ہو اور بھیک میں مجھے میری اوقات سے زیادہ نوازنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ یہی میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے دھتکارے یا مجھ پر احسان کرے پھر بقیہ زندگی جتاتا بھی رہے اور یہ تو بعد کی بات تھی جبکہ وہ ابھی مجھے ہرٹ کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں تو پوچھ لیا۔

"تائی جی نے تمہاری اماں سے کیا کہا ہے؟"

"انہیں چھوڑو، وہ جو بھی کہیں مجھے اس کی پروا نہیں ہے، میں تمہاری مرضی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے خاصی بے نیازی دکھا کر کہا۔

"میری مرضی؟" میں بلا ارادہ اسے دیکھے گئی۔

"ہاں، جلدی بتاؤ۔" اس نے ٹیبل پر بازو رکھ کر میری آنکھوں میں جھانکا تو میں چونک کر بولی۔

"سوری، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی میرا مطلب ہے سوچ کر بتاؤں گی۔"

"تمہیں کیا سوچنا ہے...... بس یہ بتادو شادی کب طے کروں؟" اس نے کہا تو میں قصداً مسکرا کر بولی۔

"میں ہامی بھروں گی تو طے کرو گے ناں!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اچھلا تھا اور میں یکلخت پرسکون ہو گئی۔

"دیکھو احسن! جب تک معاملہ میرے اور تمہارے والدین کے درمیان تھا، میں خاموش تھی اور میں خاموش ہی رہتی اگر جو بات ان کے درمیان طے ہوتی یا اگر تمہارے پاس اختیار آ ہی گیا تھا تو تم میری مرضی نہ معلوم کرتے۔ اب تو تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ہر پہلو سے سوچنے کے بعد ہی تمہیں اپنی مرضی بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے سوچ لو...... میں تمہیں ایک ہفتہ دے رہا ہوں۔" وہ سٹپٹا کر بولا تھا پھر غالباً اس کا مقصد مجھے یہ باور کروانا تھا کہ میرے پاس ہامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں جو کہنے لگا۔

"ویسے تمہاری بہن نے اچھا نہیں کیا۔ وہ اگر کسی کو پسند کرتی تھی تو اس سے شادی کرنے کے لیے ماں باپ کو فورس کرتی گھر سے بھاگنا تو عقل مندی نہیں ہے۔"

"معاف کرنا احسن، میری بہن گھر سے بھاگی نہیں تھی بتا کر گئی تھی۔ بہر حال یہ اس کا معاملہ ہے تمہیں اس پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سہولت سے ٹوکا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"ہاں واقعی، مجھے اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہیے لیکن میں تمہیں تو سمجھا سکتا ہوں۔"

"مجھے کیا سمجھاؤ گے؟" میں کسی طرح اپنی ناگواری چھپا نہیں سکی۔

"تم بہت جلدی برا مان جاتی ہو۔" اس نے ہنس کر کہا تو میں بہ مشکل ضبط سے بولی۔

"نہیں، نہیں تم سمجھاؤ...... کیا سمجھانا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں باس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں انہوں نے اپنی بیوی کے متعلق تم سے کیا کہا ہے جبکہ سچ یہ ہے کہ ان کی بیوی موجود ہے۔ تم کسی دھوکے میں نہ آنا...... میرا مطلب ہے......"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں۔"

"ہاں، ویسے تم خود سمجھ دار ہو۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم غالباً یہ فائل لینے آئے تھے۔" میں نے فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"اوہ ہاں، تھینک یو۔" وہ فائل لے کر چلا گیا تو میں فوراً سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی کیونکہ میں اس کی کسی بات کو سوچنا نہیں چاہتی تھی اور واقعی حیرت انگیز طور پر میں نے اس وقت بہت خوب

صورت ڈیزائن تیار کر لیے تھے پھر انہیں لے کر حماد بھائی کے پاس گئی تو وہ فون پر بیلا سے بات کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس سے بولے۔

"لو جیہ آ گئی، تم خود اس سے بات کر لو۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"السلام علیکم!" میں نے سلام کیا تو بیلا خوش ہو کر بولی۔

"جیتی رہو، جیتی رہو۔"

"ہاں، جی رہی ہوں تمہاری دعا ہے۔ اب آگے بولو کیا بات ہے؟"

"اصل بات تو جب تم یہاں آؤ گی تب بتاؤں گی اور تمہیں چار بجے آنا ہے۔" اس نے کہا تو میں نے صاف منع کر دیا۔

"میں روز، روز نہیں آ سکتی...... ہفتے میں ایک دن مقرر کر لو۔"

"ٹھیک ہے آج آؤ گی تو اس وقت مقرر کر لیں گے۔"

"نہیں، اب میں ایک ہفتے بعد ہی آؤں گی۔" یہ میری ضد نہیں تھی بلکہ شدید ناراضی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے احسن نے مجھے ہرٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"بکومت، میں حماد سے کہہ رہی ہوں تمہیں ابھی بھجوا دیں۔"

"زبردستی ہے کیا، میں نہیں آ رہی۔" میں نے فون پٹخ دیا تو حماد بھائی حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟"

"سمجھا کے رکھیں اسے...... مجھ پر رعب نہ جمایا کرے۔" میں ان پر بگڑ گئی تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"آرام سے، باہر تک آواز گئی تو سب جمع ہو جائیں گے۔"

"میں جا رہی ہوں۔" میں روٹھے لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ پوچھنے لگے۔

"بیلا کے پاس؟"

"نہیں، آپ بھی منع کر دیں اسے یہاں کام کا حرج ہوتا ہے۔"

"اچھی بات ہے، تم جاؤ اپنی سیٹ پر۔" انہوں نے کہا تو میں ایسے ہی روٹھی ہوئی اپنے روم میں آ گئی اور کچھ دیر فائلوں کو ترتیب دینے میں لگی رہی پھر کمپیوٹر آن کر کے گیمز کا فولڈر کھول لیا لیکن میرا دھیان بار بار بیلا کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے کیا بات بتانے کے لیے مجھے چار بجے آنے کو کہا تھا۔ اب پتا نہیں واقعی کوئی بات تھی یا مجھے بلانے کا بہانہ تھا۔ میں نے متجسس ہونے کے باوجود اس کے پاس جانے کا نہیں سوچا اور سیدھی گھر آ گئی۔

☆☆☆

یونہی کتنے دن گزر گئے، میں نے احسن سے کہا تھا کہ میں ہر پہلو سے سوچنے کے بعد ہی اسے اپنی مرضی بتاؤں گی اور واقعی میں نے بہت سوچا تھا پھر بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی جبکہ احسن شدت سے منتظر تھا۔ اس کی باتوں سے ہی لگ رہا تھا کہ میرے ہامی بھرتے ہی وہ اپنی ماں کو بھیج کر صرف بات ہی نہیں شادی بھی طے کروا دے گا۔ کاش وہ یہ اقدام میرے علم میں لائے بغیر کرتا تو میں اسے دیوتا مان کر اس کے سامنے سر جھکا دیتی لیکن مجھ پر جتا کر اس نے مجھے تو ہرٹ کیا ہی تھا خود بھی میرے دل کی مسند سے اتر گیا تھا پھر بھی میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی تو میرے پیشِ نظر...... امی کی پریشانیاں تھیں اور تائی جی کو ان کے مقصد میں ناکام کرنے کا خیال تھا جو گزشتہ چار سالوں سے بیلا کی داستان سنا کر مجھے ریجیکٹ کروا رہی تھیں اور اب میں صرف ان پر جتانے کی خاطر ریجیکٹ نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتی جو اَب احسن کی رفاقت قبول کرنے پر تیار ہی نہیں ہو رہا تھا جبکہ احسن یوں اترایا پھر رہا تھا جیسے میں منع کر ہی نہیں سکتی۔ اس وقت بھی وہ میرے پاس آیا تو اسی انداز میں پوچھنے لگا۔

"ہاں بھئی، کیا سوچا تم نے؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔" یہی تو میرا کمال تھا کہ میں اپنی اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔

"کیا مطلب؟ ایک سے دو ہفتے ہو چکے ہیں اور تم ابھی تک سوچ رہی ہو؟" اس نے تیز ہو کر کہا تو میں مزید چڑانے کو سکون سے بولی۔

"ظاہر ہے میری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"ہاں......لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم سوچنے میں زندگی گزار دو۔" وہ میرے سکون سے ہمیشہ پریشان ہو جاتا تھا۔

"نہیں، بس کچھ دن صبر کرو میں اپنی بہن سے مشورہ کرلوں پھر تمہیں بتاؤں گی۔" میں نے کہا تو وہ ناگواری سے پوچھنے لگا۔

"تمہاری بہن، وہ کہاں ہے؟"

"یہیں اسی شہر میں۔" میں نے قصداً...... بے نیازی برتی۔

"تم اس سے ملتی ہو؟" اس کی پیشانی پر مزید شکنوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"کیوں نہیں ملوں گی۔ میری بہن ہے اور میری سب سے زیادہ انڈر اسٹینڈنگ اسی کے ساتھ ہے۔" میں نے کہا تو وہ زچ ہو کر بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ تمہیں کوئی اچھا مشورہ کیسے دے سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے جب اس نے گھر سے نکلتے ہوئے تمہارے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ اس کی رسوائیوں کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا تو اب تم اس سے اچھی توقع کیوں رکھ رہی ہو؟"

"کیونکہ میں...، اسے حق بجانب سمجھتی ہوں۔ اس نے جو کیا ٹھیک کیا اور تمہیں اس سے بحث نہیں ہونی چاہیے۔ تم صرف اپنا سوچو۔" میں نے سنجیدگی سے ٹوکا تو وہ کرسی پر ڈھے گیا۔

"میں اپنا ہی سوچ رہا ہوں لیکن تم پتا نہیں کیا سوچے بیٹھی ہو۔ پہلے ماں باپ کو اختیار تھا پھر تائی جی آ گئیں اور اب بہن......اس کے بعد کس سے مشورہ کرو گی؟"

"تم سے۔" میں مذاق میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"باس کے پاس پھر وہیں سے چلی جاؤں گی۔" میں نے بتایا تو اس نے پھر طنز کیا۔

"ان کے گھر؟"

"ہاں اب کیوں کا سوال نہیں اٹھانا۔" میں نے کہا تو وہ ہنوز اسی انداز میں بولا۔

"نہیں، اب میں ایسا کوئی سوال نہیں اٹھاؤں گا جس کا تمہارے پاس جواب نہ ہو۔"

"ایسا کوئی سوال نہیں جس کا میرے پاس جواب نہ ہو۔ یہ اور بات کہ میں جواب دینا نہیں چاہتی۔ بہرحال تم اپنی غلط فہمی دور کرلو۔ باس کی بیوی بیلا میری بہن ہے اور میں اسی کے پاس جا رہی ہوں۔" میں اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل آئی کیونکہ میں اس کا ردِعمل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

میں نے ساری صورتِ حال بتا کر بیلا کو دیکھا تو اس نے ایک لمحہ سوچنے کا توقف نہیں کیا اور فوراً بولی تھی۔

"بس تم منع کردو کوئی ضرورت نہیں ایسے شخص سے شادی کرنے کی جو محبت میں بھی احسان کرنا چاہتا ہے۔ مزید ساری زندگی جتاتا بھی رہے گا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد بھی تو یہی ہوگا۔" میں نے مایوسی سے کہا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

"کیا تم واقعی احسن سے محبت کرتی ہو؟"

"محبت؟" میں اسے دیکھ کے گویا ہوئی۔ "نہیں بیلا! محبت نہیں ہے بلکہ میں تمہیں بتاؤں جب وہ مجھے ہرٹ کر رہا تھا تو میرا دل چاہا میں اسے شوٹ کردوں یا اس سے اتنی دور چلی جاؤں کہ وہ دوبارہ کبھی مجھے

نظر نہ آئے لیکن پھر مجھے امی کا خیال آتا ہے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہیں اور چاہتی ہیں کہ میں جلدی اپنے گھر کی ہو جاؤں۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنی زندگی خراب کرلو۔"

"وہ تو ہونا ہی ہے۔ احسن نہ سہی کوئی اور جو بھی آئے گا وہ ایسی ہی باتیں کرے گا۔" میں اس وقت بہت دل برداشتہ ہو رہی تھی جس پر بیلا ڈانٹ کر بولی۔

"پاگل ہو تم، فضول میں احسن کی باتوں کو دل پر لے رہی ہو۔ دفع کرو اسے اور امی سے کہہ کر میرے پاس آجاؤ پھر دیکھنا کتنی اچھی جگہ... تمہاری شادی ہوتی ہے۔"

"بس رہنے دو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں......دیکھو اگر تم چاہتی ہو کہ کوئی تم پر احسان نہ کرے تو یہ اسی صورت ممکن ہے کیونکہ یہاں تائی جی نہیں ہیں جو میری داستان سنا کر تمہیں رد کروائیں گی۔" بیلا مجھے سمجھا کر کہنے لگی۔

"تم نے گھر سے نکلنے کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس لیے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ پیچھے امی پر کیا گزری۔ اپنے گھر میں مجرموں کی طرح رہتی ہیں۔"

"جب میں وہاں تھی وہ تب بھی ایسے ہی رہتی تھیں۔ تم خواہ مخواہ مجھے الزام نہ دو۔ انہیں شوق ہے جلنے کڑھنے کا اور تم بھی ان ہی پر گئی ہو۔ تائی جی کی خوشامد کر کے سمجھتی ہو تم نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ ہونہہ، میں ایسی زندگی پر لعنت بھیجتی ہوں۔" وہ الٹا مجھے لتاڑنے لگی تھی۔ جس پر میں غصے سے کچھ بولی تو نہیں لیکن اسی وقت اس کے گھر سے نکل آئی تھی اور کیونکہ یہ آفس سے آنے کا ٹائم نہیں تھا اس لیے امی مجھے آتا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"کیا ہوا، اتنی جلدی کیسے آ گئیں؟"

"بس آفس میں کچھ کام نہیں تھا اس لیے آ گئی۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا تو پوچھنے لگیں۔

"کھانا کھاؤ گی؟"

"نہیں، ابھی بھوک نہیں ہے آپ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے جواب دینے کے ساتھ ہی پوچھا۔

"بس ابھی نماز سے فارغ ہوئی ہوں۔ اس سے پہلے تمہاری تائی جی آئی تھیں۔" انہوں نے بتایا تو میں حیران ہوئی۔

"تائی جی یہاں آئی تھیں مگر کیوں؟"

"یہ میں نے نہیں پوچھا اور پوچھتی تو وہ کون سا بتا دیتیں۔ ویسے ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ لڑکی دیکھ چکی ہیں۔ جب ہی کہہ رہی تھیں عدنان کے آتے ہی شادی کر دیں گی۔"

"اچھا، مجھ سے ذکر نہیں کیا انہوں نے حالانکہ رات میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھی تھی۔" میں نے رات تائی جی سے ہونے والی باتیں سوچتے ہوئے کہا تو امی بھی حیرت سے بولیں۔

"اور مجھے خاص طور پر بتا گئی ہیں۔"

"چلیں...... کہیں تو انہوں نے آپ کو کچھ سمجھا۔" میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو امی روک کر پوچھنے لگیں۔

"سنو، وہ احسن کی اماں نہیں آئیں؟"

"تائی جی کے پاس جانے کے بعد کون آتا ہے۔ آپ ان کا انتظار مت کریں۔" میں نے بظاہر سیدھے سادے انداز میں کہا تو امی آہ بھر کر بولیں۔

"پتا نہیں تمہارا باپ یہ بات کب سمجھے گا۔"

"شاید ان کے نہ سمجھنے میں ہماری بہتری ہوگی۔" میں کہہ کر اپنے کمرے میں آئی اور اس رات میں جان بوجھ کر تائی جی کے پاس نہیں گئی۔ شہنی بلانے آئی تو بھی میں نے سردرد کا بہانہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلی صبح ابا نے مجھے آفس جانے سے منع کر دیا۔

"بس اب تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ابا کا حتمی انداز تھا اور میں بیلا کی طرح

کیوں کہنے کے بجائے واپس اپنے کمرے میں آ گئی اور کتنی دیر کڑھتی رہی پھر ابا کے جاتے ہی امی کے پاس آ کر ان سے پوچھنے لگی۔

''کیوں، کیوں منع کیا ہے ابا نے آفس جانے سے؟''

''انہوں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔'' امی نے بجائے خوشی کے دکھ سے کہا تو میں ٹھٹک گئی۔

''میری شادی!''

''ہاں، عدنان کے ساتھ۔'' گویا وہ یہ نہیں چاہتی تھیں اور چاہتی تو میں بھی نہیں تھی لیکن یہ ابا اور تائی جی کا فیصلہ تھا جس پر امی تو کچھ بول ہی نہیں سکتی تھیں اور میری مجبوری امی تھیں پھر بھی میں نے کہنا چاہا۔

''اگر آپ نہیں چاہتیں تو میں......''

''بس خاموش ہو جاؤ۔'' امی نے فوراً میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا پھر بے چاری میری سیدھی سادی ماں مجھے تسلی دینے لگی۔

''عدنان برا نہیں ہے...... پھر تین سالوں سے باہر ہے کافی بدل گیا ہوگا۔ اللہ کرے شادی کر کے تمہیں بھی اپنے ساتھ لے کر یہاں سے چلا جائے۔ اچھا ہے دور رہو گی تو خوش رہو گی۔ بیلا بھی تو خوش ہے ناں۔'' میں نے چپ چاپ سر جھکا دیا کیونکہ یہ تو اسی روز طے ہو گیا تھا کہ جس روز بیلا یہاں سے گئی تھی اور میں اُسے بتانے کے لیے ہی لابی میں آ کر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگی پھر مجھے کتنا انتظار کرنا پڑا۔ ادھر وہ پتا نہیں کیا کر رہی تھی جب ریسیور اٹھایا تو اس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

''واش روم میں تھیں کیا؟'' میں نے ٹوکا۔

''تو یہ تم ہو، کہاں...... آفس سے بات کر رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، آج سے میرا آفس جانا بند ہو گیا ہے تم حماد بھائی کو بتا دینا۔'' میں نے کہا تو وہ طنز سے بولی۔

''کیا بتاؤں حماد کو تائی جی نے بند کروا دیا؟''

''نہیں ابا نے۔'' میں نے کہا تو وہ جل کر بولی۔

''ایک ہی بات ہے۔''

''اچھا خیر اور سنو میری شادی ہو رہی ہے۔'' میں نے مزید اطلاع دی تو اس نے فوراً پوچھا۔

''احسن کے ساتھ؟''

''نہیں، عدنان کے ساتھ۔'' میرے سکون سے کہنے پر وہ بری طرح تلملا گئی۔

''مر کیوں نہیں جاتیں تم، بے غیرت...... اسی لیے تائی جی کی خوشامد میں لگی ہوئی تھیں۔ تمہیں اگر ان کی بہو بننے کا اتنا شوق تھا تو درمیان میں سارے چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی اور میرے پاس کیا سوچ کر روتی ہوئی آئی تھیں۔''

''اب نہیں آؤں گی۔'' بہت ضبط کے باوجود میری آواز بھرا گئی تو وہ مزید تپ کر بولی۔

''ساری زندگی ایسے ہی روتی رہو گی تم۔''

''دعا نہیں دے سکتیں تو بددعا کیوں دیتی ہو۔''

''میری بددعا سے نہیں اپنی حماقت سے روؤ گی۔'' اس نے کہہ کر فون پٹخ دیا تھا۔ جس سے میں اور بددل ہو گئی کم از کم تسلی کے دو بول ہی کہہ دیتی۔ ایک تو میں اس کے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں۔ دوسرے وہ الزام بھی میرے سر رکھ رہی ہے۔

''آئندہ میں اس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔'' میں نے سوچا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے لگی تھی کہ فون کی بیل پر واپس پلٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو!''

''آج آفس کیوں نہیں آئیں؟'' دوسری طرف سے احسن نے چھوٹتے ہی پوچھا تو میں سنبھل کر بولی۔

''میری مرضی۔''

''ہاں ظاہر ہے تم پابند تھوڑی ہو، آؤ نہ آؤ۔'' اس نے کہا تو میں تائید کے ساتھ بولی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔''

''اچھا کیا، میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم......''

''تمہارے چاہنے سے نہیں احسن۔'' میں نے ٹوکا تو وہ غالباً ٹھٹکا تھا۔

''پھر......؟''

''پھر یہ کہ میری شادی ہو رہی ہے میرے تایازاد کے ساتھ۔'' میں نے بڑے آرام سے بتایا تھا۔

''ک...... کیا مطلب ہے تمہارا؟ دیکھو تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں آج ہی اماں کو بھیجتا ہوں۔ سنو، سن رہی ہو ناں؟'' وہ بوکھلاہٹ یا پریشانی میں بے ربط بولنے لگا۔

''بس جتنا سنا چکے ہو وہی بہت ہے مزید کچھ مت سناؤ۔'' میں نے ٹوک دیا۔

''نہیں، میں تمہیں یہ غلطی نہیں کرنے دوں گا۔ تم اپنی تائی جی کو نہیں جانتیں وہ بہت چالاک ہیں۔ انہوں نے تمہارے خلاف میری اماں کو ورغلانے کی بہت کوشش کی ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کتنے گھناؤنے الزام لگائے ہیں انہوں نے تم پر، تمہاری بہن پر...... میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو پھر تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔'' وہ بولے جا رہا تھا پھر میری طویل خاموشی محسوس کر کے چند لمحے رک کر پوچھنے لگا۔

''سنو کیا تمہارے ساتھ زبردستی کی جا رہی ہے؟''

''نہیں، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔'' میں نے کہا تو وہ چیخ پڑا۔

''غلط کہہ رہی ہو، تمہیں مجھ سے محبت ہے۔''

''نہیں احسن، اگر محبت ہوتی تو اس وقت تمہیں ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہتے ہوئے میرا دل ضرور روتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں اپنے فیصلے پر اگر خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہوں اور تم پلیز اب مجھے فون مت کرنا، خدا حافظ!'' میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ فون رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور کتنی دیر اپنے دل کو ٹٹولتی رہی کہ شاید کوئی پچھتاوا کوئی ملال لیکن اس وقت مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا اطمینان بھی نہیں تھا بس ہلکا سا خوف جو شاید آنے والے دنوں کا تھا اور یہ تو ہونا ہی تھا۔

☆☆☆

پھر اگلے روز ہی تائی جی نے باقاعدہ مجھے پیلا جوڑا پہنا کر مایوں بٹھا دیا تو اس وقت میں نے دیکھا امی خوش نظر آرہی تھیں اور مجھے کیا چاہیے تھا۔ ان ہی کی خاطر تو میں نے سر جھکایا تھا۔ وہ اگر خوش ہو رہی تھیں تو مجھے بھی کوئی دکھ نہیں تھا البتہ میں الجھ ضرور رہی تھی کہ تائی جی نے کیسے آناً فاناً سارے معاملات طے کر لیے تھے یعنی پہلے تو انہوں نے کبھی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا پھر بقول احسن انہوں نے مجھ پر گھناؤنے الزام بھی لگائے تھے پھر کیسے مجھے بہو بنانے پر تیار ہو گئیں۔

''یہ سب نصیب کی باتیں ہیں۔'' رات میں امی میرے پاس آکر بیٹھیں تو کہنے لگیں۔ ''ہم پتا نہیں کیا کچھ سوچتے ہیں لیکن نصیب کا لکھا ہی پورا ہوتا ہے تمہاری تائی جی نے تمہارے لیے سارے دروازے بند کیے اپنا دروازہ بند نہیں کر سکیں۔''

''آپ خوش ہیں؟'' میں نے امی کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا جو اچانک تاریک ہو گیا تھا۔

''مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی۔'' امی نظریں چرا کر بولیں پھر قدرے توقف سے اپنے آپ صفائی پیش کرنے لگیں۔ ''کیا کروں کہیں بات بنتی ہی نہیں تھی۔ احسن کی اماں بھی جواب دے گئی تھیں اور اس کا تمہارے باپ کو بھی بڑا افسوس تھا۔ تب تمہاری تائی جی نے کہا فکر کیوں کرتے ہو رشتہ گھر میں موجود ہے یوں دونوں میں بات طے ہو گئی۔ پرسوں عدنان آرہا ہے اور اسی روز تمہاری مہندی رکھی ہے۔'' مجھ میں امی کا چہرہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا جب ہی میں اپنے پیر کے انگوٹھے کا ناخن کھرچنے میں لگی رہی۔

''تمہارا باپ بہت خوش ہے۔'' امی کہے جارہی تھیں۔ ''بار بار مجھے کہہ رہے تھے کہ بھابی کو ہمارا کتنا خیال ہے اور جیہ سے تو انہیں شروع سے ہی بہت محبت ہے جب ہی تو جیہ کا دل بھی وہیں لگتا ہے۔ اب دیکھو عدنان تمہیں یہاں رکھے یا اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اللہ کرے اپنے ساتھ لے جائے۔''

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' میں ان کی باتوں سے اکتا کر بولی تو وہ فوراً کھڑی ہو گئیں شاید انہیں خدشہ تھا کہ کہیں مجھے بہلاتے بہلاتے وہ رو نہ پڑیں۔ اس لیے جیسے منتظر تھیں فوراً اٹھ کر چلی گئیں اور میں اپنے ہاتھ کی لکیروں میں اپنا نصیب ڈھونڈتے، ڈھونڈتے سو گئی۔

☆☆☆

اگلے دن صبح ہی سے گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ شہنی کی آواز تھی جو محلے کی لڑکیوں کو اکٹھا کر کے غالباً مہندی کی تقریب کا انتظام کر رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی مختلف آوازیں سنتی رہی۔ اس کے باوجود جانے کیوں مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے لیے ہو رہا ہے۔ میرے تن پر سجا پیلا جوڑا اور ابٹن کی بھینی، بھینی مہک بھی میرے احساسات کو نہیں جھنجوڑ پا رہی تھی۔ اس کے برعکس یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ساتھ کوئی مذاق ہو رہا ہو۔

''یہ مذاق نہیں ہے، میرے نصیب کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔'' میں نے خود کو یقین دلانے کی سعی کی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیسے جب میرے نصیب میں یہ تھا ہی نہیں۔ میرے نصیب میں تو اس سے بھی بھیانک مذاق تھا۔ اگلے روز عین اس وقت جب میری ہتھیلیوں پر مہندی رنگ چھوڑ گئی تھی۔ عدنان برآمدے میں کھڑا چلا رہا تھا۔

''آپ نے یہ سوچا کیسے کہ میں جیہ کے ساتھ شادی کر لوں گا۔ ہرگز نہیں، آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا اگر کوئی اور لڑکی نہیں مل رہی تھی تو میں آتا ہی نہیں ......گھر کی بات ہو یا باہر کی میں قربانی نہیں دے سکتا۔ بند کرو یہ ڈھولک، یہاں کوئی شادی وادی نہیں ہو رہی ہے، شہنی!'' وہ غالباً اس کمرے میں گیا تھا جہاں ڈھولک بج رہی تھی اور مجھے نہیں معلوم برآمدے میں کھڑے ابا اور امی کی کیا حالت تھی اور جانے تائی جی ان سے کیا کہتے ہوئے گئی تھیں۔ میں کچھ دیر بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر بہت آرام سے اٹھ کر الماری سے اپنا ایک سادہ سا سوٹ نکالا اور واش روم میں بند ہو گئی۔

دو دن سے گھر میں ڈھولک بج رہی تھی اور اب موت کا سناٹا تھا۔ میں کپڑے بدل کر واپس کمرے میں آئی تو یوں تھا جیسے برسوں سے یہاں کوئی آواز نہیں گونجی۔ پتا نہیں امی کہاں تھیں۔ میں کتنی دیر ان کا انتظار کرتی رہی پھر مجھے بھوک ستانے لگی تو میں خود ہی کمرے سے نکل کر سیدھی کچن میں آگئی اور ابھی روٹی کا برتن کھولا ہی تھا کہ امی آگئیں۔ غالباً انہوں نے مجھے ادھر آتے ہوئے دیکھا تھا جب ہی آگئی تھیں۔

''مجھے کھانے کا خیال ہی نہیں رہا تم جاؤ کمرے میں۔'' میں وہیں لے کر آتی ہوں۔'' امی مجھ سے نظریں چرا کر کہہ رہی تھیں۔ مجھے حقیقتاً ان پر بہت ترس آیا۔

''آپ نے کھالیا؟''

''نہیں۔''

''چلیں، میں لے کر آتی ہوں۔'' میں نے کہا تو جانے کیوں وہ گھبرا سی گئیں۔

''نہیں، تم اپنے کمرے میں جاؤ اُدھر تمہارے ابا......''

''ابا......!'' میں نے چونک کر دیکھا۔ ''کیا ہوا ابا کو؟''

''کچھ نہیں، بس وہ روئے جارہے ہیں۔''

''ابا رو رہے ہیں، کیوں؟ ہمارے ساتھ تو ایک عرصے سے یہی ہو رہا ہے۔ وہ اب کیوں رو رہے ہیں؟'' میرے لہجے میں حیرت کے ساتھ طنز بھی سمٹ آیا۔

''اور وہ تائی جی کہاں ہیں، ان کے پاس جا کر روئیں۔ وہ ایسے موقع پر تسلیاں دینے میں بہت ماہر ہو چکی ہیں۔'' امی نے بس ایک نظر مجھے دیکھا پھر پلٹ کر جانے لگیں کہ میں نے روک لیا۔

''سنیں امی! مجھے کوئی افسوس نہیں ہے بلکہ یوں لگ رہا ہے جیسے دل پر ایک بوجھ آن گرا تھا اس سے آزاد ہو گئی ہوں۔ ابا سے کہہ دیجیے میرے ساتھ اب تک جو ہوتا رہا ہے وہ بے شک غلط تھا لیکن آج جو ہوا یہ بہت اچھا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرا نصیب اتنا برا نہیں ہے۔'' آخر میں، میں قصداً مسکرائی پھر گھوم کر سالن گرم کرنے میں لگ گئی۔

امی اسی خاموشی سے چلی گئی تھیں۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا اس کے بعد چائے کا کپ لے کر اپنے کمرے میں آگئی اور چائے پینے کے ساتھ، ساتھ اِدھر، اُدھر بکھری مہندی اور پھولوں کی پتیاں سمیٹتے ہوئے ان کی بھینی، بھینی خوشبو اچانک میرے احساسات کو جھنجوڑنے لگی تھی اور یہ واقعی حیرت کی بات کہ تھی کہ ہتھیلیوں پر سج کر مہندی نے میرے اندر کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی جو اَب میں محسوس کر رہی تھی۔ بڑا خوب صورت احساس تھا۔ میں نے چائے کا کپ خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا پھر فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں مہندی اور پھول سمیٹ کر ان کی خوشبو اپنے اندر اتاری پھر بے اختیار اوپر اچھال کر انہیں پھر سے بکھیرتے ہوئے میں خوش ہو رہی تھی کہ اسی وقت بنا دستک دیے بلکہ دروازہ دھکیل کر عدنان اندر آگیا اور اس سے پہلے کہ میں ٹوکتی حیرت سے بولا۔

''تم ہنس رہی ہو؟''

''کیوں، ہنسنے پر پابندی ہے کیا؟'' میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ ان سنی کر کے اسی حیرت سے بولا۔

''میرا تو خیال تھا تم رو رہی ہو گی؟''

''کیوں؟'' میں نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

''ظاہر ہے، تمہاری شادی ہو رہی تھی اور اب نہیں ہو رہی۔''

''آپ کی بھی تو ہو رہی تھی اور اب نہیں

ہو رہی۔" میں نے محظوظ ہو کر اسی کے انداز میں کہا تو وہ تپ کر بولا۔

"میری بات چھوڑو، میں مرد ہوں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ جز بز ہو کر نظروں کا زاویہ بدل گیا پھر محض اپنا ہاتھ اوپر رکھنے کی خاطر بولا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، تمہارا مستقبل تاریک ہوگیا۔"

"نہ، نہ...... آپ کو افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے عدنان بھائی۔ مجھے تاریکیوں میں شمع جلانی آتی ہے۔"

"تو اب تک اندھیرے میں کیوں کھڑی ہو؟" اس نے طنز کیا تو میں بہت ضبط سے جتا کر بولی۔

"ابا کا انتظار کر رہی تھی۔ شکر ہے وہ آگئے ہیں اب اندھیرا نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ سمجھ کر تلملایا تھا۔

"میں نے تو آپ کی کسی بات کا مطلب نہیں پوچھا لیکن یہ ضرور پوچھوں گی کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" میں ٹوک کر سوالیہ نشان بن گئی تو اسے جیسے اپنی آمد کا مقصد یاد آگیا تو فوراً مصالحانہ انداز اختیار کر کے بولا۔

"میں تم سے کچھ مذاکرات کرنے آیا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟" میں اندر ہی اندر ٹھٹکی تھی۔

"شادی...... میرا مطلب ہے یہ شادی ہوسکتی ہے اسی طرح جیسے طے کی گئی ہے اگر جو تم......" وہ ایک لحظہ کو ہچکچایا تھا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ "اگر تم یہ پورشن میرے نام کردو۔" مجھے اس کی سوچ اور لالچ پر جتنا افسوس ہوتا کم تھا لیکن میں نے فوراً اظہار نہیں کیا اور بظاہر سادگی سے بولی۔

"یہ تو ابا کے نام ہے۔"

"ہاں، میں چاہتا ہوں کہ چچا جان وہ میرے نام کردیں۔ چچا جان نے کہا ہے کہ وہ نکاح میں تمہارے نام لکھ دیں گے۔" وہ میری سادگی سمجھ کر اپنے تئیں مجھے اعتماد میں لے رہا تھا۔

"تمہارے نام؟" میں قصداً سوچنے لگ گئی۔

"ہاں ایک ہی بات ہے، میں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم میرا مطلب ہے اگر کبھی بیلا آگئی تو وہ تم سے ہتھیا لے گی کیونکہ وہ بہت چالاک ہے، میرے نام ہوگا تو...... دیکھو، اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ تمہیں اپنے ہاتھوں کی مہندی چھپانی نہیں پڑے گی۔" وہ مسلسل مجھے رام کرنے میں لگا ہوا تھا اور میری نظریں اپنی سرخ ہتھیلیوں پر جم گئیں جہاں ساری لکیریں واضح ہوگئی تھیں گو کہ میں دست شناس نہیں تھی پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ میری قسمت کے اندھیرے چھٹ رہے تھے۔

"تمہارے ہاتھوں پر مہندی بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔" عدنان نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھنے چاہے لیکن میں فوراً پیچھے ہٹ گئی پھر اسے دیکھ کر بولی۔

"میرے ہاتھوں میں مہندی واقعی اچھی لگ رہی ہے لیکن یہ تمہارے نام کی نہیں ہے۔"

"پھر......؟" اس کی پیشانی پر ہلکی سی لکیر ابھری تھی،

"جس کے نام کی ہوگی وہ آجائے گا۔ آج نہیں تو کل۔" میرے مسکرانے پر وہ سلگ کر بولا۔

"کسی خوش فہمی میں مت رہو اگر اس طے شدہ تاریخ پر تمہاری شادی نہیں ہوئی تو پھر سمجھو...... کبھی نہیں ہوگی۔"

"نہ سہی، زندگی کا دوسرا نام شادی تو نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ابھی تمہاری اصلیت دیکھ کر مجھے شادی سے ہی نفرت ہوگئی ہے۔ جاؤ اپنی ماں سے کہو میں نے تمہیں ریجیکٹ کردیا ہے۔" میں بے نیازی سے کہتی اچانک غصے میں آگئی تو وہ دانت پیس کر بولا۔

"تم مجھے ریجیکٹ کروگی؟"

"ہاں ایک بار نہیں ہزار بار...... میں تمہیں ریجیکٹ کرتی ہوں۔ میں تمہیں ریجیکٹ کرتی ہوں۔" میں چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس طرح وہ الٹے پیروں پیچھے ہٹتا ہوا کمرے سے نکل گیا تو میں نے چاہا کہ دروازہ زور سے بند کردوں لیکن سامنے ابا کو کھڑے دیکھ کر میرا ہاتھ وہیں رک گیا اور میں واپس پلٹنا چاہتی تھی لیکن پھر اچانک ہی بھاگ کر ابا کے سینے سے جا لگی۔ میرے آنسو اچانک بہہ نکلے تھے۔

"روتی کیوں ہو، میں ہوں ناں۔" ابا میرا سر تھپکنے لگے پھر مجھے کمرے میں چھوڑ کر جاتے، جاتے بولے تھے۔ "تم نے بیلا کی طرح صحیح فیصلہ کیا ہے۔"

"ابا......!" میں رونا بھول کر ان کے پیچھے دیکھے گئی۔ حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ابا کی زبان پر بیلا کا نام آیا تھا اور میرا دل چاہا میں ابھی اسے بتاؤں لیکن بہت رات ہوگئی تھی مجبوراً میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

صبح بہت دن چڑھ آیا تھا جب شور سے میری آنکھ کھلی۔ کچھ دیر میں سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر جیسے ہی ذہن بیدار ہوا میں فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل آئی تو آگے تائی جی برآمدے میں کھڑی امی پر چلّا رہی تھیں۔

"تمہیں خود شوق ہے بدنامیاں گلے ڈالنے کا۔ ایک بیٹی کو بھگایا دوسری کو بھی اسی راہ لگاؤ گی۔ ارے اپنا نہیں تو کچھ ہمارا خیال کرو۔ میری شہنی عزت سے رخصت ہوجائے پھر جو مرضی کرتی پھرنا۔"

"بس تائی جی۔" میں اچانک نہیں بلکہ ان کی ساری بات سننے کے بعد ہی ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ "آپ نے ہمارا خیال کرلیا...... ہم آپ کا خیال کریں گے۔ اب آپ جائیں اپنی جگہ پر۔"

"ہائیں تم...... تم مجھ سے مخاطب ہو؟" ان کے دیدے پھٹ گئے تھے۔

"جی ہاں آپ سے...... اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ سے بدتمیزی نہ کروں تو آئندہ اپنی زبان کنٹرول میں رکھیے گا۔ میں مزید اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔" میں نے سکون سے انہیں وارننگ دی تھی۔

"ارے بے عزتی اس کی ہوتی ہے جس کی کوئی عزت ہو۔ تمہارے ماں باپ کی عزت تو وہ پہلے ہی نیلام کرگئی ہے، رہی سہی کسر تم پوری کردو۔" تائی جی بکتی جھکتی چلی گئیں تو میں نے امی کے ساتھ ان کے کمرے میں آکر پوچھا۔

"کیا ہوا تھا؟"

"پتا نہیں، اپنے آپ آکر بولنے لگیں جیسے تمہارے ابا کے جانے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ادھر وہ نکلے اُدھر یہ آن موجود ہوئیں...... رات عدنان کیا کہہ رہا تھا؟" امی نے اپنی بات کہہ کر مجھ سے پوچھا تو میں سر جھٹک کر بولی۔

"وہ بھی ایسے ہی بکواس کر رہا تھا۔"

"پتا تو چلے۔"

"چھوڑیں، یہ بتائیں آپ نے ناشتا کرلیا؟"

"ہاں، تمہارے لیے پراٹھا بنا دیا ہے...... جاؤ ٹھنڈا ہوجائے گا۔" امی نے میرے ناشتے کے خیال سے مزید نہیں کریدا۔

"اچھی بات ہے۔" میں ان کے کمرے سے نکل آئی اور آنگن میں لگے واش بیسن پر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے مجھے ایک دم بیلا کا خیال آیا تو میں تولیا کھینچتی ہوئی لابی میں آکر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیلو!" خلافِ توقع اس نے پہلی ہی بیل پر ریسیور اٹھا لیا۔

"السلام علیکم مسز بیلا حماد۔" میں نے قدرے شوخی سے کہا تو وہ اچھل کر بولنے لگی۔

''ارے تمہاری شادی ہوگئی؟''

''میں نے تمہیں مسز کہا ہے اپنے آپ کو نہیں۔'' میں نے ٹوکا تو وہ جھنجلا کر بولی۔

''پتا ہے، میں تمہاری شادی کا پوچھ رہی ہوں؟''

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ یقین سے بولی۔

''نہیں ہوسکتی۔''

''ظاہر ہے، تمہارا بویا میں کاٹ رہی ہوں۔'' میں اس کے یقین سے چڑ کر بولی تو وہ پہلے زور سے ہنسی پھر کہنے لگی۔

''یہ کریڈٹ مجھے نہیں اُسے جاتا ہے۔''

''اسے کسے؟''

''تمہارے عاشق کو۔''

''ہائیں، میرا کون عاشق پیدا ہوگیا؟'' میری حیرت پر وہ عادت کے مطابق ڈانٹنے لگی۔

''معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے احسن کو نہیں جانتیں کیا؟''

''نام مت لو اس کا۔'' میں نے فوراً ٹوکا۔

''ارے، وہ تمہارے نام کی تسبیح پڑھ رہا ہے اور تم اس کا نام نہیں سننا چاہتیں۔''

''تم نے کہاں دیکھ لیا اسے؟''

''وہ تین دن سے میرے گھر آرہا ہے...... گھنٹوں بیٹھا گڑگڑاتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ اس کی شادی کروادوں اگر تم اسے نہیں ملیں تو وہ مرجائے گا وغیرہ، وغیرہ۔'' بیلا نے بتایا تو میں چڑ کر بولی۔

''بکواس نہیں کرو۔''

''یہ بکواس نہیں ہے جیہ، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم ایک بار اس سے مل کر سارے گلے شکوے دور کرلو۔'' بیلا ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی پھر بھی میں نے منع کردیا۔

''نہیں، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''ایسا مت کرو جیہ، وہ سچ مچ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور اگر اس نے تم سے کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا ہے تو اس میں اس کا قصور نہیں ہے تائی جی نے جس انداز سے تمہاری کردار کشی کی ہے اس سے اچھے سے اچھا شخص بدگمان ہوسکتا ہے پھر احسن کی بدگمانی تو بہت تھوڑی دیر کی تھی اور اس پر بھی وہ شرمندہ ہے۔ معاف کردو اسے بھول جاؤ پچھلی ساری باتیں۔'' بیلا دھیرج سے سمجھا رہی تھی۔ میں چاہتے ہوئے بھی اسے ٹوک نہیں سکی اور چپ چاپ سننے لگی۔

''دیکھو، اگر تمہاری شادی نہیں ہوئی تو صرف اس لیے کہ آسمانوں پر تمہارا جوڑا عدنان یا کسی اور کے ساتھ نہیں لکھا گیا اور میں یہ نہیں کہتی کہ ضرور احسن ہی کے ساتھ لکھا ہوگا لیکن آزمانے میں کیا حرج ہے، اپنا نصیب آزما دیکھو، ہوسکتا ہے ابا مان جائیں۔''

''رات، ابا تمہیں یاد کررہے تھے۔'' میں نے اس کی ساری باتوں کے جواب میں کہا تو وہ اچھل کر بولی۔

''کیا...... ابا مجھے یاد کررہے تھے؟''

''ہاں تم آجاؤ حماد بھائی کے ساتھ۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

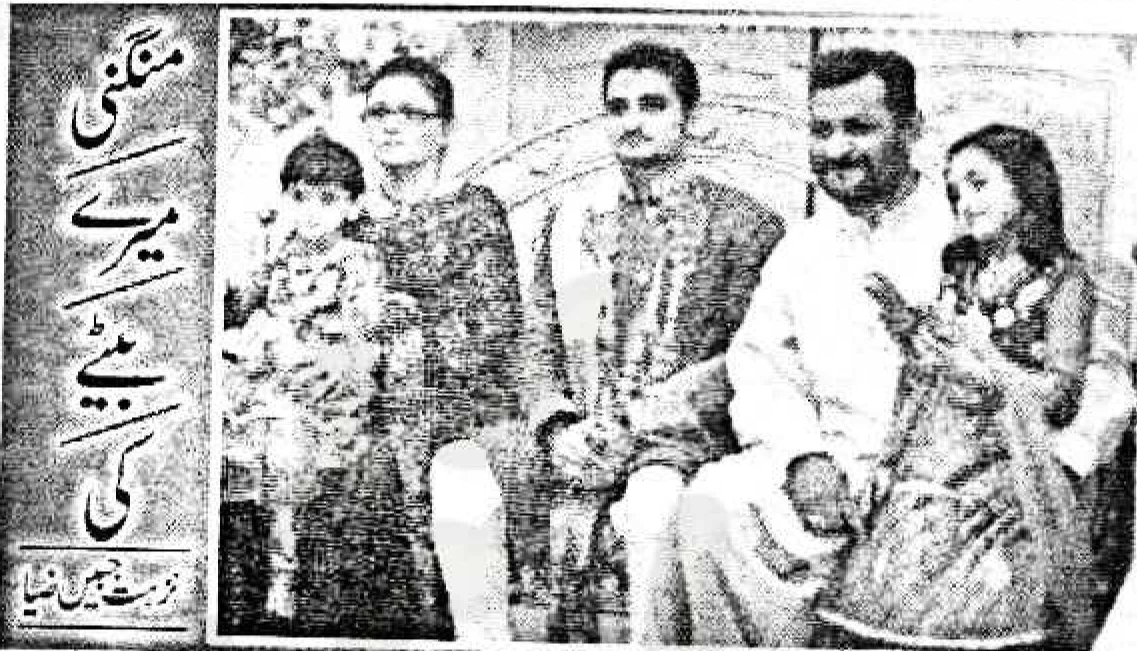
''احسن کو بھی لے آؤں؟''

''تمہاری مرضی۔'' میں بے اختیار بولی تو اس نے شوخی سے پوچھا۔

''اور تمہاری مرضی کیا ہے؟''

''میں اپنا نصیب آزمانا چاہتی ہوں۔''

''ضرور، ضرور۔'' بیلا یوں کھلکھلا رہی تھی جیسے اس نے میرے نصیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہو۔ اس کی ہنسی تو یہی بتا رہی تھی کہ میرے نصیب کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں۔



لڑکے کی شادی کا ارمان ہر ماں اور بہن کو ہوتا ہے اور مجھے بھی اپنے اکلوتے بیٹے منہاج کی شادی کا بہت ارمان ہے، سنا ہے...... بلکہ دیکھا بھی ہے کہ لڑکی پسند کرنے کا مرحلہ بھی بہت مشکل ہوتا ہے خصوصاً جب بیٹا اکلوتا ہو تو ماؤں اور بہنوں کی ڈیمانڈ بڑھ جاتی ہیں۔ مگر الحمدللہ ہمارے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ویسے تو ہم سب کو بہت ارمان تھا منہاج کی شادی کا مگر خاص طور پر میرے شوہر ضیا کو بہت جلدی تھی...... ایک رات باتوں، باتوں میں ضیا نے مجھ سے کہا کہ ''اب بہو کی تلاش شروع کردو تم لوگ کافی ٹائم لگاؤ گے۔'' ان کا لہجہ پُرمزاح تھا۔

''ارے واہ......'' میری سب سے چھوٹی بیٹی جویریہ ایک دم خوش ہوگئی۔

''امی آپ نے میری دوست اریبہ کو تو دیکھا ہے ناں بس وہ بیا (بھیا) کے لیے بالکل مناسب رہے گی۔''

''ہاں مگر میں نے اس نظریے سے کب دیکھا ہے؟'' میں جلدی سے بولی اتفاق سے میری دونوں میریڈ بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ یوں جھٹ پٹ اگلے ہی دن اریبہ کے ہاں جانے کا فوری پروگرام بن گیا۔ سیدھی سادی اور کم گو اریبہ ہماری پہلی اور آخری چوائس ثابت ہوئی کیونکہ ہم نے ایک ہی لڑکی دیکھی اور فائنل کردی...... جھٹ پٹ رشتہ طے ہوگیا اور منگنی کی تاریخ بھی طے کردی گئی۔ 19 اکتوبر 2013ء ہمارے چھوٹے سے گھر میں جیسے خوشگوار سی ہلچل شروع ہوگئی تھی۔ منگنی کے جوڑے کی تیاری میں تمام بڑی، بڑی مارکیٹس کے چکر اسٹارٹ ہوگئے۔ بڑی مشکلوں اور سب کی باہمی رضامندی کے بعد آخرکار اریبہ کے لیے باٹل گرین اور...... میرون کامبی نیشن کی بنارسی جارجٹ کی نگوں کے کام والی لانگ فراک پسند آئی جس کا دوپٹا بھی کافی کام والا تھا۔ اس کی میچنگ کی میرون نگوں والی پازیب اسٹائل سینڈل اور بے حد خوب صورت میرون پورے نگوں سے بھرا ہوا کلچ بھی لے لیا۔ خوب صورت سی جیولری کا مرحلہ بھی باہمی مشورے سے حل ہوگیا۔

چوڑیوں کے بھاری سیٹ کی جگہ کافی چوڑے، چوڑے گولڈن اور پرل کے بریسلیٹ لے لیے تھے۔ یوں اریبہ کی تیاری مکمل ہوئی۔ منہاج کو شاہینہ باجی (اریبہ کی والدہ) نوشین (بہن) احتشام (بھائی) طارق روڈ لے گئے اور اس کی پسند سے کپڑے دلوائے تھے...... اب مرحلہ تھا ہماری اپنی تیاریوں کا...... کافی محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد ہماری شاپنگ بھی مکمل ہوئی۔

منگنی کا اہتمام القمر گارڈن (ماڈل کالونی) میں کیا گیا تھا یہ کمبائنڈ پروگرام تھا (مگر دولھا، دلہن کی رسمیں الگ، الگ ہوئی تھیں) ویسے تو منہاج میرا اکلوتا بیٹا ہے مگر اس کے دوستوں نے کبھی اس کو اکیلا نہیں ہونے دیا کوئی پریشانی ہو یا خوشی وہ تمام سائے کی طرح منہاج کے ساتھ رہتے ہیں (خدا تعالیٰ ان سب کو سلامت رکھے، آمین) منگنی کی تقریب سے دو دن پہلے میری دونوں میرڈ بیٹیاں بھی آگئیں...... میں جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں...... دونوں جیٹھانیاں ان کی بچیاں اور خصوصاً میری دونوں ننھی منی پریاں اشنہ اور ہانیہ (نواسیاں) سب نے مل کر خوب گانے گائے، بیوٹی پارلر جاکر سب نے باری باری مہندی لگوائی اور جیب ہلکی ہوئی ضیا کی...... کیونکہ میک اپ کروانے کے لیے

منہاج سے پیسے پہلے ہی لے لیے گئے تھے...... گویا موقع کا صحیح فائدہ اٹھایا جارہا تھا۔

ہال میں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچنا تھا کیونکہ منہاج اور اریبہ کا الگ، الگ فوٹو سیشن بھی ہونا تھا۔

ضیا نے آج اسکائی بلو کاٹن کا کلف والا شلوار قمیص جبکہ میں نے میرون نیٹ کی ساڑی جس پر بلیک سیکوئنس کا کام تھا پہنی تھی، میچنگ نازک سا سیٹ تھا۔ آج پہلی بار میں نے تیاری میں بیوٹیشن کی ہیلپ لی تھی اور سنا ہے اچھی بھی لگ رہی تھی۔ (ہاہاہا) طیبہ اور صوفیہ نے ایک جیسی فراکیں اور چوڑی دار پاجامے پہنے تھے بس رنگ الگ تھے۔ طیبہ کا ملٹی کے ساتھ موو کلر تھا اور صوفیہ کا ملٹی کے ساتھ میجنٹا مع خوب صورت جیولری...... دونوں ماشاء اللہ پارلر سے تیار ہوئی تھیں۔ دونوں داماد بھی ماشاء اللہ ہینڈسم اور گڈ لکنگ ہیں، چھوٹی بیٹی جویریہ نے پنک اور بلو کامبی نیشن کی لانگ فراک اور پاجامہ پہنا تھا فراک پر ستاروں اور نگوں سے بھاری کام تھا اس نے بھی میک اپ کروایا تھا، کانوں میں بڑے، بڑے نگوں والے میچنگ ائیر رنگز پہنے تھے اور ماتھے پر ٹیکا بھی لگایا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کیونکہ اس کی سب سے اچھی دوست اب اس کی بھابی بننے جارہی تھی۔

میری دونوں ننھی پریوں (نواسیوں) نے نیٹ کی گرین اور ریڈ کامبی نیشن کی لانگ فراک پہنی تھی۔ جس پر موتیوں، ستاروں نگوں کا کام تھا اور ساتھ ہی ریڈ گرین بنارسی پاجامے اور چھوٹے، چھوٹے دوپٹے جسے وہ اسٹائل سے اوڑھنا چاہ رہی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں میچنگ نگوں والے کلچ بھی تھے اور ضیا نے بطورِ خاص اپنی نواسیوں کے انڈین جگنی کے ریڈ اور گرین جیولری سیٹس منگوائے تھے اشنہ نے ٹیکا بھی لگایا تھا۔ وہ دونوں خوب صورت تتلیاں لگ رہی تھیں۔ میں نے سب پر نظر بد کی دعا پڑھ کر دم کی اور جب دولھا میاں تیار ہو کر آئے تو ماشاء اللہ ... آج تو میرا بیٹا واقعی شہزادہ لگ رہا تھا جیسے بچپن میں اس کی پھوپھی امی (ضیا کی سب سے بڑی بہن) ہمیشہ بانکا کہہ کر مخاطب کرتی تھیں ماشاء اللہ آج وہ واقعی بانکا لگ رہا تھا باریک نگوں اور بلیک ریشمی دھاگے کے کام سے مزین میرون شیروانی اور آف وائٹ چوڑی دار پاجامے میں ملبوس شہزادہ لگ رہا تھا ساتھ میں ہم رنگ پگڑی، چُنری اور میچنگ کھسا تھا، ضیا گھر سے نکلنے سے پہلے صدقہ دینا نہیں بھولے تھے۔ ایک مزے کی قابلِ فخر بات بتاؤں میری بیٹی صوفیہ کی شادی سے پہلے جب عذرا رسول باجی میرے گھر تشریف لائی تھیں تو انہوں نے منہاج کو دیکھ کر کہا تھا ”نزہت تمہارا بیٹا تو بہت خوب صورت ہے اس کو ماڈلنگ میں بھیجو ناں......“

ہم مقررہ وقت پر ہال پہنچے تو دلہن والوں نے ہمارا بہت اچھا استقبال کیا ہم سب مہمانوں کو گجرے دیے، ہار پہنائے اور مٹھائی کھلائی، ہم نے بھی ان لوگوں کو اسی طرح خوش آمدید کہا ہم نے آنے والے تمام دلہن والوں میں بوکے تقسیم کیے۔

اریبہ کو رسم کے لیے لایا گیا ماشاء اللہ آج اریبہ بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بائل گرین کلر اس پر بہت سوٹ کررہا تھا۔ پارلر کے میک اپ نے مزید خوب صورت بنادیا تھا ہر کوئی دولھا، دلہن کی تعریف کررہا تھا۔

پہلے ہم نے اریبہ کی رسم کی پھول اور گجرے پہنائے اور میں نے اریبہ کو اپنی منگنی کی خاصی بھاری انگوٹھی پہنائی (جو میں نے منہاج کے پیدا ہوتے ہی یہ کہہ کر رکھ دی تھی کہ منہاج کی دلہن کو منگنی میں پہناؤں گی۔ الحمدللہ آج میری برسوں پرانی خواہش پوری ہورہی تھی) کچھ لوگ رسم دیکھنے قریب آگئے اور کچھ اپنی سیٹوں پر بیٹھے بڑے سے پلازما ٹی وی پر رسم انجوائے کرتے رہے۔ میں نے اریبہ کے گھر والوں میں جوڑے تقسیم کیے اور مٹھائی کھلائی، تصاویر اور موو ی بنتی رہی پھر منہاج کو رسم کے لیے لایا گیا، منہاج کو بھی ہار پہنا کر انگوٹھی پہنائی۔ دلہن کی والدہ نے ہم سب کو خوب صورت جوڑے دیے مٹھائیاں کھلائیں پھر کھانا اسٹارٹ ہوا کھانے میں بیف پلاؤ، چکن کڑاہی، چکن بروسٹ، رائتہ، چٹنیاں اور رشین سلاد تھی جبکہ سوئیٹ ڈش میں گلاب جامن اور پھر قلفی بھی تھی کھانا الحمدللہ بہت شاندار تھا (جو منہاج اور ضیا نے بھی ارینج کیا تھا)

کافی سارے مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد اریبہ کی فیملی اور ہم سب گھر والوں نے اکٹھے کھانا کھایا ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ بچے ان خوشگوار اور خوب صورت لمحات کو پل، پل اپنے، اپنے موبائل اور ڈیجیٹل کیمروں میں قید کرتے رہے جن میں منہاج کے خاص دوست، اطہر، افسر، فہد، سعادت، فرحان شامل ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں فیملیوں نے ایک دوسرے سے اجازت چاہی اور یوں یہ خوب صورت تقریب اختتام کو پہنچی۔

آپ سب دعا کریں کہ اگر زندگی رہی تو جلد ہی بیٹے کی شادی کے احوال کے ساتھ ایک بار پھر حاضر ہوں۔ (انشاءاللہ!)

☆☆☆

ہر ایک بزم میں اب ہیں بجٹ کے افسانے

شائستہ زریں

بُھلا چکے ہیں قصیدے سبھی محبت کے
خرد پسند ہوئے جا رہے ہیں دیوانے
ہر ایک انجمن میں داستاں اسی کی ہے
ہر ایک بزم میں اب ہیں بجٹ کے افسانے

جون کا مہینہ گرمیِ بازار کا ہوتا ہے جو اچھے بھلے متحمل مزاجوں کو بھی گرما گرمی پر مجبور کردیتا ہے بالخصوص خواتین دن میں کئی مرتبہ بجٹ کا خصوصی بلیٹن نشر کرتی ہیں کہ عموماً گھر کی وزارت میں ”وزارتِ خزانہ“ کا شعبہ خاتونِ خانہ کے ہنر مند ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ سلیقہ شعار خواتین ایسا گھریلو بجٹ بناتی ہیں کہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرہی لیتی ہیں اور اپنی دانشمندی سے ”منی بجٹ“ اور ”امداد“ کی نوبت آنے ہی نہیں دیتیں گویا دانا ماہرین معاشیات کے ”افکارِ عالیہ“ کی روشنی میں جو ملکی وصوبائی بجٹ سامنے آتا ہے وہ گھریلو بجٹ کو تلپٹ کردیتا ہے۔ ماہانہ گھریلو بجٹ خاتونِ خانہ کی دانائی اور ہنر مندی کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ متوازن اور اچھا بجٹ بنانے میں خواتین کلیدی کردار ادا کرتی ہیں اور یہ ان کی سب سے بڑی آزمائش بھی ہوتی ہے جبھی سب سے زیادہ قربانی خاتونِ خانہ کے حصے ہی میں آتی ہے کہ انہیں اپنی خواہشات کو نظر انداز بھی کرنا پڑجاتا ہے۔ وہ خواہشات خالصتاً ان کی اپنی نہیں بلکہ ان کے پیارے گھر کی بہتری کی ہوتی ہیں۔

جون کی مناسبت سے اس مرتبہ ہمارا موضوع گھریلو بجٹ ہے۔ ہم نے چند معزز خواتین سے معلوم کیا کہ

ا: گھریلو بجٹ میں سب سے زیادہ اور سب سے کم رقم کس مد میں خرچ کرتی ہیں؟

۲: گھریلو بجٹ میں کس مد میں آپ کیا خرچ کرنا چاہتی ہیں جو چاہنے کے باوجود خرچ نہیں کرپاتیں؟

عائشہ خان
(سینئر فنکارہ، کہانی نویس)

ا: سب سے زیادہ رقم مہمانداری میں خرچ ہوتی ہے اور سب سے کم خرچہ بجلی کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کے غیر ضروری استعمال سے گریز کرتی ہوں۔

۲: حسرت ہی رہی کہ میں اپنے گھر میں ہفتے میں دو بار سہی خوشبو والے اصلی پھول خرید کر لاؤنج میں رکھے گلدان میں سجاؤں تاکہ جب میں یا باہر سے آنے والے گھر میں داخل ہوں تو خوشنما فرحت



عائشہ خان

بخش پھولوں کی مہک سے لطف اندوز ہو سکیں۔

روبی شکیل
(فیشن ڈیزائنر)

ا: زیادہ رقم تو گھریلو استعمال کی اشیا پر خرچ کرتی ہوں۔ کسی زمانے میں کپڑے بنانے کا بہت شوق تھا اور بناتی بھی تھی لیکن اب سب سے کم رقم اپنے کپڑوں کی خریداری پر خرچ کرتی ہوں محض اس لیے کہ بجٹ کی اس رقم کو اپنے کاروبار پر لگا سکوں۔

۲: گھر کی سجاوٹ کا بہت شوق ہے کبھی یہ حال تھا کہ اکثر ڈیکوریشن پیسز لے آتی تو کبھی کرسیاں



روبی شکیل

خرید لیں لیکن اب چاہنے کے باوجود اس پر خرچ نہیں کر پاتی یہی سوچ کر کہ اگر یہ رقم کاروبار میں لگادوں تو زیادہ بہتر ہے کہ قطرہ، قطرہ ہی دریا بنتا ہے۔ کاروباری ضرورتیں میرے شوق پر حاوی ہوگئیں۔

تابندہ لاری
(نعت خواں)

ا: سب سے زیادہ رقم بچوں کی تعلیم اور یوٹیلٹی بلز پر خرچ ہوتی ہے اور اس میں بھی بجلی اور گاڑی کا خرچہ



تابندہ لاری

زیادہ ہے۔ پیٹرول اور ڈرائیور بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ سب سے کم خرچ میں اپنے اوپر کرتی ہوں اور اس کی بڑی وجہ لوگوں کی محبت ہے کہ تحائف بہت مل جاتے ہیں۔ بالخصوص کپڑے اور بیگز وغیرہ۔

۲: گھر کی آرائش کا سامان ہر مہینے ہی رہ جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ خرچہ اضافی ہے اور میری نظر میں بچوں کی تعلیم زیادہ اہم ہے۔

دلشاد نسیم
(مصنفہ، شاعرہ)

ا: جب گھریلو ضروریات سے واقف نہیں تھی تو امی سے ایک بات سنتی تھی کہ مہینہ ختم ہوتے ہی کچن کے ڈبے بولنے لگتے ہیں اور ایسا ہی ہے کچن بہت ڈیمانڈنگ ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بجٹ کا خاصا بڑا حصہ اس کے لیے مختص ہوتا ہے اور دوسری طرف دیکھا جائے تو ہمارا ذاتی خرچ ہی کوئی نہیں، ہر وقت ڈائٹنگ کا بھوت سوار رہتا ہے میں سب سے کم خرچ اپنے کھانے پر کرتی ہوں۔

۲: ایک خواہش ہے جو ہر ماہ دل میں رہ جاتی ہے گھر



دلشاد نسیم

کو پینٹ کرانے کی ہاہا...... ہاہا...... پودے لینے ہیں۔ ایک صوفہ بدلنا ہے۔ موٹیو اینڈ تھریڈ کے چند سوٹ لینے ہیں۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

ثوبیہ خانم
(پروڈیوسر پاکستان ٹیلیوژن کراچی مرکز)

ا: تعلیم جس قدر مہنگی ہوگئی ہے اسی لحاظ سے سب سے زیادہ خرچ بچوں کی تعلیم پر ہی ہوتا ہے اور سب سے کم خرچ میں کپڑوں پر کرتی ہوں۔

۲: گھر کی آرائش کی اشیا بالخصوص پردے کشن وغیرہ کی خواہش ہے جو ہر ماہ چاہنے کے باوجود پوری نہیں کر پاتی محض اس لیے کہ دیگر ضروری اخراجات کے بعد بجٹ اجازت نہیں دیتا۔



ثوبیہ خانم

تسنیم ماہ پارہ (ماہر پکوان)

ا: سب سے زیادہ گھر کی تمام بڑی چھوٹی اشیا اس میں گروسری سے لے کر باتھ روم تک کا سامان



تسنیم ماہ پارہ

شامل ہے اور یہ اشیا جتنی مہنگی ہیں اتنی ہی زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے۔ سب سے کم خرچ گھر کے پردوں میں ہوتا ہے۔

۲: ڈیکوریشن پیسز خریدنے کے لیے بجٹ اجازت ہی نہیں دیتا تو دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ ہر بار یہ ارادہ آئندہ کے لیے ٹل جاتا ہے لیکن اگلا مہینہ بھی صرف سوچتے ہی گزر جاتا ہے۔

شازیہ افتخار
(ناشر)

ا: سب سے زیادہ خرچ بچوں کی تعلیم پر کرتی ہوں اور سب سے کم رقم باہر

کھانے پر خرچ کرتی ہوں۔ گھر پر ہی بچوں کی پسند کی چیزیں بنا کر دے دیتی ہوں۔

۲: ڈیزائنرز لان کے مقابلے میں اچھی کتابیں لینا پسند کرتی ہوں، اس لیے کتابوں پر خرچ کرنا چاہتی ہوں لیکن بجٹ سے بڑی رقم نکالنی مشکل ہوتی ہے تب میں اپنے دل اور شوق سے مجبور ہو کر پرانی کتابوں کے



شازیہ افتخار

اسٹال سے سیکنڈ ہینڈ کتابیں خرید لیتی ہوں۔ لیکن نئی کتابوں پر چاہنے کے باوجود نہیں خرچ کر پاتی۔

شگفتہ شفیق
(شاعرہ)

۱: سب سے زیادہ رقم بچوں کی تعلیم پر خرچ ہوتی ہے۔ اس مد میں جتنے بھی خرچے ہوتے ہیں خوشی، خوشی برداشت کیے جاتے ہیں، چاہے میرے لیے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، ہم اپنا کوئی بھی کام روک لیتے ہیں لیکن بچوں کو پڑھائی کے سلسلے میں مایوس نہیں کرتے۔ میرے اور شفیق کے کوئی زیادہ خرچے نہیں ہوتے۔ شاپنگ کی مد میں میرے خیال میں ہم کم خرچ کرتے ہیں۔



شگفتہ شفیق

۲: مجھے گھر سجانے اور گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے لیکن میں اس پر چاہنے کے باوجود زیادہ خرچ نہیں کرتی محض یہ سوچ کر کہ اگر اس رقم سے میں کسی ضرورت مند کی مدد کر سکوں تو زیادہ بہتر ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسا حسبِ خواہش کر بھی نہیں پاتی جس کا مجھے بہت رنج ہے۔

انیلا ارشد
(گھریلو خاتون)

۱: سب سے زیادہ بھاری رقم بچوں کی تعلیم پر جاتی ہے حالانکہ ابھی ایک ہی بچی پڑھ رہی ہے وہ بھی کلاس 2 میں لیکن مہنگی کتابیں، فیس، وین کا کرایہ، بچوں کا لنچ وغیرہ اور سب سے کم خرچ دیگر شاپنگ پر ہوتا ہے۔ ایک آدھ ضرورت کی چیز وہ بھی کم قیمت کی خرید لی جاتی ہے ہاں وقت بہت خرچ ہوتا ہے۔

۲: اِنڈور پلانٹس، ڈیکوریشن پیسز خریدنا چاہتی ہوں لیکن ہر ماہ اس اضافی خرچے سے ہاتھ کھینچنا پڑتا ہے اور دل کے ارمان دل میں رہ جاتے ہیں۔



انیلا ارشد

رفعنا سیف
(معلمہ)

۱: سب سے زیادہ تعلیم اور پھر یوٹیلیٹی بلز، بجٹ کو بیلنس رکھنے کے لیے کپڑوں پر سب سے کم خرچ کرتی ہوں۔

۲: ڈیکوریشن پیسز نہیں خرید پاتی چونکہ میں گھریلو بجٹ میں سے ہر ماہ کچھ رقم پس انداز بھی کرتی ہوں۔

☆☆☆

بجٹ کے شکار عزیز قارئین! گھریلو بجٹ میں بچت کا مسئلہ خواتین کے لیے ہمیشہ ہی سے کارِ محال ہے۔ روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی سے گھریلو بجٹ بناتے ہوئے خواتین ترجیحات کو پیشِ نظر رکھتی ہیں تو بلا شبہ بچوں کی تعلیم ہی کو اولیت دی جاتی ہے جو فی زمانہ بہت مہنگی ہے۔ سب سے کم رقم خرچ کرنے کے لیے خواتین کو اپنا ہی دل مارنا پڑتا ہے اور سمجھدار خواتین یہ قربانی بڑے مزے سے دے دیتی ہیں۔ گھر کم و بیش ہر عورت کا یکساں خواب ہوتا ہے جو محض گھر تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس گھر کو گھر بنانے اور اس کی آرائش کی خواہش بھی ہوشربا مہنگائی کی طرح بڑھتی ہی

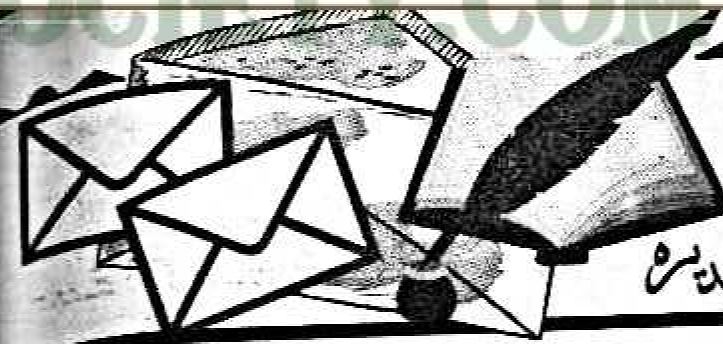


رفعنا سیف

جاتی ہے لیکن یہی مہنگائی اس خواہش کی تکمیل کی راہ کا بھاری پتھر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ترجیحی بنیادوں پر لازمی ضروریات کا پلڑا بھاری رہتا ہے، یوں گھر کی آرائشی اشیا کی خریداری چاہنے کے باوجود آئندہ کے لیے اٹھا کر رکھ دی جاتی ہے اور سلیقہ مند خواتین پرانے کو ہی نیا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ سالانہ قومی اور صوبائی بجٹ کی ماہانہ تبدیلی گھریلو بجٹ میں بچت کا موقع آنے ہی نہیں دیتی ایسے میں گھریلو بجٹ بنانے والی خواتین انور شعور کے الفاظ میں وزیرِ خزانہ سے شکوہ کرتی نظر آتی ہیں کہ

واحد بجٹ وہ بناتے ہیں جب
بگڑتے ہیں لاکھوں گھروں کے بجٹ

کیا ہی اچھا ہو کہ اشیائے خورونوش، گھریلو استعمال کی اشیائے ضرورت اور تعلیم پر ٹیکس لگاتے وقت وزیرِ خزانہ ہاتھ ہلکا رکھیں تاکہ گھر کی وزیرِ خزانہ کا ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے ان پر عرصۂ حیات تنگ نہ ہو۔ یہ کتنی خوش آئند بات ہے کہ اپنی زیبائش سے زیادہ ہر خاتون کو گھر کی آرائش کا خیال ہے۔ بے شک سمجھدار اور کفایت شعار خواتین ہی گھر کو جنت بنا سکتی ہیں۔



بہنوں کی محفل

مدیرہ

✖ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

✖ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

✖ گرمی کی لہر نے پورے ملک کو ہی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کہیں اسکول کالجز کی تعطیلات شروع ہو گئی ہیں اور کہیں ہونے والی ہیں...... بڑے دن ہیں جو زیادہ تر سو کر گزارے جا رہے ہیں اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ کھانا، سونا اور پھر اٹھ کر کھانا...... ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہے...... آپ کو یہ سوچنا ہے کہ جس دن آپ نے اپنے لیے کوئی کام نہیں کیا یا آپ نے کسی دوسرے کے لیے کوئی کام نہیں کیا تو وہ دن آپ کا ضائع گزرا ہے۔ یہ بات میں ہر سال تمام ماؤں سے کہا کرتی ہوں کہ موسم گرما کی تعطیلات میں اپنی بچیوں کو باورچی خانے کے کام ضرور سکھائیں۔ اللہ کرے کہ عملی زندگی میں انہیں تمام تر آسائشیں حاصل ہوں مگر ملازموں سے کام بھی صرف وہی خواتین لے سکتی ہیں جنہیں خود بھی کام کرنا آتا ہو اس لیے آپ بچیوں کو گوشت کے دو سالن دو سبزیاں اور دو میٹھے بنانا ضرور سکھائیں اور جب بچیاں کام کریں تو ان کی خوب تعریف کیجیے ان کے کام میں کیڑے ہرگز نہیں نکالیں...... سلاد کی ڈش تو ایک کلاس پنجم کی بچی کو بھی سیٹ کرنی آنی چاہیے۔ کراچی اور پنجاب کے موسم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کراچی میں گرمیاں دس مہینے چلتی ہیں اور دو مہینے قدرے خوشگوار موسم رہتا ہے جبکہ پنجاب میں سارے موسم بھرپور انداز میں آتے ہیں۔

✖ میں فیس بک بہت زیادہ استعمال نہیں کرتی مگر جو بہنیں صبح شام بلکہ دن کا بیشتر حصہ فیس بک کے ساتھ گزارتی ہیں انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بہت سی گندی خواتین اب...... اُس بازار کو چھوڑ کر فیس بک پر براجمان ہو گئی ہیں اس لیے آپ سب محتاط ہو کر فیس بک کا استعمال کیا کریں اچھی بات تو آپ ضرور ہر ایک سے کیجیے مگر کسی کی بری یا اوچھی بات کو نہ آپ پسند کیجیے اور نہ ہی اس پر کوئی رائے زنی کیجیے کہ جس کی وجہ سے وہ لٹھ لے کر آپ کے پیچھے پڑ جائیں اور خاص بات یہ کہ آپ نے اپنے بچوں پر بھی نظر رکھنی ہے۔ یوں تو ہر کام کی حفاظت صرف اللہ ہی کر سکتا ہے مگر بے خبر رہنا بہتر نہیں ہے۔

✖ تیرہ اپریل کو جب میں کراچی سے اسلام آباد پہنچی تو میری ماں نے تو مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اس کے ساتھ خوشگوار رِم جھم کرتے موسم نے بھی اپنے سحر میں مجھے جکڑ لیا۔ اسلام آباد جانے کی وجہ میری بے حد پیاری اور لاڈلی بھتیجی اریبا ندیم کی شادی تھی۔ جس میں شرکت کرنے کے لیے میرا ایک بھائی احمد نعیم نیویارک سے آیا تھا اور دوسرا بھائی سلیم انصار اس کی بیوی سعدیہ اور پیاری سی بھتیجی رابعہ آسٹریلیا سے آئے تھے جن سے میری ملاقات کئی سالوں کے بعد ہوئی اور یادوں کا البم جیسے کھل سا گیا...... ”چمنا تمہیں یاد ہے ناں میں نے جو غالب کے بارے میں تمہیں نوٹس بنا کر دیے تھے...... وہ تم امتحان میں میر کے بارے میں لکھ آئے تھے...... سہیل کو ڈراما کرنے کا شوق تھا اور میں مزیدار مکالمے لکھ کر اس کے ساتھ ڈراما بولا کرتی تھی...... جسے ٹیپ پر سن کر کسی کی بھی ہنسی نہیں رکتی تھی...... میں نے پہلا مکالمہ بولا...... ”سنیے...... آپ کی قمیص کا بٹن ٹوٹا ہوا ہے......“ اور کسی کے بولنے سے پہلے ہی ندیم بول پڑا۔ ”ہاں...... کوئی لگانے والی ہی نہیں تھی......“ میرا بھتیجا عدنان مذاقیہ لہجے میں بولا...... ”پھپو...... چاچا ہیرو جیسے تھے۔ جان کر اپنی قمیصوں کے بٹن توڑا کرتے ہوں گے......“ ایسی ہی لاتعداد یادیں...... جن میں محو ہو کر وقت کیسے گزرا مجھے پتا ہی نہیں چلا اور جب ہم مری گئے اور وہاں سخت سردی اور درجہ حرارت چھ ڈگری پر دیکھ کر مجھے کراچی کی ایک ہفتے کی شدید سردی یاد آ گئی...... مال روڈ کا صرف ایک ہی راؤنڈ لگایا مگر آج بھی اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے نئی نویلی دلہنیں اپنے توندو سے شوہر کا ہاتھ تھامے اونچی نیچی سڑکوں پر لڑھکتی ہوئی نظر آئیں...... بھوربن کے خوب صورت مناظر سے بھی لطف اندوز ہوئی اور پھر پے آرایل کے گیسٹ ہاؤس راحت کدہ میں ٹھہرے اور اس ٹرپ کی میزبانی میرا بھائی ڈاکٹر سہیل انصار کر رہا تھا میری پیاری سی بھتیجی صفیہ سہیل جو انجینئرنگ یونیورسٹی

میں پڑھ رہی ہے۔ وہ پل، پل کی تصویریں بنا رہی تھی اور کیسے کیسے کمنٹس پاس کیے جا رہے تھے جنہیں میں اس وجہ سے بھی نہیں لکھ رہی کہ آپ کہیں گی یہ انجم باجی اتنی ہنسوڑ خاتون بھی ہو سکتی ہیں اور اتنا زیادہ بولتی ہیں ایک ہفتہ کیسے گزرا مجھے پتا ہی نہیں چلا...... اور جب ہیں اپریل کو میں واپس کراچی پہنچی تو درجہ حرارت چھتیس ڈگری تھا...... موسم کی گرم جوشی کے ساتھ میرے بچے مجھے لینے ائرپورٹ پر موجود تھے اور عظمیٰ کی زبان پر ایک ہی بات تھی ”امی...... آپ کتنے سالوں کے بعد آئی ہیں۔“

اب مجھے آئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے ہیں...... بفضلِ اللہ تعالیٰ عظیم، آرزو...... رامین، کرن اور عبداللہ بھی...... عمرے کی سعادت حاصل کر کے سعودی عرب سے واپس آ گئے ہیں اور میں اپنی جنم بھومی پنڈی اور پھر اسلام آباد...... کے سحر میں تا حال گرفتار ہوں...... اللہ میرے پیاروں اور مجھ سے بے لوث محبت کرنے والوں کو سدا سلامت رکھے...... آمین، ثم آمین! اسلام آباد قیام کے دوران میرا موبائل آف ہی رہا مگر جب کھلا تو رفاقت جاوید سے بات ہوئی...... وہ بے حد پیار سے بلا رہی تھیں...... مگر میں کہیں بھی نہیں جا سکی کہ یہ دن میں صرف اپنی بیمار ماں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی...... بشریٰ مسرور بھی بے حد محبت کرنے والی شخصیت کا نام ہے...... انہوں نے ڈنر پرائیویٹ کرتے ہوئے یہاں تک کہا...... انجم میں پرہیزی کھانے بنوالوں گی ہم دونوں وہ کھائیں گے اور اپنی ایوارڈ کی تقریب کی دعوت بھی دی۔ بشریٰ جی...... آئندہ جب بھی آؤں گی تب ضرور آپ کے پاس آؤں گی اور ہم ایک ساتھ کھانا بھی کھائیں گے۔ (انشاء اللہ) میں پاکیزہ کی اور اپنی فین شہناز فاطمہ کا ذکر کرنا چاہوں گی یہ اسلام آباد میں رہتی ہیں نہ صرف یہ۔ بلکہ ان کی فیملی کا بڑا سرکل...... ان کی سمدھن سب پاکیزہ کی اور ہماری فین ہیں۔ وہ میرے پاس گھر بھی آنا چاہ رہی تھیں مگر ہم مری جا رہے تھے اور اس کے بعد آتے ہی مجھے کراچی جانا تھا...... زندگی رہی تو پھر ملیں گے شہناز اور آپ سے مل کر واقعی بڑا مزہ آیا تھا۔ پاکیزہ کی ایک اور قاری شاہدہ آصف میری کالج فیلو نکل آئیں جو مجھ سے سینئر تھیں میں اپنے کالج میں لکھنے کی وجہ سے مصروف تھی اور وہ ریڈیو پر انگریزی میں خبریں پڑھا کرتی تھیں اور اس زمانے میں میرے والد انصار حسین صدیقی ریڈیو کے نیوز ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے اور وہ اس حوالے سے بھی مجھے اور میرے والد کو جانتی تھیں۔ شاہدہ سے مل کر ایک انجانی سی خوشی ہوئی وہ بے حد خوب صورت اور خوب اچھی ہائیٹ کی ہیں اور ان کے شوہر بھی زبردست پرسنالٹی کے ساتھ خوب طویل قامت ہیں...... اس لیے سے کپل کو دیکھ کر چند لمحے کے لیے یہ خیال آیا...... شاید ان دونوں نے عالم چنا کورس کیا ہو گا...... مگر اپنے دل کی بات ان سے نہیں کہی مگر کالج کی یادیں تازہ ہو گئیں...... پروفیسر رضیہ سلطانہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں......؟ مسز شمس التہلہ کا کوئی اتا پتا ہے اور وہ پیاری سی مس فرحت جو ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں...... اب وہ کہاں ہوں گی اور نگہت آرا...... کتنی کیوٹ ہوا کرتی تھیں اور ہماری کالج فیلو ملدرم کتنا اچھا گاتی تھی، وغیرہ وغیرہ اے پیارے لوگو...... اگر پاکیزہ پڑھتے ہو تو مجھ سے فوراً رابطہ کرو کہ اتنا تو یقین ہے کہ اگر آپ نہیں تو آپ سے وابستہ کوئی نہ کوئی شخصیت یہ سطور پڑھ کر یاد دلوں کے یہ جگنو آپ تک ضرور پہنچا دے گی اور کوئی نہ کوئی مجھ سے رابطہ ضرور کرے گا۔ آپ بہنوں کو مجھ سے یہ شکوہ تھا کہ میں اپنی پرسنل باتیں آپ سے شیئر نہیں کرتی تو آج دیکھیں میں نے آپ سے اپنے دل کی ہر بات کر لی...... بلکہ اپنی یادوں کا البم تک آپ کے سامنے کھول دیا۔ اور اب آئیں اپنی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود ابراہیمؑ پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا اله الا انت سبحانك انی كنت من الظالمين

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے کہ جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ معروف شاعرہ فریدہ جاوید فری نے اسلام آباد میں اپنا چھٹا ایوارڈ بشریٰ مسرور کی تقریب میں جا کر حاصل کیا۔ (مبارک باد)

☆ معروف شاعرہ نسیم نیازی کے حوالے سے دو خبریں ہیں...... پہلی یہ کہ ان کے بھتیجے وقاص نیازی کی شادی لاہور میں نایاب

خان کے ساتھ ہوئی......اور دوسری یہ کہ ان دنوں وہ لاہور سے حیدرآباد آئی ہوئی ہیں اور ان کا کراچی آنے کا بھی پروگرام ہے۔(ماشاءاللہ)

☆ لاہور میں طوبیٰ نیازی کی منگنی طلحہ نیازی کے ساتھ خوب دھوم دھام سے ہوئی۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شائستہ اعجاز کی بھانجی ماریہ جاوید خان کی شادی سید منصور علی کے ساتھ گزشتہ دنوں ہوئی۔(مبارک باد)

☆ ہماری تبصرہ نگار ڈاکٹر ممتاز ضیا کی طبیعت اب قدرے بہتر ہے۔(الحمدللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا حمید فاروق، کراچی کی بیٹی سعدیہ حمید نے اپنا میڈیکل کا امتحان پاس کرلیا ہے اور ان دنوں وہ شکاگو گئی ہوئی ہیں۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی پیاری تبصرہ نگار بہن اور شاعرہ شگفتہ شفیق اپنی شاعری کے حوالے سے خوب معروف ہوگئی ہیں اور آئے دن کسی نہ کسی ٹی وی چینل پر اپنا انٹرویو دیتی نظر آرہی ہیں۔(ماشاءاللہ اور بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صبا نور، لیہ کی بہن رخسانہ کی شادی اسی ماہ ہو رہی ہے۔(مبارکاں)

☆ ہماری بے حد پیاری مصنفہ ساجدہ حبیب کے حوالے سے دو خوشی کی خبریں......ان کی لاڈلی بھتیجی زارا سعید ڈاکٹر بن گئی ہے۔گزشتہ دنوں اس کی منگنی کی تقریب میرپور میں ہوئی۔احسن سرفراز جو انجینئر ہیں ان سے زارا کی منگنی ہوئی ہے اور اس خوب صورت تقریب کا سارا انتظام آمنہ سعید نے کیا۔(بے حد مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار رابیل شاہ نے ملائشیا میں اپنی سالگرہ منائی۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی کے لیے دعائے خیر کریں۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ دلشاد نسیم کا نیا سیریل......ایک نجی ٹی وی چینل سے شروع ہو رہا ہے جسے سلیم شیخ نے بنایا ہے۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری......ستارہ کراچی کی طبیعت اب قدرے بہتر ہے۔(الحمدللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر، فیصل آباد ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار فیروزہ بیگم کے فرسٹ کزن آصف علی ریٹائرڈ ڈی ایس ریلوے......انتقال کرگئے۔

☆ اس ماہ ہماری رقیہ بجیا کی برسی ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مصباح رضا سعید، فیصل آباد کے والد وفات پاگئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

✍ رفعت سراج، کراچی سے۔"اس خط کے لکھنے کا محرک دو باتیں ہیں۔نمبر ایک اقبال بانو کا انٹرویو، نمبر دو نزہت اصغر کا خط یا تبصرہ......پہلے محرک سے بات کا آغاز کرتی ہوں۔اقبال بانو سے 80ء کی دہائی میں ایک یا دو بار ملاقاتیں ہوئیں پھر خط کتابت بھی رہی۔اُن دنوں اقبال بانو بہت خوب صورت کاغذ پر خط لکھتی تھیں۔دائیں جانب بڑا سا اقبال بانو بھی لکھا ہوتا تھا۔اقبال بانو سے ملاقات کا خوب صورت تاثر آج بھی تازہ ہے۔سادہ لوح، بے ساختہ، ہر طرح کے کامپلیکسز سے پاک، بے حد محبت کرنے والی نہایت پُراعتماد و ذہین۔مجھے اقبال بانو کے خطوط بہت اچھے لگتے تھے۔ان میں بڑی بے ساختگی اور خلوص نظر آتا محسوس ہوتا تھا۔میں نے آج تک اتنی سادہ لوح و معصوم لکھاری نہیں دیکھی۔ان کی خوشیوں بھری زندگی کے بارے میں پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔بیٹے کو دیکھ کر دل سے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔اللہ ان کی خوشیوں و بہار کو سلامت رکھے، آمین پھر ایسا ہوا کہ میری سماجی زندگی بالکل صفر ہوگئی۔میں صرف گھر کی چہار دیواری میں چکراتی پھری......نو سال وہ کچھ دیکھا جس کی پیشگی خبر سچے خوابوں نے دی تھی۔سب دوستانے چھوٹ گئے......میں کئی سال بعد 1996ء میں خاندان کی ایک شادی کی تقریب میں شریک ہوئی تو میری پھوپھو نے مجھے دور سے دیکھتے ہی کہا کہ مٹھائی بانٹو......آج تو رفعت بھی آئی ہے پھر اقبال بانو بھی کہیں مجھ سے گم ہوگئیں۔بہت سے دوستوں نے سمجھا ہوگا کہ شاید شہرت و کامیابی نے رفعت کا دماغ خراب کردیا ہے اور وہ ہواؤں میں اُڑ رہی ہے......مگر اس وقت تو مجھے اس لگنے پر سوچنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔بہرحال اقبال بانو کی مسکراہٹ کی چمک سے آج بھی میرے دل کا ایوان روشن ہے اور میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔اقبال بانو نے بہت پُرمغز اور متوازن جوابات دیے۔ٹیپو کے نوڈلز سے مجھے اپنی بیٹی فاطمہ کے نوڈلز یاد آگئے۔(ماشاءاللہ اب تو فاطمہ اپنے نوڈلز خود بنالیتی ہے ورنہ کچھ دن پہلے یہی سین میرے ساتھ بھی تھا) یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ ہم میں سے بہت سی رائٹرز کو بڑے، بڑے سسرال ملے ہیں......یہ بھی زندگی کا حُسن ہے کہ ہم رشتوں کو انجوائے کریں۔شہرت و کامیابی میری حقیقی ذات پر کبھی اثر انداز نہیں ہوئی۔میرے لیے تو یہ مخلص محبت حاصل کرنے کا پلیٹ فارم ہے۔قارئین ہم سے بے غرض محبت کرتے ہیں۔اقبال بانو سے زور دے کر لکھوایا کریں بڑی البڑ تحریریں ہوتی ہیں ان کی......مجھے یقین ہے کہ بڑے سے دوپٹے کے نیچے خوب صورت سا پراندہ بھی ہوگا۔اب آتے ہیں نزہت اصغر کے خط کی طرف۔نزہت کا تبصرہ اتنا متوازن ہے کہ میں داد دیے بنا نہ رہ سکی۔ایک، ایک لفظ جیسے ناپ تول کر استعمال کیا ہے۔قارئین ان کا خط بہت توجہ سے پڑھیں۔اس میں غور و خوض کرنے کے لیے بہت مواد ہے۔کمال یہ ہے کہ تبصرہ مختصر ہے۔تیسری اور آخری بات (اس خط کی) امانت قارئین کو میری سابقہ تحریروں سے مختلف محسوس ہو رہا ہے۔کیا میں اپنے ہی لکھے کو دُہراتی رہوں......؟ ان پچیس سالوں کی کمائی کہاں خرچ کروں......؟ ان پچیس سالوں نے جو کمایا......جن راہوں سے گزرا جن لوگوں سے ملا یا وہ بھی تو میرے ہی محسوسات کا اثاثہ ہے۔کچھ قارئین نے ڈاکٹر مہرجان......کے کردار کو غیر حقیقی قرار دیا ہے۔میں آپ کو بتاؤں اس کردار کے ساتھ میں نے مہینے نہیں کئی سال گزارے ہیں۔اس طرح کا ذہنی مرض کن لوگوں میں پیدا ہوتا ہے، کیوں ہوتا ہے، ان کی کیریکٹر پروفائل کیا ہوتی ہے کہ انجام کار ان کی ذہنی حالت اس طرح کی ہوجاتی ہے۔یہ دو بہنیں آج بھی حیدرآباد شہر میں بستی ہیں۔کہانی کو مگر زیبِ داستان کے لیے بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے، میں نے ان دونوں بہنوں سے base لی ہے اس دنیا میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو آپ کی نظر سے نہیں گزرتا......مگر کسی اور کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ہم لوگ اکثر لفظ چونکا دینے والا استعمال کرتے ہیں۔عام سی بات کہانی نہیں لکھواتی......کچھ خاص ہوتا ہے تو تحریک کا آغاز ہوتا ہے، شاہ عالم جیسے فرشتے بھی اسی دنیا میں بستے ہیں۔کچھ لوگ رات دو، تین بجے اپنی لگژری کار میں گرم کمبل رکھ کر باہر نکلتے ہیں اور فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے لوگوں پر ڈال کر چپ چاپ چلے جاتے ہیں نہ ان کی فوٹو بنتی ہے نہ خیرات کا چرچا ہوتا ہے۔ایک بندۂ خدا نے عبدالستار ایدھی کو دو عالیشان بنگلے ڈونیٹ کردیے جو ایسے پوش ایریا میں واقع ہیں جہاں لوگ رہائش کے خواب دیکھتے ہیں جو خیال میں آتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے میں نے اس ناول میں تیکنیک بھی تبدیل کی ہے۔جس کا اندازہ آپ کو آخری قسط پڑھنے کے بعد ہوگا۔ابھی نہیں......اور آخری قسط بھی دور نہیں۔کچھ باتیں تو ایسی ہوتی ہیں جو نہ ہم لکھ سکتے ہیں نہ اسکرین پر دکھا سکتے ہیں۔روح بھی کانپتی ہے اور قلم بھی۔" (پیاری رفعت تفصیلی خط لکھنے کا شکریہ)

✍ نگہت سیما، چکوال سے۔"انجم بہت دنوں بعد آپ سے بات کرنا بہت اچھا لگا۔پاکیزہ میں سب بہت اچھا لکھ رہے ہیں جو تحریریں بھی نظر سے گزرتی ہیں پسند آتی ہیں......عنیزہ سید کیا کمال کا لکھتی ہیں ہر جملہ، ہر لفظ جیسے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فِٹ ہوتا ہے۔رفعت سراج ہمیشہ سے میری فیورٹ رائٹر رہی ہیں۔ان کے ناول ہمیشہ ہی مجھے پسند رہے ہیں۔نئے لکھنے والے بھی خوب لکھ رہے ہیں، نایاب جیلانی امیزنگ، حیران کر رہی ہیں مجھے۔جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں قسط وار کہانی تو پڑھ لیتی ہوں جو پسند ہو باقی میگزین ترتیب سے نہیں پڑھتی تو آج میرے ہاتھ میں عطیہ عمر والا پرچہ آیا......عطیہ آپ ہماری کرائیں ہو تو کبھی آؤ نا ں مارے دیش......آپ کبھی آئیں تو ضرور ملیے گا......آپ نے لکھنا کم کیوں کردیا۔" (آپ کا پیغام عطیہ عمر تک پہنچایا جا رہا ہے اور اب وہ آپ کے پاس چکوال ضرور آئیں گی)

✍ اُم ثمامہ، جھڈو، سندھ سے۔"میرے پاکیزہ سے وابستہ ہونے کے پیچھے دو ہی اسباب تھے ایک آپ یعنی انجم انصار اور دوسرا پاکیزہ کا خوفِ خدا اور لوگوں کے ساتھ دل سے جڑنا۔پروفیشنلزم کے نام پر باقی اداروں میں جو بے حسی ہے وہ یہاں نظر نہیں آئی اور یہی باتیں پاکیزہ کو سب سے جدا بھی کرتی ہیں۔آپا میرے خیال میں آج کا قاری بہت عقلمند، باشعور اور اِک احساس دل رکھنے والا قاری ہے۔پلیز سچی کہانیاں آپ چھاپ دیا کریں پھر اگلے مہینے خطوط میں ان کے بارے میں رسپانس دیکھیں......پچھلے ماہ بڑی مشکل سے وقت نکال کر خط بھی لکھا تھا۔حالانکہ میں تبصرہ کسی بھی رسالے میں ارسال نہیں کرتی۔آپا ذکیہ بلگرامی جی کا ایڈریس یا نمبر مل سکتا ہے مجھے ان سے قرآن کی طباعت کے بارے میں کچھ معلومات لینی ہے۔سالگرہ نمبر اچھا تھا تفصیلی تبصرہ پھر کبھی کروں گی بہنوں کی محفل بہت زبردست تھی خاص لوگوں میں کہیں ایک لائن اگر ہمارے نام بھی ہوتی تو مان بڑھ جاتا۔" (گڑیا......ابھی تو آپ

آئی ہیں...... انشاء اللہ آپ کا نام بھی آئے گا)

✍ اُمِ طیفور، گوجرانوالہ سے۔ ”پچھلے ماہ مجھے دو خوشیاں اکٹھی نصیب ہوئیں۔ ایک بیٹی کی پیدائش اور دوسرے آپ کے شمارے میں اپنی تحریر کی نمائش...... ہی ہی ہی یقین کیجیے چھلانگ مار نہیں سکتی تھی ورنہ خوشی اس قدر تھی کہ کچھ مت پوچھیں آنٹی! میرا آپ سے بات کرنے کو بے حد دل چاہتا ہے مگر جب ارادہ کرتی ہوں ہمت ٹوٹ جاتی ہے، پزل سی ہو جاتی ہوں لیکن جلد ہی میں آپ سے فون پر ضرور بات کروں گی۔ (ارے میں ایسی خوفناک تو نہیں ہوں جو تم مجھ سے اتنا ڈر رہی ہو) مجھے محض یہ پوچھنا ہے کہ اگر میں کچھ اور بھجوانا چاہوں تو کیا پہلے سابقہ تحریر کے چھپنے کا انتظار کروں؟ یا بھجوا دوں ضرور بتایئے گا اور آپ سے بات کرنے کے لیے کیا آفس کے نمبر پر ہی کال کی جائے؟“ (گڑیا آپ بوری میں بھر کر اپنی تحریریں مجھے ارسال کر سکتی ہیں، ہنسنا منع ہے بھی جلد شائع ہوگی...... مجھ سے بات کرنے کے لیے آپ کو اس نمبر پر فون کرنا ہوگا۔ 021-36981952)

✍ ماہ پارہ تسنیم، کراچی سے۔ ”سرائیکی بہن اقبال بانو کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ انہوں نے کھل کر جواب دیے ہیں اور ہمیں ایسا ہی اچھا لگتا ہے۔ کارنر پر گولارچی کی ایشل شادیان کا انٹرویو بھی بہت پسند آیا۔ سیمار ضا ردا، نایاب جیلانی، عنیزہ سید، رضوانہ پرنس اور رفعت سراج کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی تحریریں ہمیں اچھی نہ لگی ہوں وہ بھی سب انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھیں۔ بہنوں کی محفل اور جلترنگ اس دفعہ بھی اے ون رہے۔“ (شکریہ)

✍ منیزہ نعیم، راولپنڈی سے۔ ”بہت عرصے بعد اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ اقبال بانو کا انٹرویو بہت پسند آیا ہے، میں ان سے ان کی دوست شہناز کے ہاں مل بھی چکی ہوں ان کا بیٹا ٹیپو بھی بہت پیارا ہے، سالگرہ نمبر کے دونوں شمارے بہت شاندار رہے اور بہنوں کی محفل کا تو کہنا ہی کیا تھا۔“ (شکریہ، ہاں اقبال بانو شکریہ کہہ رہی ہیں)

✍ تبسم احفاظ الرحمن، بمبئی سے۔ ”میں انڈیا سے واحد تبصرہ نگار ہوں جو گاہے بہ گاہے اس محفل میں شریک رہتی ہوں۔ میں نے انجم باجی کو جب فون کر کے کہا اس دفعہ کے سالگرہ نمبر میں آپ مجھے بھول گئیں تو انہوں نے مجھے فون پر پاکیزہ کا صفحہ نمبر تک بتایا جہاں میرا نام تھا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میرا بیٹا بیمار ہے، ذہنی طور پر اس کے لیے دعا کے لیے التماس ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ذہنی طاقت عطا فرمائے اور وہ بھی نارمل بچوں کی طرح ہو جائے۔ سالگرہ کے شمارے بہت زیادہ پسند آتے ہیں۔ اب ہم آپ کا اور عظمیٰ کا انٹرویو بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ اقبال بانو، اختر شجاعت، عطیہ عمر اور عذرا رسول کے انٹرویو ہمیں بہت پسند آئے تھے۔“ (پیاری تبسم اللہ آپ کے بیٹے کو جسمانی اور ذہنی صحت عطا فرمائے۔ ہماری بہنیں اس کے لیے ضرور دعا کریں گی، رہی بات ہمارے انٹرویو کی...... تو پہلے میری مصنفات اور شاعرات کی تو باری آ جائے، میرا کیا ہے بعد میں ہو جائے گا)

✍ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”مئی کا شمارہ مکمل پرچہ تھا...... اس دفعہ بھی افسانوں نے محفل لُوٹ لی۔ صائمہ اکرم کی بے چاری ایک ہلکی پھلکی تحریر مگر معنی کے لحاظ سے بھرپور تحریر تھی۔ کبھی کبھی ایک لفظ بھی دل آزاری کا سبب بن جاتا ہے۔ عقیلہ حق کی یہ تحریر بھی پسند آئی۔ رفاقت جاوید نے حق مہر اور تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور ایک بہت اچھے موضوع کو لے کر آئیں۔ ارجمند عقیل کا احتجاج پڑھ کر ہنسی آئی۔ شمیم ناز صدیقی کی ماں کی محبت میں گندمی کہانی پسند آئی، سیمار ضا کی تحریر بھی اچھی لگی۔ رضوانہ پرنس ایک نئے موڑ پر لے آئی ہیں اور زنیرہ کی طلاق کا پردہ اچھی طرح سے رکھا۔ امانت اچھا جا رہا ہے بلکہ اگلی قسط کا انتظار رہے گا...... شام شہر یاراں میں گزارش ہے کہ کہانی میں تیزی لے کر آئیں، سکینہ فرخ کا ناولٹ بھی پسند آیا۔ عائلہ کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ نایاب کی تحریر بھی تجسس لیے ہوئے ہے۔ بہنوں کی محفل اور جلترنگ دونوں ہی اچھے لگے۔ ایسے لوگوں کو میں بھی جانتی ہوں جو کروڑپتی ہونے کے باوجود سادگی کا شاہکار ہیں۔ روحانی مشورے میں ایک بار پھر تم لکھ دو جو ہمارے لیے زادِ راہ ہے۔ یہ بات میں اس وجہ سے کہہ رہی ہوں کہ میری ایک دوست نے مجھ سے کہا ہے کہ تم جو اتنا پڑھتی ہو اس لیے بیمار رہتی ہو“ (اپنی دوست سے آپ کہیے گا کہ اللہ تعالیٰ جن کو قرآن پاک اور تسبیحات پڑھنے کی توفیق دیتا ہے وہی پڑھا کرتے ہیں اور اس کے پڑھنے سے کوئی بیمار نہیں ہوا کرتا...... ویسے بھی یہ باتیں وہ لوگ ..... کرتے ہیں جو دین سے دور ہوا کرتے ہیں۔ ہاں تبصرے کا شکریہ)

✍ سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ”رضوانہ پرنس کا ناول بہت پسند آیا مگر آخری قسط پڑھ کر یوں لگا جیسے انہوں نے جلدی سے سمیٹ دیا۔ امانت بھی اچھا ہے۔ صائمہ اکرم نے غیر حقیقی موضوع پر قلم اٹھایا مگر پھر بھی اچھا تھا، رفاقت جاوید کی کہانی اچھی تھی مگر ان

کے ہاں مشکل نویسی نظر آتی ہے۔ رفاقت عام فہم اردو میں لکھا کریں۔ اقبال بانو کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ بہنوں کی محفل اچھی تھی۔ ہمیں مختصر افسانے پڑھنے اچھے لگتے ہیں۔ شاید مختصر افسانہ لکھنا مشکل ہوتا ہے مگر پلیز آپ مختصر افسانے ہر ماہ لگایا کریں۔“ (جی ضرور)

✉ مسز نسیم تاج، لاہور۔ اتنے برسوں کے بعد رابطہ کیا ہے، پہلے کی طرح آؤ، تبصرے کے ساتھ اس محفل میں آکر یقیناً تمہیں اچھا لگے گا کہ یہاں سب کے دکھ سکھ سانجھے ہیں۔ ماشاء اللہ۔

✍ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”سرورق والے کیک کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ پچھلی سالگرہ پر تو آپ نے مجھ ناچیز کو شہزادی بھی بنایا تھا اور ناچیز کی شخصیت پر چند لائنیں بھی کہی تھیں مگر اس سالگرہ پر آپ نے ناچیز کو بااثر شخصیت بناتے ہوئے چند لائنیں بھی نہیں لکھیں اور اپنی رعایا میں رکھا جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ چلیں جی آپ ملکہ عالیہ ہیں ہم رعایا کے ساتھ کچھ بھی کریں ہم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ شاید آئندہ شمارے میں سالگرہ نمبر دو میں ہمیں بھی آپ بااثر شخصیت کی حیثیت دے دیں۔ ناولٹ اور افسانوں میں جنہیں جرمِ عشق پر ناز تھا، اک نئے موڑ پر، آدھا چہرہ، کہانیوں جیسی محبت، ترکِ وفا بہت بہت پسند آئے۔ شائستہ زریں کا سروے بھی دلچسپ تھا۔“ (آپ کی شکایت جائز ہے، زندگی رہی تو آئندہ سال ازالہ کرنے کی کوشش کروں گی)

✍ ناہید فاطمہ حسنین، کراچی سے۔ ”آنٹی آپ نے سالگرہ نمبر میں جس محبت سے میرا اور تمام لکھاری و تبصرہ نگار خواتین کا تذکرہ کیا اس نے کم از کم مجھے تو آبدیدہ کر دیا واقعی مجھے اپنی کسی خوبی کا علم نہیں تھا اس لیے کہ مجھ میں کوئی خوبی ہے ہی نہیں یہ سب آپ کی محبت ہے جو اس نظر سے دیکھتی ہیں۔ آپ کے کہنے کے بعد بہت خوش ہو کر خود میں خوبی تلاش کی، بخدا صرف ایک بات کے سوا کوئی خوبی نظر نہیں آئی وہ بات بھی کیا؟ اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ میرے دل کو آئینہ کر دے کسی کے لیے، کبھی بغض نہیں آئے بس وہ دعا قبول ہوئی اور میرے دل میں آج تک کسی کے لیے بغض و عناد آیا ہی نہیں...... اگر یہ خوبی ہے تو شاید یہی ہے بس اس کے سوا کچھ نہیں آپ نے جو کچھ لکھا اس نے شرم سے مجھے سر نہ اٹھانے دیا کہ اتنی محبت کرنے والی ہستی کا شکریے کا حق تو بنتا ہے سو خط کے ذریعے حاضر ہوں۔ نزہت اصغر کی محبت کا قرض جو بہت دھیمے سے ہر فون کال پر بات کے اختتام پر کہتی ہے ناہید ڈائجسٹ پر تبصرہ اور واقعی میں شرمندہ ہو جاتی ہوں کہ آج کل ایک لمحے کی فرصت میسر نہیں۔ میری گندی لکھائی اس کا بین ثبوت ہے۔ ایک تیسرا قرض بہت پیاری ہستی عذرا رسول کا جو بہت محبتوں سے ہر ہائی ٹی پر بلاتی ہیں...... ابتدا بہت محبت سے اس جملے سے کرتی ہیں۔ ”ناہید میں ہائی ٹی رکھ رہی ہوں۔“ لمحے بھر میں لہجہ غصے میں بدل جاتا ہے۔ ”دیکھو آنا ضرور ہے۔“ جب میں ہنستی ہوں تو خود بھی چھوٹا سا قہقہہ لگا دیتی ہیں۔ تو اتنے محبت کرنے والوں کا قرض تو شانے، آنکھیں، سر اور دل جھکا ہی دیتا ہے ناں اچھا جی جلدی سے تبصرہ کر دوں۔ آنٹی آپ نے جو اداریہ لکھا وہ واقعتاً کسی ادبی جریدے کے مماثل تھا۔ جہاں ادب اور زندگی کو لازم و ملزوم جانا جاتا ہے۔ اداریے میں بھی آپ نے کبھی کریڈٹ خود نہیں لیا یہاں بھی ہم لکھاریوں کو تمغہ یوں عطا کر دیا جیسے اس میں آپ کا کوئی حصہ ہی نہیں...... سدا خوش رہیں آنٹی آپ۔ امانت بہت اچھے موڑ لیتا آگے بڑھ رہا ہے۔ رفعت جی بہت مبارک...... شمشاد اختر کی کہانی نے اپنے حصار میں رکھا، بہت اچھی لائنز انہوں نے لکھیں اور بڑے اچھے برتاؤ سے کہانی آگے بڑھائی جو بات حیران کر گئی وہ یہ کہ آخر وہ لڑکی چاہتی کیا تھی؟ نہ اس نے عدیل کو قبول کیا نہ محسن کو...... گھر سے بھاگی لڑکیاں کب توقع کرتی ہیں کہ وہ حقیقت بتا دیں گی اور معاشرہ، ساس، سسر انہیں قبول بھی کر لیں۔ بس یہیں کہانی اور حقیقت الگ، الگ ہو گئے...... آگہی کا لمحہ ایسا متاثر کن نہ تھا...... کہانی کیا تھی؟ کہاں تھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا...... ایسی غلطیاں لوگوں سے ہوتی ہیں میں نہیں کہتی کہ صحیح ہوتی ہیں مگر میں یہ کہتی ہوں ایسی باتیں عام کہانی تو کہلائی جا سکتی ہیں متاثر کن ہرگز نہیں۔ روشانے پلیز دل خراب مت کرنا...... یہ میری رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ بہت آرزو تھی ایک اچھی کہانی نو عمر لڑکیاں کسی بھی لڑکے کو دیکھ کر خواب بُن لیتی ہیں۔ الفت کا خط صولت کی بیوی نے غائب کر دیا یہ بھی عین فطری تھا جو بالکل درست لگا۔ صولت کی ہمدردی وہ بھی سمجھ میں آئی اور اس کا کسی دوسری لڑکی سے شادی کرنا بھی کہانی میں حقیقی رنگ بھر گیا۔ کہانیوں جیسی محبت کہیں، کہیں عمیرہ احمد کے افسانے میری ذات ذرہ بے نشان کا عکس جھلکا...... لڑکی کا اتنا قانع ہونا، وہاں مجھے عمیرہ سے بھی اختلاف تھا ہر ظلم سہہ کر معاف کر دینا کم از کم آج کے دور کی لڑکی...... اتنا ممکن نہیں...... برہان کا اپنے بھائی کو کمرے میں لاک کرنا تا کہ منگیتر پر الزام آ جائے عمیرہ کے ڈرامے کی یاد دلا گیا...... اب بتائیں نوشین کون مرد اتنا بے غیرت ہوگا کہ ایک دن کا صبر نہیں ہے اور نا جائز راستے سے بیوی بنا رہا ہے ورنہ طلاق کی دھمکی اور نہ مدتوں ساتھ رہا تو ریپ کا خیال نہیں آیا۔ کہانی میں

کئی جگہ جھول تھے مجھے امید ہے نوشین ڈیئر آپ برا نہیں مانو گی تحمل سے اپنے لکھے کو دوبارہ پڑھو گی پھر حقائق تلاشو گی۔ رضوانہ پرنس ایک منجھی ہوئی رائٹر ہیں جو قلم کی حرمت کو نبھانا خوب جانتی ہیں۔ شوبز کے حوالے سے لکھی ان کی بہترین تحریر ہے۔ سکینہ فرخ کی تحریر اے ون شاندار رہی...... سکینہ بھی ایک منجھی ہوئی لکھاری ہیں جنہوں نے دو دن یا دو مہینے میں یہ مقام نہیں پایا بلکہ برسوں ریاضت کی ہے ان کے قلم نے تب یہ نکھار آیا ہے۔ بہت عمدہ بلکہ بہت ہی عمدہ ناول ہمیں ان سے ایسے ہی ناول کی امید تھی۔ شائستہ زریں کے سروے ہمیشہ با مقصد ہوتے ہیں، وہ بھی خانہ پُری نہیں کرتیں بلکہ مجھے ہمیشہ ان کے سروے میں ایک میسج نظر آتا ہے...... اگر عظمیٰ کا تذکرہ نہ کیا جائے تب مجھے لگتا ہے بات مکمل نہیں ہوئی خط ادھورا ہے ابھی...... عظمیٰ بہت محنت سے پاکیزہ ڈائری سجاتی ہیں، جس میں حمد و نعت سے لے کر دنیا بھر کی تمام معلومات دعائیں چٹکلے، غزلیں، نظمیں سما جاتے ہیں...... ڈائجسٹ کی جان جلترنگ میں معمولی بات نے ہنسا کر دُہرا کر دیا...... میں اکثر گنگناتی ہوں اس سلسلے کو میں کبھی مِس نہیں کرتی...... اس میں تمام اشعار باوزن اور معیاری ہوتے ہیں۔" (پیاری ناہید، محبت بھرے انداز میں خط لکھنے اور بھرپور تبصرہ کرنے کا شکریہ)

✍ **امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔** "سب سے پہلے مسز ناز فرقان، ثنا خان، پروین افضل شاہین کے والد محترم ارم کمال کی بھابی فوزیہ بشارت سینئر اناؤنسر عبیدہ انصاری، شمیم ناز صدیقی کے بہنوئی شیر افگن، مصباح رضا کے والد اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ جو بیمار ہیں اللہ تعالیٰ سب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ جن بہنوں کو اللہ تعالیٰ نے خوشیوں سے نوازا ہے سب کو دلی مبارک باد۔ باجی ڈاکٹر ممتاز ضیا بیمار ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ امانت ناول اچھا جا رہا ہے، مصنفہ نے پردہ اٹھا دیا، رابی، روما، اصیل خان کی بیٹیاں ہیں کچھ کچھ ناول پڑھ کر اندازہ ہو رہا تھا۔ جابر علی اپنے نام کا بھی جابر اور کام بھی جابر۔ ایمان دار ہونا اچھی بات ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے ہر شخص ایماندار اور نیک سیرت ہو، پہلے شبینہ کی بات وارث علی سے طے کی پھر ستارہ کی...... ستارہ کا احتجاج، دھمکیاں بھی کچھ کام نہیں آیا، خاموشی سے وارث علی کی دلہن بن کر رخصت ہوگئی۔ جابر علی نے اپنے ناروا سلوک سے پورے گھر کو آگ لگا دی۔ بیٹے کو گھر سے نکلنے پر مجبور کیا...... در بدر ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ستارہ بے چاری کا کیا قصور تھا اسے بے گناہ قتل کر دیا...... میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ باقی پاکیزہ کے تمام مستقل سلسلے بہت اچھے رہے...... جلترنگ، بڑے لوگ پڑھا۔ آپ نے جو بھی لکھا سچ لکھا...... ہمارے معاشرے میں کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات کیوں ہے کہ بڑے افر فیشن ایبل رہے ہوں گے؟ ثنا بہت سادہ روپ میں اچھی لگی۔ مجھے اکثر یہ سننے کو ملتا ہے۔ بڑے لوگوں سے ہم دور ہی بھلے۔ میں نہ جانے کتنی انہیں مثالیں دیتی ہوں ان کے ذہن سے یہ بات نہیں نکلتی۔ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بہنوں نے آپ کا مان تو نہیں رکھا بہت دل دُکھا آپ نے سالگرہ نمبر میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی بہت سے نام رہ گئے ہیں، جب کوئی اعتراف ہی کر رہا ہے آپ سے پیشگی معافی بھی مانگ رہے ہیں پھر بھی یہ گلے شکوے...... یہ اعتراف کرتی ہوں، گلے شکوے اپنوں سے کیے جاتے ہیں۔ باجی انجم انصار نے سالگرہ نمبر ان حالات میں سجایا جب بہت بیمار تھیں۔ لیٹ کر لکھا کبھی ہمیں معاف بھی کر دینا چاہیے...... کتنی محنت کی ہر سال نئے انداز میں سب کو وِش کرتی ہیں۔" (کوئی بات نہیں، اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں)

✍ **فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔** "بے حد محبتوں کے ساتھ آپ سے مخاطب ہوں کہ ہمیں آپ نے اِن رکھا۔ کرکٹ والوں کی طرح آؤٹ نہیں کر دیا عزت افزائی اور خلوص کا بے حد شکریہ سالگرہ نمبر شاندار ہے اور لکھاریوں سے لے کر ترتیب دینے والوں نے اپنا، اپنا حصہ ڈالنے میں خوبؔ خوب انصاف کیا، اللہ تعالیٰ ان کاوشوں کو سدا بہار رکھے اور پاکیزہ اسی طرح آنگن، آنگن، قریہ، قریہ، شہر، شہر اپنی پاکیزہ خوشبوئیں پھیلاتا رہے، آمین۔ آپ نے ہمیں اس قابل جانا بھئی ہم تو خیر معتبر ٹھہرے کہ ہماری ناچیز نگارشات اس اعلیٰ درجے کے میگزین کے صفحات میں اپنی جگہ پاتی ہیں۔ بے حد شکریہ۔ کیسے تعریف کروں کہ کس قدر حوصلہ افزائی محبت، خلوص سے آپ نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ شمیم فضل خالق، عطیہ ہدایت اللہ دو روز قبل پشاور لیڈیز کلب کی خواتین کے ہمراہ غریب خانے آئیں...... سیر و تفریح، پیار کے موسم کے مزے لیتی یہ زندہ دلانِ پشاور درجن بھر (ماشاء اللہ) کو سٹر بھر کر سیر و تفریح کرتے ہوئے، میری دعوت پر شام کی چائے کے لیے آئیں۔ خوب ہلا گلا رونق میلا رچا میرے ہاں اور الحمدللہ اس سے پہلے بیس مارچ کو بھتیجے کی ڈھولک میرے گھر تھی۔ بارات لاہور سے پشاور کے لیے آئی تھی...... سو مُڈوے بریک میں مہندی ڈھولک، ولیمہ راول

پنڈی، اسلام آباد میں وقوع پزیر ہوا اور خوب خوش خوش انجام کو پہنچا۔ دولھا، دلہن ماشاء اللہ خوش ہیں اور لاہور میں گھوم پھر رہے ہیں۔ پروردگار سب کو خوشیاں دیکھنی نصیب کرے، آمین۔" (آپ بھی ماشاء اللہ تقریبات میں مصروف ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے)

✍ **فائزہ فاوق سحر، لاہور سے۔** "سرورق بہت خوب گیا...... کیک کھانے کو بہت دل کیا اور پھر بھی بھاگے بھاگے جا کر لے بھی آئے۔ کیک کھاتے ہوئے چائے کے ساتھ رم جھم میں پاکیزہ پڑھنے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ محبت کے بدلتے رنگ مجھے بہت اچھے لگے کہ میں نے محبت کے بدلتے رنگ ان پینتیس سالوں میں بہت دیکھے۔ شادی کی سالگرہ میں ڈاکٹر اقبال نے سچ بول کر اقبال کے نام کی لاج رکھی۔ تلافی کی کوشش ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ بہنوں کی محفل میں اپنا نام شامل دیکھ کر دل گلاب کی طرح کھل گیا اور باغ باغ ہو گیا۔" (آپ کو خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہو رہی ہے)

✍ **صائمہ سید، کراچی سے۔** "نیلوفر آنٹی کے بارے میں آپ نے لکھا تھا کہ جنوری میں پاکستان آئیں گی تو وہ آئیں کیوں نہیں...... امینہ عندلیب کے لیے ڈھیروں دعائیں امینہ سے کہیے گا کہ 103 کی جگہ 104 بہنوں کے نام زبانی یاد کر لیں اور وہ ایک نام ہو میرا یعنی صائمہ سید کا، ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں رکھیے گا کہ مسئلے، مسائل تو ہر ایک کی زندگی میں ہوتے ہی ہیں۔ آنٹی آپ کا نمبر مجھ سے مِس ہو گیا ہے برائے مہربانی بہنوں کی محفل میں شائع کر دیں۔ آپ کے بیٹے اور بہو، بچوں کے ساتھ عمرہ کرنے جا رہے ہیں تو آپ اکیلی کیسے رہیں گی کیونکہ ہماری امی بھی گھر پر اکیلی نہیں رہ سکتیں، ایسا کریں عظمیٰ کو بلا کر پاس رکھ لیں دو سراہٹ رہے گی آنٹی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے ملنے کا بڑا شوق ہے۔" (نیلوفر عباسی پاکستان آ گئی ہیں۔ میرا نمبر پچھلے خط میں ہے جب بیٹا اور بہو سعودی عرب میں تھے تو میں اسلام آباد گھوم آئی، ذکیہ بلگرامی کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ ان سے ملنے کو ہر ایک کا دل چاہتا ہے)

✍ **شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری سے۔** "ایک ضروری بات بتانی ہے شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں ہی شبنم کنول حافظ آباد سے ہوں اور میں ہی شبنم کنول، پاپا نگری سے ہوں۔ آپی میں حافظ آباد کے چھوٹے سے گاؤں پاپا نگری میں رہتی ہوں۔ اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ نے میرے دو نام مختلف شبنم کنول، حافظ آباد اور شبنم کنول، پاپا نگری سے شائع کیے ہیں اوہ خدایا میں ایک ہی لڑکی ہوں۔ آپی آپ میری شاعری احتیاط سے ایک ہی نام سے شائع کیا کریں۔ شکریہ۔" (گڑیا...... تم اپنے خطوط میں ہر مرتبہ جائے رہائش مختلف لکھو گی تو میں دو لڑکیاں ہی سمجھوں گی۔ یہ احتیاط مجھے نہیں تمہیں کرنی ہے)

✍ **کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔** "آپ کی ہمت کی داد دینا پڑے گی جس طرح کی دقیق خطوں کی محفل آپ سجاتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ آخری سانسوں تک باہمت رہیں اور ہم سب مل کر اپنے ملک کی بقا کے لیے کچھ کر سکیں...... مسز نگہت غفار آپ مایوس نہیں ہوں میں آپ کو دعا دوں گی، دعاؤں کے لیے میرا ذہن ہر وقت تیار رہتا ہے بدلے میں آپ میرے لیے عمل کی دعا کرنا، سالگرہ پاکیزہ پر لکھی سب کاوشیں دل میں اتر گئیں۔ خاص طور پر امینہ عندلیب کی۔ نایاب جیلانی کو پہلے پڑھا...... حرفؔ حرف کیا انداز ہے ایک ماحول بنا دیتی ہیں کہ جیسے بندہ خود وہاں موجود ہو۔ رضوانہ پرنس نے بھی اچھا لکھا...... نگہت سیما نے اصفیہ کی ٹریجڈی دکھائی، ہمارے دل کی دعا ہے کہ خدا نہ کرے کبھی کسی کے ساتھ ایسا حادثہ ہو۔ اس صدی کی محبت، بہت دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا۔ میرا خیال ہے کہانی یوں ہی ہونی چاہیے کہ جس میں ہمارے ملک کا احوال آئے۔ امانت اور شام شہر یاراں سے واقفیت حاصل نہیں کر سکے حالانکہ عنیزہ سید کے ہم مداح ہیں۔" (کوثر تبصرہ لکھتے وقت اہلِ محلہ کے واقعات نہ لکھا کریں ہاں تبصرہ بے شک طویل لکھیں)

✍ **سحر فیروز، سیالکوٹ سے۔** "اس ماہ کی خاص بات تو یہ تھی کہ اس میں نگہت سیما کی تحریر تھی، اس کی کیا تعریف کروں کہ ان کا اندازِ تحریر مجھے بہت پسند ہے اور ہر لفظ مجھے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چلیں جی اللہ، اللہ کر کے ستارہ کی تدفین ہو ہی گئی۔ رفعت سراج جی آپ سے گزارش ہے کہ اب گل جان، بی بی جان اور اصیل خان کی بلیاں تھیلے سے باہر نکال ہی دیں اب اور کتنی سنسنی پیدا کریں گی۔ نوشین ناز اختر کی کہانیوں جیسی محبت کہانیوں جیسی نہیں فلموں جیسی محبت تھی ویسے مزے کی تھی۔ تمام مستقل سلسلے بھی شاندار تھے۔ میرے نام کے بغیر بھی اچھے تھے۔" (اس ماہ زیادہ اچھے لگ رہے ہوں گے۔ بھئی جب تبصرہ بھیجو گی ہی نہیں تو وہ کیسے لگ سکتا ہے)

✍ **بشریٰ سہیل، یو اے ای سے۔** "اپریل کا شمارہ میرے لیے بے حساب خوشیاں لے کر آیا مجھ جیسی تبصرہ نگار کو آپ نے با اثر شخصیات میں نام دے کر جو عزت، مان اور خوشی عطا کی ہے وہ شاید آپ کو میں کبھی بتا نہیں سکوں ایسی عزت اور محبت کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا بے حد شکریہ۔ مجھے کچھ کہنا ہے اور دین کی باتیں حسبِ معمول شاندار تھیں پھر امانت حسبِ معمول تھا۔ رابی

اور روما، اصیل خان اور گل جان کی بیٹیاں ہیں یہ تو اندازہ ہو ہی رہا تھا مگر پلیز رفعت جی اب اس ناول کو سمیٹ دیں بہت ہی پریشانیوں بھرا ناول ہے بالکل بھی پڑھ کر مزہ نہیں آتا۔ نایاب جیلانی کا ترکِ وفا بہت اچھا جا رہا ہے۔ الفاظ اور کہانی پر ان کی گرفت مضبوط ہے جرمنی کا کلچر اور زبان بھی اچھی لگ رہی ہے مون یقیناً غیر معمولی صلاحیتیں رکھتی ہے تبھی وہ مالا کو بند کمرے میں بھی ہراساں کرنے میں کامیاب ہے۔ عنیزہ سید کے شام شہر یاراں کو کچھ کہنا تو سورج کو چراغ دکھانا ہے گو کہ کردار بہت ہیں مگر کہیں الجھاؤ اور جھول نہیں ہے، سیاست دانوں پر ان کا مشاہدہ زبردست ہے یا وہ بھی کسی سیاسی فیملی سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ اتنی باریکی سے ہر چیز بیان کرنا زبردست ہے...... رضوانہ پرنس کے ناول میں اب شہزادی کی ایک نئی کہانی شروع ہوگئی ہے یعنی مزید چار، پانچ اقساط ہوں گی۔ فی الحال تو اس میں زنیرا کے بجائے نوکس شہزادی ہوگئی ہے۔ نگہت سیما بہترین ناولٹ کے ساتھ شامل ہوئیں ان کے لیے تو یہی بہت ہے کہ نام ہی کافی ہے کہانی شاندار تھی۔ بہنوں سے ایک بات میں بہت متفق ہوں اپنے اردگرد کہ ڈپریشن ہو رہا ہے تو اگر صرف وہ یہی ایک کام کرلیں تو یقین کریں کہ وہ ڈپریشن کا نام بھی بھول جائیں گی کہ کتاب اللہ یعنی قرآن اور اچھی دینی کتب کا مطالعہ شروع کردیں تو انہیں انشاءاللہ کچھ اور سوچنے تک کا ٹائم نہیں ملے گا دل میں خود بخود ایک سکون اترتا چلا جائے گا۔ قرآن پاک کی تلاوت روز کا معمول بنالیں کہ جیسے کھانا ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے یہ تو ہماری قبر کا ساتھی ہے جہاں ہمارا کوئی بھی دنیاوی پیارا رشتہ ساتھ نہ ہوگا۔" (بے شک، اتنی پیاری بات بتانے کے لیے جزاک اللہ)

✍ **صائمہ یاسر شاہ، کراچی سے۔** "اپریل کا پاکیزہ ہمیشہ کی طرح اپنے خوب صورت سرورق اور دلکش تحریروں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں انجم آپا نے بہت دلگداز انداز میں ادب کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ بے شک پاکیزہ نے ڈائجسٹ کی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے اور معاشرے میں اصلاح کار کی حیثیت سے ابھرا ہے اور انجم آپا کا بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے تبصرہ نگار بہنوں کا بھی تذکرہ کرکے ہماری اہمیت کو دو چند کیا...... سالگرہ نمبر کی فہرست میں ہمارے من پسند نام جگمگا رہے تھے۔ امانت کی کہانی سست روی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شام شہر یاراں میں عنیزہ سید معاشرے میں موجود مکروہ چہروں سے خوب صورتی سے پردہ چاک کر رہی ہیں۔ جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا میں اصفیہ کی ماں بہت سنگدل واقع ہوئی ہیں۔ اک نئے موڑ پر کے آخری موڑ کا انتظار ہے۔ پل صراط پڑھ کر نوے کی دہائی کا خوب صورت اینڈ یاد آ گیا۔ پاکیزہ نے اس زمانے میں بہت سے ٹیلنٹڈ لوگوں کو نام دیا، پہچان دی۔ جنہوں نے اپنی خوب صورت تحریروں سے اسے چار چاند لگائے...... اور اسی طرح موٹی ناک نے ستم گر معاشرے کے پوشیدہ بدصورت پہلو پر روشنی ڈالی۔ ناہید جی آسی چھا گئے اودھا کرکے۔ کہانیوں جیسی محبت باہمت لڑکی کی دلچسپ روداد تھی۔ خوش ذائقہ میں مونگرے کی ترکیب آزمائی بہت مزیدار بنے۔ پاکیزہ ڈائری کمال تھی۔ امینہ عندلیب، انیلا کرن، فریدہ افتخار پروین عذرا تشنہ اور صائمہ سجاد بخش کے مراسلات پسند آئے۔ جلترنگ کے بھی بھی میں خواتین کی اتور مقصود، انجم آپا مردوں کی سائڈ لیتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بہنوں کی محفل میں تمام رائٹرز کا تعارف آپا نے بہت خوب صورت انداز میں کرایا۔ یقیناً یہ سطور ان کے لیے متاعِ عزیز ہوں گی۔ باا ثر شخصیات میں مابدولت کا نام بھی شامل تھا۔ ہائے اللہ خوشی سے میرا دل خشک پتے کے مانند پھڑ پھڑانے لگا۔ سمجھ نہیں آ رہی اس رسالے کو کہاں سنبھال کر رکھوں......" (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ **بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان سے۔** "امانت میں جابر علی کی فیملی پر جو کچھ گزرا اسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ حد یہ کہ اب بھی اس انسان کو احساس نہیں کہ اس سے ایک ناقابلِ معافی جرم سرزد ہوا ہے...... بہ ہاں، صابرہ اور شبینہ کی اذیتوں کا سوچ کے دل کٹ جاتا ہے۔ خدا ایسا وقت کسی پر نہ لائے...... اک نئے موڑ پر رضوانہ پرنس نے جو قدم زنیرا سے اٹھوایا، میرے خیال میں یہ قدم زنیرا کی ازدواجی زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے...... اگلی قسط کا انتظار رہے گا...... نوشین ناز کے قلم نے دل کو چھولیا...... مزاح کا دلیرانہ اقدام اچھا لگا جو اس نے گناہ سے بچنے کے لیے اختیار کیا...... جزاک اللہ...... نئی مصنفات بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ نہ جانے ان مصنفات میں ہمارا نام کب شامل ہوگا......؟ تھک گئی ہیں آنکھیں خواب بنتے بنتے...... شہلا نواز بہت پیاری لڑکی ہیں...... ہمیں ایسے ہی لوگ پسند ہیں، زندہ دل اور نفس کھ...... نایاب جیلانی شاہکار الفاظ کی تخلیق کار ہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ **نگینہ ضیا بخش، کراچی سے۔** "بہبود ایجوکیشن کی میڈم شاہینہ اور میڈم تنویرا اور سب ٹیچرز نے پاکیزہ کی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اب کچھ تبصرہ مئی کے شمارے پر...... سالگرہ نمبر دو اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت دل کو بھایا۔ ٹائٹل زبردست رہا۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔

آپ کی سبق آموز باتوں کو ذہن نشین کیا۔ دین کی باتوں سے ایمان کو تازہ کیا۔ سبحان اللہ، محترمہ رفعت سراج کا ناول امانت، زبردست رہا۔ صائمہ اکرم کا بے چاری بھی لاجواب رہا۔ نایاب جیلانی کا چوتھا حصہ اچھا رہا۔ رشتہ بھروسے کا، رفاقت جاوید، منی ناول، رضوانہ پرنس کے ناول کا آخری حصہ، حجاب، عقیلہ حق، احتجاج، ارجمند عقیل، ستارہ ہو کہ دل، سیمار ضا ردا، شبنم ناز صدیقی، تہی دست مکمل ناول اس صدی کی محبت، سکینہ فرخ کا آخری حصہ بھی اچھا رہا۔ عنیزہ سید کا ناول، شام شہر یاراں کی کیا بات ہے، وہ آئے بزم میں موسٹ فیورٹ اقبال بانو کا انٹرویو بہت زیادہ پسند آیا۔ نزہت اصغر صاحبہ زورِ قلم اور زیادہ شائستہ زریں کی کوششیں بھی اچھی رہیں۔ بہنوں کی محفل کی کیا بات، ویری ویل ڈن انجم باجی محفل ہماری اور پاکیزہ کی جان ہے اللہ پاک پاکیزہ اور ان سے وابستہ تمام کے تمام افراد کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ڈھیر ساری خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین، باجی آخر میں ایک درخواست ہے بلکہ میری خواہش کہ میں پہلے کی طرح پاکیزہ کے ہر سلسلے میں شرکت کروں اور مجھے امید ہے کہ آپ میری خواہش ضرور پوری کریں گی۔" (جی ضرور)

✍ **نازیہ محمود، پنجاب سے۔** "بارہ سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ آج پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ پاکیزہ بہت اچھا ڈائجسٹ ہے اور میں اس سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کا سمجھانے کا طریقہ تمام خواتین کو آسانی سے شعور و آگہی دینا، نیکی کی طرف راغب کرنا اور بہت کچھ سیکھ کر خواتین کا اپنے اندر اتنا اعتماد، یقین، بھروسا کمایا ہے۔ آپ نے، آپ کی تمام رائٹرز کی بہترین سبق آموز کہانیوں سے تبدیلی آ رہی ہے۔ جیسے صبا نور نے آپ کی بات مان کر تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا مجھے بڑی خوشی ہوئی...... نایاب جیلانی...... جی ہاں ترکِ وفا مجھے بہت پسند آیا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اگلے ماہ ڈائجسٹ میں ترکِ وفا کی دو تین اقساط ایک ساتھ شائع ہوں۔ بہت انتظار رہتا ہے اس کہانی کا...... نایاب...... میرے پاس الفاظ ختم ہیں آپ کی تعریف کے لیے...... بہت شاندار لکھتی ہیں۔ آپ بہت جلد باجی نایاب کا انٹرویو لگائیں۔ باقی کہانیاں اچھی تھیں۔ ناہید فاطمہ حسنین، روشانے عبدالقیوم، شہناز وسیم، فرحت احمد، نگہت اعظمی نے بہت بہت اچھا لکھا۔ رضوانہ پرنس کا ناول بھی اچھا لگا۔ اور قسط وار سلسلے میں پڑھتی نہیں...... دو قسطیں پڑھنے کے بعد دلچسپی نہیں بنی میری معذرت کے ساتھ...... باقی بہنوں کو تو پسند آ رہے ہیں یہ سلسلے تو یقیناً اچھے ہوں گے اور ہاں یاد آیا نمرہ احمد کا پارس آؤٹ اسٹینڈنگ رہا تھا۔ ویل ڈن...... پچھلے ماہ کے پاکیزہ میں جرمِ عشق پہ ناز تھا۔ شروع میں اچھی تھی۔ اینڈ بالکل غلط تھا۔" (تبصرے کا شکریہ، آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ **مسز نگہت غفار، کراچی سے۔** "دین کی باتیں ہمیشہ کی طرح مفید اور معلوماتی تھیں۔ آگہی کا لمحہ کہانیوں جیسی محبت کہانیاں اچھی تھیں۔ سلسلے وار کہانیوں کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں حمدِ باری تعالیٰ، نعتِ رسول مقبول حسنِ سلوک ثواب وعذاب کی باتیں، سالگرہ مبارک، سنہرے حروف، اچھے لگے ادھوری شام سے پہلے۔ انیلا جی، میرے شوہر کے انتقال کو یہ تیسرا سال ہے۔ مجھے تو آپ کی اس نظم نے بہت دکھی کیا، میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ارشد محمود کی غزل بھی اچھی تھی۔ اس نفسا نفسی کے دور میں اس مہنگائی میں خاص کر کراچی کے ان حالات میں کسی پریشان حال اور دکھی دل کو تفریح مہیا کرنا اور ہنسانا بہت بڑی نیکی ہے اور یہ مبارک کام یہ نیکی ہماری (ملکہ مزاح) میں نے اس سے قبل بھی انجم جی کو یہ لقب دیا تھا۔ ہاں جی ملکۂ مزاح پیاری سی انجم باجی کرتی ہیں۔ یہ نیکی کرنا بھی بہت بڑا ثواب ہے اور انجم جی ہر ماہ رسالے کے توسط سے یہ نیکی ادا کرتی ہیں۔" (نگہت جی اتنا خوب صورت خطاب دینے کا شکریہ۔ ویسے آپس کی بات ہے آپ نے مزاح کا شہنشاہ کس کو بنایا ہے؟)

✍ **ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔** "اداریہ حسبِ حال ہے اور بہترین بھی۔ دین کی باتوں کے فوراً بعد بہنوں کی محفل میں پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ ارے واہ کیا خوب صورت اور منفرد اسٹائل ہے۔ مایہ ناز لوگوں سے ملوانے کا واقعی یہ سب بہنیں بااثر شخصیات ہیں۔ ویلڈن انجم باجی! ہم بھی اگر کچھ بااثر ہوتے تو آپ کے قلم کی نوک ہمارے نام کو ضرور چھو لیتی مگر بس دکھ ہوتا ہے کہ بیس سالہ پاکیزہ اور آپ سے وابستگی بھی آپ کے ذہن و دل میں جگہ نہ بنا پائی۔ آج آپ سے فون پر بھی بات ہوئی آپ کا یہ کہنا کہ آج کل تو میں فون بھی ڈرتے، ڈرتے ریسیو کر رہی ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ باجی کو یاد دلاؤں گی کہ عظمیٰ محبتوں کے پھول بہنوں میں تقسیم کریں یا آپ پاکیزہ محل کی شہزادیوں کا تذکرہ کریں یا پھر ہماری پیاری وہ بہنیں جو بااثر شخصیات ہیں۔ ان سے ملوالیں تو میں ان میں خود کو تلاش کرتی رہ جاتی ہوں مگر خیر کوئی بات نہیں اللہ آپ کو صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے آپ نے اپنی محبت کی ڈور سے جس طرح ہمیں باندھا ہوا ہے ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ پاکیزہ اور آپ سے ہمارا رشتہ ہمیشہ قائم رکھے۔

آمین۔ (گڑیا دلی معذرت...... واقعی اس بھول پر میں خود شرمندہ ہوں) سالگرہ نمبر کی خصوصی تحریر مجھے تو نگہت سیما کی ہی لگی۔ نگہت آپا میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ مجھے ان کی تحریر کا انتظار رہتا ہے مگر جرم عشق دکھی کر گیا، سب کرداروں کی ناکام محبتیں...... اور یہ اصفیہ کی زبان سے نکلی بات کیا قبولیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی۔ میں خودکشی نہیں کروں گی خود ہی میرا دل بند ہو جائے گیا۔ کیا عورت دوسری عورت کے لیے زندگی بھر اس قدر نفرت رکھتی ہے جو اصفیہ کی والدہ نے منی پھپھو کے لیے رکھی کہ اولاد کی خوشیاں اور ان کی زندگی کو بھی داؤ پر لگایا۔ نگہت آپا کے قلم کو رُلانے کا فن آتا ہے۔ باجی ان کا انٹرویو بھی لگائیں کبھی تحریر یہت تفصیلی گفتگو تاکہ تشنگی نہ رہے...... اور ہاں محترمہ ذکیہ آنٹی کا بھی بہترین انٹرویو کرنے پر نزہت اصغر کو مبارک۔ ذکیہ آنٹی کا اِک، اِک لفظ ہم نے توجہ سے پڑھا ہمارے دل میں ان کے لیے جس قدر محبت اور عقیدت ہے اس قلم کے ذریعے اس کا اظہار ممکن نہیں اللہ پاک ان کو سلامت رکھے۔ آمین۔ شمشاد اختر کا آدھا چہرہ مکالمہ نگاری بہت اچھی تھی مگر کہانی کچھ حقیقت سے دور......" (تبصرے کا شکریہ)

✍ شائلہ سہیل جاوید، کراچی سے۔ "آپ ان لوگوں میں شمار ہوتی ہیں جن کو لوگ واقعی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ آج ہم جس مقام پر ہیں یہاں تک پہنچانے کے لیے میں تاحیات شکرگزار رہوں گی آپ وہ قیمتی پتھر ہے جو جس کو چھو جائے وہ پارس بن جائے۔ اس ملک کو آپ جیسے لوگوں کی بے حد ضرورت ہے۔ آپ لوگ قابلِ فخر اور قابلِ تقلید لوگ ہیں۔ اللہ آپ کو دونوں جہان میں کامیابیاں عطا فرمائے۔ ماہنامہ روز بروز ترقی کی طرف گامزن رہے۔ تمام رائٹرز کو اللہ تعالیٰ زورِ قلم عطا فرمائے۔ شاعری میں بھی روز بروز جدت اور ترقی ہو رہی ہے۔ کچھ نظمیں اور غزلیں واقعی دل کو چھو جاتی ہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ...... آپ کی دعاؤں کے لیے واقعی احسان مند ہوں)

✍ مصباح رضا سعید، فیصل آباد سے۔ "ابو، امی نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو ابو جی روز بینک چلے جاتے اور پوچھتے کہ کب فارم فل کرنے ہیں۔ وہ کہتے جب کریں گے تو آپ کو کال کریں گے آپ روز نہ آیا کریں مگر ابو جی ہر دوسرے روز پاسپورٹ لے کر چلے جاتے۔ ہر بینک میں اپنا نام لکھوایا جس دن فارم فل کرنے تھے اس سے دو دن پہلے ابو جی کو کال آئی کہ آپ آ کر فارم فل کرلیں۔ لسٹ میں سب سے پہلا نام آپ کا ہوگا...... کیونکہ آپ روزانہ ہی فارم فل کرنے آتے ہیں۔ ابو جی نے فارم فل کیے اور اگلی صبح پیسے جمع کروانے چلے گئے۔ بینک والے کہنے لگے کہ سب لوگوں کے پیسے 21 اپریل کو جمع کرنے ہیں اور ابو جی کہتے مجھ سے ابھی لے لو وہ کہتے رسید ہم 21 کو ہی دیں گے اور ابو جی پیسے جمع کروا کے گھر آ گئے۔ بھائی کہتے ابو جی آپ کو 21 کو ہی جمع کروانے چاہیے تھے۔ ابو جی کہتے کوئی بات نہیں بس مجھے تسلی ہے کہ میں نے حج ادا کرنے کے سارے مراحل طے کر لیے پھر 21 کو رسید لے کے آئے تو گیٹ سے ہی الّلھمہ لبیک پڑھتے رہے۔ آپی جی رونا آئے جا رہا ہے۔ کتنا شوق تھا ابو جی کو حج پر جانے کا۔ 9 سال پہلے عمرہ کر کے آئے تھے۔ ابو، امی کو اسی وقت سے بہت شوق تھا کہ کب بلاوا آئے۔ میرے ابو، امی 3 بجے صبح اٹھتے تھے۔ تہجد کے لیے...... 21 کو سارے کام مکمل ہوئے 22 اپریل کو 3 بجے اٹھے۔ دونوں نے نوافل ادا کیے۔ عبادت کرتے رہے پھر ابو جی نماز ادا کرنے چلے گئے اور روز مسجد میں جا کے آہستہ آواز میں تلاوت کرتے۔ اس روز اونچی آواز میں تلاوت کی اور پھر گھر آئے۔ روٹین کے مطابق ابو جی اور امی واک کرنے چلے گئے۔ دونوں ابھی واک کر ہی رہے تھے کہ امی سے کہنے لگے آؤ واپس چلیں گھر...... فوراً تیز تیز چلنے لگے۔ روزانہ امی کو ساتھ لے کر جاتے تھے ایک قدم آگے پیچھے نہیں ہوتے تھے۔ اس روز تیز چلے گھر کی طرف امی پوچھتی رہ گئیں خیریت ہے؟ گھر میں خیریت ہے؟ پی ٹی سی ایل پہ کسی کی کال آئی ہے؟ کچھ نہ بتایا بس چلتے گئے۔ امی پریشان کہ الٰہی خیریت ہو گھر میں...... امی نے راستے میں ہی نوافل مان لیے کہ گھر میں خیریت ہو...... جب گھر آئے تو سب طرف سکون تھا۔ ابو جی جا کے بیڈ پر لیٹ گئے اور امی جی نفل پڑھنے لگ گئیں کہ گھر پر سب خیریت ہی ہے۔ میری امی جی کو یہ نہیں پتا کہ خیریت تو ہے ہی نہیں...... دو نفل پڑھ کر اور پڑھنے کی نیت کرنے لگیں تو ابو جی بولے سینے میں درد ہے۔ امی کہنے لگیں عمران، فرقان (بھائی) کو بلا لو۔ اسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹر بولے بہت شدید ہارٹ اٹیک تھا لیکن ابو جی نے اتنا کنٹرول کیا کہ محسوس بھی نہیں ہونے دیا کہ مجھے تکلیف کتنی ہے۔ ڈاکٹر بولے اب ٹھیک ہیں۔ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا...... فرقان کے ہاتھ میں میڈیسن اور عمران کے ہاتھ میں پانی کا گلاس ابو جی نے دو لمبی لمبی سانسیں لیں اور بس ڈ...ھیر...... ہو گئی۔" (اللہ تعالیٰ آپ کے ابو جی کو جنت الفردوس میں اونچا مقام عطا فرمائے)

✍ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ "تقریباً نئی رائٹرز کے افسانے تھے سالگرہ نمبر کے خصوصی موقع پر آپ نے ہم سب کو یاد

رکھا۔ کتنی خوشی ہوتی ہے جب آپ ایک، ایک کا نام لیتی ہیں آپ کا ہمارا بڑا مضبوط رشتہ ہے اس لیے کہ اس میں کوئی غرض نہیں ہے، بے لوث محبت اور دوستی کا۔ سکینہ فرخ کی اس صدی کی محبت ناول اچھا لگ رہا ہے، ویسے اس صدی کی محبت ہر ایک کو بڑی مہنگی پڑتی ہے کیونکہ اس صدی میں ٹینشن بڑی ہے۔ رضوانہ پرنس کا ایک نئے موڑ پر نیا موڑ لے رہا ہے۔ دلچسپی بڑھ رہی ہے کہ اب کیا ہوگا۔ زنیرا اور فاران کی زندگی میں؟ نگہت سیما نے بھی اچھا لکھا بس اصفیہ کے دل کے ساتھ ہمارا بھی دل بند کر دیا جگہ پر نہیں آیا۔ جلترنگ میں آپ نے خواتین کی نیچر کو بہت اچھا دھویا ہے۔ خصوصاً اس ایک جملے نے بڑا محظوظ کیا۔ آپ کا تو لیا کتنا لگی ہے جو چوبیس ہزار کی سائیکل پر پھیل کر سو کھتا ہے۔ فصیحہ آصف ملتان سے کی بات سے اتفاق کروں گی کہ ہمارے ٹی وی ڈراموں سے دوپٹا اور آستین غائب ہو گئے ہیں۔ آیا بات بھی ٹھیک ہے کہ اس میں رائٹرز کا کوئی قصور نہیں لیکن بات یہ ہے کہ پہلے یہ باتیں معیوب سمجھی جاتی تھیں لیکن اب دل میں بھی بری نہیں سمجھی جاتیں۔ یعنی غلط کو غلط کہنے والے بھی اب نہیں بچے کوئی اس بارے میں آواز بھی نہیں اٹھاتا کہ یہ غلط ہے۔" (آپ کی اس بات سے میں سو فی صد متفق ہوں کہ غلط کو غلط کہنا چاہیے ورنہ پھر بری باتیں بھی بری نہیں سمجھی جائیں گی۔ جزاک اللہ)

✍ مسز اقصیٰ، لاہور سے۔ "پاکیزہ کا سالگرہ نمبر پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح بہتر سے بہترین کی طرف رواں ہے۔ ٹائٹل اے ون اور کول تھا۔ اچھا لگا...... تمام سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح ٹھیک تھے۔ مجھے کچھ کہنا ہے، میں آپ نے صحیح کہا کہ کہانیاں ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں، دنیا میں بدترین حالات ہو چکے ہیں اور ہماری کہانیاں وہی سب کچھ پیش کرتی ہیں، بہت سی کہانیاں آج کل کی نسل کی اصلاح کرتی ہیں۔ اور بہت سی باتیں اور جملے دل میں اتر جاتے ہیں، یہی ایک رائٹر کی کامیابی ہوتی ہے۔ شائستہ زریں کا سروے کا ٹاپک دلچسپ تھا۔ شادی کے شروع اور کئی سال بعد سالگرہ منائیں یا نہ منائیں، رشتے میں احترام اور محبت ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔ مختلف لوگوں کے مختلف تجربات پڑھ کر مزہ آیا۔ پاکیزہ کی سالگرہ کی ڈھیروں مبارک بادیں اور آپ نے کہا تھا کہ اپنے انٹرویوز بھیجیں تو وہ کیسے بھیجنے ہیں۔ کن کن سوالات کے جوابات ہونے چاہئیں۔ بتایئے گا ضرور......" (جو آپ کا دل چاہے ایشل شادیان نے اپنا انٹرویو کتنا اچھا لکھ کر بھیجا ہے، آپ اس کو دوبارہ پڑھیں)

✍ رضیہ زبیر، کراچی سے۔ "آج بہت سالوں کے بعد اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ میں نے پاکیزہ میں پڑھا تھا پھوڑے، پھنسی کے علاج کے لیے اول آخر درود شریف کے ساتھ یا مالکُ، یا قدوسُ، یا سلامُ گیارہ مرتبہ پڑھنا ہے۔ میری ایک پرانی پھنسی، پھوڑے کی شکل میں باہر کو نکل آئی تھی اور میں نے جب اس کو پڑھنا شروع کیا تو اللہ کے کرم سے وہ پرانا پھوڑا بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس محفل کے طفیل میں یہ کہنا چاہوں گی کہ جس بہن کو اپنی کسی بیماری یا تکلیف کا علاج جس دعا سے ہوا ہو...... وہ اپنی بہنوں کو ضرور بتائے تاکہ دوسروں کا بھی فائدہ ہو۔" (جزاک اللہ آپ نے بہت پیاری بات کہی ہے اور اس محفل میں آپ کی دوبارہ شرکت غالباً دس یا بارہ سال بعد ہوئی ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین)

پیاری بہنو! پاکیزہ کے جولائی اور اگست کے شمارے رمضان اور عید کے حوالے سے ہوں گے...... آپ اپنے مراسلات جلدی اور اسی حوالے سے ہمیں ارسال کریں...... ہماری شاعرہ بہن ایشل شادیان کا انٹرویو ہمارے قارئین نے بے حد پسند کیا ہے اگر آپ اپنے انٹرویوز تصویر یا بغیر تصویر کے بھیجنا چاہتی ہیں تو ضرور بھیجیں...... ہمیں اسے شائع کر کے دلی خوشی ہوگی...... اور آئیں اب ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں پہلے درودِ ابراہیمی پڑھ لیں بلکہ ہمیشہ دعا مانگتے ہوئے اول آخر درود پاک ضرور پڑھا کریں۔

یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرمائے اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے...... یا رب العالمین تو مجھ سے، میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا...... ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے...... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ، یا مجیبُ، یا مجیبُ

دعا گو

آپ کی باجی انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمد باری تعالیٰ

اسے ڈھونڈو نہ زمین نہ آسمان میں
وہ تو ملتا ہے نماز میں، قرآن میں
دیکھنے والی نظر اب کوئی کہاں سے لائے
کہتے ہیں وہ بستا ہے ہر انسان میں
ہم گناہ گاروں سے بھی مولا کبھی کلام کر
اس جہاں میں نہ سہی اگلے جہان میں
یوں تو لکھ دی ہے تعریف تری اس عاجز نے
پر وہ تاثیر کہاں سے لاؤں اندازِ بیان میں

شاعر......آصف بشیر انجم
مرسلہ: بنین عباس، کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

نور کے ہالے میں آئے ہیں آج نبیؐ سرکارؐ
آج سجالو اے دل والو سب اپنا گھر بار
آج نچھاور کردو اپنی ساری وفائیں اور پڑھو
صلِ علیٰ پھر صلِ علیٰ ہاں صلِ علیٰ ہر بار
نور سے اپنے گھر کو سجایا نور کو اپنے دل میں بسایا
غم نہ رہا کوئی دکھ نہ رہا اور روح ہوئی سرشار
پھول کھلے ہیں رنگ برنگے آئی ہر سو بہار
آج چمن میں گونج اٹھی ہے چڑیوں کی چہکار
ان کی عظمت ان کی رحمت ان کی الفت ان کے گیت
آؤ فرشتو مل کر گائیں، تن من کردیں ان پر وار

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: مسز شمع حسین، ٹورنٹو

معراجِ مصطفیٰ

معراجِ مصطفیٰ کی یہ معراج دیکھیے
بُراق کا انوکھا شہسوار دیکھیے
کس شان سے چلے ہیں وہ عرش کی جانب
اللہ سے اپنے پیارے کا دیدار دیکھیے
بدلا شعارِ جاہلیت ان کے قدم سے
کیسے مٹا تکبرِ کفار دیکھیے
اللہ نے جن کا خود ہی رکھا نام محمد ﷺ
رب کے حبیبؐ کا ذرا دلار دیکھیے
اُمّی نے خلق کو دیا انسانیت کا درس
عالم کو بدلنے کا یہ شعار دیکھیے

شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

ریا شرک

شدّاد ابن اوسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی تو اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا تو اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کا صدقہ کیا تو اس نے شرک کیا۔

اس ارشاد کے ذریعہ حضور ﷺ یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ جو بھی نیکی کا کام کیا جائے صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے، نیت یہ ہو کہ یہ میرے مالک کا حکم ہے اور مجھے اسی کی خوشنودی کی فکر ہے۔ دوسروں کی نگاہ میں پارسا بننے اور دوسروں کو خوش کرنے کے لیے جو نیکی کا کام کیا جائے گا، اس کی کوئی قیمت نہیں، قیمت تو صرف اس نیکی کی ہے جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے کی گئی ہو۔

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

ادب کے قرینے

خلیفہ ہارون الرشید نے دیکھا کہ اس کا بیٹا اپنے استاد کو وضو کروا رہا ہے اور لوٹے سے اپنے استادِ محترم کے پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے۔ ہارون الرشید یہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور اپنے بیٹے کو خوب ڈانٹا۔ استاد نے کہا کہ نماز کا وقت جا رہا تھا اس لیے شہزادے کو میں نے زحمت دی۔

خلیفہ نے کہا میں ناراض اس لیے ہوا ہوں کہ شہزادے کا ایک ہاتھ خالی ہے اور وہ اس ہاتھ سے آپ کے پاؤں کیوں نہیں دھوتا۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

زندگی کے لیے بہترین سوچ

☆ ہر ایک کی سنو اور ہر ایک سے سیکھو کیونکہ ہر کوئی سب کچھ نہیں جانتا لیکن ہر ایک کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔

☆ شکر ادا کرتے رہا کرو اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ ضرور دیتا ہے۔

☆ جو تمہیں خوشی میں یاد آئے سمجھو تم اس سے محبت کرتے ہو اور جو تمہیں غم میں یاد آئے تو سمجھو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔

☆ اگر قسمت میں سب لکھ دیا جاتا تو میرا اللہ سے جو رشتہ دعا کا ہے وہ کون نبھاتا۔

از: اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

جنریشن گیپ

ماں کے بوڑھے ہاتھوں سے
چائے کی جو پیالی چھلکی
بیٹا، یک دم ماں سے بولا
اماں تھوڑا دھیان سے رکھنا
پچھلی بار بھی تم سے
ایک پیالی ٹوٹ گئی تھی
تمہیں پتا ہے؟
میں وہ ٹی سیٹ کوریا سے لایا تھا
ماں نے پیالی دھیرے سے میز پر رکھی
اور دُکھتے دل سے سوچا
اپنی نیند گنوا کر میں نے
تمہیں راتوں کو سلایا تھا
انہی کانپتے ہاتھوں نے
تم کو چلنا سکھایا تھا......

کاوش: ام ثمامہ، جھڈو سندھ

چاول کھانے کے فوائد اور علاج

حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے۔

☆ چاول کھانے سے پیٹ کا درد ختم ہو جاتا ہے۔

☆ اگر پیٹ میں درد ہو تو تھوڑے سے چاول لے کر دھو لو اور اسے سائے میں خشک کر لو پھر پیس لو اور ہر صبح ایک چمچ بھر کر کھالو۔ پیٹ کا درد ختم ہو جائے گا یا پھر چاول کے آٹے کی روٹی بنا کر کھاؤ اس سے زیادہ کوئی شے مفید نہیں۔

☆ حضرت امام جعفر صادقؓ کا فرمان ہے چاول اچھی غذا ہے یہ آنتوں کو کشادہ کرتا ہے اور بواسیر کو جڑ سے اکھاڑتا ہے۔

انجیر

حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے کہ انجیر چاہے تازہ ہو یا خشک اسے کھایا کرو یہ اعصاب کو مضبوط بناتی ہے۔ بواسیر کو جڑ سے ختم کرتی ہے۔ پاؤں اور اس کی انگلیوں کے شدید درد کو ختم کرتی ہے۔

از: جبیں ہاشمی، بھیرہ

تیرا

لمحوں کے کرب میں ہے عکسِ جمال تیرا
خود اپنے حال سے ہی ظاہر ہے حال تیرا
نظارے کا یقیں تو ہرگز نہیں ہے مجھ کو
آنکھوں کے سامنے ہے پر خدوخال تیرا

چہرے ستم گروں کے کب ہوں گے سب پہ ظاہر؟
دہلیزِ وقت پہ ہے ٹھہرا سوال تیرا
نامہرباں زمانہ، اپنوں کی بے وفائی
آئینہ کہہ رہا ہے، رُخِ پُر ملال تیرا
شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، سڈنی

شادی

خوشگوار شادی حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کی تھی۔ حضرت آدمؑ کو یہ نہیں سننا پڑتا تھا کہ کیسے کیسے بہتر مرد بی بی حوا سے شادی کرنے کے خواہاں تھے اور بی بی حوا کو یہ نہیں سننا پڑتا تھا کہ حضرت آدمؑ کی ماں کتنا عمدہ کھانا پکاتی تھیں۔

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

عشق

آنکھوں میں برسات عجب ہے
عشق کی ہر اک بات عجب ہے
ہر دن اس کا سب سے الگ ہے
اس کی ہر اک رات عجب ہے
جتنا درد بڑھے گا دل میں
اتنا عشق بڑھے گا ساتھی
آج کے دور میں کون چلے گا
سولی کون چڑھے گا ساتھی

از: سیدہ جیا عباس، مرالی تلہ گنگ

چھوٹا قد مگر دھمکی بڑی سی

برکت رنگت کے تو کالے تھے ہی مگر ان کا قد بھی بہت چھوٹا سا تھا ایک دن اپنی طویل القامت بیوی سے لڑ کر گھر سے باہر نکلے تو راستے میں ان کا سالا ملا...... اس نے مزاج پرسی کی تو برکت غصے میں چلّاتے ہوئے بولے۔ ''اپنی بہن کو اچھی طرح سے سمجھا دینا آئندہ اگر مجھ سے بدزبانی کی تو سیڑھی پر چڑھ کر اس قدر پٹائی کروں گا کہ دماغ درست ہو جائے گا۔''

مرسلہ: امینہ عندلیب...... سلانوالی

غزل

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی
سرگزشت اپنی کس اندوہ سے تب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی
درد مندی میں کٹی ساری جوانی اس کی
اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

شاعر: میر تقی میر
مرسلہ: یاسمین کنول، پسرور

پریشانی

ایک معروف اداکار نے فلمی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے دو شادیاں کیں لیکن دونوں ہی ناکام رہیں۔ پہلی بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی...... اور دوسری مجھے چھوڑتی ہی نہیں۔''

مرسلہ: صبا نور، لیہ

دل کا معاملہ

محبت کا چلا پھر سلسلہ ہے
کسی سے بعد مدت دل ملا ہے
اے دنیا بیچ میں نہ آ ہمارے
یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے
نہ کاٹو یہ شجر کہ اس شجر پر
پرندوں نے بنایا گھونسلا ہے
مری تقدیر میں تھی بے وفائی
بھلا اس شخص سے پھر کیا گلہ ہے
نظر کے سامنے رہتے ہیں لیکن

دانت

☆ ڈاکٹر صاحب نے مریض سے پوچھا۔ ''یہ تین دانت آپ کے کیسے ٹوٹے......؟''
مریض نے جواب دیا۔ ''میری بیگم نے کڑک روٹی پکائی تھی۔''
''ڈاکٹر نے کہا...... ''تو انکار کر دینا تھا۔''
''مریض...... ''جی وہی تو کیا تھا۔''

از: پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

مرد کی خوب صورتی

مرد کی خوب صورتی کیا ہوتی ہے بھلا......؟
☆ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کی بڑی سے بڑی خطا بھی معاف کر دیتا ہے۔
☆ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو روٹی، کپڑا اور پناہ دے کر احسان نہیں جتاتا بلکہ مشکور نظر آتا ہے۔
☆ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو وحشت کے گھوڑے پر سوار ہو کر عورت کی انا کی دھجیاں نہیں اڑاتا۔
☆ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو بن مانگے عورت کو محبت، عزت کے ساتھ دیتا ہے۔

فرضی کہانی

دس سالہ بچے نے اپنی ماں سے پوچھا۔ ''امی کیا ساری فرضی کہانیاں ایک دفعہ کا ذکر ہے سے شروع ہوتی ہیں۔''
ماں نے ایک نظر اخبار پڑھتے ہوئے شوہر کو دیکھا اور تمسخر بھرے لہجے میں بولیں۔
''نہیں بیٹا...... بہت سی کہانیاں اس طرح بھی شروع ہوتی ہیں۔''
''معاف کرنا بیگم...... آج دفتر میں کام بہت تھا، ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔''

مرسلہ: قیصر قدیر...... ٹورنٹو

☆☆☆

دلوں میں پھر بھی کتنا فاصلہ ہے
اسے تو جیتنے کا بس جنوں ہے
اور مجھ میں ہارنے کا حوصلہ ہے

شاعر: ریحان آفاق
مرسلہ: دل آویز خان، کراچی

سرکاری دفتر

ایک سرکاری دفتر کے برآمدے میں سائن بورڈ پر یہ تحریر لکھی تھی۔ ''شور نہ مچائیں۔'' کسی نے اس تحریر کے آگے ان الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ ''ورنہ ہم جاگ جائیں گے۔''

مرسلہ: نجمہ اصغر، کراچی

خواب

آپ آئے کہ خواب دیکھا
خط کا اچھا جواب دیکھا
تیرے پاس سکون پایا
تیرے پیچھے عذاب دیکھا
قسمت کا لکھا ہے یہ کوثر
عجب اپنا حساب دیکھا

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

احسان

مجھے اکثر رُلاتی ہیں
محبتیں، بارش، تیری یادیں
اِک ترکِ وفا پر اُسے کیسے بھلا دوں
مجھ پہ اس شخص کے احسان بہت ہیں

مرسلہ: شمسہ ارشاد ہمدانی، ہٹیاں بالا

یقین

☆ استاد نے رانا متین سے پوچھا۔ ''یقین اور وہم میں کیا فرق ہے؟''
رانا متین ''سر جی...... ! آپ پڑھا رہے ہیں اس بات کا آپ کو یقین ہے اور ہم پڑھ رہے ہیں یہ آپ کا وہم ہے۔''

جلترنگ

انجم انصار



مذاق

"یہ فرزانہ منزل ہے۔" سڑک کے کنارے بنی ہوئی یہ خوب صورت کوٹھی دور سے پہچانی جاتی ہے۔

اس میں رہنے والے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باعزت ہیں۔ فرزانہ منزل میں ساس، سسر کے ساتھ نھیا ساس (ساس کی ماں) اور ددھیا ساس (سسر کی ماں) بھی ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ اس گھر میں تین بھائی ساتھ رہتے ہیں، جن کا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا اور کاروبار بھی ایک ہے۔

تمام لوگوں میں اس خاندان کی بڑی اہمیت ہے کہ اس نفسانفسی کے دور میں نہ صرف ساتھ رہتے ہیں بلکہ سب کا باورچی خانہ بھی ایک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نہ صرف خاندان والوں بلکہ دوست احباب کی بھی یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس گھرانے کی خواتین کو کسی طرح آپس میں لڑا دیا جائے جس میں وہ اکثر کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تھوڑے دنوں میں ہی وہ یہ دیکھ کر اپنا دل مسوس کر رہ جاتے ہیں کہ تینوں بہویں...... اپنی ساسوں سے نہ صرف راضی خوشی ہیں بلکہ بے پناہ اپنائیت کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے کام بھی نمٹاتی ہیں ایک دوسرے کے کام بھی آتی ہیں...... مگر دل پشوری کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ بھی لیتی ہیں۔

یوں بھی لڑنا، چیخنا، چلّانا اچھی صحت کے لیے بہت ضروری ہے اس سے دماغ کی آلودگی...... زبان کے راستے رفع ہو جاتی ہے۔ گھریلو لڑائیوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں مگر اب بہ مقابل فوجوں کی طرح لڑائیاں خال، خال ہی ہوتی ہیں۔ زیادہ تر لڑائیاں جو اِن سمجھی جاتی ہیں...... وہ پیٹھ پیچھے کی لڑائیاں...... جو عام بھی ہیں اور خاصی دلچسپ بھی ہوتی ہیں۔

"بھابی جان آپ کو پتا ہے...... یہ آپ کی دیورانی آپ کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کیا کہہ رہی تھیں......؟"

"یہی کہ آپ اتنی قابل اور عالم نہیں جتنا کہ علامہ بننے کا شوق ہے آپ کو......"

"اے ہے میں کب بنی تھی علامہ......؟"

"جب بھائی جان نے آپ کو اپنی شاپنگ دکھائی تھی تو آپ نے اس کی آدھی سے کم قیمتیں بتائی تھیں۔"

"جو ریٹ چل رہا ہے...... وہی تو بتاتی...... اب ان کے لان کے سوٹ جو پانچ سو روپے والے تھے...... تو میں نے ان کی قیمت اتنی ہی تو بتائی تھی...... اب اگر وہ اسے ڈھائی ہزار کا ایک سوٹ کہہ رہی ہیں جو ایک دو دُھلائیوں میں پھٹکار مارے بھی ہو گئے ہیں تو آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہیں۔"

"ارے آپ نے بڑی نند کے بارے میں کہہ دیا کہ انہیں کھانا پکانا ہی نہیں آتا...... کچھ ہی پکا لیں ایک ہی مزہ ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے والوں کا بہت بڑا حوصلہ ہوتا ہے۔"

"میں نے تو ان کے ہاتھ کی ہانڈی کے بارے میں کم کہا ورنہ ایسی ہرا ندی ہنڈیا، جس میں سے بھبک بھی آتی ہے بلی کے آگے ڈال دو...... تو وہ سونگھ کر آگے بڑھ جائے۔"

"آپ نے دیورانی کی باجی کا مذاق اڑایا...... کہ وہ توتلی ہیں اور جب دیورانی کو کسی نے مطلع کیا...... تو انہوں نے کہا کہ فرانس کے لوگ انگریزی توتلے انداز

میں بولا کرتے ہیں...... ان کی باجی چونکہ اہلِ فرانس کو بہت پسند کرتی ہیں اس لیے وہ اردو بھی اہلِ فرانس کی طرح بولتی ہیں۔"

بھابی جان کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے اور چرب زبانی میں وہ اتنی ماہر ہیں کہ وہ ہر ایک کو یہ باور کرا دیتی ہیں کہ ان کی ہر بات سو فیصد درست ہوتی ہے۔

ایک شام جب انہیں پتا چلا کہ ساس، سسر اپنی شادی کی نہ صرف پچاس ویں سالگرہ منا رہے ہیں بلکہ قریبی عزیزوں کو بھی مدعو کیا جا رہا ہے تو انہیں ازحد غصہ آیا۔

"سالگرہیں تو جوان نسل کو منانی چاہئیں مگر ان کے پاس فرصت نہیں رہی۔ اب لوگوں کے چونچلے کس قدر بڑھ گئے ہیں کہ پچاس سال کی شادی ہونے کے بعد بھی ایسے اترا رہے ہیں جیسے ابھی شادی ہوئی ہے۔"

ساس بے چاری بیوٹی پارلر میں اپنے بال برابر کیا کروا آئیں تمام بہوؤں نے فون پر ایک دوسرے کو اطلاع دے دی کہ "ساس کی چوٹی کٹ گئی ہے...... خیر سے ناک بچی ہوئی ہے......"

ساس صاحبہ کو جب ان کی چہیتی بہو نے ساری رام کہانی خوب بڑھا چڑھا کر سنائی تو انہوں نے بھی بیان جاری کر دیا۔ تینوں بہویں بھی اس گھر میں ایسی آئی ہیں جن کی وجہ سے ان کی ناک ازخود کٹ گئی تھی...... ایسی بہوؤں کی موجودگی...... میں انہوں نے اپنے آپ کو باعزت تک سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ (کرلوگل)

ساس کا بیان سن کر نہ صرف سب کی عزت افزائی ہو گئی...... بلکہ سب کے دلوں میں دکھ کا ایک حصہ علیحدہ ہو گیا۔

صرف زبان کا مزہ لینے کے لیے اور ماحول کا ہلکا پن دور کرنے کے لیے ہفتے وار لڑائیاں اور پندرہ روزہ لڑائیاں تو فرزانہ منزل میں ہو ہی جاتی تھیں جب بے چاری نندیں اماں، ابا سے ملنے آتیں تو کسی نہ کسی بہانے یہ چھوٹی موٹی لڑائیاں ہو جاتی تھیں (بحالتِ مجبوری، محفل کو گرم رکھنے کے لیے......)

بڑے موضوعات پر نہ ہوتیں تو اسی بات پر ہو جاتیں کہ فلاں...... کپڑا اپنی کزن سے زیادہ برا لگ رہا تھا...... (کتنی معصوم لڑائیاں تھیں کہ اپنے آپ کو از خود برا کہا جاتا تھا)

مگر ایک لڑائی جو اکثر گھرانوں میں ناگہانی طور پر ہو جاتی ہے اور ایسے مناظر کسی بھی گھر میں دیکھے جا سکتے ہیں وہ فرزانہ منزل میں بھی گاہے بہ گاہے ہونے لگتے تھے۔

اور جب بھی لڑائی ہوتی گھر کے مکین بعد میں عرصے تک اس کا لطف اٹھاتے اور ایک، ایک ڈائیلاگ اس قدر ازبر کیا جاتا کہ بطور حوالے کے نشر ہوا کرتا۔

منجھلی بھابی...... بلا کی ڈرپوک تھیں...... چار بچوں کے ساتھ فرسٹ فلو پر رہتی تھیں مگر صرف انہیں روزانہ رات کو جن بھوت کے چلنے کی آوازیں آیا کرتیں۔

ان کے کچن میں اگر کوئی پلیٹ بھی گر جاتی تو وہ اس کے لیے جنوں کو الزام دے دیتیں۔ نیچے رہنے والے ان کی مزے دار کہانیاں ازخود چسکا لے کر سنا کرتے تھے اور اگر کبھی وہ یہ گیتوں بھری کہانیاں سنانا بھول جاتیں تو سسر خود پوچھ لیا کرتے۔

"سطوت، کیا تمہارے فلور کے جن بھوت کہیں دوسری جگہ شفٹ ہو گئے ہیں ان کی کوئی تازہ بات مارکیٹ میں نہیں آئی ہے۔"

پوچھنے کی دیر ہوتی...... وہ کئی کہانیاں لے کر شروع ہو جاتیں اور جسے سب اپنی ہنسی روک کر سنا کرتے۔

ایک شام کا ذکر ہے وہ پریشان سی نیچے آئیں اور اپنی تینوں ساسوں سے بولیں...... "اب میں اوپر کے

مالے پر نہیں رہ سکتی...... چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے...... پہلے تو جن بھوت ہی تنگ کیا کرتے تھے۔ اب چور بھی آنے لگے ہیں...... آج تو شاید کچھ نہ کچھ لے گئے ہیں اور میرا اُن سے سامنا بھی نہیں ہوا کل کو اگر ان کی مجھ سے... مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ مجھے مار بھی سکتے ہیں...... آپ یہ کریں کہ مجھے نیچے کی منزل کے چار کمرے دے دیں بڑی بھابی بہت بہادر ہیں انہیں اوپر کے مالے پر شفٹ کر دیں......"

"مگر ہوا کیا......؟"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ چور آیا ہے......" تینوں ساسوں نے بڑی رغبت سے پوچھا جیسے ٹی وی پر کوئی سی آئی ڈی ٹائپ پروگرام دیکھ رہی ہوں۔

"سلطان کے کمرے کی الماری جس میں وہ اپنا کیش رکھتے ہیں وہ آج نہ صرف کھلی ہوئی تھی بلکہ اس کی ایک، ایک چیز زمین پر گری ہوئی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی بزنس کی اہم فائلیں جنہیں وہ انتہائی حفاظت سے خود رکھا کرتے ہیں وہ تک زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔"

"تمہارے بچے خاصے شریر ہیں...... انہوں نے یہ حشر کیا ہوگا......" ننھیا ساس نے کہا۔

"میرے چاروں بچے سیکنڈ شفٹ میں اسکول جاتے ہیں سلطان خود بچوں کو چھوڑ کر تیار ہو کر اپنے آفس گئے اور جب شام کو بچوں کے اسکول سے آنے سے پہلے میں برابر کے کمرے میں گئی تو حیران رہ گئی...... کہ کون اوپر کے مالے میں آ کر یہ چوری کر کے گیا ہے۔"

"کیا اوپر کی کوئی کنڈی کھلی رہ گئی تھی؟"

"نہیں، دروازے تو سب لاکڈ تھے مگر ماسٹر کی کے ذریعے ہر دروازہ کھل جاتا ہے ناں...بس وہ چور اسی طرح آیا ہوگا۔"

"کھٹکے سے تمہاری آنکھ نہیں کھلی......؟" ساس نے جرح کی۔

"ہاں کھلی تو تھی...... سوتے میں نیند بھی خاصی بے چین سی ہی تھی...... مگر میں یہ سمجھی شاید نیچے والے بھاری کباب بنا رہے ہیں، بڑی بھابی گوشت پر لوہے کی موصل بھی خوب مارتی ہیں جب بھی وہ یہ ڈش بناتی ہیں میرے سر میں کم از کم تین دن تک درد رہتا ہے اور اگر سوئی ہوئی ہوں تو نیند میں بھی تکلیف کا احساس نمایاں رہتا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کیا کچھ چلا گیا تمہارا......؟" بڑی بھابی اطمینان سے پوچھ رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیا کچھ چلا گیا...... اب گھر میں ہر چیز کوئی رجسٹر پر درج تھوڑی ہوتی ہے۔"

"سلطان کو فون کر کے بتایا تم نے......؟" دیور مسکرا رہا تھا......

"ہاں، ہاں بتایا تھا........... اور وہ آئیں گے تو پتا چلے گا کہ کتنا نقصان ہوا ہے۔" اور پھر سلطان بھی آ گئے اور جب نیچے کی منزل والے انہیں اپنے ساتھ اوپر لے کر گئے تو وہ ہنس کر بولے۔

"یہ چیزیں تو میں نے خود الماری میں سے باہر پھینکی تھیں۔"

"ارے بھیا ایسا ظلم کیوں کیا......؟" ماں نے پوچھا۔

"وہ ذرا میری پتلون کی بیلٹ نہیں مل رہی تھی، میں وہی ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ بے پروائی سے بولے۔

"اس کا مطلب ہے تمہارے جنوں نے بھی تمہاری بیلٹ پہننی شروع کر دی ہے۔" بڑے بھیا ہنس کر کہہ رہے تھے۔

منجھلی بھابی کو غصہ آ رہا تھا...... بڑی بھابی اس کو مذاق کا رنگ دے کر باتیں بنا رہی تھیں اور منجھلی بھابی اس کو لڑائی سمجھ رہی تھیں۔

"مجھے کسی سے لڑنا نہیں آتا ورنہ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کوئی میرے منہ پر میرا مذاق اڑائے......" غصے میں کہا گیا، تب فرزانہ منزل کے اراکین ہنس کر بولے۔

"مذاق تو سب کا پیچھے ہی اُڑتا ہے کسی پتنگ کی طرح...... جو آسمان میں لہرائی سب کو ہی اچھی لگتی ہے۔"

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ رابیل شاہ...... ملائشیا

دلوں میں فرق پڑ جائے تو اتنا یاد رکھنا تم
دلیلیں، منتیں اور فلسفے بیکار جاتے ہیں

☆ زریں زبیر کوٹھاری...... کراچی

نہ جانے جوش ایسے عشق کا انجام کیا ہوگا
جو پہلے مرحلے میں اس قدر مشہور ہو جائے

☆ عرشیہ جنید...... کراچی

نئی رُتوں میں دکھوں کے بھی سلسلے ہیں نئے
وہ زخم تازہ ہوئے ہیں جو بھرنے والے تھے

☆ امبر صادق...... واہ کینٹ

آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا
یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

☆ ماہ نور قیصر...... راول پنڈی

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

☆ نکہت غفار...... کراچی

خوشبو کا اِک نگر آباد ہونا چاہیے
اس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہیے
ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

☆ ثنا اجالا...... پھلواں

اسی کوچے میں کئی اس کے شناسا بھی تو ہیں
وہ کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

☆ مسز تسنیم...... جہلم

اُف جوانی کے وہ آوارہ سے کچھ لمحے قتیلؔ
آپ بھی رسوا ہوئے ہم کو بھی رسوا کر گئے

☆ ممتاز خانم...... کراچی

خلوصِ دل سے کہو ہم کو بھولنے والو
کبھی تمہیں بھی ہمارا خیال آتا ہے

☆ ارم کمال...... فیصل آباد

وہی محفوظ رکھے گا زمانے کی بلاؤں سے
جو بارش میں شجر سے گھونسلا گرنے نہیں دیتا

☆ مہرین ضیا بخش...... کراچی

میرے ذہن کو جو نہیں قبول وہی لوگ ہیں میرے ہم سفر
مجھے ہر طرح سے جو راس تھا وہی شخص مجھ سے بچھڑ گیا

☆ مینا دلدار خان...... کوہاٹ

مانا کہ تجھ سے دوریاں تو کچھ بڑھ گئیں لیکن
تیرے حصے کا وقت آج بھی تنہا گزرتا ہے

☆ نگینہ ضیا بخش...... کراچی

یہ دل ہی تو جانتا ہے میری پاک محبت کا عالم دوست
کہ مجھے جینے کے لیے سانسوں کی نہیں تیری ضرورت ہے

☆ صبا سجاد...... دبئی

خوشبو سا بدن اس کا مری سانس میں اترے
وہ پھول مرے گھر میں بکھر جائے کسی روز
اس تاک میں بیٹھے ہیں تیرے رہبر و ناصر
تو راہ بھٹک جائے یا ڈر جائے کسی روز

☆ فاطمہ بلال...... کینیڈا

پھر مفلسوں نے رکھ دیے اُن کے سروں پر تاج
جن رہبروں کا ان سے کوئی واسطہ نہیں

شیشے میں دیکھ کر وہ ہوا مطمئن بہت
حسن اداکے ہاتھ میں جو آئینہ نہیں
☆جبیں نیاز......ملتان

اس نے مری وفا کا لیا امتحان یوں
پہلے جواب، سارے سوالات بعد میں
کتنا زمانہ ساز ہے وہ شخص آج بھی
جو ہار کر بھی دے گیا ہے مات بعد میں
☆غزالہ طارق......سرگودھا

جنھیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بجھا دیا
جو گراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر
☆ایقہ انا......چکوال

اڑا لی توتیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
☆نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

یہ بھی آرائشِ ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقۂ فکر سے میدانِ عمل میں آئے
اٹھ کے اک بار الٹ دوں غمِ دنیا کی بساط
اتنی طاقت تو مرے بازوئے شل میں آئے
☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

عجب سوزِ دروں ہے جو مجھے شب بھر جگاتا ہے
دلِ مضطر کو جا کے اب سُلا بھی دوں تو کیا ہوگا
☆سعیدہ بانو......لوئر مال، مری

جس کے آنے سے ملا تھا زندگی کو حوصلہ
اس کا جانا زندگی میں موت جیسا ہوگیا
☆نوخیز انجم......آزاد کشمیر

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
☆ام ثمامہ......جھڈو، سندھ

درد کا سلسلہ مسلسل ہے
ضبط کا حوصلہ مسلسل ہے
لوٹ آئے گا سرِ شام کبھی
دل کو اک آسرا مسلسل ہے

☆شمسہ ارشاد......بٹیاں بالا
جو کاری زخم ہے دل پر پہلے اس کی فکر کرو
یہ بات میں دیکھا جائے گا کہ کس کی کارگزاری ہے

☆امینہ عندلیب......سلانوالی
دیکھا مجھے تو آج وہ یوں مسکرا دیے
گویا صبا نے باغ میں پھر گل کھلا دیے

☆کائنات عبدالحلیم......میر پور خاص
یہی ہم اہلِ جنوں سے ہوئی خرد سازی
یقیں کو ڈھونڈ رہے تھے کسی گماں کے لیے

☆زہرہ جنید......واہ کینٹ
طوفان ان کی یاد کا دل میں نہ تھم سکا
اس سے اگرچہ ہم نے کنارا بہت کیا

☆صائمہ یاسر شاہ......کراچی
نوکِ شمشیر پہ ہم نے یوں گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

☆بختاور بلوچ .... لورہی بلوچستان
اتر گئے ہیں سناٹے رگ و پے میں
اِک مجبور چپ کی خاموش تصویر ہوں میں

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر
اس حسنِ دل نواز کو روکیں ذرا سی دیر
کچھ دیر کو تو دل مرا لہرانے دیجیے
انوار اس کے چہرے پر رنگِ بہار ہے
کچھ دیر کے لیے اسے گھبرانے دیجیے

☆مسز اقصیٰ عمران......لاہور
سارے وہم و گماں تیرے اپنے ہیں
ہم کہاں تجھے بھول سکتے ہیں

☆فصیحہ آصف خان...... ملتان
آس کے پنچھی اُڑ جاتے ہیں
پنجرے خالی رہ جاتے ہیں
رات کے پچھلے سناٹے میں
ہم ہجر کے نغمے گاتے ہیں

☆☆☆



بیف میکرونی ویجی ٹیبل مکس

اشیا: میکرونی 1/2 پیکٹ۔ گوشت، دو کپ۔ ابلا ہوا۔ (چوکور بوٹیاں کاٹ لیں) لہسن کے جوئے، چار عدد (کوٹ لیں) توری، دو عدد۔ (چار، چار ٹکڑے کر کے سلائس کاٹ لیں) فرنچ بینز (چوپ کرلیں) گاجر، (چوکور کاٹ لیں) دو عدد۔ سیلری، (باریک چوپ کرلیں) دو عدد۔ مٹر، (ابلے ہوئے) 1/2 کپ۔ سرخ لوبیا، 200 گرام۔ بند گوبھی، (چوکور کاٹ لیں) چوکور کٹے ٹماٹر، ایک کپ۔ پیاز، ایک عدد۔ (سلائس کاٹ لیں) تیز پات، دو عدد۔ نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: میکرونی کو نمک ملے ابلتے ہوئے پانی میں پانچ سے سات منٹ کے لیے ابال لیں۔ یہاں تک کہ ایک کنی رہ جائے اس کے بعد چھلنی میں ڈال کر ٹھنڈا پانی گزار دیں اس میں ایک کھانے کا چمچ تیل ملا کر میکرونی کو ایک پیالے میں نکال لیں۔ ایک بڑے سوس پین میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز اور لہسن ڈال کر پانچ منٹ تلنے کے بعد گوشت، توری، فرنچ بینز، گاجر اور سیلری ڈال کر مزید تین منٹ تک فرائی کریں...... اب اس میں دو کپ ٹھنڈا پانی اور تیز پات ڈال کر ڈھکن ڈھک کر سبزیاں اور گوشت دس منٹ پکائیں...... اس کے بعد میکرونی، مٹر اور سرخ لوبیا ڈال کر مزید دس منٹ پکائیں پھر بند گوبھی، ٹماٹر، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ اور پکائیں۔ مزیدار بیف میکرونی ویجی ٹیبل مکس تیار ہے۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر گرم، گرم سرو کریں۔ کیچپ کے ساتھ لطف دے گی۔

از: جبیں نیاز، ملتان

کرسپی اینڈ مزیدار کریمی چکن ونگز

اشیا: چکن ونگز، ایک کلو۔ بریڈ کرمز، دو کپ۔ میدہ، 1/2 کپ۔ انڈے، دو عدد۔ سویا سوس، چھ چائے کے چمچ۔ چلی ساس، چار چائے کے چمچ۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ کارن فلور، چار چائے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: چکن ونگز کو صرف دو ابال دیں۔ انڈے کی سفیدیاں الگ کر کے اس میں کارن فلور ڈال کر پھینٹ لیں۔ میدہ چھان کر رکھ لیں۔ چکن ونگز میں سویا سوس، چلی سوس، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ بریڈ کرمز اور میدے کو آپس میں مکس کرلیں۔ چکن کو پہلے میدہ، بریڈ کرمز لگا کر انڈے کی سفیدی میں ڈپ کریں اور ایک بار پھر میدہ اور بریڈ کرمز لگائیں۔ ایک سوس پین میں تیل گرم کریں اور تمام چکن ونگز کو اسی طرح انڈے، میدے اور بریڈ کرمز میں لپیٹ کر اب گرم تیل میں ڈال کر ڈیپ فرائی کریں...... کرنچی اور کرسپی ہونے پر نکال لیں۔ گرین چلی سوس اور کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

از: عنبرین ندیم، کراچی

لوکی اور ساگو دانے کی کھیر

اشیا: دودھ، ڈیڑھ کلو۔ ساگو دانا، پانچ کھانے

کے چچ۔چینی، ایک سے ڈیڑھ پاؤ۔ سبز رنگ، چند قطرے۔عرقِ گلاب، ایک کھانے کا چچ۔بادام، پستہ، (چھلکے اتار کر) آدھا کپ۔لوکی، ایک پاؤ۔

ترکیب: ساگودانے کو دس منٹ کے لیے بھگودیں...... دودھ اچھی طرح پکائیں اور اس میں ساگودانہ ڈال کر پکائیں۔جب ساگودانہ گل جائے تو لوکی کو پانچ منٹ پانی میں ڈال کر بوائل کریں اور پھر میش کرکے ساگودانے میں اسے ڈالیں۔دس منٹ بعد چینی ڈالیں اور گھوٹیں۔پانچ منٹ بعد عرقِ گلاب اور سبز رنگ ڈالیں۔پھر ڈش میں نکال لیں اور بادام پستہ ڈال کر سجادیں اور ٹھنڈی کر کے کھائیں۔

از: ممتاز خانم، کراچی

لاھوری سموسہ چاٹ

اشیا: آلو ابال کر میش کیے ہوئے...... دو عدد۔ میدہ، ایک پیالی۔سفید چنے، ایک پیالی۔نمک، حسبِ ذائقہ۔میٹھا سوڈا، ایک چٹکی۔سفید زیرہ، ایک چائے کا چچ۔کٹی ہوئی لال مرچ، ایک چائے کا چچ۔کالی مرچ پسی ہوئی۔ہرا دھنیا (باریک کٹا)، آدھی گٹھی۔ہری چٹنی، حسبِ ذائقہ۔املی کی چٹنی، دہی پھینٹی ہوئی، ایک پیالی۔تیل، تلنے کے لیے۔چاٹ مسالا، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: چنوں کو چار گھنٹے سوڈا ڈال کر بھگوئیں اور پھر ابال لیں۔سموسے بنانے کے لیے زیرہ، نمک اور گھی ڈال کر میدہ گوندھ لیں۔آلوؤں میں نمک، لال مرچ، کالی مرچ، ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔گندھے ہوئے میدے کے چھوٹے، چھوٹے پیڑے بنالیں۔پوریاں بیل کر درمیان میں سے کاٹ لیں...... ایک حصہ لے کر کون کی شکل میں بنالیں اور اس میں آلوؤں کا مکسچر بھر لیں...... کون کے کناروں کو ہلکا پانی لگا کر بند کردیں کڑاہی میں تیل گرم کر کے سموسوں کو گولڈن فرائی کرلیں۔سموسوں کو توڑ کر ڈش میں رکھیں کناروں پر ابلے چنے ڈالیں۔

از: سنبل ملک، شاہدرہ

سندیسے



کوئی تو یاد رکھے......کہ

☆ کل تک میں دنیا کو بدلنا چاہتا تھا اور میں بہت ناکام تھا...... آج میں خود کو بدل رہا ہوں اور میں بہت کامیاب ہوں۔

☆ تجھ جیسے ہزاروں کو دنیا نے موٹا تازہ کیا اور پھر نگل گئی۔

☆ خالی تمنا حماقت کا جنگل ہے، جس میں احمق ہی مارا، مارا پھرتا ہے۔

☆ محبت نہ تو سیکھی جاسکتی ہے نہ سکھائی جاسکتی ہے۔

☆ مذاق کی کثرت اکثر دشمنی کی وجہ بن جاتی ہے۔

از: اتیقہ انا، چکوال

بے چارے مرد

☆ آنسو ٹپک آئے بیروزگاری کے اس احساس پر کہ جب امی نے کہا۔''بیٹا! فارغ بیٹھا ہے تو مٹر ہی چھیل دے۔''

☆ بیوی! میں نے سنا ہے کہ جنت میں مردوں کو حوریں ملیں گی تو عورتوں کو کیا ملے گا؟

شوہر......! کچھ نہیں یہ پیکج صرف اور صرف مظلوم طبقے کے لیے ہے۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

وفادار

☆ دوست کو کبھی دولت کی نگاہ سے مت دیکھو
کیونکہ......وفادار دوست
اکثر غریب ہوتے ہیں

از: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ لاہور

گِلہ

کیسی آہٹ تھی
دبے پاؤں پکارا تھا کسی نے
اب تو عرصہ ہوا کوئی بلاتا ہی نہیں
کوئی آواز نہ روشنی
نہ ماضی کے جھروکے
تیرے آج یا تیرے کل میں
کہیں بھی نہیں ہوں میں

از......صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

دعا میری

سدا روشن رہے تیری قسمت کا ستارہ
میری سوچ سے بڑھ کر، تیری امید سے زیادہ

از: مسز اقصیٰ عمران......لاہور

جمھوریت

نہ تو موجودہ حالات سے اور نہ ہی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکثریت حکومت کرتی ہے یا اکثریت نے کبھی حکومت کی ہے۔

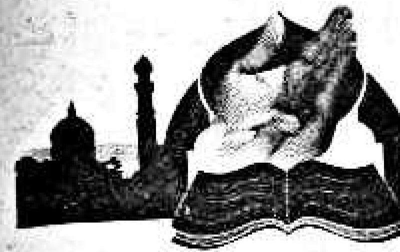
(جیفرسن ڈیوس)

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ



سیدُ الا ستغفار

حضرت شدّاد بن اوسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں استغفار کے سردار کے متعلق نہ بتاؤں...... وہ یہ دعا ہے۔ ترجمہ...... ''اے اللہ...... تو ہی میرا پروردگار ہے، تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا...... میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک میری استطاعت ہے تیرے عہدو پیمان پر قائم ہوں، تجھ سے اپنے کاموں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور اپنے اوپر تیرے احسانوں کا اقرار کرتا ہوں...... نیز اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتے ہوئے تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں کیونکہ تیرے علاوہ کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص شام کو یہ دعا پڑھے گا اور صبح ہونے سے پہلے مرجائے گا تو جنت اس کے لیے واجب ہوجائے گی اور اسی طرح صبح کے وقت پڑھنے والے کے لیے شام تک۔

(جامع ترمذی شریف)

بیماری کا علاج اور تقدیر

حضرت خزامہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ یہ رقیہ (وہ کلام جس سے دم کیا جائے) جس سے ہم دم وغیرہ کرتے ہیں اور یہ دوائیں جنہیں ہم بطور علاج استعمال کرتے ہیں اور یہ پرہیز وغیرہ کیا یہ تقدیر کو روک سکتی ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''یہ (چیزیں) خود اللہ کی تقدیر میں شامل ہیں۔'' (یعنی فلاں بیماری فلاں دوا سے اور فلاں دم سے دور ہوگی)

(جامع ترمذی شریف)

نمازِ توبہ اور اس کے فضائل

جس شخص سے کوئی گناہ صادر ہوجائے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ دو رکعت نماز پڑھ کر اپنے اس گناہ کے معاف کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔

(طحاوی)

حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان سے کوئی گناہ ہوجائے وہ اس کے بعد فوراً طہارت کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا پھر آپ نے بطور سند اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

ترجمہ: جب کوئی شخص گناہ میں مبتلا ہوجائے تو پھر اللہ کا ذکر کرے اور اپنے گناہ کی معافی چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے برے فعل پر اڑے نہیں رہتے باوجود علم کے۔

دعائے توبہ

اگر کسی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ ہوجائے اور وہ پھر یہ چاہے کہ توبہ کرے تو اس کو چاہیے اپنے دونوں ہاتھ اللہ عزوجل کی جناب میں اٹھائے اور یوں کہے یا اللہ میں تیرے سامنے اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں اور اب کبھی یہ گناہ نہیں کروں گا جو شخص یہ کلمات کہے گا اس کا یہ گناہ بخش دیا جائے گا...... جب تک وہ اس کو دوبارہ نہ کرے (اس کو حاکم نے روایت کیا

ہے) مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا کر درج ذیل کلمات پڑھے اور اس نیت سے یہ کلمات کہے کہ وہ اب آئندہ اس گناہ کو نہیں کرے گا۔ یہ کہنے سے اس کا وہ گناہ معاف ہوجائے گا ہاں اگر دوبارہ اس نے وہ کیا تو پھر وہ لکھ لیا جائے گا یعنی پہلا تو معاف ہو ہی چکا پھر کرے تو پھر لکھا جائے گا۔

اللّٰھم انی اتوب الیک منھا لا ارجع الیھا ابداً

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ہائے گناہ ہائے گناہ کرتا ہوا حاضر ہوا آپ ﷺ نے فرمایا تو یہ کلمات پڑھ۔ ''یا اللہ تیری بخشش میرے گناہ سے زیادہ وسیع ہے اور میں اپنے گناہ کے مقابلے میں تیری رحمت کا زیادہ امیدوار ہوں......'' اس شخص نے یہ کلمات کہے آپ ﷺ نے فرمایا پھر کہہ...... اس نے پھر کہے آپ ﷺ نے فرمایا پھر کہہ اس نے پھر کہے آپ ﷺ نے کہا جا کھڑا ہو جا اللہ نے تجھ کو بخش دیا۔

(اس کو حاکم نے نقل کیا)

ہر بیماری کی شفا

جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ سورہ فاتحہ میں ہر بیماری کے لیے شفا ہے......

(بیہقی، مشکوٰۃ)

مال و جاہ کی حرص

حضرت کعب بن مالک انصاریؓ اپنے والد سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اگر دو بھوکے بھیڑیے بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں تو بھی وہ اتنا فساد برپا نہ کریں، جتنا مال و جاہ کی حرص انسان کے دین کو خراب کرتی ہے۔

(جامع ترمذی شریف)

نیکی، گناہوں سے آزادی کا سبب

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ ''جو شخص گناہ کرتا ہو پھر نیکی کے کام کرنے لگے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جس نے اتنی تنگ قمیص پہن رکھی ہو کہ اس کا گلا گھٹ رہا ہو پھر وہ نیکی کا ایک عمل کرے اور اس کا ایک حلقہ کھل جائے پھر دوسری نیکی کرے اور دوسرا حلقہ بھی کھل جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے آزاد ہو کر زمین پر نکل آئے۔''

(سند احمد بن حنبل)

اولادِ نرینہ کے لیے

نماز کی باقاعدگی کریں...... اگر سب ٹیسٹ صحیح آچکے ہیں...... تو صبح ناشتے سے پہلے تین عدد چھوہارے (عمدہ قسم کے) درودِ ابراہیمی پڑھ کر اپنے شوہر کو کھلائیں...... اور عصر کی نماز کے بعد صرف ایک مرتبہ سورۂ محمد پڑھنا اپنا معمول بنالیں...... انشاء اللہ جلد ہی اولادِ نرینہ ہوگی بچے کے نام سے پہلے محمد ضرور لگائیں اور اس کا اسلامی نام رکھیں۔

خاندان میں یک جہتی کے لیے

سب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے بچوں میں باہمی محبت رہے اور ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کریں...... اس کے لیے ماؤں کا یہ فرض ہے کہ کسی بھی بچے کی برائی یا چغلی دوسرے بچے سے نہ کریں اگر بڑی بہن کو چھوٹی بہن برا بھلا کہتی ہے تو دوسری بہن کو یہ باتیں ہرگز نہ پہنچائی جائیں کیونکہ بچے چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوجائیں ہر اچھی اور بری بات اپنی ماؤں سے ضرور شیئر کرتے ہیں اور یہ ماؤں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حکمتِ عملی سے کام لیں...... ہمیشہ ایک دوسرے کو جوڑے رکھیں اور کسی کو کسی پر فوقیت نہ دیں...... اس کے لیے یا وَدُودُ کثرت سے پڑھیں...... سورۂ بقرہ اگر روزانہ پوری نہ پڑھ سکیں تو...... چند سطریں ہی سہی مگر پڑھیں ضرور اور پڑھ کر دعا مانگیں اور سورۂ بقرہ زیادہ سے زیادہ ہفتے بھر میں تو ختم کر ہی لیں...... اللہ تعالیٰ ہم سب میں پیار محبت، ہمدردی اور یک جہتی عطا فرمائے، آمین۔



شوابے ہومیو کلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہرو تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تا کہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجئے پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تا کہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بچوں کا قد اور غصہ

بشور جہاں......حیدر آباد

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کا قد 5 فٹ 2 انچ ہے۔ میرا قد 5 فٹ ہے۔ میرے تین بیٹے

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جولائی 2014

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

ہیں۔ بڑے بیٹے کی عمر 13 سال، دوسرے بیٹے کی عمر 11 سال، چھوٹے بیٹے کی عمر 7 سال ہے۔ میں اپنے بچوں کے لیے قد میں اضافہ چاہتی ہوں۔ تینوں کے قد اپنے ہم عمر بچوں سے کم ہیں۔ برائے مہربانی دوا بتائیں۔

میرا دوسرا مسئلہ اعصابی ہے۔ مجھے شور برداشت نہیں ہوتا۔ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ مجھے غصہ بہت آتا ہے، خاص طور پر بچوں کی پڑھائی کے وقت۔

جواب: بچوں کو متوازن غذا دیں اور ان کو اچھل کود والے کھیل کھلائیں۔ ہاکی، فٹ بال، بیڈ منٹن وغیرہ۔ کم از کم روزانہ ایک گھنٹا۔ Calc. phos-30 اور Alfalfa-Ø کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 2 مرتبہ دیں۔ آپ خود Kali. phos-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ پیا کریں۔ اعصاب مضبوط ہوں گے۔ تمام ادویات صرف اور صرف ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔ اپنا بلڈ پریشر بھی چیک کرائیں، نمک کا استعمال کم کردیں۔

ناک سے پانی

عالیہ بشیر............اسلام آباد

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ناک سے مسلسل چھ ماہ سے پانی آرہا ہے۔ میں نے بہت سی انگریزی اور اینٹی بایوٹک ادویات استعمال کیں۔ انجکشن بھی لگوائے لیکن سب لاحاصل۔ میں ناک صاف کرتے کرتے عاجز آ گئی ہوں۔ حتیٰ کہ ناک کے نتھنے زخمی ہونے کے باعث خون بھی بہنے لگتا ہے (ناک پونچھنے کی وجہ سے) میری عمر 48 سال ہے۔ باقی اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس مسئلے کا حل تجویز کردیجیے۔ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

جواب: ٹھنڈا گرم نہ کیجیے یعنی گرم کے بعد ٹھنڈا یا ٹھنڈے کے بعد گرم نہ کیجیے۔ نہانے کے بعد پنکھے کے نیچے اور نہ اے سی میں آئیں۔ کولڈ ڈرنکس سے بھی پرہیز کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات باقاعدگی سے استعمال کریں۔ Kali.bich.30، Allium cepa-30 اور Natr.mur-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

بڑھتی عمر اور مسائل

عبداللہ......کراچی

میں ملازمت کرتا تھا اب ریٹائر ہوگیا ہوں۔ صحت الحمدللہ ٹھیک ہے۔ چل پھر لیتا ہوں۔ نماز کے لیے مسجد جاتا ہوں۔ بصارت میں کچھ کمی آ گئی ہے جس کی وجہ سے رات کے وقت آنے جانے میں مشکل ہوتی ہے۔

مسئلہ: 1 میری کمر میں عرصہ تقریباً 20 سال سے درد رہتا ہے۔ بعض دفعہ درد کمر سے ہٹ کر ٹانگوں اور کولہوں میں آجاتا ہے۔

مسئلہ: 2 اکثر قبض رہتا ہے۔ اجابت زور لگانے سے ہوتی ہے۔



مسئلہ: 3 پیشاب بہت جلدی جلدی آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ سے درخواست ہے کہ ولمار شوابے جرمنی کے بورڈ کے مشورے سے کوئی زوداثر دوا تجویز فرمادیں۔

جواب: متوازن غذا لیں۔ پانی زیادہ مقدار میں کم از کم 10 گلاس روزانہ پیا کریں۔ صبح نہار منہ ایک گلاس پانی ضرور لیں۔ اسپغول کی بھوسی بالکل استعمال نہ کریں۔ زیادہ استعمال مضر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. carb-30، Bryonia-30، Nux. vomica-30 کے 7،7 قطرے آدھے گلاس پانی میں کھانے کے ایک گھنٹے بعد لیں۔ 2 ماہ بعد آ کر ملیں۔

نفسیاتی مسئلہ

زہرہ............وزیر آباد

بیماری کے دوران دل گھبراتا ہے۔ دماغ کانپنا شروع کردیتا ہے۔ گھر سے بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ سونے کی کوشش کرتی ہوں سو نہیں سکتی۔ دماغ میں ہلچل ہوتی ہے۔ اب اس بیماری نے تیسری بار حملہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اب سر میں درد بھی رہتا ہے۔ جب درد ہو تو عجیب سی کیفیت ہوتی ہے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہوتا ہے۔ تین بچوں کی ماں ہوں اور بیماری کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ مرنے کو دل چاہتا ہے، دل چاہتا ہے کوئی ہر وقت میرے پاس رہے۔ کوئی مجھ سے جدا نہ ہو۔

جواب: نمک کا استعمال بند کردیں۔ پانی 8-10 گلاس روزانہ پئیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ سبزی، فروٹ کا استعمال کریں۔ دوپہر کھانے کے بعد بالکل بھی نہ سوئیں۔ صبح و شام باغ کی سیر کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات باقاعدگی کے ساتھ استعمال کریں ایک ماہ تک۔

From Nature. For Health.

Belladona-30، Lachesis-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

نسوانی حسن

صوفیہ......وزیر آباد

شادی کو 7 سال ہو گئے ہیں۔ تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ تین بار ابارشن ہو چکے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے نسوانی حسن میں کمی ہے جو میرے لیے وبالِ جان بن گئی ہے۔

جواب: ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ بھی ایک بیماری ہے۔ ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ بازاری واشتہاری ادویات بالکل استعمال نہ کریں۔ یقیناً ان کے نتائج خطرناک ہوسکتے ہیں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں جن میں مچھلی ضرور شامل ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Iodium.30, Natrmur.30 کے 5-5 قطرے اور Alfalfa-Ø کے 11 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

پائیوریا

فاطمہ گل......سیالکوٹ

میرے نیچے کے چار دانتوں میں ماس خورہ ہو گیا ہے۔ دانتوں پر اندر اور باہر کی طرف مسوڑھوں کے ساتھ کالی کالی سی جم گئی ہے جو بہت بری لگتی ہے۔ مسوڑھے کمزور ہو گئے ہیں۔ ذرا سی چیز لگنے سے خون نکلنے لگتا ہے۔

جواب: ہر کھانے کے بعد دانتوں کو ایک خاص طریقے سے برش کرنا چاہیے۔ رات کو سونے سے پہلے بھی دانتوں کو خاص طریقے سے برش کرنا چاہیے اور صبح ناشتے کے بعد۔ اول ہم برش نہیں کرتے ہر کھانے کے بعد، دوم رات کو تو بالکل نہیں کرتے۔ صبح ناشتے سے پہلے کرتے ہیں۔ سوم یہ کہ برش کرنے کا طریقہ نہیں جانتے۔ آپ کے دانتوں پر سے اینمل پالش نکل گئی ہے اور اب دانت خرابی کی آخری حد کو پہنچ چکے ہیں۔ بہرحال آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں۔

Merc.sol-6، Calc.fluor-30، Calendula-30، Fragaria-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں 3 مرتبہ ہر کھانے کے بعد اور رات سونے سے پہلے آدھے گلاس پانی میں 15 قطرے CalendulaØ ڈال کر کلیاں کریں۔

شوگر اور پتے کی پتھریاں

وحیدہ بیگم......کراچی

مجھے شوگر بہت ہے۔ 400 تک پہنچ گئی ہے اور جوڑوں میں بھی درد ہوتا ہے اور جہاں درد ہوتا ہے وہ جگہ سوج جاتی ہے۔ میرے پاؤں بہت جلتے ہیں اور پیشاب بہت زیادہ تنگ کرتا ہے۔

جواب: بہتر یہ ہوگا کہ آپ آ کر ملیں۔ شوگر کو کنٹرول کرنے کے لیے 1-2 گھنٹے کی چہل قدمی کریں۔ کھانا تھوڑا تھوڑا کئی بار کھائیں۔ میٹھی تمام چیزوں سے پرہیز کریں اور مرغن چربیلی چیزوں سے سخت پرہیز کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں اور پھر آ کر ملیں۔ Syzygium JamboØ، کے 21 قطرے دن میں 4 مرتبہ، Chelidonium-Ø کے 11 قطرے دن میں 3 مرتبہ، Calc.carb-30، Belladona-30، Bryonia-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3

مرتبہ پئیں۔

مائی اوپیا

مسز نازیہ اشفاق......لاہور

میری دور کی نظر بہت کمزور ہے۔ اکثر سر میں درد رہتا ہے اور کنپٹیوں پر کھنچاؤ رہتا ہے۔ تقریباً آٹھ سال پہلے میری نظر کمزور ہونا شروع ہوئی تھی اور ہر سال ہی...... مزید کمزور ہو جاتی ہے۔

جواب: گاجر، سیب اور بادام کا استعمال بڑھائیں۔ پڑھتے وقت روشنی مناسب ہونی چاہیے جو پیچھے سے یا اوپر سے ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ استعمال کر کے حال بتائیں۔ Phyostigma-30، Calc. phos-30، Calc. fluor-30، Ruta-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

Period کا مسئلہ

ک، ش......ملتان

میرا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ پہلے دن نہ برداشت ہونے والا درد رہتا ہے اور Clot کی صورت میں آتے ہیں۔ مسئلہ تو ہارمونز کا ہی ہے جس کی وجہ سے ٹھوڑی پر اور گردن پر بال ہونے لگے ہیں۔ مزید یہ کہ میرا قد 5 فٹ اور 5 انچ ہے مگر وزن 60kg۔ ہر مہینے ایک آدھ کلو بڑھ جاتا ہے۔ فاقے کر کے بھی کم نہیں ہوتا۔ پیٹ بھی بڑھا ہوا ہے۔

جواب: ٹیسٹ کروالیتیں تو اچھا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں۔ Pulsatilla-30، Calc. Carb-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں Fucus ves-Ø کے 11 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔



برش کرنے کا صحیح طریقہ

ہر تین ماہ بعد برش کو تبدیل کر دیں۔ ۳ سے ۵ منٹ تک برش کریں۔ برش کرنے کا بہترین وقت ہر کھانے کے بعد ہے۔ کم از کم رات کو سونے سے پہلے اور صبح ناشتے کے بعد ضرور کرنا چاہیے۔ برش اوپر والے دانتوں پر اوپر سے نیچے اور نیچے والے دانتوں کو نیچے سے اوپر۔ داڑھوں کی صفائی کے لیے برش کو متوازی کریں۔

گرمیوں کی احتیاطیں

پانی کا استعمال بڑھائیں، پانی کا کوئی نعم البدل نہیں۔ پانی کی مقدار کا تعین درجہ حرارت اور آپ کے کام کی نوعیت پر ہے۔ بچوں کے لیے کم از کم مقدار ۴ سے ۶ گلاس روزانہ اور بڑوں کے لیے ۸ سے ۱۰ گلاس روزانہ ہے۔ خیال رکھیں کہ پانی کھانے کے درمیان اور بعد میں نہ پئیں۔ بہترین وقت کھانے سے پہلے اور کھانے کے ڈھائی گھنٹے بعد ہے پینے کا۔ گرمی میں سے آ کر پہلے اپنے جسم کا درجہ حرارت نارمل کیجیے پھر پنکھے یا ائر کنڈیشنڈ میں آئیں۔ پانی پئیں یا نہائیں تو تیز، یخ ٹھنڈا پانی یا مشروب استعمال نہ کریں۔ کولڈ ڈرنکس، اشتہاری اور بازاری تمام قسم کے شربت صحت کے لیے مضر ہیں۔ کیری، بیل گیری، فالسہ، انناس، اسٹرابیری وغیرہ کے شربت استعمال کریں۔

روزانہ نہائیے صاف ٹھنڈے یا نیم گرم پانی سے۔ کپڑے لان یا کاٹن کے ہلکے رنگ کے استعمال کریں۔ نہانے کے فوراً بعد پنکھے، اے سی، دھوپ یا لو میں نہ جائیں۔ سر کو دھوپ سے بچائیں، ٹوپی یا کپڑا استعمال کریں۔

موسم کے پھل اور سبزیوں کا استعمال کریں۔ شوربہ، چپاتی یا چاول کا استعمال کریں۔

عینک اتر جائے

نرمین اعجاز......سیالکوٹ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عینک لگی ہوئی ہے جو کہ 1۔ ہے لیکن میری آنکھ کے اندر بھی درد ہوتا ہے اور دھندلا نظر آتا ہے۔ کیا میری عینک ہٹ سکتی ہے۔ آنکھ کے درد کی وجہ سے سر میں بھی درد ہوتا ہے لیکن یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ میں چونکہ طالبہ ہوں مجھے پڑھنا ہوتا ہے آپ ایسی کوئی دوا بتائیں جس سے میری نظر ٹھیک ہوجائے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

جواب: بی بی آپ پریشان نہ ہوں۔ متوازن غذا کا خیال رکھیں ورزش کیا کریں۔ پھل، گاجر، سیب کا استعمال زیادہ کریں۔ روزانہ صبح نہار منہ 7 بادام کھایا کریں۔ سر میں لگانے کے لیے زیتون کا تیل استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے کی مندرجہ ذیل دوائیں ایک ماہ تک استعمال کریں۔ Cantharis30, Ruta 30, Calc Flour 30 , Physostigma30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

غیر ضروری بال

عقیلہ......پشاور

مسئلہ یہ ہے کہ میری بچی کے ماتھے، چہرے بازوؤں اور ٹانگوں پر بال ہیں جو کہ پیدائشی ہیں۔ ناک کے نیچے یعنی اوپر والے ہونٹ کے اوپر بھی لڑکوں کی طرح مونچھوں کے بال ہیں جو نمایاں نظر آتے ہیں۔ برائے مہربانی اس کا کوئی حل بتادیں۔

جواب:۔ بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc. Phos30 کے 3 قطرے ایک کھانے کے چچ کے برابر پانی میں دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

بغل میں پسینا آنا

ثاقب......کوئٹہ

میں پہلی مرتبہ اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہو رہا ہوں امید ہے کہ آپ کا بورڈ رہنمائی کرے گا۔ مجھے پسینا بہت آتا ہے جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ گرمی ہو یا سردی مجھے بغلوں میں بہت پسینا آتا ہے اور پسینا ٹھنڈا ہوتا ہے یہ مسئلہ بہت عرصے سے ہے۔ پسینے میں عجیب سی بو ہوتی ہے۔

جواب:۔ جنک فوڈ سے پرہیز کریں۔ کولڈ ڈرنکس کا استعمال نہ کریں۔ Sulphur200 کی ایک خوراک صبح نہار منہ لیں اور ایک دن بعد Calc.Phos 30 کے 5.5 قطرے 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ دوائیں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔

رات کو نیند نہ آنا

احسن فیروز.................کراچی

نیند نہیں آتی، رات بھر جاگتا ہوں، خیالات کی بھرمار رہتی ہے۔ کوئی اچھی سی دوا تجویز کردیں۔

جواب:۔ ڈپریشن کی وجہ سے بھی نیند نہیں آتی۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کرکے تفصیل سے حال لکھیں۔ بہتر ہوگا کہ آکر ملیں۔ LAIKAN اور VALAXAN کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ نگلیں۔ اپنا بلڈ پریشر بھی چیک کرائیں۔

☆☆☆